www.pkdigest.com

صدر اعلیٰ
عذرا رسول

11 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں کچ ادائیاں
نامے پیام کھٹی میٹھی باتیں

18 — پسِ دیوار — ایچ اقبال

ایک ایسی مشاطہ جو کسی بھی
لمحے ٹوٹ کر بکھرنے والی تھی

71 — آخری نکتہ — تنویر ریاض

چونکا دینے والے انجام کی
ایک دلچسپ قتل کہانی

79 — محسن — رضوانہ منظر

جذبۂ انسانیت کا غماز اختصار
کے پیرائے میں پر اثر قصہ

83 — محبت گزیدہ — کاشف زبیر

خوف و دہشت کے ماحول میں جنم
لینے والا زندگی اور موت کا کھیل

96 — گرداب — اسما قادری

تقدیر کی انوکھی گردش کی چال بازیاں مقدر
کا کھیل ... لٹے اور بکھر جانے والوں کی کہانی

137 — سیاہ عمامات — محمد عرفان آزاد

قانون کے رکھوالوں کے مابین
انصاف کے حصول کی جنگ کا احوال

147 — حسیب — احمد صغیر صدیقی

اسرار و تحیر کی دبیز تہوں میں
پوشیدہ سراغرسانی کا منفرد پارہ

154 — للکار — طاہر جاوید مغل

محبت کے محاذ پر بکھرے ہوئے شخص کی جدوجہد...
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

199 — سہیلی — مریم کے خان

درد و کرب کی گرفت میں مقید
دوستوں کا فسوں خیز ماجرا

215 — وبالِ دل — ثمر عباس

نکتہ رس انجام کی عقل و شعور
کو جھنجھوڑ دینے والی کہانی

227 — حدگماں — بابر نعیم

شوبز کی چمکتی دمکتی دنیا
کی پُر فریب داستان

256 — دشمن — احمد اقبال

لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دینے والے قلم کار
کی پُر ظرافت تحریر سرورق کا نکھار رنگ

000 — تراش خراش — ادارہ و قارئین

اقتباسات گدگدیاں مسکراہٹیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور ذوق کے لیے

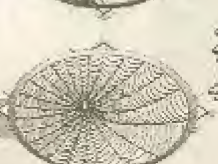

جلد39 • شمارہ06 • جون2010 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون:5895313 (021) فیکس5802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.pkdigest.com

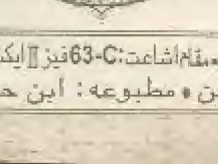

مدیراعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

جون 2010ء کا شمارہ آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ مہینا ہماری تاریخ میں عام آدمی کے لیے معاشی عسکری کے دو دست نئے جلوے لے کر آتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ ایک بار پھر جون، بجٹ اور ہم عوام... بات یقین وہی ہے بقول شاعر!

ادھر آ ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

بجٹ کا ہنر، غریب کا جگر اور بے رحم معیشت کا تیر اتنی بار عوام کو چھلنی کر چکا ہے کہ اب تو یہ حالت ہے کہ گھاؤ پر گھاؤ لگ رہے ہیں مگر ستم سہنے والوں میں تو آہ بھرنے کی بھی سکت باقی نہیں ہے۔ ادھر وہ خوش ہیں اور مجبور ہے ہیں کہ جو سسکی تک نہیں بھر رہے۔ ابھی ان کے آہ و بکا کرنے کا وقت بہت دور ہے۔ حکومت ہر سال پہلے تو یہ کہہ کر عوام کو خوش کر دیا کرتی تھی کہ بجٹ عوام دوست ہوگا۔ اب وہ ہوتا ہے کہ نہیں یہ بجٹ آنے کے بعد کی بات ہے مگر آنے سے پہلے وہ ہوتا ہے عوام دوست۔ آنے کے بعد عوام دوست نا ہوا تو یہ قسمت عوام کی... مگر اس بار تو حکومت نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جناب بجٹ عوام دوست نہیں ہوگا۔ صاحب! سالانہ بجٹ پہلے کون سا عوام دوست ثابت ہوتا رہا ہے جو اب اس خوش فہمی میں پڑتے۔ رہی بات کہ سخت ہوگا تو ہوتے دو۔ آخر سالانہ بجٹ ہے اور وہ بھی اعلانیہ۔ یہاں تو ہر ماہ غیر اعلانیہ بجٹ زندگی کو اجیرن بنائے چلا جا رہا ہے۔ ہم اس تلخ صورتِ حال پر زیادہ بات نہیں کریں گے... آپ کے مکتوبات کا رخ کرتے ہیں۔ جو یقیناً امید افزا باتوں سے پُر ہوں گے۔

سائرہ مسعود، میرپور سے شامل محفل ہیں ''7 مئی کی بارش میں نہائی سحر انگیزی مع جاسوسی نے بطور تحفہ شرف دیدار بخشا کیونکہ 31 مئی کو ہمارا اکیسواں جنم دن ہے۔ (ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں)۔ جاسوسی سے بڑھ کر ہمارے لیے اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ سرورق پر نظریں دوڑائیں تو مس جاسوسی چار حصوں میں جلوہ افروز نظر آئیں۔ دائیں طرف بھوت نما صنف وجاہت چلاتے ہوئے جانے کیوں اپنا سر پیٹ رہے تھے جبکہ شیشے میں پڑا اژدھا وجود کسی انہونی کو ظاہر کر رہا تھا۔ خلافِ توقع سرورق دیکھ کے بہت دل گرفتہ ہوئے۔ فہرست کا جائزہ لینے کے بعد اداریے سے مستفید ہوئے۔ خیر! ہمیں تو پیشگی اطلاع سے قبل ہی پرچہ 50 کا ملا۔ (کیوں؟) آغاز، خلافِ معمول طاہر انکل کی للکار سے کیا۔ تعمیری سوچ کی غماز سبق آموز تحریر میں اس دفعہ بھی تابش کے بجائے عمران ہی سرگرمِ عمل نظر آئے۔ کہانی قابلِ ستائش انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ مصائب و مشکلات اور جدوجہد سے بھرپور سرگزشت سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ ہر دل عزیز داستان ام کلثوم کا شف آفتاب کی بڑی نہایت گہرائی اور درد کا تاثر لیے ہوئے تھی۔ سجاد راناتو ملک عدم ہو گئے جبکہ ماہ بانو ایک بار پھر گردشِ ایام کا شکار ہو گئی۔ شہریار اور ماہ بانو پر یکے بعد دیگرے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں جن سے نبرد آزما ہونا ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف کشور کو اپنے شریکِ حیات کے ساتھ بتائے گئے خوش گوار لمحات کے ردِعمل کا سامنا حویلی کی انتہائی وحشت انگیز ظالمانہ روایتوں سے کرنا پڑے گا۔ کاشف زبیر کی جھوک میں حسن خوب صورتی سے انسانی رویوں اور جذبات و احساسات کی عکاسی کی گئی۔ وفا شیلا قابلِ تحسین ہے۔ مریم کے خان کی خیالی سراب محبت کے انوکھے جذبے سے بھرپور قابلِ ستائش تحریر ثابت ہوئی جس نے آخر تک ہمیں سحر زدہ کیے رکھا لیکن روبینہ کی ناکہانی موت افسردہ کر گئی۔ رضوانہ منظر کی چوٹ مختصر مگر سسپنس سے بھرپور سبق آموز تحریر تھی جس میں مسٹر ہیٹ خوب صورتی سے بچھائے گئے اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ آصف ملک کی پیشگی دفاع اور شرجیل کی تنہا سفر میں مماثلت ہوتے کے باوجود دونوں حقیقت سے قریب ترین خاصی متاثر کن لاجواب تحاریر تھیں۔ دل سنگ اور تعبیر اپنی نوعیت کی انوکھی مگر الجھی ہوئی تحریریں تھیں۔ دنیا نے رنگ میں محبت کے پاکیزہ جذبوں سے لبریز تخلیق، جوشِ وحشت انوکھی اور اچھوتی تحریر ثابت ہوئی۔ جواد جیسے کم ظرف لوگوں کو اگر ان کے ظرف سے بڑھ کر مل جائے تو وہ ایسے ہی بھیانک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ سلیم فاروقی کی رزقِ حلال ہمارے معاشرے میں ہونے والے جرائم و مظالم کی عکاس ایکشن سے بھرپور تیز رفتار کاوش تھی۔ اب کچھ تبصرہ دوستوں پر۔ صدیقی صاحب! آپ کی عقل مندی پر صد افسوس۔ ارے ہم نے کب کسی کو مورد الزام ٹھہرایا۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمایا ہوتا کہ ہم نے کس کی مایوسی کا ذکر کیا تھا۔ رومیو صاحب! ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں لیکن صنف کرخت میں وجاہت والی بات بھی تو ہو۔ اب صنف

قارئین سے گزارش احوال واقعی

مہنگائی کے طوفان بلاخیز نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنی ہزار ہا گرفت میں لیا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ہم بھی شب و روز اس کڑی آزمائش سے گزر رہے ہیں، آپ کا یہ ماہ نامہ اس صورتِ حال سے متاثر ہے۔ قارئین کی طرف سے قیمت میں اضافے کی تجویز کو ہم مسلسل نظر انداز کرتے رہے مگر تابکے!

کاغذ سے جلد سازی تک، سب اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ازالے کی ایک ہی صورت تھی جس کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ اس ماہ سے قیمت 50 روپے فی شمارہ کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس اضافے کو ہماری ناگزیر مجبوری کے طور پر قبول کریں گے۔ (ادارہ)

www.pkdigest.com

صاف دل یا صنفِ مہربان تو لکھنے سے رہے۔ نرپل ایس آپ کا تبصرہ ہمیشہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ اسی لیے دیگر تبصرہ نگار آپ کا انداز اپنا رہے ہیں۔ آئندہ بھی لکھتے رہیے گا۔ بہت شکریہ۔''

عبدالرؤف زرگر کا تبصرہ مظفر گڑھ سے ''سرورق پر بکھرے ہوئے کسی حسینہ کے چہرے کے ٹکڑے دراصل اس دل کے ٹکڑے ہیں جس میں یہ حسینہ جلوہ افروز ہے۔ تو پھر اس دل کے اتنے ٹکڑے کیوں ہو گئے...؟ دکھ سے... تکلیف سے... یا ذلت سے... لیکن کسی کو دل میں بسانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ دل کی وادی میں بسنے والے ہمیشہ خوشی و عزت اور احترام نہیں دیتے۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے اداریے کو ایک نظر دیکھا تو رک گئے۔ آپ نے بالکل سچ کہا، لوڈشیڈنگ، مہنگائی کی وجہ سے وسائل میں کمی اور مسائل میں اضافہ ہوا ہے اس لیے جاسوسی ڈائجسٹ کی قیمت میں اضافے پر کوئی خاص حیرانی نہیں ہوئی... کیونکہ مہنگائی کے اس دور میں اتنے معیاری رسالے کا ادارے ہاں مختلف مراحل سے گزر کر آنا یقیناً ان کے حوصلے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تبصروں کی دنیا میں بھاگے بھاگے پہنچے تو ہمیں رکنا پڑا، سوچنا پڑا اور بے اختیار اقرار کرنا پڑا، ہم تو پہلی مرتبہ لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں... خیر اب آ ہی گئے ہیں تو علی عمران کو مبارک باد دے ہی دیتے ہیں جن کے تبصرے کو پڑھ کر ہمیں کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ روشانے صنم و اعجاز احمد، ایم اے صدیقی کا تبصرہ پسند آیا۔ سب سے پہلے بھوک پڑھی جسے کاشف زبیر نے لکھا، کہانی پر گرفت تو خیر کی تھی اور لکھنے کے لیے یہ بھی تو تھا کہ جب پیٹ کے اس جہنم کا ایندھن نہیں بھرتا تو انسانیت کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر انسان بھی آدم خور درندہ بن جاتا ہے۔ ہر رشتہ و تعلق اور واسطہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ تنہا سفر پڑھی جو مغربی معاشرے کی سیاہ کاریوں کو اجاگر کر رہی تھی اور معاشرے میں موجود غلاظت کا پردہ چاک کر رہی تھی اور ان لوگوں میں موجود تشدد پسندی کو عیاں کر رہی تھی۔ حیرت تو یہ ہے کہ دنیا ان کو امن پسند، پرندوں و جانوروں سے محبت کرنے والی اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی ہے۔ پیشگی دفاع پڑھی، متاثر ہوئے۔ اپنا دفاع تو حق ہے، نیز عزت سے بڑھ کر اور کون سی چیز پیاری ہو سکتی ہے۔ ملک کے محافظ کی اخلاقی پستی کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ طاہر جاوید مغل کی للکار پڑھی اور اس میں کھو گئے۔ جوش، وحشت سچ کہتے ہیں حسن و علم اور دولت اپنا آپ منواتا ہے۔ جواد کے پاس حسن بھی تھا، علم بھی اور وہ مسیحا بھی تو تھا مگر اس نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا، خدا کو بھول گیا۔ دوسروں کی زندگی کو برباد کرنا شروع ہوا تو خود بھی تو برباد ہوا۔ یہ تو مکافاتِ عمل کا ایک حصہ تھا۔''

محمد سلیم شبلی کی فرمائش ضلع ملتان سے ''مئی 2010ء کا سرورق خاصا دلچسپ لگا۔ حسینہ کی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تصویر کے پیچھے بیٹھا آدمی چاہے ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ ہائے رے مہنگائی۔ یہ مہنگائی ہمیں اور آپ کو اس سے بھی آگے لے جائے گی۔ ہمیں بھی آپ کا یہ فیصلہ بادلِ ناخواستہ قبول کرنا پڑے گا۔ جواد اداس صاحب عزت افزائی کا شکریہ! ویسے اتنے اداس کیوں رہتے ہو؟ کبیر عباسی کی لگتا ہے چھٹی حس کافی تیز ہے جو ٹھیک ٹھیک اندازے لگاتے ہو۔ روشانے صنم! ارسلان رضا پر اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟ آمنہ پٹھانی! میں نے تو آپ سے اتنا پوچھا تھا کہ آپ کون سی کلاس میں ہو جبکہ آپ الٹا مجھے سنانے بیٹھ گئیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ میں نے نہ صرف دو، چار جماعتیں پڑھ لی ہیں بلکہ اب ایف ایس سی کر رہا ہوں۔ لگتا ہے نرپل ایس کے اسماعیل نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ بہرحال، ہم دعا کریں گے کہ آپ چوتھی بار میٹرک میں فیل ہونے سے بچ جائیں۔ آسیہ خان! اتنا غصہ اچھا نہیں۔ تنقید کو میر لیس بنا لیا کرو۔ اصل بات تنقید کو برداشت کرنا چاہیے۔ دلنشین بلوچ! آپ کو بھی ہمارے ساتھ بلیک لسٹ کر دیا گیا۔ خیر، اب کبھی ملتان آنا ہو تو بتا کر آنا، کچھ میزبانی کا حق ہمیں بھی ادا کرنے دیجیے۔ اپنے پیارے شہر ملتان سے نئے دوستوں ڈاکٹر سلیم رضا اینڈ کاشف رضا اور غزالہ وقار کو دل سے خوش آمدید۔ غزالہ وقار! آپ لکھتی بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ یہ قسط کافی سنسنی خیز رہی۔ سجاد رانا کا قتل اور ماہا بانو کے اغوا پر بہت افسوس ہوا۔ شہریار اب بہت مشکل میں پھنس چکا ہے۔ ادھر اب کشور کا راز بھی ظاہر ہو چکا ہے۔ دیکھتے ہیں اب وہ کس طرح خود کو بچائے گی۔ للکار میں عمران کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میڈم کو قابو کر لینا بڑی بات ہے۔ اب تابش کو بھی کچھ ہاتھ پیر ہلانے چاہئیں۔ دونوں رنگ بہت زبردست تھے۔ جوش، وحشت میں آذر کو کم از کم ایک بار علینہ سے کہہ تو دینا چاہیے تھا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے۔ سلیم فاروقی کی رزقِ حلال میں ایک تو جمی کی بہادری پسند آئی، دوسرا رزقِ حلال کی برکت نے جمی کو بچا لیا۔ دل سنگ کہانی بالکل پسند نہیں آئی۔ انکل! ابتدائی صفحات پر صرف اور صرف تاریخی کہانی لگایا کریں۔''

ساگر تلوکر، چشمہ بیراج سے حاضر ہیں ''اس بار ٹائٹل مختلف اور منفرد تھا مگر دلکش نہیں تھا۔ ڈاکر انکل سے گزارش ہے کہ کبھی کبھی ٹائٹل کو رومانٹک بھی بنا دیا کریں۔ چٹنی، رخت چٹنی میں داخل ہوا تو پتا چلا کہ چٹنی کی طرح ہمارا فیورٹ رسالہ بھی مہنگا ہو گیا۔ بس انکل! اسے بند نہ کرنا۔ محفل میں علی عمران کرسیِ صدارت سنبھالے ہوئے تھے مگر ان کا تبصرہ اتنا جاندار نہیں تھا کہ کرسیِ صدارت پر فائز ہو جاتے۔ جواد صاحب! اپنے نام کے ساتھ اداس کے بجائے شاد لگائیں، مشورہ مفت ہے۔ تصویر احسن، آمنہ پٹھانی، آسیہ خان، زینب کیپٹ، کبیر عباسی، ایم اے صدیقی اور رومیو کے تبصرے واقعی شاندار اور اچھے تھے۔ نوبی کو مجرائی طور پر ڈائجسٹ جلد مل گیا مگر ہمارے ساتھ تو یہ معجزہ کبھی نہیں ہوا۔ روشانے صنم بہت عرصے بعد تشریف لائیں، اچھے سے تبصرے کے ساتھ۔ اب آتی ہی رہنا۔ جہانگیر اسلم بھی بہت عرصے بعد آئے پرانے تیکھے کے ساتھ خوشبو لگا کے۔ جب آپ ہر کام خوشبو لگا کے کرتے ہیں تو پھر خط پر بھی خوشبو چھڑک کر ارسال کیا کریں۔ آپ نے پرانے ساتھیوں کو یاد کیا مگر کسانہ اور گلکوری کو کیوں بھلا دیا؟ سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی گرداب پڑھی۔ اسما قادری کی کہانی پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ کہانی آغاز سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ سجاد رانا اور اکرم خان کی موت نے بہت حیرت کیا ہے۔ اب ''را'' کے ساتھ ساتھ ''موساد'' بھی منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ للکار کی بھی یہ قسط اچھی رہی۔ پہلا رنگ اچھا تھا۔ بہت پسند آیا۔ دوسرا رنگ سلیم فاروقی کا تھا۔ ان سے گزارش ہے کہ آپ بچوں کے لیے ٹارزن اور سپرمین کی کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ ان کی ہر کہانی میں ہیرو خدائی فوج دار بنا پھرتا ہے اور اپنے منہ میاں مٹھو بھی۔ مختصر کہانیاں ساری مغربی تھیں۔ انکل جی! شارٹ اسٹوریز میں مشرقی کہانیوں کو بھی شامل کیا کریں۔ ابتدائی کہانی بہت بور اور بکواس تھی۔ ابتدائی صفحات پر کوئی شاندار مشرقی کہانی شائع کیا کریں۔''

جعفر حسین کی رائے بھوانہ سے ''اس دفعہ جاسوسی مئی کی ایک حبس زدہ شام کو ملا۔ سرورق اس بار جاسوسی کے شایانِ شان تھا۔ کونے میں پڑا شخص لگتا تھا شاید جان کنی کی کیفیت میں ہے۔ لوڈ کے دانتوں میں منقسم پری چہرہ دوشیزہ کو غالباً اس کی ذہنی کشمکش کے پیشِ نظر اس طرح دکھایا گیا تھا۔ فہرست کے سرسری جائزے کے بعد محفل میں قدم رکھا۔ محفل میں شاک کی کیفیت سے سنبھلنے میں بھی کافی وقت لگ گیا۔ دوستوں میں زبان زدِ عام ہمارا تذکرہ تھا اور جن کا تذکرہ تھا، وہ محفل سے غیر حاضر اور بلیک لسٹ میں تشریف فرما تھے۔ تصویر احسن صاحب! اچھا نہ اچھا کیا آپ نے پڑھائی نہ کرنے کے لیے۔ غزالہ وقار صاحبہ! اگلی بار آپ تعریف و

توصیف کر کے کرسیِ صدارت حاصل کر سکتی ہیں تو کریں۔ نرپل ایس صاحب! اگر آپ اسی طرح کہانیوں کے خلاصے سناتے رہیں گے تو سیاست تو کرنی پڑے گی۔ تبصروں میں روشانے صنم، کبیر عباسی، ایم اے صدیقی اور رومیو کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے تنویر ریاض کی دل سنگ پڑھی۔ مغربی تہذیب کے خود غرض اور ریاکار معاشرے کے انسانی احساسات کا احاطہ کرتی لو یہ رنگ بدلتی ایک شاندار تحریر تھی۔ گرداب کرداروں کی بھرمار کے باوجود مصنفہ کی زبردست کاوش ہے۔ مدوجزر کہانی کا مرکزی خیال واضح ہو رہا ہے لیکن تھوڑی سی تحریر میں پختگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ سسپنس جو قاری کو الجھاؤ میں ڈال کر اس کو سطر سطر تحریر سے جڑے رہنے پر مجبور کرتا ہے وہ مصنفہ پہلے ہی ظاہر کر دیتی ہیں۔ زندگی کی ساعتوں سے سر تیں کشید کرتے کرتے شاید آفتاب اور کشور تقدیر کی فسوں گری کو بھول گئے تھے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ للکار کی قسط ہمیشہ کی طرح شاندار رہی۔ تابی کا عمران سے رویہ کافی درشت محسوس ہوتا ہے۔ مغل صاحب نے لطیف پیرائے میں جیو دو چینل پر چوٹ کی۔ مجھے تو للکار کے کردار عمران اور ابنِ صفی مرحوم کے مشہورِ زمانہ کردار ''عمران'' میں چنداں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ وہی انداز بیاں، وہی شوخ و چنچل رویہ اور وہی ہر فن مولا شخصیت۔ نئی مصنفہ کا پہلا رنگ جوش، وحشت نے مایوس کیا۔ رزقِ حلال میں ہمیشہ کی طرح سلیم صاحب کا ہیرو بے پناہ طاقت اور مار دھاڑ میں ماہر تھا۔ تحریر میں ایکشن تو تھا مگر قاری کو اپنی گرفت میں جکڑنے والی کیفیت ناپید تھی۔ جو تھرل، سسپنس اور ایکشن رنگوں کا خاصہ ہوا کرتا تھا، وہ اب نظر نہیں آتا۔ بھوک اپنی تمام تر سفاکی اور کراہت کے باوجود اس لیے پسند آئی کہ جہاں معاملہ پیٹ کی آگ کا ہو وہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ تعبیر ایک نئے مصنف کی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ پیشگی دفاع موضوع کے تنوع کے لحاظ سے تو اچھی تھی مگر تحریر کی بے جا طوالت اور مخصوص فقروں کی گردان نے بور کیا۔ انقلابِ فرانس کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر خیالِ سراب نے خاصا متاثر کیا۔ روزین کی بے خبری اس کو اس کے محبوب کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھی محروم کر گئی۔ چوٹ اس حقیقت کی بھرپور عکاس تھی کہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کتنے سنگین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ثمر عباس کی تنہا سفر مغربی معاشرے کی بے راہ روی کی صحیح عکاس خوب صورت تحریر تھی۔''

کبیر عباسی کی باتیں ملکہ کوہسار سے ''ٹائٹل اس دفعہ انتہائی خوب صورت اور عام ڈگر سے ہٹ کے تھا۔ ٹکڑوں میں بٹی ٹائٹل گرل کو تین سر کو ہاتھوں میں تھامے پریشان زدہ شخص اور خون اگلتی ادھوری لاش یعنی سرورق کے تینوں کردار جہاں سرورق کے رنگوں کے مصطفیٰ کو ٹائٹل پوز دے رہے تھے، وہاں ہمیں بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ فہرست پسند آئی۔ آغاز حسبِ معمول گرداب سے کیا۔ آج تک شائع ہونے والی اقساط میں سب سے دلچسپ قسط اس دفعہ کی لگی۔ ''را'' اور ''موساد'' کے بعد کسی امریکی تنظیم کے بھی شامل ہونے کے امکانات ہیں۔ سجاد رانا اور اکرم کی موت دکھی کر گئی۔ ویل ڈن اسما صاحبہ۔ للکار میں عمران کا کردار بہت منفرد اور جاندار ہے اور کہانی کی جان بھی یہی کردار ہے۔ ابتدائی صفحات پر انگریزی سے ترجمہ تحریر دیکھ کے بہت خوشی ہوئی مگر خلافِ توقع تنویر ریاض کا انتخاب ہمیں کچھ خاص پسند نہ آیا۔ جہاں ایک تو ہمیں کہانی کا پلاٹ خاصا کمزور لگا، دوسرا ہمیں سراغ رسی پر مبنی ایسی تحریریں کچھ خاص پسند نہیں آتیں جن میں سراغ رساں محض کمزور سے اندازوں کی بنا پر ادھر ادھر چھاپے مارتا پھرتا ہے اور اسے غیر معمولی کامیابیاں مل جاتی ہیں۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ نئی رائٹر کا تھا۔ کہانی پسند آئی۔ ہمارا تو اندازہ تھا کہ رائٹر صاحب کوئی فلمی سی چویشن پیدا کر کے آذر کو ٹھیک کر دیں گی۔ تاہم رائٹر نے واقعات کو حقیقت کی بھرپوری کے ساتھ پیش کیا۔ سلیم فاروقی کی تحریر اس امید پر شروع کی کہ شاید یہ کچھ مختلف سی تحریر ثابت ہو مگر خلافِ امید یہ ایک مکمل ''فاروقی تحریر'' ثابت ہوئی۔ ہم تو پوری کہانی کے دوران خائف ہی رہے کہ ابھی ہیرو صاحب خالص امریکی لہجے میں رواں انگریزی بولنا شروع کر دیں گے۔ تاہم خیریت گزری۔ ہیرو صاحب نے امریکا سے آنے کی گپ تو ماردی مگر ہم پر کرم کرتے ہوئے انگریزی بولنے سے گریز کیا۔ سلیم فاروقی کا اندازِ تحریر بھی دلچسپ ہے۔ کاوش مصنف کچھ کردار نگاری پر بھی توجہ دیں۔ مختصر تحریروں میں پہلے نمبر پر یقینی طور پر آصف ملک کی پیشگی دفاع رہی۔ تحریر کیا تھی، دنیا کے مہذب ترین کہلانے جانے والے ملک کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ تھی۔ دوسرا نمبر کاشف زبیر کی بھوک کا تھا۔ اس تحریر نے تو ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے جو ابھی تک بیٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ آخری جملہ پہلے تاثر میں مزاحیہ محسوس ہوا مگر اس کی گہرائی میں گہرا اور پوشیدہ دکھ تھا جس کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو کئی دن تک بھوکا رہا ہو۔ تیسرا نمبر مریم کے خان کی خیالِ سراب کو ملا۔ یہ تحریر کچھ اتنی زیادہ دلچسپ تو نہیں تھی تاہم نصف صدی پرانے واقعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پسند آگئی۔ ثمر عباس کی تنہا سفر چوتھا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ تھیم اور واقعات تو عام سے تھے تاہم سسپنس کا فیکٹر اس میں موجود تھا۔ رضوانہ منظر کی چوٹ کو ہم نے پانچواں نمبر دیا۔ سراغ رسی پر مبنی تحریروں کی کامیابی کا دارومدار ہمارے نزدیک اس نکتے پر ہوتا ہے جیسے سراغ رساں پکڑ کر مجرم تک پہنچتا ہے۔ چوٹ میں یہ نکتہ کچھ اتنا اچھوتا نہ تھا سو تحریر کچھ خاص پسند نہ آئی۔ شاکر صنم کی تعبیر جو آخری نمبر پر رہی شروع میں تو دلچسپ لگی مگر آگے جا کے اس کا سرپیر ہی نہیں رہا۔ اسکیچز تو شاہد صاحب ہمیشہ زبردست ہی بناتے ہیں۔ ہم تو ان کے فن کے بہت قدردان ہیں۔ کچھ میں دلچسپ تو تھیں مگر زیادہ تر پرانی تھیں۔''

چودھری کی سسٹر زکی باتیں رحیم یار خان سے ''جاسوسی اس دفعہ حسبِ معمول 3 تاریخ کو ہی ملا۔ ٹائٹل اس دفعہ معمول سے ہٹ کر تھا اس لیے پسند آیا۔ اس بار علی عمران اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ محفل جاسوسی کی قیادت کر رہے تھے، مبارکاں۔ روشانے صنم، غزالہ وقار، ہمایوں سعید، رومیو، ایم اے صدیقی کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ کبیر صاحب! کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق ہی رومانس ہو تو اچھا لگتا ہے، زیادتی کسی بھی شے میں ہو تو ناگوار گزرتی ہے۔ بہرحال، ہم نے آپ کو شکریہ کہہ کر دوبارہ شکریہ کہنے پر مجبور نہیں کیا۔ اسی بات پر ہو جائے پھر ایک ''شکریہ''۔ نرپل ایس کے اسماعیل نے اس دفعہ خلاصہ کے بجائے تبصرہ لکھ دیا سو یہ بھی مبارک باد کے مستحق ٹھہرے۔ رومیو صاحب! آپ کے کس کلاس کے امتحانات ہو رہے تھے؟ گرداب میں تمام کردار اس دفعہ حالات کے گرداب میں پھنسے رہے۔ سجاد رانا کے قتل پر بہت دکھ ہوا۔ ادھر ماہا بانو پر اکرم اپنی زندگی ہار گیا اور ابھی نہ جانے کتنے لوگ ماہا بانو پر قربان ہوں گے۔ چودھری صاحب اپنی ہوس پرست فطرت کے ہاتھوں را اور موساد کے شکنجے میں پھنس چکے ہیں اور ان کی انتہا بھی را کے ہاتھوں ہوگی۔ کشور پہلے گرداب سے نکلنے میں تو کامیاب رہی لیکن اب جس گرداب میں پھنسی ہے اس سے نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ للکار اس دفعہ بھی زبردست رہی مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میڈم منشورا کو بہت کم عمر دکھایا گیا ہے جبکہ اس کو جتنا کاروباری اور تجربہ کار دکھایا گیا ہے، کم از کم اس کی عمر 35 سال ہونی چاہیے۔ ڈیڈی کی بے راہ روی ایک آنکھ نہ بھائی۔ بہرحال، مجموعی طور پر کہانی دلچسپ رہی۔ کاشف زبیر نے بھوک جیسے حساس موضوع پر قلم اٹھایا۔ بھوک انسان سے ایسے ایسے کام کرواتی ہے جن کا عام حالات میں کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ شہرت، دولت اور ہوس کا پیٹ بھرنے کے لیے ایسے گھناؤنے کام کرتے ہیں جن سے ہم روزانہ اخبارات کے پیٹ بھرے دیکھتے ہیں۔ تنہا سفر میں مغربی معاشرے کی صحیح تصویر کشی کی گئی۔ مغربی عورتیں ہماری عورتوں سے کہیں زیادہ عدم تحفظ کا شکار ہیں لیکن ہمارے ہاں کے معمولی سے واقعے کو مغربی میڈیا اتنا اچھالتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ خیالِ سراب میں روزین کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔ ذاتی محبت کو ملک و قوم کی محبت پر مقدم نہیں

ہونا چاہیے۔ روبین نے اپنی قوم سے غداری کی جس کی سزا بھی پائی۔ پہلا رنگ جوش، وحشت پسند آیا۔ جو محبت کاروباری بنیادوں پر استوار ہو، کبھی پائیدار نہیں ہوتی۔ جواد نے بھی محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہا، نتیجتاً ہار اس کا مقدر بنی۔ علینہ اور آذر کا کردار پسند آیا۔ آذر کی محبت سچی تھی سو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ سلیم فاروقی کی کہانیاں حقیقت سے کوسوں دور ہونے کے باوجود پسند آتی ہیں۔ باقی چھوٹی کہانیاں اس دفعہ ٹھیک ہی تھیں۔ کترنیں البتہ بہترین اور دلچسپ تھیں۔''

ہمایوں سعید رومیو جوں سے لکھتے ہیں ''اس دفعہ سرورق زیادہ خاص تو نہیں البتہ منفرد ضرور تھا۔ لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کی وجہ سے شدید ڈپریشن میں مبتلا شخص تقریباً 90 فیصد پاکستانیوں کی بے بسی اور لاچاری کی عکاسی کر رہا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے فہرست میں داخل ہوئے۔ جاسوسی کی سلیکشن کمیٹی نے ایک دفعہ پھر میرٹ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے علی عمران کو صدر گلستان بنایا۔ اواس صاحب! مبارک ہو۔ آپ نے چودھری اور عمران کے بارے میں درست اندازے لگائے۔ تصویر العین جی! آمنہ نے آپ کا شکریہ ادا کیا تو آپ کو برا لگا۔ میں نے نہیں کیا تو بھی برا لگا۔ ایک ہی وقت میں دو متضاد بیانات؟ رضا بروار! پہلے تبصرے میں جب لوگ خود ویلکم کے متمنی ہوتے ہیں آپ دوسروں کو ویلکم کہہ رہے ہیں، خیریت ہے؟ ایلی وے، وہ مگروٹ جن پور، شہزادے پیارے، میں سڑک چھاپ رومیو نہیں اور جنگل رومیو ہوں۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں۔ روشانے صنم! ہم آپ کو کیا بتاتے یہ تو خود میرے لیے بھی کسی انکشاف سے کم نہیں۔ آمنہ جی! نوٹ کر لیں غزال کو آپ کا نام ہیبت ناک، وحشت ناک، خطرناک اور باقی کے بھی ناک لگتا ہے۔ جہانگیر بھائی! شاید آپ کو طویل عرصے بعد خوشبو کی صفت بول ملی ہے۔ اسی لیے آپ خوشبو میں نہا کے آگئے۔ خیر آتے رہیے گا۔ آپ اکیلے پورے محفل کو مہکا دیتے ہیں۔ خوشبو لگا کے۔ ململ کار اس بار قدرے پھیکی رہی۔ سوائے آرٹ پیس کی چوری کے کچھ بھی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ البتہ گرداب کافی تیز رفتار رہی۔ اکرم اور سجاد رانا کی موت نے دکھی کیا۔ ماہ بانو تو ایک بار پھر عجیب و غریب لوگوں کے پیچھے چڑھ گئی۔ شاید ماہ بانو کی خوب صورتی نے ڈیوڈ کو اسے اغوا کروانے پر مجبور کیا۔ رنگوں میں پہلا رنگ دل پر نقش ہو گیا۔ جواد کو بے شمار معصوموں کی بددعائیں لے ڈوبیں اور آذر کی مخلصی اور انسانیت کا صلہ اسے علینہ جیسی من چاہی شریک حیات کی صورت میں ملا۔ رزق حلال میں رزق حلال نے اپنا اثر دکھایا اور جمی جرائم کی دلدل میں پھنستے پھنستے بچ گیا۔ کاشف زبیر کی بھوک کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ واقعی پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے انسان کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ پیشگی دفاع نے امریکیوں کی حیوانی فطرت کے ایک اور باب سے روشناس کرایا۔ واقعی سچ ہے۔ وہ اپنوں کو نہیں بخشتے تو ہم کس گنتی میں آتے ہیں۔ خیال سراب میں روبین نے محبت کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے محبوب کی خاطر جان قربان کر دی۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ جس کے لیے وہ اپنی قوم سے غداری کرنے جا رہی ہے، وہ اس کا محبوب نہیں بلکہ ایک ظالم حکمران تھا۔ تجا سلر میں میلسی نے ہوش و حواس سے کام لے کر نہ صرف خود کو اس وحشی دیوزاد کے چنگل سے چھڑایا بلکہ ان بے شمار لڑکیوں کو بھی جو مستقبل میں دیوزاد کا شکار بننے والی تھیں۔ چوٹ اور تعبیر تو بالکل اچھی نہیں لگیں اور دل سنگ اس لیے نہیں پڑھی کہ ابتدائی صفحات پر صرف مشرقی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔''

تنویر ریاض ڈڈیال سوہنگی آزاد کشمیر سے ''مئی کا شمارہ خلاف معمول 4 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق زبردست تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے جوئے کے پانسوں پر حسینہ کی تصویر بنا کر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ جوئے کے پانسوں اور زیادہ تر حسیناؤں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کوئی پتا نہیں، یہ کب کس کی طرف لڑھک جائیں۔ اس چیز کو نہ سمجھنے کا انجام سرورق میں موجود دو اشخاص کی صورت میں دکھایا جن میں ایک تو چارو ناچار ... تھا۔ اشتہارات کو دیکھتے ہوئے پہنچے محفل مکتوبات میں۔ میرے خیال سے قارئین جاسوسی پر دس روپے کے اضافے ... ادارے کی مجبوری کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ منڈی بہاؤالدین سے جہانگیر اسلم کو دل سخت گرمی میں پسینے کی بو سے چھٹکارا پانے کے لیے بار بار خوشبو لگا رہے تھے۔ جہانگیر اسلم! آپ لڑکیوں کو گرین سگنل دینے کے چکر میں نہ پڑو۔ پہلے ہی آپ اس کی وجہ سے ریڈ سگنل میں پھنسے ہوئے ہو۔ کرسی صدارت پر علی عمران براجمان تھے، اچھے انداز سے کیے گئے تبصرے کے ساتھ آپ کو بہت مبارک ہو۔ علی عمران صاحب، تصویر العین کا تبصرہ بڑا پسند آیا۔ جواد اواس، اواس ہونے کے باوجود اچھے تبصرے کرتے ہیں۔ صدیقی صاحب بھی اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ کبیر عباسی عرف شہزادہ کو ہمارا آپ نے دلنشین بلوچ کو حماقتوں پر انعامی شیلڈ نہ بھیج کر اچھا فیصلہ کیا۔ بندے کو اچھا انجام دوسروں کو نہیں دینا چاہیے۔ آسیہ خان رومیو کی تعریف میں اتنا لکھ دیتی ہیں کہ جب کہانیوں کی باری آتی ہے تو کہتی ہیں، اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ رومیو بھی اچھا تبصرہ کرتے ہیں جبکہ محفل میں عصمت صاحب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ عصمت یار! اکثر لگاتے لگاتے کہیں سو تو نہ لگا؟ شروع کر دیا مہربانی ہوگی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی پسندیدہ رائٹر مریم کے خان کی خیال سراب پڑھی۔ روبین نے ہزاروں لوگوں کی جدوجہد آزادی کو خطرے میں ڈال کر اپنی نام نہاد محبت کو بچانے کے لیے اپنوں سے غداری کی جس کی سزا اسے گلوٹن پر سر کٹانے کی صورت میں ملی۔ ململ کار زبردست جا رہی ہے۔ عمران نے جس طرح بدھا کا مجسمہ نکالا، قابل تعریف ہے مگر بخش اور سراج کی صلح پسند نہیں آئی۔ گرداب بھی اچھی جا رہی ہے۔ پیشگی دفاع میں امریکن فوجیوں کا مکروہ چہرہ سامنے آیا۔ سوزن نے قتل کرنے کی زبردست دلیل دے کر ججوں کی بولتی بند کر دی۔ دل سنگ بھی اچھی تھی اور چوٹ میں ڈاکٹر سیڈ ارا اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پھنسا۔ بھوک میں کاشف صاحب نے غیر متوقع اینڈ کر کے اس کو بے اثر کر دیا جبکہ تعبیر پڑھ کر اتنا سر میں ہی درد ہو گیا۔ عجیب سی کہانی تھی، بالکل بھی پسند نہیں آئی جبکہ سرورق کے دونوں رنگ لاجواب تھے لیکن پہلے رنگ میں علینہ کا جواد کی حقیقت کھلنے کے باوجود منگنی نہ توڑنے اور اسے آذر کے گھر نے جانے کے لیے راضی ہونا غیر فطری لگا۔ دوسرے رنگ میں جمی کو سبق مل گیا کہ درندوں کا ساتھ دینے کی صورت میں خود انسان کا اپنا گھر بھی درندگی سے محفوظ نہیں رہتا اور اصل سکون رزق حلال ہی میں ہوتا ہے۔ الغرض مئی کے شمارے میں موجود تمام کہانیاں پسند آئیں ماسوائے بھوک اور تعبیر۔''

ملتان سے غزالہ وقار کی تعریف و توصیف ''مئی کا شمارہ چلچلاتی گرمی میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا، اس لیے نہیں کہ میرا خط چھپا تھا بلکہ اس لیے کہ جاسوسی میں پسند ہی اتنا ہے۔ سب سے پہلے عادتاً سرورق پر غور فرمایا کہ عقل مند لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لیتے ہیں ہم نے بھی کوشش کی، عقل مند بننے کی نہیں مضمون بھانپنے کی۔ ایک آدمی کو سر کے بال نوچتے دوسرے کو اوندھے منہ گرے اور حسینہ دلنواز کو بے نیاز دیکھ کر کچھ کچھ اندازہ لگایا۔ مختلف کرشنوں کو شان بے نیازی سے دیکھا اس کے بعد سیدھے زندہ دلوں کی محفل میں انٹری کی آپ کی باتوں سے سو فیصد اتفاق کرتے ہوئے وکٹری اسٹینڈ پر علی عمران کا ''زبردست'' تبصرہ پڑھا۔ اتنا مختصر کر گئے تھا زبردستی ہی لکھا ہے پھر باقی سب کے تبصرے، رائے و تعریف پڑھنے کے بعد فوراً گرداب کی طرف رخ موڑا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ کشور کے آگے کے حالات جاننے کی کوشش کی اور اسے بال بال بچتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ماہ بانو لگتا ہے ملک دشمن عناصر کے ہتھے لگ گئی ہے اور وہ اس کے ذریعے چودھری سے کوئی خطرناک

سودا کریں گے۔ اس قسط میں سارا نقصان اپنے لوگوں کا ہوا اس لیے اگلی قسط میں ان کو منہ توڑ جواب ملنا چاہیے۔ اس کے بعد طاہر صاحب کے ململ کار کی طرف چلے۔ کہانی بخوبی ایکشن میں آتی جا رہی ہے۔ امید ہے عمران کا ماضی بھی جلد سامنے آئے گا۔ میڈم مطورا کا کردار بھی لمبا چلتا نظر آتا ہے۔ کہانی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ سلسلے وار کہانیوں کے بعد ریوس گیئر لگایا اور تنویر ریاض کی دل سنگ پر بریک لگائی۔ کہانی دلچسپ اور جاسوسی سے بھرپور تھی۔ اینڈ بھی چونکا دینے والا تھا۔ شاکر صنم کی تعبیر خواب سے زیادہ بھیانک نکلی۔ کبھی کبھی سب الٹا بھی ہو جاتا ہے مگر اس قسم کے نفسیاتی مریض کا یہی علاج تھا۔ کاشف زبیر کی بھوک پڑھ کر ایسا لگا جیسے پہلے بھی پڑھی ہے یا شاید اس جیسے موضوعات پر کافی لکھا گیا ہے۔ بہرحال، یہ ایک ہولناک موضوع ہے۔ ثمر عباس کی تجا سلر مغربی معاشرے کی آئینہ دار کہانی تھی۔ اکیلی عورت دنیا کے جس کونے میں ہو، غیر محفوظ ہے۔ خیال سراب مریم کے خان کی اچھی کاوش تھی۔ روبین کو بہرحال غداری کی ہی سزا ملنی چاہیے اس نے اپنے محبوب سے وفاداری کی کوشش کی تھی لیکن اپنی سرزمین سے محبت ہر حال میں اولین ترجیح ہونی چاہیے کہ یہ نسلوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ رضوان منظری کی چوٹ بس ٹھیک ہی تھی۔ پہلا رنگ جوش و وحشت ہمارا، شاہد کی بڑی پیاری تخلیق تھی جسے شروع کیا تو ختم کر کے ہی چھوڑا۔ ہلکے پھلکے انداز اور روانی سے لکھی کہانی جس کے کرداروں سے محبت اور نفرت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر جواد کا انجام اس کے اعمال کے عین مطابق ہوا کہ ٹوٹے دلوں سے بڑی بددعا شاید کوئی نہیں۔ بابر کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ سلیم فاروقی کی رزق حلال بڑی تیز رفتار کہانی تھی۔ جمی کے ساتھ ساتھ بھاگتے اور لڑتے ہم تھک گئے کہ الفاظ کے اتار چڑھاؤ سے کہانی پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم وہیں موجود ہیں اور وہ سب ہو رہا ہے اور یہی مصنف کی کامیابی ہے۔ مجموعی طور پر تمام کہانیاں اچھی تھیں۔''

ٹرپل ایس کے اسماعیل کی وہتنگ نمبر 1 جنجی شاہ کس سے ''جاسوسی 3 مئی کی ایک گرم صبح کو حاصل کیا۔ ہم روز روز گاؤں سے شہر نہیں آ سکتے اس لیے بک اسٹال والے کا نمبر حاصل کیا ہے۔ اس کو کال کر کے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ کتنے ذہین ہیں ہم، ہے نا؟ خیر وہ تو آپ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کتنا ذہین ہوں۔ سرورق پر حسینہ کو انکل نے چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ تو حسینہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اوپر ایک آدمی بہت ہیبت ناک چیز کو دیکھ کر چیخ رہا تھا اور نیچے ایک آدمی مرا یا بے ہوش پڑا تھا۔ علی عمران کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ جا کہیں کیوں؟ محمد اقبال صرف فرسٹ ڈویژن؟ او ہو یار! اے ون گریڈ تو لیتے۔ روشانے صنم! اس نے طرز میں آپ کا تبصرہ اچھا کہا تھا، سچ میں نہیں۔ آمنہ بھائی! توبہ توبہ، ایک مہینا پہلے تم میٹرک کر رہی تھیں اور اب ایف ایس سی۔ صدیقی صاحب نے بھولی بھالی دیکھی باتیں لکھ کر کچھ بلیک لسٹ والوں کا حق کھایا تھا۔ تو بھی اپنے آگے کا راستہ دیکھو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو نصیحت کرتے کرتے خود سر کے بل گر جاؤ۔ جہانگیر! آپ جیل میں بھی خوشبو لگا رہے ہیں اور ہم گھر میں بھی نہیں لگا سکتے۔ گرداب میں ماہ بانو مصیبتوں کے دلدل سے نہیں نکل سکی۔ کچھ اجنبی لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے۔ چودھری کو ماہ بانو کا تو پتا چل گیا مگر شاید اب وہ اس جگہ نہ ملے۔ دوسری طرف کشور اور ٹیچر صاحب کی ملاقات خراب ہو گئی۔''

پنجاب سے ماہا ایمان کی پہیلی ''میں جاسوسی کی نئی قاری اور نئی تبصرہ نگار ہرگز نہیں ہوں۔ ہمیں تو اک عرصہ ہو گیا اس دشت کی سیاحی میں۔ یہ تو جسٹ فار چینج (کیونکہ یکسانیت سے مجھے ہمیشہ کا بیر ہے) اک نئے قلمی نام سے جاسوسی کی رونقوں میں شامل ہونے کا شوق چرایا ہے ہمیں۔ اور میری طرف سے تمام اہل محفل کو محبت عام ہے۔ ہمارے طرز تحریر سے کوئی ہمیں پہچان سکتا ہے تو پہچان لے۔ آپ کا کیا جائے گا۔ ہاں، ہمیں اک معصوم سی خوشی ضرور ملے گی۔ ایک مدت دوں کی گزشتہ تین سال سے مسلسل تبصرہ لکھا ہے ہم نے لیکن ایک بار بھی بلیک لسٹ میں نام نہیں آیا اور دو بار کرسی صدارت پر بھی قبضہ جمایا ہے۔ یعنی ہم کامیاب تبصرہ نگار رہ چکے ہیں۔ خیر اب اپنے پیارے جاسوسی کی خوب صورتیوں کا جائزہ تحریر میں لاؤں گی۔

روش روش میں ہے شگفتگی، کہیں تازگی کہیں نغمگی
چمن سے کس کا گزر ہوا کہ تمام پھول نکھر گئے

پورا ڈائجسٹ اس شعر کی عملی تفسیر پیش کر رہا ہے۔ ٹائٹل کافی عرصے بعد اتنا منفرد سا تاثر لیے ہوئے ہے۔ انفرادیت تو جاسوسی کا خاصہ رہی ہے جو کچھ عرصے سے کھوئی ہوئی تھی۔ ٹائٹل میں لیکن صد شکر کہ بلاک میں بنے ہوئے خوب صورت چہرے سے اک نیا پن لایا گیا ہو، تھینکس ڈاکٹر انکل۔ حاضرین محفل خوب چہچہا رہے ہیں۔ پرانے نئی دار تبصرہ نگار تو خواب و خیال ہی ہو گئے ہیں۔ ہاں زیست کی راہ گزر میں کچھ پل ایسے بھی آتے ہیں کہ اپنے من پسند کاموں سے بھی چھوڑنا پڑتا ہے لیکن دوستو! کبھی جیتے ہیں مسکرا کے، ہم جیتے ہیں خوشیوں میں غم ملا کے۔ سو ہر حال میں زندگی کو انجوائے کرنے کی کوشش کرو۔ محفل میں رنگ منفرد ہو رہا ہے۔ اس دفعہ صدر محفل علی عمران تھے، تبصرہ گزارا، لائق ہی تھا سو مبارک و بادرک۔ جواد اواس کی اداسیاں اتنی خوشیوں کے بعد یقیناً کچھ کم ہوئی ہوں گی۔ تصویر العین اتنا لیٹ ڈائجسٹ ملنے کے بعد آپ نے پڑھ کے تبصرہ بھی لکھ ڈالا اور وہ چھپ بھی گیا۔ چوراہے پر حاجی تھا یا... ویری فاسٹ۔ کبیر عباسی عرف خود ساختہ شہزادے کا تبصرہ نمکین تھا پھر بھی اچھا لگا۔ ہاں، برائے مہربانی ہم آپ کے شکریے کی زد میں نہ آئیں تو اچھا ہے۔ روشانے صنم کی دلفریب اداؤں نے ہمیں بذریعہ تبصرہ خوب محظوظ کیا۔ غزالہ وقار کا تبصرہ انتہائی پروقار تھا، ہماری طرح۔ ایم احمد ہاشمی اپنے کہے پر آپ خود بھی تو عمل کیجیے۔ جہانگیر صاحب کی خوشبو کافی عرصے بعد سونگھنے کو ملی۔ محمد وحی لیکن کس سے ادھاری کی آپ نے؟ ہمایوں سعید کے نام میں رومیو آ رہا ہے جو ان سے تو بچتے ہوئے گزرنا جائز ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح ابتدا گرداب سے کی۔ اسلامی ہمیں گرداب کے گرداب میں جکڑ چکی ہیں۔ آپ کی تحریر میں آہستہ آہستہ خوب نکھار آتا جا رہا ہے۔ سجاد رانا کی موت نے شہریار کے جذبات کو پھر سے لگام دے ڈالی۔ ململ کار شہنشاہ جذبات طاہر صاحب کی آفت کہانی ہے۔ عمران کا کریکٹر میرا فیورٹ ہے۔ میرے فیورٹ کاشف زبیر، شکر ہے تسلسل سے مجھے پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ محبت اور شکر کی آگ میں بالآخر بھوک جیت گئی۔ اسی موضوع پر کچھ عرصہ پہلے سسپنس میں بھی کہانی پڑھنے کو ملی تھی لیکن بھوک کا اینڈ اس سے مختلف اور چونکانے والا ہے۔ اخلاقی گراوٹ کے شکار مغربی معاشرے کی تحریری عکاس ثمر عباس کی تجا سلر عمدہ تحریر تھی۔ میلسی کی بہادری کی داد دینی پڑے گی۔ مریم کے خان کی خیال سراب میں روبین کے انجام نے مجھے سونے نہ دیا۔ قسمت کی ستم گری کا انوکھا وار تھا۔ سلیم فاروقی میرے فیورٹ رائٹرز میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ رزق حلال ان کی باقی تحریروں کی طرح مجھے بہت پسند آئی۔ فاروقی صاحب خیالوں میں تو ہمیں خوش ہونے کا موقع دے ہی دیتے ہیں۔ ماورائی بہادر کریکٹرز سے ملاقات کروا کے۔''

نومی اے کی شمولیت بہاولپور سے ''اس بار جاسوسی کے درشن کم کوشی ہو گئے۔ حسینہ جاسوسی کو دردناک طریقے سے چار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یہ دیکھ کر ایک صاحب تو دہائی کو پہنچ گئے اور دوسرا شاید یہ صدمہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ علی عمران کا تبصرہ زبردست تو نہیں تھا پھر بھی مبارک ہو۔ اقبال صاحب نے بک اسٹال سے خریدنے کا ایسے بتایا جیسے باقی سب فروٹ اسٹال سے خریدتے ہیں۔ روشانے صنم چھوٹے منہ سے پوچھا یا... اگر انکل نے ہاں کہہ دی

www.pkdigest.com

تو...؟ آسیہ خان شاید آپ یقین نہ کریں پر میرا جواب ہاں ہوتا۔ میرا تبصرہ دو بیاتی ہوتا۔ ہمایوں سعید لغاری بھی آپ کی۔ کبیر عباسی، دلچسپ تبصرہ تھا۔ عزالدین نے اچھا موازنہ کیا کہانیوں کا۔ مصنف نازک کا نام اولیا کب تھا جو ایس ایس ناز نے ڈبو دیا۔ جہانگیر اسلم کا خوشبودار تبصرہ اینڈ میں مہکا گیا۔ گرداب کچھ زیادہ ہی بھنور میں پھنستی جا رہی ہے۔ ماہ بانو نہ جانے کن لوگوں کی گرفت میں آ گئی۔ سجاد رانا کی موت اور لیاقت رانا کی اس حالت کے بعد شہریار تو بالکل اکیلا ہی ہو گیا۔ کشور اور آفتاب کا راز تو بس اب کھل ہی گیا۔ ایکشن، تھرل، طنز و مزاح سے مزین للکار بہت اچھی چل رہی ہے۔ تابش کو بھی اب تیز ہو جانا چاہیے۔ سلیم کی حالت پر افسوس ہوا۔ جوشِ دہشت میں جواد کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ آذر نے بھی حالات اور بیماری کا ہمت سے مقابلہ کیا۔ رزق حلال دلچسپ تحریر تھی، پر سمجھ نہیں آیا کہ فرسٹ ایئر کا طالب علم اتنا کچھ کیسے کر سکتا ہے؟ (اب اتنا کام تو آپ کریں... سوچیں)۔“

اعجاز احمد کا تبصرہ ساہیوال سے ”ماہ مئی کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی یوں گویا ہوئے۔

کرتا ہے روشن شبِ فراق کو اعجاز
جو اک چہرہ تھا مہتاب کے مانند

لوڈو کے پانسوں میں بنا ایک سندری لڑکی کا روشن چہرہ، سرخ و سفید رخسار، مخمور نگاہیں، جو کہ ادھ کھلے یاقوتی ہونٹوں پر بیک وقت کتنے افسانے سموئے اپنے خوابوں کے دیس میں کھوئی ہوئی تھی۔ اوپری کارنر پر ایک بندہ جو دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اپنے کیے پر رو رہا تھا، سب سے نیچے بغیر سر کے لاش۔ سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ سب سے پہلے آپ کا مہنگائی کے بارے میں لیکچر سنا جو کہ حقیقت پر مبنی ہے۔ انکل جی! ہم نے تو جاسوسی پڑھنا ہے چاہے اس کی قیمت 50 ہو جائے۔ علی عمران کو وزیر ہونے پر مبارک باد۔ نہ جانے مصنف نازک کی باری کب آئے گی۔ تبصروں میں محمد اقبال بھٹی، ٹی ایس کے اسماعیل، ایم اے صدیقی، ہمایوں سعید رومیو کے تبصرے پسند آئے۔ جہانگیر اسلم کو ندل تھینک یو جہانگیر بھائی، یہ ادا اس لیے ہمارے لیے سرمایہ حیات ہوتے ہیں۔ شہزادہ کو ہمارا اینڈ لولی بہادر لیو آپ کی آمد اچھی لگی۔ آمنہ پٹھانی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ تصویر الحسن کئی بار سمجھایا ہے، پرائے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑایا کریں۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ مغل صاحب! میری ریکویسٹ ہے کہ تابش کو تھوڑا سا تیز کر دیں، بجائی استاد... رستم اور شاہ خاور کی طرح بس۔ گرداب پڑھی اب دیکھتے ہیں کہ شہریار، ماہ بانو اور کشور اس گرداب سے کیسے نکلتے ہیں۔ دل سنگ پڑھی۔ اسرار و تحیر و تجسس میں ڈوبی یہ کہانی پسند آئی۔ انکل جی! ابتدائی صفحات پر انکل نواب علیم الحق حقی کی موجودگی جاسوسی کی شان ہے۔ پہلا رنگ جوشِ دہشت پڑھا۔ ڈاکٹر جواد نے نہ جانے کتنے معصوموں کی زندگی تباہ کی، آخر خود بھی اپنے انجام سے دوچار ہوا۔ واقعی حد سے زیادہ محبت یا نفرت تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ آذر کی سچی محبت نے علینہ کو پا لیا۔ سلیم فاروقی کا رنگ رزق حلال پسند آیا۔ مختصر کہانیوں میں ثمر عباس کی تنہا سفر پڑھی۔ ایلزکی اچھی تربیت کی وجہ سے حسن اور ذہانت یکجا ہوئے۔ میلسی کا یہ تنہا سفر سام کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ مریم کے خان خیال سراب کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ روبین کی زندگی کے خوش گوار لمحے تادیر نہ رہ سکے۔ پیشگی دفاع میں سوزن نے اپنا بہتر دفاع کیا۔ تعبیر میں جارج کے خواب کی تعبیر اس کی موت بن گئی۔ کاشف زبیر کی بھوک زیادہ چمک گئی۔ کسی کو دوستی، رشتے ناتوں کی پروا نہ رہی۔ چوٹ نے یہ ثابت کیا کہ زبان سے نکلے الفاظ بندے کو ہیٹ کی طرح پھنسا دیتے ہیں۔“

حافظ محمد بلال حیدر کی تجویز خانیوال سے ”اس دفعہ بڑے دنوں کے بعد حاضری ہو رہی ہے۔ آپ کی اور یار بیلیوں کی محفل میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں۔ (اپنی محفل میں اجازت... کیوں؟)۔ رسالہ 3 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر ڈالی تو ڈاکر انکل کی انگلیوں کی مہارت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ لوڈو کے دانوں پر پرفیکٹ حسینہ کی تصویر بنا ڈالی۔ دانے بھلے علیحدہ پڑے ہیں لیکن حسینہ کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اوپر ایک مصنف کو دیکھا جو سر پکڑے ہوئے تھے۔ شاید سر میں شدید درد ہے۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں۔ اس بے چارے کے حواسوں پر بھی مہنگائی کی بجلی گری ہے جو سر پکڑے ہوئے ہے اور نیچے تو ایک نے مہنگائی سے تنگ آ کر شاید خودکشی بھی کر لی ہے۔ اس کے بعد پہنچے محفل میں جہاں پر کوئی بے سری آواز میں الگ الگ راگ الاپ رہا تھا یا شاید سب پر مہنگائی کا اثر ہو گیا ہے اور ستم ظریفی کی تو حد یہ ہوئی کہ ہمارے عزیز ان انکل نے رسالے کی قیمت بتا کر ہمارے حواس پر بجلی گرا دی۔ ہائے ایک یہی تو سستا مشغلہ تھا، اب وہ بھی مہنگا پڑ گیا۔ بے دلی سے سب کے تبصرے پڑھتے ہوئے پہلی کہانی دل سنگ پر پہنچے، کچھ خاص تحریر نہیں تھی۔ اس کے بعد تعبیر پڑھی۔ جارج ایک نفسیاتی مریض تھا۔ اپنے ہی خواب کو تعبیر دیتے دیتے خود اپنے ہی خواب کی تعبیر بن گیا۔ اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی بھوک پڑھی۔ اف کراہت ہی کراہت، تذکرہ ناگفتنی ہے۔ اس کے بعد تنہا سفر میں ثمر عباس تشریف فرما تھے اور اس میں ایک اور نفسیاتی مریض تھا۔ شکاری بالآخر خود شکار ہو ہی گیا۔ جرم جتنا بھی چھپ کر کرو لیکن وہ ایک دن سامنے آ ہی جاتا ہے۔ اس کے آگے گرداب پڑھی۔ اسما قادری بہت زبردست کہانی لکھ رہی ہیں۔ ایک بات سچ بتاؤں طاہر جاوید مغل کی کہانی میں ہمیں وہ مزہ نہیں آ رہا جو اس کہانی میں ہے اور ہر مہینے ہمیں صرف اسی کہانی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ سجاد رانا اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ڈھونڈتے ہوئے خود بھی موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد آصف ملک کی پیشگی دفاع پڑھی۔ خود امریکا کی عورت اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں، وہ ہماری ماؤں بہنوں کی حفاظت کیا کرے گا۔ یہ تحفظ نسواں بل اور عورتوں پر بننے والی غیر ملکی این جی اوز سب ڈھکوسلے ہیں۔ ان کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کریں۔ نہیں تو وہ دن دور نہیں جو وہاں کی عورتوں پر گزر رہا ہے۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ کہانی ابھی سو سو ہے۔ دشمن منظر کی چوٹ تجسس آمیز کہانی تھی۔ مجرم اپنے ہی الفاظ سے پکڑا گیا۔ اس کے بعد رنگ تھے۔ پہلا رنگ جوشِ دہشت ایک نئی مصنفہ لیے حاضر ہوئیں۔ جواد ایک خود پرست انسان تھا اور اس جیسے انسان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد رزق حلال پڑھی جو دوسرے رنگ پر مشتمل تھی۔ فاروقی صاحب کے جن جن ہیروز کو پڑھا ہے، یتیمی یا تو لاٹ صاحب کی اولادیں ہوتی ہیں یا کسی غریب کی۔ لیکن ایک بات ان سب میں مشترک ہوتی ہے کہ یہ بہادر ہوتے ہیں اور ولن کی ایسی تیسی کر دیتے ہیں۔ انکل جی! ایک بات کہوں، آپ نے رسالے کی قیمت بڑھائی ہے تو کوشش کر کے رسالے کے 2، 4 صفحے بھی بڑھا دیں۔“

آمنہ پٹھانی، فتح پور لیہ سے حاضر ہیں ”ہمیشہ کی طرح اس بار بھی منفرد اسٹائل کا سرورق لیے مئی کا شمارہ دل کو بھا گیا۔ محفل خطوط میں بہت سے نئے دوست موجود تھے۔ سب کو تہہ دل سے خوش آمدید۔ تصویر الحسن! ڈیئر آپ ہمیشہ اپنی ہی صنف کی کھینچا تانی کرتی نظر آتی ہیں۔ کس ایجنڈے پر کام کر رہی ہو؟ روشانے صنم! میں عقائی ہوں رومیو دماغ الور ذہین کر سکتے۔ چند دن کے لیے رومیو سے پرے کر آئے ہیں... بے چارے۔ ایم اے صدیقی! ہماری صنف وغیرہ الفاظ میں خود تقبل ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں بوتیاں مارنی نہیں آتیں... آپ کی طرح... اگر میرا مقصد تبصرہ آپ کی کوتاہ نظری کے باعث جناب کو متاثر نہیں کر سکتا تو ہم معذور ہیں۔ ایم احمد ہاشمی! خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ کاش! میری زبان سے 440 وولٹ کرنٹ نکلے تاکہ ہمارے شہر میں تو بجلی کا مسئلہ حل ہو۔

ٹی ایس کے اسماعیل! تمہاری تعلیمی قابلیت کی بھی ویری فیکیشن ہو رہی ہے۔ تمہاری تمام جعلی ڈگریاں عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔ آسیہ خان! ہمارا واسطہ صنف خواہ مخواہ جیسے لوگوں سے ہے۔ جاناں! کس کس کے سامنے وضاحتیں کریں گی۔ للکار کی موجودہ قسط کچھ سست روی کا شکار رہی۔ تابش اب کافی حد تک عمران کی بے لوث دوستی کا قائل ہو گیا ہے۔ امید ہے اگلی قسط میں ثروت کے بارے میں کچھ مزید اشارے ملیں گے۔ گرداب اس وقت پورے جوبن پر ہے۔ اسما جی بڑی خوب صورتی سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ اسما راشد کا پہلا رنگ جوشِ دہشت محبت کی رنگینی اور سنگینی کو آشکار کرتی بہت ہی خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر جواد علینہ کے ساتھ مخلص طور پر مس فٹ لگ رہا تھا۔ دوسرا رنگ رزق حلال بھی اچھی کہانی تھی۔ البتہ سلیم فاروقی حسبِ معمول یہاں بھی کہانی کو تیز رفتاری سے بھگانے میں کامیاب رہے۔“

رضا علی کا تیز رفتار تبصرہ گوجرانوالہ سے ”مئی کا جاسوسی خلافِ توقع جلد مل گیا۔ سرورق کچھ پھیکا پھیکا سا لگا جیسے چینی، شکر، چینی کی مٹھاس سے دور کیا۔ جہانگیر اسلم کو محفل میں دوبارہ پا کر خوشی ہوئی۔ آپ یقین کریں میں خود ایک سال بعد حاضر ہوا ہوں لیکن میں نے ہر ماہ آپ کی کمی محسوس کی ہے۔ باقی تمام ساتھیوں کی نوک جھوک پُرلطف رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب نے اپنی طرف توجہ مبذول کروائی۔ اسما قادری بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور اس دفعہ تو اختتام بھی سنسنی خیز موڑ پر ہوا ہے۔ للکار بھی اب اپنا رنگ جما رہی ہے اور تابش صاحب بھی آہستہ آہستہ فارم میں آ رہے ہیں۔ عمران کا کردار کافی دلچسپ ہے۔“

نہال سنگھ کی آمد ضلع بھکر سے ”سب سے پہلے آپ سب کا شکریہ کہ آپ نے مجھے جاسوسی کی محفل میں شامل کیا۔ مئی 2010ء کا سرورق اس مرتبہ منفرد قسم کا تھا۔ لوڈو کے چار ڈائس اور ہر ڈائس کے ایک طرف ٹائٹل گرل کی چار حصوں میں بٹی ہوئی تصویر ڈاکر انکل کے تخیل کا پتا دے رہی تھی۔ بائیں طرف والے ڈائس میں موجود ایک کا نشان ٹائٹل گرل کے ماتھے پر بندیا کی طرح سج رہا تھا جبکہ باقی ڈائس کے اسکور ٹائٹل گرل کے چہرے پر چیچک کے داغوں سے مشابہ تھے۔ پس منظر میں ایک آدمی شدید پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔ مہنگائی پر ہم بھی کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ مگر ہماری التجا ہے کہ اب اس قیمت کو کم از کم ایک سال کے لیے مستقل کر دیں پھر ایک سال بعد چاہے اس میں رد و بدل کر لیں۔ محفل میں علی عمران صاحب پہلے نمبر پر موجود ہیں، ان کو مبارک باد۔ تصویر الحسن صاحب، پٹھانی جی کی ٹانگیں کھینچتی نظر آئیں۔ کبیر عباسی صاحب کو ٹائٹل پر دیہاتی حسینہ نظر آئی، کیا کہنے جی۔ آمنہ پٹھانی کو ٹائٹل پر لڑکی اپنی طرح لگی۔ خوش فہمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایم اے صدیقی اور ہمایوں سعید رومیو کے تبصرے پسند آئے۔ اس مرتبہ بلیک لسٹ میں بھی اچھی خاصی تعداد آرام فرما رہی تھی۔ پہلا رنگ اسما راشد کی محبت کے موضوع پر ایک اصولی تحریر تھی۔ کہانی کی شروعات ذرا پھیکی تھی مگر بعد میں کہانی نے ہمیں گرفت میں لے لیا۔ مصنفہ کا نام جاسوسی میں نیا نیا لگتا ہے مگر جس طرح انہوں نے کہانی کو اور کرداروں کو استعمال کیا، وہ ان کی تحریر میں مہارت اور پختگی کا ثبوت ہے۔ گرداب اس مرتبہ کافی سنسنی خیز رہی۔ اکرم خان اور سجاد رانا کا قتل اور ماہ بانو کا اغوا کہانی کو کسی اور طرف لے کر جا رہا ہے۔ کہانی میں اب کشور کے حالات اور ستارے بھی گردش میں ہیں۔ للکار میں مغل انکل کا ہیرو، عمران کی شاگردی میں کچھ کچھ سنبھل رہا ہے۔ عمران اینڈ کمپنی میڈم صفورا کے گروہ میں شامل ہو چکی ہے۔ دوسری طرف ثروت کا پتا بھی ملنے والا ہے۔ مغل انکل! اب ہمارے ہیرو بھائی کے لیے بھی کوئی ہیروئن لا دیں۔ آخری رنگ رزق حلال شمارے کی بہترین کہانی تھی۔ ویسے بھی سلیم فاروقی کا نام سرورق کے رنگوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ جی غلطی پہ غلطی کر کے پھنستا چلا گیا مگر اس نے جو کیا ٹھیک کیا۔ جی کی غیرت مندی پر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب ہمیں کوئی گالی دیتا تو تختیوں سے اس کا سر پھوڑ دیتے تھے۔ کاشف زبیر کی بھوک بھی پسند آئی۔ انسان کتنا خود غرض ہے، اپنی بھوک مٹانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک انسان کی لاش بھی کھا سکتا ہے۔ پیشگی دفاع میں امریکا بہادر کی فوج اور ان کے سپاہیوں کی اخلاقیات کا مظاہرہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ جو فوج اپنے ہی ساتھیوں کے ساتھ یہ سلوک کر سکتی ہے، دوسروں کے ساتھ وہ کیا کرے گی۔ تعبیر خوابوں سے متعلق ایک انوکھی کہانی تھی جس کی ہمیں کچھ سمجھ نہیں آئی۔ تنویر ریاض کی ترجمہ شدہ کہانی دل سنگ اعلیٰ پائے کی بہترین کہانی تھی۔ بہت عرصے بعد جاسوسی میں ایسی کہانی پڑھنے کو ملی۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر مئی کا شمارہ بہترین تھا۔“

کولمبو اردو دان کی شمولیت بچیاں کھڑی شریف سے ”سرورق کا مجموعی تاثر ہیرو، ہیروئن اور ولن کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دہلیز فہرست کو پار کر کے وارد محفل ہوئے تو علی عمران زبردست کی گردان کرتے ہوئے کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ ویسے موصوف کا تبصرہ اتنا بھی زبردست نہیں تھا۔ بہرحال، مبارک باد قبول ہو۔ تصویر الحسن! دل سے شکریہ۔ ٹی ایس اے بہترین تبصرے کے ساتھ شریک محفل تھے۔ معصوم دوست! آئندہ بھی محفل میں اپنی شرکت کو یقینی بنائیں۔ ایف ایس سی کرنے والی پٹھانی! شاعرانہ انداز میں تبصرہ تخلیق کرنے سے پہلے اتنا تو غور فرما لیا ہوتا کہ ٹائٹل گرل کی جھیل جیسی گہری آنکھیں نیلگوں کے بجائے براؤن ہیں۔ قیدی گوندل! یار آنکھیں کھول کر میرا نام پڑھنے کی کوشش کرتے تو تبدیلیٔ نام کے فضول مشورے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ایک وضاحت کرتا چلوں کہ ایم اے عاصی میرے والد محترم کا نام ہے اور میں کولمبو اردو دان ہوں۔

شیخ محمد سجاد نثانی کا عذرا آزاد کشمیر سے ”مئی کا شمارہ 7 مئی کو ملا۔ سرورق اس مرتبہ بڑا دلچسپ اور خوب صورت تھا جس طرح شاعر نے فرمایا۔

آئینے کے سو ٹکڑے کر کے ہم نے دیکھے ہیں
ایک میں بھی تنہا تھے سو میں بھی اکیلے ہیں

ایک طرف ایک آدمی کو مرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دوسری طرف ایک شخص اپنے بال نوچنے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ مدیر اعلیٰ کی تحریر میں اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ حکمرانوں کے چہرے سے نقاب کھینچنے میں مدیر کی تحریر بڑی اہم حیثیت رکھتی ہے مگر کیا کیجیے یہ حکمران گدھے پر سوار ہو کر بھی خوش دکھائی دیتے ہیں۔ رہ گئی قیمت بڑھانے کی بات تو نو پرابلم... ڈی جی خان سے روشانے صنم کا تبصرہ پسندیدہ رہا۔ کہانیوں میں دل سنگ سے آغاز کیا مگر انتہائی کوشش کے باوجود مجھے اس تحریر کی سمجھ نہیں آ سکی۔ اتنے کردار شامل کیے گئے ہیں کہ کسی کا نام یاد رکھنا مشکل لگتا ہے۔ گرداب انتہائی شاندار موڑ پر پہنچ رہی ہے۔ ڈی آئی جی سجاد رانا کی موت کا دکھ ہوا۔ مسز آفتاب اور کشور شاید اب اپنا راز پوشیدہ نہ رکھ پائیں۔ للکار میں عمران میاں نے تو کمال کر دیا۔ دونوں رنگ بھی اپنی جگہ اہم تھے مگر مقصد ہمیشہ ایک سا سامنے آیا۔ اس مرتبہ انتہائی مصروفیات اور کچھ ٹینشن کی وجہ سے باقی کہانیوں پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ تفصیل سے ملاقات ہوگی۔“

ان قارئین کے نام جن کے مکتوبات شاملِ محفل نہ ہو سکے۔

زوار انجم، جہلم۔ چودھری محمد سرفراز، جتوئی۔ میاں محمد شکیل احمد بوا، مانانوالہ ضلع شیخوپورہ۔ ایچ کے کھوکھر، ملتان۔ تصویر الحسن، اوکاڑہ سٹی۔ سویرا خان، خورشید عباس۔ عابد خان بلوچ، خانیوال۔ علی عمران، ڈی آئی خان۔ عبدالسلام صدیقی، ملتان۔ شان احمد کنگوری، محمد پور دیوان۔ محمد اقبال بھٹی، ضلع قصور۔

www.pkdigest.com

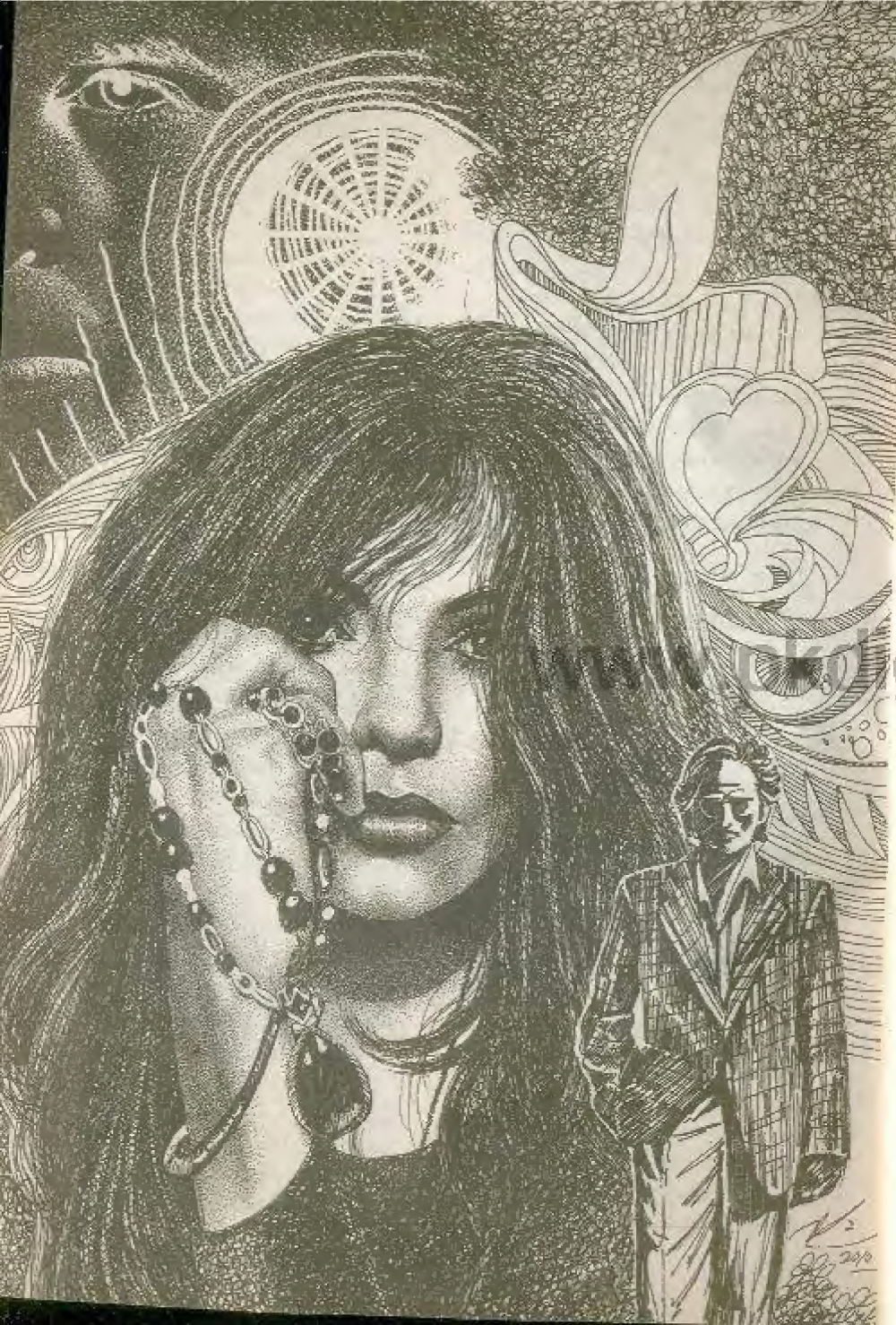

ایک ایسی مثلث جو کسی بھی لمحے ٹوٹ کر بکھرنے والی تھی

ایچ اقبال

پسِ دیوار

زندگی کا کوئی واقعہ چاہے وقت کے کتنے ہی سنگ میل طے کرلے شعور و آگہی سے اوجھل ہونے کے باوجود محو نہیں ہوتا...... زندگی کا ایک ہی ایسا حادثہ...... واقعہ جب سامنے آیا تو کئی زندگیوں کو سختی ... بے مہری اور تاریکیوں کا سامنا کرنا پڑا ...... ایک باہمت دوشیزہ کے تلخ و شیریں لمحات کی روداد ...... وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والے تغیرات کا ہر ممکن ازالہ چاہتی تھی۔

اپنے پیاروں کی دھوکا دہی...... منافقت...... المیوں اور تلخ تجربات کا نچوڑ

www.pkdigest.com

فروزاں جوگنگ کرتی ہوئی پارک کے اس سرے تک چلی گئی جہاں سناٹا رہتا تھا۔ جوگنگ کرنے والے پارک کے اس حصے تک آنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ اس حصے سے کچھ ہی آگے گندہ نالا تھا۔ اس علاقے کے رہنے والوں نے مقامی کونسلر سے دو ایک مرتبہ کہا تھا کہ اس نالے کو اوپر سے بند کروا دیا جائے لیکن شنوائی نہیں ہوئی۔

فروزاں خیالات میں کھوئی ہوئی وہاں تک آگئی تھی۔ وہ اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب گندے نالے کی طرف سے آنے والی خفیف سی بو اس کی حسِ شامہ سے ٹکرائی۔ وہ رکی، اور پھر واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ بائیں جانب درختوں کے درمیان اسے ایک نوجوان نظر آیا۔

کسی نوجوان کا نظر آنا، کوئی چونکا دینے والی بات نہیں۔ لیکن فروزاں کے چونکنے کا سبب اس نوجوان کے ہاتھ میں ریوالور کی موجودگی تھی۔

فروزاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

نوجوان کی انگلی، ریوالور کے ٹریگر پر تھی لیکن نال کا رخ فروزاں کی طرف نہیں تھا۔ وہ اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ ریوالور نوجوان کے چہرے کے قریب تھا۔ وہ انداز ایسا تھا جیسے کسی کو نشانہ بنانے سے پہلے کچھ سوچ رہا ہو۔

فروزاں ایسی لڑکی نہیں تھی کہ خوف زدہ ہو کر چیختی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی۔ وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی، تاہم اس وقت اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

نوجوان کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بال نمایاں طور پر بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر داڑھی مونچھیں بھی تھیں لیکن داڑھی بڑھی نہیں تھی۔ اسے فیشن ایبل داڑھی کہا جا سکتا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار اچھے تھے۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ فروزاں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بمشکل چند سیکنڈ تک فروزاں کی طرف دیکھنے کے بعد اجنبی نوجوان نے ریوالور اپنی جیب میں رکھا اور تیزی سے نالے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس طرف خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

فروزاں نے محسوس کیا کہ ان چند لمحوں میں اس کا جسم پسیج گیا تھا اور سانسیں کسی حد تک ناہموار ہوگئی تھیں۔

نوجوان کے غائب ہونے کے بعد فروزاں تیزی سے واپس ہونے لگی۔ وہ شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس اجنبی نوجوان کا اس طرح دکھائی دینا اور پھر غائب ہو جانا اس کے لیے ایک ناقابلِ فہم سی بات تھی۔ اس حرکت کا مقصد اگر کچھ ہو سکتا تھا تو صرف اتنا کہ اس نے فروزاں کو جیسے وارننگ دی ہو۔

پارک میں جوگنگ کرنے والوں نے فروزاں کو پریشانی کے عالم میں تیزی سے واپس جاتے ہوئے دیکھا تو ان کی وہ توجہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ وہاں جو لوگ جوگنگ کے لیے آتے تھے، وہ ایک دوسرے کے چہروں سے تو شناسا تھے ہی! ان میں سے شاید کچھ لوگ یہ بھی جانتے ہوں کہ وہ ملک کی ایک اہم کاروباری شخصیت طارق زنجانی کی اکلوتی بیٹی ہے۔

فروزاں کسی کی طرف توجہ دیے بغیر پارک سے نکلی اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ اجنبی نوجوان کا چہرہ اور انداز اس کے تصور میں بسا ہوا تھا۔ وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ وہ نوجوان کون تھا اور اس نے خود کو اتنے ڈرامائی انداز میں کیوں پیش کیا تھا۔

کیا کوئی اسے ڈرانا چاہتا ہے؟ ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

مگر کون؟ دوسرا سوال اُبھرا۔

اور کیوں؟ یہ تیسرا سوال تھا۔

سوالوں میں الجھی ہوئی وہ احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ذہنی انتشار کے سبب وہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ کر بیٹھے حالانکہ وہ رہائشی علاقہ تھا جہاں ٹریفک کی بھرمار نہیں تھی۔

دس منٹ میں وہ اپنے گھر کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس نے اپنی کار سڑک کے کنارے کھڑی کی اور موبائل نکال کر اکبر سے رابطہ کیا۔

اکبر اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے والدین دو دو سال کے وقفے سے انتقال کر چکے تھے۔ اس وقت اس کی عمر بارہ سال تھی جب وہ فروزاں کے باپ طارق زنجانی کی سرپرستی میں آیا تھا۔ طارق زنجانی نے اس کی تربیت اپنی اولاد کی طرح کی تھی۔ اس کی تعلیم مکمل کرانے کے بعد اسے کاروبار میں اپنا معاون بھی بنا لیا تھا لیکن کلیدی معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کی شادی اسی سے کر دے لیکن جب اس نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا، اسی وقت فروزاں کو انگریزی لٹریچر میں ایم اے کرنے کی سوجھ گئی۔ اس نے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایم اے کرنے کے بعد ہی شادی کرے گی۔ اس طرح شادی کا معاملہ کچھ عرصے کے لیے ٹل گیا تھا۔

موبائل پر اکبر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد فروزاں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم اس وقت گھر پر ہی ہو گے!"

"ہاں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اور تم کہاں ہو؟"

"میں گھر کے قریب ہی ہوں۔ تم پھاٹک سے باہر نکلو گے تو مجھے نظر آجاؤ گے۔ تم کتنی دیر میں باہر آسکتے ہو؟"

"کیا بات ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"باہر آجاؤ۔" فروزاں نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ "تمہیں دیکھتے ہی میں کار قریب لے آؤں گی۔ تم پھاٹک سے ذرا آگے نکل جانا۔ اس حد تک کہ ہمارے گھر کا چوکیدار تمہیں میری کار میں بیٹھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔" یہ ہدایات دینے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کتنی دیر میں باہر نکل سکو گے؟"

"میں اس وقت گھریلو لباس میں ہوں، تیار ہونے میں دس منٹ تو لگیں گے۔ بارہویں منٹ پر میں باہر آجاؤں گا لیکن کچھ بتاؤ تو سہی، آخر بات کیا ہے؟"

فروزاں نے اب بھی جواب نہیں دیا اور بولی۔ "میں قریب کا ایک چکر لگا کر واپس آتی ہوں تب تک تم تیار ہو کر باہر آجانا اور جلدی سے کار میں بیٹھ جانا۔"

"لیکن...."

"سبب ذرا طویل ہے جو فون پر نہیں بتایا جاسکتا۔" فروزاں نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا اور موبائل بند کر کے کار حرکت میں لے آئی۔

چھ منٹ تک سیدھا چلنے کے بعد فروزاں نے کار موڑی۔ جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچی تو اس نے اکبر کو دیکھ لیا جو پھاٹک سے نکل کر اس سے کچھ دور ہو گیا تھا۔ فروزاں نے کار اس کے بالکل قریب لے جا کر روکی۔ وہ اتنی عجلت میں تھی کہ اس نے خود ہی اپنی برابر کی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

کار میں اکبر کے بیٹھتے ہی فروزاں نے بہ آہستگی کلچ چھوڑتے ہوئے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا۔ کار کی رفتار تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔

اکبر بولا۔ "تم نے میرے دماغ میں ہیجان برپا کر دیا ہے۔"

فروزاں نے جواب دیا۔ "وہ اس ہیجان کا پاسنگ بھی نہیں ہوگا جو اس وقت میرے دماغ میں ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" اکبر کو فروزاں کے رویے کا سبب جاننے کی بہت بے چینی تھی۔

فروزاں نے اسے وضاحت سے بتایا کہ پارک میں ایک نوجوان اسے کس انداز میں دکھائی دیا تھا۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے اکبر کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کا تاثر بڑھتا چلا گیا۔ فروزاں کے خاموش ہوتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی سنسنی خیز فلم کا ایک چھوٹا سا سین ہو۔"

"لیکن میں نے تمہیں کسی فلم کا سین نہیں سنایا ہے۔ وہ صورت حال بتائی ہے جس سے میں گزری ہوں۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا دماغ تھکنے لگا ہے۔ تم اس بارے میں کیا اندازہ لگا سکتے ہو؟"

"فوری طور پر تو ایک ہی خیال ذہن میں آتا ہے۔ اس قسم کی حرکت کا مقصد غالباً تنبیہ کرنا ہی ہو سکتا ہے۔"

"وارننگ کا خیال مجھے بھی آیا تھا، مگر کس سلسلے میں؟"

"یہ تمہیں اس کام سے روکنے کی کوشش ہو سکتی ہے جو تم کرنا چاہتی ہو اور جس کے لیے تم نے شیر خاں کو ایک بہت بڑی رقم دی ہے۔"

"لیکن اس کام کا علم کس کس کو ہے؟ مجھے، تمہیں، شیر خاں کو، یا صرف اس شخص کو جسے شیر خاں نے اس کام کے لیے مامور کیا ہو۔ کوئی پانچواں شخص تو ہو نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں یہ سوال پریشان تو کرے گا کہ مجھے اس کام سے روکنے کی خواہش کس کی ہوگی، اور کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں وہ کام کروانا چاہتی ہوں۔ شیر خاں تو میری اصل شخصیت سے واقف بھی نہیں ہے اور...."

"اس طرح مت سوچو۔" اکبر نے اس کی بات کاٹی۔ "شیر خاں ایسا آدمی ہے کہ اگر چاہے تو سب کچھ معلوم کر سکتا ہے۔"

"لیکن وہ اس معاملے میں مجھے تنبیہ کیوں کرے گا؟ میں نے تو اسے اس کام کے لیے کثیر رقم دی ہے۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ اسی نے تمہیں تنبیہ کروائی ہوگی۔ مجھے صرف اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ وہ تمہاری شخصیت سے واقف نہیں ہوگا۔ اگر وہ چاہے تو ہو سکتا ہے۔"

"گویا میں نے وہ لمبا چوڑا سیٹ اپ خواہ مخواہ بنایا؟"

"خواہ مخواہ بھی نہیں کہا جاسکتا! وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے۔ میں نے اس کے بارے میں یہی سنا تھا۔ اسی لیے میں نے اس کام کے لیے اس کا نام تجویز کیا۔ اسے اس بات کے جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ملنے والی عرب عورت واقعی عرب ہے یا نہیں۔"

"تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے اکبر؟" فروزاں نے تشویش سے پوچھا۔

اکبر نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "یہ ایک خطرناک بات ہے۔ اس کا پتا لگانا ضروری ہے۔"

"میں اس معاملے میں شیر خاں سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو وہیں چل رہی ہو؟"

"ہاں۔"

اکبر کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے فکر و تردد کا اظہار ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کار ایک پوش علاقے کے کمرشل ایریا میں داخل ہوئی۔ وہاں اپارٹمنٹس کی تین منزلہ عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ دکانوں کی وجہ سے جگہ جگہ ان لوگوں کی کاریں کھڑی تھیں جو آس پاس کی دکانوں پر شاپنگ کے لیے آتے تھے۔

فروزاں نے ایک جگہ کار کھڑی کر دی۔ وہ اور اکبر کار سے اتر کر ایک طرف بڑھے۔

موٹاپا

اسپتال میں ایک بہت موٹے زخمی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے موٹاپے سے تنگ آ کر آٹھویں منزل سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی کیا میں ابھی تک زندہ ہوں۔" قریب کھڑی ہوئی نرس نے جواب دیا۔ "جی ہاں آپ زندہ ہیں مگر وہ چار آدمی مر گئے جن پر آپ گرے تھے۔"

پانچ منٹ بعد وہ ایک عمارت کی سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ وہ ایک نئی عمارت تھی۔ ابھی اس کے زیادہ اپارٹمنٹس آباد نہیں ہوئے تھے۔ فروزاں نے کچھ ہی دن پہلے اس عمارت کا ایک اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ اس خریداری کے لیے اسے اپنے باپ سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ طارق زنجانی اپنی بیٹی سے اتنی ہی محبت کرتا تھا کہ اس نے ایک خاصی بڑی رقم سے فروزاں کا اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے فروزاں کو باپ سے کچھ کہنے کی احتیاج نہیں تھی۔

وہ اکبر کے ساتھ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی جس کے لیے اس نے بہت سادہ سا فرنیچر خریدا تھا۔ زیادہ قیمتی اور خوب صورت فرنیچر کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپارٹمنٹ ایک مقصد کے لیے وقتی طور پر لیا گیا تھا۔

"تم بیٹھو۔" فروزاں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تیار ہو کر ابھی آتی ہوں۔"

اکبر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ بدستور متفکر و متردد نظر آرہا تھا۔

فروزاں ڈرائنگ روم سے خواب گاہ میں آگئی۔ اس نے الماری سے ایک لباس نکالا اور تبدیل کرنے میں اس نے بہت کم وقت لگایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس وضع قطع میں وہ فروزاں کی حیثیت سے شناخت نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسے دیکھنے والے یہی کہہ سکتے تھے کہ وہ کسی خلیجی ریاست کی رہنے والی ہوگی۔ حجاب میں اس کی آنکھوں کے سوا چہرے کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اکبر اس وقت ذرا بھی نہیں چونکا جب فروزاں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہ فروزاں کو اسی وضع قطع میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"چلیں؟" وہ کھڑا ہو گیا۔

"ظاہر ہے کہ ہم یہاں کوئی میٹنگ کرنے نہیں آئے تھے۔" فروزاں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

www.pkdigest.com

''پہلے کی طرح آج بھی تم ہی باہر نکلو۔'' وہ دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ گئی۔

اکبر باہر نکلا۔ اس نے راہ داری میں دائیں بائیں دیکھا، اور پھر اس کا اشارہ ملتے ہی فروزاں اپارٹمنٹ سے باہر آ گئی۔ دروازہ خودکار طور پر مقفل ہو گیا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے وقت بھی فروزاں محتاط ہی رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی اسے اس اپارٹمنٹ میں جاتے یا عربی وضع قطع میں باہر نکلتے دیکھے۔

ابتدا میں اکبر اس سے دو قدم پیچھے رہ گیا لیکن زینے پر وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ اوپر آتے ہوئے دو تین افراد نے انہیں دیکھا۔ وہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس عمارت کے کئی اپارٹمنٹس میں خلیجی ریاستوں کی کچھ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے رہتے تھے جو یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ فروزاں نے اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس عمارت کا اپارٹمنٹ خریدا تھا۔

عمارت کا ایک اپنا پارکنگ شیڈ تھا۔ وہاں انہی لوگوں کی گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں جو وہاں رہتے تھے۔ فروزاں اور اکبر اسی پارکنگ شیڈ میں کھڑی ہوئی ایک کار میں جا بیٹھے۔ فروزاں نے بیٹھنے سے پہلے ہی چابی اکبر کو دے دی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی بیٹھا تھا۔

پرانے ماڈل کی وہ سیکنڈ ہینڈ کار بھی فروزاں نے اس اپارٹمنٹ کے ساتھ ہی خریدی تھی۔ وہ اور اکبر اس روز دوسری مرتبہ وہ کار استعمال کر رہے تھے۔

کار حرکت میں آ گئی۔

مٹیالی شام پر اب سیاہ رات غالب آ چکی تھی۔ سڑکوں پر بڑے بڑے نیون سائن رنگارنگ روشنیاں پھیلا رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس سڑکوں کو جگمگا رہی تھیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نے ان روشنیوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''شیر خاں سے اس بارے میں کیا بات چیت کی جا سکتی ہے؟'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے اکبر نے فروزاں سے پوچھا۔

''دراصل...'' فروزاں نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس داڑھی والے نوجوان نے، یا کسی اور نے اس نوجوان کے ذریعے مجھے دھمکانے کی کوشش کی ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے کس سلسلے میں دھمکایا جا سکتا ہے؟ لے دے کر ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ کسی کو علم ہو گیا ہے کہ میں شیر خاں کے ذریعے کیا کروانا چاہتی ہوں۔ اب مجھے شیر خاں سے یہی پوچھنا ہے کہ اس کا علم کسی اور کو کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کم از کم شیر خاں خود تو یہ راز کسی پر افشا نہیں کر سکتا۔'' اکبر نے کہا۔ ''یہ بڑے لوگ اپنے اصولوں پر کوئی سودا نہیں کرتے۔''

''شیر خاں نے اس کام پر جس شخص کو مامور کیا ہوگا، کیا وہ بھی اتنا اصول پسند ہو سکتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ شیر خاں اس قسم کے کام جن لوگوں سے لیتا ہوگا، وہ اس کے انتہائی اعتماد کے لوگ ہوں گے۔''

''تو پھر وہ تم ہی ہو سکتے ہو جس نے مجھے اس نوجوان کے ذریعے دھمکانے کی کوشش کی۔''

اکبر نے چونک کر فروزاں کی طرف دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی توجہ ڈرائیونگ کی طرف سے ہٹ گئی۔

''سامنے دیکھو۔'' فیروزاں جلدی سے بولی۔ ''کہیں ایکسیڈنٹ نہ کر بیٹھنا۔''

''تم نے تو میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' اکبر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تمہاری خواہش پر میں نے ہی معلومات کر کے تمہیں شیر خاں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں اب تمہارے خلاف کیسے جا سکتا ہوں فروزاں؟''

''جھنجلا کے میں اور کیا کہتی؟'' فروزاں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں شیر خاں اصول پسند آدمی ہے اور وہ جن لوگوں سے کام لیتا ہے، وہ بھی اس کے اعتماد کے آدمی ہیں۔ تو پھر اب میں تمہاری ہی بات کروں گی نا! کوئی اور تو میرے اس راز سے واقف نہیں۔''

''گویا تم سمجھتی ہو کہ شیر خاں نے اس معاملے میں جس آدمی پر اعتماد کیا ہے، وہی کسی پر یہ راز افشا کر سکتا ہے؟''

''اس کے علاوہ اور کیا سوچ سکتی ہوں؟'' فروزاں بولی۔ ''شیر خاں بہرحال ایک انسان ہے۔ غلطی اس سے بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کسی ایسے آدمی پر اعتماد کر سکتا ہے جس پر اسے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

اکبر خاموش رہ گیا۔

☆☆☆

بیس منٹ بعد کار ایک جگہ رکی۔ وہاں اور بھی بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ فروزاں نے اترنے کے لیے دروازہ کھولا۔

''جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔'' اکبر نے کار کا انجن بند کرتے ہوئے کہا۔

فروزاں کار سے اترتے اترتے رک گئی اور غور سے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پہلی مرتبہ جب میں شیر خاں سے ملنے گئی تھی تو تم نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا تھا۔''

''اس وقت کی بات اور تھی۔ اب صورتِ حال بجھے عجیب ہو گئی ہے۔''

فروزاں وہ ایک لمحے تک اکبر کی طرف دیکھتی رہی، پھر کار سے اتر گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے سڑک پار کی اور قریب ہی کی ایک گلی میں داخل ہو گئی۔

سڑک اور اس گلی کے کونے پر تین منزلہ ہوٹل کی عمارت تھی۔ اس کا مرکزی دروازہ سڑک پر ہی تھا، لیکن ایک چھوٹا سا دروازہ گلی میں بھی تھا۔ فروزاں اسی میں داخل ہوئی۔ فوراً ایک باوردی دربان اس کے سامنے آ گیا۔

''مجھے شیر خاں سے ملنا ہے۔'' فروزاں نے دربان کے سوال کرنے سے پہلے ہی اپنا مقصد بیان کر دیا۔

''ٹائم لے لیا تھا آپ نے ملاقات کا؟'' دربان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''تم انہیں اطلاع دے دو کہ رباب آئی ہے۔''

دربان وہیں موجود انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فروزاں نے اس سے اردو ہی میں بات کی تھی مگر لب و لہجہ کسی ایسی عرب عورت کا سا تھا جسے اردو بولنے پر مکمل قدرت حاصل نہیں ہو۔ وہ جب شیر خاں سے ملی تھی، تب بھی اس نے یہی انداز اختیار کیا تھا۔

دربان نے انٹرکام پر دھیمی آواز میں بات کرنے کے بعد فروزاں سے کہا۔ ''جائیے۔''

فروزاں زینے طے کرنے لگی۔ پہلی منزل پر ایک کمرے کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ وہاں چالیس پینتالیس سال کی ایک خرانٹ سی عورت کھڑی تھی۔ اس نے فروزاں کی تلاشی لی۔ فروزاں پہلے بھی اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ شیر خاں سے ملاقات کے لیے آنے والوں کی تلاشی ضرور لی جاتی تھی۔ ملاقاتی اگر مرد ہوتا تو اس کی تلاشی کوئی مرد ہی لیتا تھا... کسی کو ہتھیار کے ساتھ شیر خاں کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

تلاشی لینے کے بعد عورت نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ ہینڈل کے قریب ہی دروازے پر ایک انچ کا بیضوی شیشہ لگا ہوا تھا جس کی رنگت دودھیا تھی۔ عورت نے ہینڈل پکڑتے ہوئے اپنے اسی ہاتھ کا انگوٹھا اس شیشے پر رکھ دیا۔

بہ مشکل دو سیکنڈ تک انگوٹھا اس شیشے پر رکھنے کے بعد عورت نے ہینڈل سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

دروازہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف کھلنے لگا لیکن دروازہ کھولنے والا دکھائی نہیں دیا۔

فروزاں جب پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی، تب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ اس دروازے کے کھلنے کا

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

انحصار کسی میکنزم پر تھا۔ اس میکنزم کے کمپیوٹر میں کچھ نشانات انگشت محفوظ ہوں گے جن کی شناخت کے بعد ہی کمپیوٹر اس میکنزم کو حرکت میں لاتا ہوگا جس سے دروازہ کھل سکے۔

فروزاں کمرے میں داخل ہوگئی۔

وہ نہایت قیمتی فرنیچر سے آراستہ ایک دفتری کمرا معلوم ہوتا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی میز کے پیچھے شیر خاں بیٹھا ہوا تھا۔ عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ تھی۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا لیکن سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کلین شیو اور سرخ و سفید تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں فروزاں پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔

فروزاں میز کی طرف بڑھی۔ فرش پر بڑے بڑے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ٹائل پر فروزاں نے قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے عقب میں دروازہ خود بہ خود بند ہوتا چلا گیا۔

فروزاں میز کے قریب پہنچی تو شیر خاں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو!“

فروزاں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اس وقت اچانک آنے کی ضرورت؟“ شیر خاں سوالیہ نگاہوں سے فروزاں کی طرف دیکھنے لگا۔

فروزاں بولی۔ ”تم نے کہا تھا کہ اگر کام کی تکمیل سے پہلے مجھے کوئی خاص ضرورت ہو تو میں تم سے ملنے آسکتی ہوں۔“

”وہی میں نے پوچھا ہے۔“ شیر خاں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کیا ضرورت آپڑی؟“

”میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں نے تم سے جس کام کا سودا کیا ہے، اس کے بارے میں کون کون جانتا ہے؟“

”صرف ایک آدمی۔“ شیر خاں نے جواب دیا۔ ”کام کی نوعیت پر انحصار ہوتا ہے کہ اس کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے کام کی تکمیل صرف ایک آدمی کر سکتا ہے۔“

”کیا وہ آدمی قابلِ اعتماد ہے؟“

اس موقع پر شیر خاں کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ اب وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ نہیں تھا۔ لہجے میں سرد مہری آگئی تھی۔ ”مجھ پر اعتماد کرنے کے بعد تمہیں اس قسم کا کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے۔“

”بات ہی کچھ ایسی ہے...“

شیر خاں سوالیہ نگاہوں سے فروزاں کی طرف دیکھنے لگا۔

فروزاں نے اسے وہ سارا قصہ سنا دیا جس کی وجہ سے وہ پریشان ہوئی تھی۔ وہ قصہ سنتے ہوئے شیر خاں کی پیشانی ایک بار پھر شکن آلود ہوگئی۔ فروزاں کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے غور و فکر کا اظہار ہونے لگا۔

”اب بتاؤ؟“ فروزاں کچھ رک کر بولی۔ ”اس سے میں آخر کیا نتیجہ اخذ کروں؟“

”کم از کم یہ نتیجہ اخذ مت کرو کہ وہ نوجوان میرا کوئی آدمی ہوگا۔“

”تو پھر وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”یہ جاننا تمہارا درد سر ہے۔“

فروزاں اس جواب سے کچھ کھسیا گئی لیکن وہ شیر خاں جیسے آدمی سے کوئی سخت بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اچانک بپھرنے والے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اس نوجوان کی اس حرکت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟“

”بظاہر تو وہی بات معلوم ہوتی ہے جو تم نے سوچی ہے۔“ شیر خاں نے کہا۔ ”تمہیں کسی سلسلے میں دھمکایا گیا ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“

”میں نہیں جانتا کہ تمہاری زندگی اور کس کس سلسلے میں الجھی ہوئی ہے۔“

”اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ مجھے دھمکی دی گئی ہے، تو وہ صرف اسی کام کے سلسلے میں ہوئی ہو جس میں تم سے [illegible] ہوں اور جس کا معاوضہ ادا کر چکی ہوں۔“

”اس کام کے بارے میں تمہارے علاوہ اور کون جانتا ہے؟“

”صرف ایک شخص، لیکن میں اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“ شیر خاں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہارا کزن اکبر کوئی فرشتہ ہے؟“

فروزاں چونک پڑی۔

شیر خاں بولا۔ ”اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ میری زبان پر اکبر کا نام آگیا۔ میں تمہارے نام سے بھی واقف ہوں فروزاں بی بی!“

فروزاں نے ایک طویل سانس لی۔ اسے شیر خاں کی بات پر حیران ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اکبر نے یہ بات پہلے ہی کہہ دی تھی کہ شیر خاں اگر چاہے تو سب کچھ جان سکتا ہے۔

شیر خاں پھر بولا۔ ”میں صرف یہ نہیں جانتا کہ تم اپنے باپ کے خلاف کیوں ہوگئی ہو اور اکبر اس معاملے میں تمہارا ساتھ کیوں دے رہا ہے، ان باتوں سے مجھے کوئی غرض نہیں اس لیے میں نے اس کے بارے میں چھان پھٹک ضروری نہیں سمجھی۔“

فروزاں چند لمحے شیر خاں کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”میں اکبر پر شبہ نہیں کر سکتی۔“

”نہ کرو۔“ شیر خاں نے بے پروائی سے کہا۔

”لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ نوجوان کون ہے اگر وہ کسی کا آلۂ کار ہے تو کس کا؟ اور جس نے اسے آلۂ کار بنایا ہے، وہ کیا چاہتا ہے اور اس کے آئندہ عزائم کیا ہیں۔“

”گویا سراغ رسانی؟“ شیر خاں بولا۔ ”نہیں فروزاں بی بی! میں بس لوگوں کو اغوا کر سکتا ہوں، قتل کروا سکتا ہوں، انہیں کسی اور قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ سراغ رسانی میرا میدانِ عمل نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ فروزاں بولی۔ ”سراغ رسانی تمہارا میدانِ عمل نہیں ہوگا لیکن تم میری حفاظت کا بندوبست تو کر سکتے ہو، میں محسوس کر رہی ہوں کہ مستقبل میں شاید میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ فی الحال بات شاید دھمکی یا دھمکیوں سے آگے نہ بڑھے لیکن تم وہ کام کر گزرو گے جو میں نے تمہارے سپرد کیا ہے تو ممکن ہے کہ دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے۔“

”تمہاری حفاظت کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔“ شیر خاں نے کہا۔ ”اس کے لیے خفیہ طور پر باڈی گارڈز کا بندوبست کرنا ہوگا جو ظاہر ہے کہ میرے ہی آدمی ہوں گے۔ اگر تم خطرے میں پڑیں تو انہیں حرکت میں آنا ہوگا۔ اس طرح وہ ایکسپوز ہو جائیں گے اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میرے آدمی ایکسپوز ہو جائیں۔“

فروزاں پریشان ہوگئی۔

شیر خاں پھر بولا۔ ”اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہیں خطرہ صرف اس کام کی وجہ سے ہے جو تم نے میرے سپرد کیا ہے تو اس خطرے سے بچنے کے لیے تم اپنا ارادہ بدل سکتی ہو۔ تم مجھ سے وہ کام نہ کرواؤ۔ جو معاوضہ تم نے مجھے دیا ہے، اس کا نصف تمہیں واپس مل جائے گا۔ یہ میرا اصول ہے جس سے میں تمہیں آگاہ بھی کر چکا ہوں۔“

فروزاں پریشانی اور بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

کچھ دیر رک کر شیر خاں ہی کو... بولنا پڑا۔ ”اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی وقت ہے تمہارے پاس، پورے دو دن ہیں۔“

فروزاں کا باپ طارق زنجانی کسی کام سے لندن گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی دو دن بعد ہونا تھی۔

فروزاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں اس بارے میں کل تک بتا دوں گی۔ مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو۔“

”میں یہ باتیں ٹیلی فون یا موبائل پر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“ شیر خاں نے جواب دیا۔ ”تم خود آکر بتا جانا۔ اسی وقت تمہیں نصف رقم بھی واپس مل جائے گی۔“

”اگر مجھے رقم واپس نہ لینا ہوئی تو میں نہیں آؤں گی۔“ فروزاں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔“

فروزاں مڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ اندر سے دروازہ کھولنے میں کوئی میکنزم رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔

فروزاں باہر نکلی۔ جس عورت نے اس کی تلاشی لی تھی، وہ اب وہاں نظر نہیں آئی۔ فروزاں زینے اترنے لگی۔ وہ اب خاصی متفکر نظر آرہی تھی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ شیر خاں کو اس کی مطلوب رقم دے کر، اپنے اوپر منڈلاتے ہوئے خطرات کے سلسلے میں بھی اس کا تعاون حاصل کر لے گی لیکن اس ضمن میں اسے کورا جواب ملا تھا۔

زینے کے نیچے دربان موجود تھا۔ اس نے فروزاں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اس طرح غافل ہو گیا جیسے وہاں اکیلا ہی ہو۔

فروزاں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچی۔ کار میں اکبر اس کا منتظر تھا۔ وہ دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گئی۔

”کیا رہا؟“ اکبر نے کار حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔ انجن وہ فروزاں کو آتے دیکھ کر ہی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

”مختصر جواب تو یہ ہے کہ میں ناکام اور مایوس لوٹی ہوں۔“

”مجھے وضاحت سے بتاؤ فروزاں؟“

فروزاں نے کچھ رک کر وہ ساری گفتگو دہرا دی جو شیر خاں سے ہوئی تھی۔ الفاظ اس کے اپنے تھے مگر لب لباب اسی گفتگو کے مطابق تھا۔

اب اکبر کے چہرے پر بھی فکرمندی بڑھی ہوئی نظر آئی۔ وہ بولا۔ ”گویا تم سمجھ رہی ہو کہ تمہاری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے؟“

”پارک میں وہ نوجوان مجھے خالی ہاتھ نظر نہیں آیا تھا، ریوالور تھا اس کے ہاتھ میں۔“ فروزاں نے جواب دیا۔ ”اور ریوالور کا جو مطلب ہوتا ہے وہ تم بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”تو پھر بہتر ہوگا کہ خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔“ اکبر پھر بولا۔ ”ایسا فائدہ حاصل کرنے سے کیا حاصل جس سے زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ میری زندگی جس طرح گزر رہی ہے، میں گزار لوں گا۔ تم اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔“

فروزاں خاموش رہی۔ بات صرف وہ نہیں تھی جو اس

نے اکبر سے کہی تھی۔ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا جو وہ کسی پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔

اپارٹمنٹ میں جا کر فروزاں نے عربی لباس سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اپنا لباس پہن کر وہ اکبر کے ساتھ وہاں سے نکلی۔ وہ دونوں خاموشی سے اس طرف بڑھتے رہے جہاں فروزاں نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

کار کی طرف بڑھتے ہوئے فروزاں نے پرس سے چابی نکال لی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنا ہی چاہا تھا کہ گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ اس آواز سے وہ ایسی چونکی اور بوکھلائی کہ اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ کار کے قریب سڑک پر گری۔ اس نے اپنے برابر میں بھی کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی ایک کراہ بھی سنائی دی جو کسی مرد کی تھی۔ فروزاں کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ اپنے قریب گرنے والے کو دیکھ سکتی۔

چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ ایک شور مچ گیا۔ لوگ چیخنے کے سے انداز میں بول رہے تھے۔ انہی میں سے ایک نے کہا تھا۔

"سرخ شیراڈ بھاگ گئی۔ گولی اسی سے چلائی گئی تھی۔"

فروزاں اب اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکی کہ اکبر کب اس کے قریب آیا تھا۔

فروزاں کے برابر میں گرا ہوا آدمی اٹھا۔ قمیص پتلون میں ملبوس وہ متوسط طبقے کا نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے سے بہتا ہوا خون اس کی قمیص کو رنگین کرتا ہوا پتلون تک پہنچ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوف، گھبراہٹ اور تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔

فروزاں نے گولی چلنے کی آواز سننے کے بعد اپنے قریب اس زخمی شخص کو دیکھا... تو کسی خیال سے اس کے حواس پراگندہ ہو گئے...... اسے اکبر نے کار میں بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی۔

"پریشانی سے بچ گئے۔" اکبر بولا۔

فروزاں نے چونکے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ ہوا کیا تھا؟"

"گولی چلائی گئی تھی اس شخص پر جو تمہارے برابر میں گرا تھا۔" اکبر نے جواب دیا۔ "وہ خوش قسمت ہے کہ اس کی زندگی بچ گئی۔ وہ صرف زخمی ہوا ہے۔ کچھ دنوں سے ہمارے شہر میں ٹارگٹ کلنگ کا ایک سلسلہ ہی چل پڑا ہے۔ میں نے ایک پولیس موبائل اس طرف آتے دیکھ لی تھی۔ مجھے اسی وقت یہی سوجھا کہ وہاں سے نکل لیا جائے ورنہ پریشانی ہوتی۔ پولیس جن لوگوں سے پوچھ گچھ کرتی، ان میں ہم بھی ہوتے۔"

"وہ تھا کون؟"

"کوئی راہ گیر ہی ہوگا۔" اکبر نے جواب دیا۔ "حلیے سے کوئی معمولی ہی آدمی معلوم ہو رہا تھا۔"

"اس کی وضع قطع پر نہیں جانا چاہیے۔" فروزاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اب تک جو ٹارگٹ کلنگ ہوتی رہی ہے، وہ معصوم راہ گیروں کی نہیں ہوئی ہے۔ مرنے والے کسی نہ کسی اہمیت کے حامل ضرور تھے۔"

اکبر کے کچھ بولنے سے پہلے، فروزاں کے پرس میں پڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ فروزاں نے جلدی سے اپنا پرس کھولا۔ اکبر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ فروزاں نے موبائل نکال کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی جو نمبر دکھائی دیا، وہ کسی موبائل ہی کا تھا۔

"نہ جانے کون ہے؟" فروزاں نمبر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

فروزاں نے کال ریسیو کی۔ موبائل کان سے لگاتے ہوئے اس نے متفکر لہجے میں کہا۔ "ہیلو!"

"بچ گئیں تم اس وقت۔" دوسری طرف سے ایک اجنبی مردانہ آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟" فروزاں نے تیزی سے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"پارک میں تم میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھیں۔" جواب ملا۔

فروزاں کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی ہو۔

دوسری طرف سے آواز آتی رہی۔ "میرا خیال تھا کہ تم ایک ذہین لڑکی ہو۔ تم سمجھ جاؤ گی کہ اس طرح تمہیں وارن کیا گیا ہے لیکن تم پھر بھی شیر خان سے ملنے پہنچ گئیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں تھوڑی سی سزا دے دی جائے اور تم سمجھ لو کہ بات گیدڑ بھبکی کی نہیں ہے۔ میں نے صرف اتنا چاہا تھا کہ تمہاری ٹانگ زخمی کر دی جائے مگر اچانک وہ بدنصیب نہ جانے کہاں سے بیچ میں آ گیا۔ اس کی وجہ سے میرا ہاتھ بہک گیا۔ خیر، اچھا ہی ہوا کہ ہاتھ بہک گیا۔ ٹریگر تو دب ہی گیا تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ وہ ہلاک نہیں ہوا، صرف زخمی ہوا ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آتی رہی اور فروزاں کے جسم کی سنسناہٹ میں اضافہ ہوتا رہا۔

وہ چپ ہوا ہی تھا کہ فروزاں نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟" فروزاں نے کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے میں سختی ہو لیکن اس کے بکھرتے اعصاب نے اس کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ اس کے لہجے میں مردنی تھی۔

اکبر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"محترمہ فروزاں!" دوسری طرف سے مذاق اڑانے کے سے انداز میں کہا گیا۔ "کیا میں اتنا بے وقوف ہو سکتا ہوں کہ تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتا دوں؟"

فروزاں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" فروزاں کی آواز بھرائی ہوئی سی نکلی۔

"صرف اتنا کہ تم اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "اس وقت تمہاری ٹانگ تو زخمی نہیں ہو سکی لیکن جو کچھ ہوا، وہ تم نے دیکھ لیا ہے، اسے تم میری دوسری وارننگ سمجھ لو لیکن اگر تم اپنے ارادے سے باز نہیں آئیں تو ضروری نہیں کہ میں تیسری وارننگ بھی دوں۔ میں تمہیں ختم بھی کر سکتا ہوں۔ تمہارے بعد شیر خاں اس کام کی تکمیل ضروری نہیں سمجھے گا جو تم نے اس کے سپرد کیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ فروزاں پھر کچھ کہتی، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

☆☆☆

فروزاں کے جانے کے بعد شیر خان فکرمندی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں ہو دارا ب؟"

"اگر آپ اس وقت ہوٹل میں ہیں خان بابا، تو سمجھ لیجیے کہ میں اس وقت آپ سے بہت دور ہوں۔"

"جلد از جلد آ کر ملو۔"

"کوئی خاص بات؟"

"وہ لڑکی فروزاں آئی تھی۔ اس کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"کیا اس نے اپنا ارادہ بدل دیا؟"

"ابھی تک تو نہیں بدلا۔"

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-

اندھیری رات کے مسافر 325/-

ثقافت کی تلاش 150/-

قیصر و کسریٰ 380/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-

گمشدہ قافلے 350/-

داستان مجاہد 200/-

پردیسی درخت 325/-

یوسف بن تاشفین 325/-

معظم علی 325/-

خاک اور خون 350/-

کلیسا اور آگ 300/-

قافلہ حجاز 350/-

محمد بن قاسم 300/-

پورس کے ہاتھی 180/-

انسان اور دیوتا 280/-

پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-

آخری چٹان 325/-

سو سال بعد 150/-

سفید جزیرہ 225/-

شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو

061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220879
041-2627568

"پھر کیوں آئی تھی؟"

"اسی بارے میں تم سے بات کرنی ہے۔ جلد از جلد کب تک آسکتے ہو؟"

"پون گھنٹا تو یقیناً لگ جائے گا خان بابا!"

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

شیر خاں رابطہ منقطع کر کے میز کے پیچھے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اب اس کا چہرہ معمول کے مطابق نظر آرہا تھا۔ اس نے خود اپنی تربیت اس طرح کی تھی کہ کوئی بھی پریشانی اس پر زیادہ دیر تک مسلط نہ رہ سکے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر دماغ کو ایک ہی پریشانی میں مبتلا رکھا جائے تو اس کا اثر زندگی کے دوسرے معاملات پر پڑتا ہے جس سے کوئی اور پریشانی بھی کھڑی ہو جاتی ہے۔

میز پر بیٹھنے کے بعد اس نے انٹرکام پر ہوٹل کے منیجر کو انتظامی معاملات کے سلسلے میں ہدایات دیں۔

اس ہوٹل کو چلانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک "گینگ" بھی چلا رہا تھا۔ اپنے اس گینگ میں اس نے پیشہ ور قاتل جمع کیے تھے۔ کبھی وہ خود بھی ایک پیشہ ور قاتل رہ چکا تھا لیکن اس نے جتنے بھی قتل کیے تھے، اتنی ہوشیاری سے کیے تھے کہ اس پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا۔ کبھی حوالات تک کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کیونکہ اس نے ابتدا ہی میں نہایت سرکردہ افراد کی خواہش پر ان کے مخالفین کو قتل کیا تھا۔ انہی سرکردہ لوگوں کی وجہ سے پولیس شبہے کے باوجود اسے گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ دو ایک پولیس افسر اس کے سخت دشمن تھے مگر انہیں بھی احساس تھا کہ وہ ٹھوس ثبوت کے بغیر اس پر ہاتھ ڈالیں گے تو خود ان کے لیے کچھ مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔

پولیس کے انہی شبہات کی وجہ سے شیر خاں کو ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اس شہرت کی وجہ سے لوگ اپنے خطرناک کام کرانے کے لیے اسی سے رجوع کرتے تھے۔ ہوٹل کے فون نمبر پر اس سے رابطہ کیا جاتا تھا۔ شیر خاں انہیں بری طرح لتاڑ دیا کرتا تھا۔

"تم پولیس کے ٹٹو معلوم ہوتے ہو جو بلاوجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" وہ ان لوگوں سے کہتا۔ "میرا ان کالے کاموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

لیکن بعد میں وہ فون کرنے والے کے بارے میں چھان بین کروانے کے بعد اسے پیغام بھجوا دیتا کہ اس سے کس طرح ملاقات کی جا سکتی ہے۔

جب فروزاں نے اسے ایک خلیجی عورت کی حیثیت سے فون کیا تھا تو شیر خاں نے اسے بھی جھاڑ سنا دی تھی لیکن بعد میں مطمئن ہونے کے بعد اس نے معمول کے مطابق فروزاں کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ اس سے کس طرح مل سکتی ہے۔

پہلی ملاقات میں شیر خاں نے اس پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہے۔

چھان بین کرنے کے بعد شیر خاں کو حیرت ہوئی تھی۔ وہ فوری طور پر نہیں سمجھ سکا تھا کہ فروزاں اپنے باپ کی دشمن کیوں ہو گئی ہے۔ اس نے بعد میں مزید چھان پھٹک کروائی تھی اور سبب اس کو معلوم ہو گیا تھا۔

بات تو وہ کچھ عجیب سی تھی لیکن اسے سمجھ لینے کے بعد شیر خاں نے اس بارے میں دوبارہ کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی کہ کون، کس وجہ سے، کس کا دشمن بن گیا۔

فروزاں کی خواہش پوری کرنے کی ذمے داری اس نے داراب کو سونپی تھی۔ اس کے گینگ میں داراب سب سے کم عمر تھا۔ اسے شیر خاں کی اتنی قربت حاصل تھی جو گینگ کے دوسرے لوگوں کو نہیں تھی۔ وہ لوگ یوں محسوس کرتے تھے جیسے شیر خاں اور داراب باپ بیٹے ہوں۔

بعض اہم معاملات میں شیر خاں داراب ہی سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی اسے داراب ہی یاد آیا جب فروزاں کی باتیں اسے الجھن میں ڈال گئی تھیں۔ اس نے فروزاں کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ سراغ رسانی اس کا میدانِ عمل نہیں ہے لیکن وہ داڑھی والے اس نوجوان کے سلسلے میں متجسس ہو گیا تھا۔

"یہ صرف تجسس... کی بات نہیں ہے۔" شیر خاں نے داراب کے آنے کے بعد اسے سب کچھ بتا کر کہا۔ "وہ داڑھی والا نوجوان ہمارے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ اگر اسے فروزاں کے عزائم کا علم ہو گیا ہے تو وہ یہ بھی جان چکا ہو گا کہ فروزاں نے اس معاملے میں مجھ سے رابطہ کیا ہے۔"

"اس کا تو قوی امکان ہے خان بابا!" داراب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے؟" شیر خاں نے کہا۔

"یہ تو شاید آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔"

"کیسے؟"

"وہ فروزاں کو اس کے عزائم سے روکنا چاہتا ہے تو برابر اس کے پیچھے لگا رہے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شیر خاں نے سر ہلایا، پھر بولا۔

"ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ نوجوان فروزاں کو اس کے ارادے سے کیوں باز رکھنا چاہتا ہے؟"

"شاید وہ کسی کا آلۂ کار ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر وہ آلۂ کار ہے تو کس کا ہے؟ اور وہ کون ہے جسے فروزاں کے اس ارادے کا علم ہوا۔"

"کیا وہ اکبر ہو سکتا ہے خان بابا؟"

"میں نے فروزاں سے اس شبہے کا اظہار کیا تھا لیکن درحقیقت مجھے اس پر شبہ نہیں ہے۔"

"اس لیے کہ وہ اس معاملے میں اس کا ساتھی بنا ہوا ہے؟"

"نہیں۔" شیر خاں نے کہا۔ "اس لیے کہ اس معاملے میں فائدہ اسے بھی پہنچے گا۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ فروزاں نے اصل بات اسے نہیں بتائی ہوگی، اس سے یہی کہا ہو گا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کی خاطر یہ اقدام کر رہی ہے۔"

"آپ کو اکبر پر قطعی شبہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ دراصل میرے خیال میں وہ کوئی ذہین آدمی نہیں ہے۔"

"احسن کے بارے میں سوچا آپ نے؟"

"مجھے اس پر بھی شبہ نہیں ہے۔ فروزاں نے اسے بتایا بھی نہیں ہو گا کہ اپنے باپ کے بارے میں اس کے کیا عزائم ہیں۔" [illegible] "ہماری چھان بین کے مطابق احسن اور فروزاں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے اکبر کی پوزیشن کیا بنتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کی پوزیشن جواب ہے۔ مستقبل میں وہ بھی نہیں رہے گی۔ وہ اکبر کو اس وقت تک بے وقوف بنائے رکھنا چاہتی ہے جب تک اپنا مقصد حاصل نہ کر لے اس کے بعد وہ..." شیر خاں یکایک چپ ہو گیا۔

داراب خفیف سا مسکرایا اور بولا۔ "آپ غالباً سوچے سمجھے بغیر بولتے چلے گئے، اور اچانک اب آپ کو خیال آیا ہے کہ اس طرح سوچنا غلط ہے۔"

"صحیح کہہ رہے ہو تم۔" شیر خاں بھی مسکرایا۔ "میں واقعی اس وقت سوچے سمجھے بغیر بولتا چلا گیا۔ وہ اکبر کی پوزیشن ختم نہیں کر سکتی۔ وہ ایک سنگین راز میں اس کا شریک ہے۔ رازداروں کی مخالفت یا دشمنی مول نہیں لی جا سکتی۔ لیکن یہ طے ہے کہ شادی وہ احسن سے ہی کرے گی۔"

"اکبر کا کیا ہو گا؟"

"کوئی بڑی رقم دے کر اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اسے وہ ہمارے ہی ذریعے سے قتل کروا دینا چاہے۔"

داراب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسی عجیب و غریب لڑکی ہے خان بابا! اس قسم کے معاملات میں پڑتے ہوئے تو مردوں کو بھی پسینا آ جاتا ہے۔"

"کوئی کوئی لڑکی ایسی بھی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے کئی سال امریکا میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہاں وہ اپنی کسی عزیزہ کے پاس رہتی تھی جس کا میل جول ایک امریکی عورت سے تھا جو امریکی پریذیڈنٹ کی باڈی گارڈ رہ چکی تھی۔ وہ کسی وجہ سے مستعفی ہو گئی تھی۔ فروزاں نے اس سے روابط بڑھا لیے تھے۔ فروزاں پر اس ماحول کا خاصا اثر ہوا ہو گا۔"

داراب حیرت سے بولا۔ "اتنی معلومات حاصل کر لی ہیں آپ نے اس کے بارے میں؟"

"کرنا پڑیں۔" شیر خاں نے کہا۔ "کیونکہ اس نے مجھ سے ملنے کے لیے خلیجی عورتوں جیسا روپ دھارا تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ معاملہ خاصا پراسرار لگنے لگا۔ خیر چھوڑو یہ

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

باتیں! تم اس شخص کے بارے میں سوچو جو فروزاں کے عزائم سے واقف ہو گیا ہے۔ اس کا سراغ لگنا ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ طارق زنجانی لندن سے آئے، ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔"

"کیا اس معاملے میں احسن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟"

شیر خان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس پر شبہ تو نہیں ہے لیکن اس قسم کے معاملات میں کسی امکان کو مسترد نہیں کرنا چاہیے۔"

داراب نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ یہی جواب سننا چاہتا ہو۔

☆☆☆

اس رات احسن سونے کے لیے لیٹ تو چکا تھا لیکن اسے جلد نیند نہیں آسکی۔ وہ لیٹے لیٹے فروزاں کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی یادوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے بھی امریکا ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہیں فروزاں سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے اور پھر اس دوستی نے محبت کی شکل اختیار کر لی تھی۔

جب احسن تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا گیا تھا، اس سے پہلے اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد زندہ تھے اور ایک بڑا کاروبار چلا رہے تھے۔ احسن جب امریکا سے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے والد کئی ماہ سے بسترِ علالت پر تھے۔ انہوں نے احسن کو اپنی بیماری کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ محبت کرنے والا بیٹا اپنی تعلیم چھوڑ چھاڑ کر انہیں دیکھنے کے لیے واپس نہ آجائے۔

احسن کو اس بات سے بہت دکھ ہوا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کی زیادہ خدمت نہیں کر سکا۔ امریکا سے اس کی واپسی کے ہفتہ بھر بعد ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ احسن کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔ باپ کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں صرف فروزاں ہی تھی جس نے اسے سنبھالا دیا تھا۔

گزرتا ہوا وقت بڑے سے بڑا زخم بھر دیتا ہے۔ تین چار ماہ میں احسن معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ وہ فطری طور پر فائن آرٹس سے دلچسپی رکھتا تھا یا پھر اسے مطالعے کا شوق تھا۔ عموماً ایسے لوگ کاروباری صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ احسن بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے باپ کا سارا کاروبار ختم کر کے ایک کثیر رقم بینک میں جمع کرا دی۔ وہ رقم اتنی تھی کہ اگر اسے کسی مصرف میں نہ لایا جاتا تو بھی دو تین نسلیں آرام سے زندگی گزار سکتی تھیں۔

احسن نے ایک مرتبہ شرارتاً فروزاں سے کہا تھا۔ "اگر ہماری اولاد کو تجارت سے دلچسپی ہوئی تو وہ کوئی کاروبار شروع کر دے گی۔ میں تو اپنی زندگی اپنے شوق پورے کرتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔"

فروزاں اس بات پر ہنس پڑی۔ "کیا ہے وہ ضرب المثل کہ سوت نہ کپاس اور....."

"چپ!" احسن بول پڑا۔ "بڑی بوڑھیوں کے انداز میں بات نہ کیا کرو۔ شادی تو ہم دونوں کی ہوگی ہی نا! اور شادی ہوگی تو بچے بھی ہوں گے۔ ہماری شادی جلدی بھی ہو سکتی تھی لیکن تم نے رخنہ ڈال دیا۔ یہ تمہیں اچانک انگریزی لٹریچر میں ایم اے کرنے کی کیوں سوجھ گئی؟"

"مجبوری تھی۔" فروزاں کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"کیا مجبوری تھی؟"

"ڈیڈی میری شادی اکبر سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ اچانک میرے سامنے آیا تو میں اس معاملے کو ٹالنے کے لیے فوری طور پر کوئی اور بہانہ نہیں سوچ سکی۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ میرے بارے میں تم اپنے ڈیڈی سے صاف صاف بات کرنے کی ہمت رکھتی ہو۔"

"ہمت تو مجھ میں تھی، اور ہے، لیکن اس بات سے میرا مطلب ہے، اکبر سے شادی کی بات سامنے آنے سے کچھ ہی دن پہلے ایک عجیب سا معاملہ میرے سامنے آیا تھا۔ اب میں جب تک اس معاملے کو اپنی خواہش کے مطابق ایک نتیجے تک نہ پہنچا دوں، شادی نہیں کرنا چاہتی... تم سے شادی کرنے کے بعد وہ سب کچھ کرنا شاید میرے لیے دشوار ہو جائے۔"

"گویا مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا، جب تک تم اپنا یہ نیا شوق پورا نہ کر لو۔ یعنی انگریزی لٹریچر میں..."

"نہیں۔" فروزاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "...... وہ تو صرف ایک بہانہ بنایا ہے میں نے۔ مجھے بس اتنا وقت چاہیے کہ جو معاملہ میرے سامنے آیا ہے، اسے ایک نتیجے تک پہنچا دوں۔"

"معاملہ کیا ہے آخر؟"

"بس یہ ابھی نہ پوچھو۔ جب وقت آئے گا تو تم سب کچھ جان لو گے۔"

"کیا کوئی گمبھیر معاملہ ہے؟"

فروزاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں! گمبھیر تو ہے۔"

"اور وہ تم مجھے ابھی بتانا نہیں چاہتیں؟"

"ہاں، ابھی نہیں بتانا چاہتی۔"

"گویا مجھے کچھ عرصے تک الجھن میں ڈالے رکھنا

چاہتی ہو؟"

"غلطی ہو گئی مجھ سے۔ تمہیں ابھی اتنا بھی نہ بتاتی تو بہتر تھا لیکن میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

اس موضوع پر گفتگو کچھ دیر چلی لیکن فروزاں نے احسن کو مزید کچھ نہیں بتایا۔ احسن کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نظر آئے تو فروزاں نے اسے منا لیا لیکن اصل بات اپنی زبان پر پھر بھی نہیں لائی۔

احسن وہ باتیں بھی نہیں بھولا۔ ذہن میں ایک خلش رہ گئی تھی۔ اس وقت بستر پر لیٹے لیٹے، فروزاں کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کی یادوں کے ساتھ اس کے دماغ میں کہیں دبا دبا سا یہ سوال بھی تھا کہ فروزاں آخر کس معاملے میں الجھ گئی ہے؟

انہی خیالات میں کسی وقت اسے نیند آگئی۔

دوسرے دن اس نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

"دو تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔" وہ روٹھے ہوئے سے انداز میں بولا۔

"میں نے تم سے جس معاملے کی بات کی تھی، وہ اب کلائمکس کے قریب آگیا ہے۔ اسی میں الجھی ہوئی تھی، لیکن خیر آج ہم ملیں گے۔"

"کہاں؟"

"جہاں زیادہ تر ملتے ہیں۔"

ان کی زیادہ تر ملاقاتیں ساحلِ سمندر پر ہوا کرتی تھیں۔ اس شام بھی ان کی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہ لہروں سے کچھ دور ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے احسن!" فروزاں بولی۔ "تم گھر میں اکیلے پڑے پڑے کس طرح دن رات گزار لیتے ہو؟"

احسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب تم سے ملاقات ہوتی ہے تو میں گھر پر نہیں ہوتا۔"

"جب ہم دونوں نہیں ملتے، اس وقت تو گھر ہی پر ہوتے ہو نا! یہ مجھے تم ہی نے بتایا تھا۔ میرے ساتھ ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرتے۔ باقی سارا وقت تم گھر پر اکیلے گزارتے ہو۔"

"میں اکیلا نہیں ہوتا۔" احسن کی مسکراہٹ قائم رہی۔ "کتابیں میری ساتھی ہوتی ہیں۔ تم جانتی ہو کہ مطالعہ کرنا میرا شوق ہے، اور پھر وہ تصویریں بھی تو میرے ساتھ ہوتی ہیں جو میں بناتا رہتا ہوں۔"

فروزاں کو یہ بات معلوم تھی کہ احسن کو فوٹوگرافی کے علاوہ مصوری کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ اس نے اس کی

انوکھا ہار

ایک اداکارہ نے دوسری اداکارہ کے گلے کے ہار کو دیکھ کر کہا۔ "یہ تم نے عجیب و غریب ہار پہن رکھا ہے۔"

"ہاں، یہ میں نے اپنی منگنی کی انگوٹھیوں کو پرو کر تیار کیا ہے۔" دوسری نے فخر سے جواب دیا۔

(انتخاب، سید افتخار حسین شاہ، مظفر آباد)

باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن بڑے آرٹسٹوں کو پڑھ پڑھ کر اور ان کی تخلیقات دیکھ دیکھ کر ہی اس نے رنگ آمیزی شروع کی تھی۔ اب اس کی بنائی ہوئی تصاویر اچھی خاصی ہوتی تھیں لیکن خود اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ اس فن میں اتنی پختگی حاصل نہیں کر سکا کہ اپنی بنائی کوئی تصویر یا منظر عام پر لائے۔

"کبھی میری تصویر بناؤ۔" فروزاں نے فرمائش کی۔

"یہ میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں۔"

"اور میں جواب بھی دے چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری تصویر میں کہیں کوئی خفیف سی کمی رہ جائے۔"

"مجھ سے شادی کے بعد بھی تم کتابوں اور اپنی تصویروں میں الجھے رہو گے؟"

"شادی کے بعد مجھے اس کی فرصت کم ہی ملے گی۔ تم بھی تو قدرت کی ایک شاہکار تصویر ہو، اور پھر عورت ہونے کے ناتے ایک کتاب بھی ہو۔ میں تمہیں بہت غور سے پڑھا کروں گا۔"

فروزاں کے ہونٹ پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔

احسن اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پہلے تم میری اس قسم کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ...... اب کچھ عرصے سے تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں بہت دن سے کھل کر ہنستے نہیں دیکھا۔"

"میرا دماغ آج کل ایک معاملے میں الجھا رہتا ہے۔ یہ میں تم کو بتا چکی ہوں۔"

احسن نے ایک طویل سانس لی۔ "وہ معاملہ تم نے میرے لیے ایک معما بنا دیا ہے۔ اکثر میرا دماغ بھی اسی میں الجھ جاتا ہے۔ اگر تم مجھے سب کچھ بتا دیتیں تو خلش نہ رہتی۔"

"اب وہ معاملہ طے پانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ پرسوں کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے وہ معاملہ غالباً اپنے کلائمکس پر ہوگا۔"

"کیا اس معاملے کا تعلق تمہارے ڈیڈی سے ہے؟"

فروزاں چونک پڑی۔ "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟" وہ تیزی سے بولی۔

"تم نے ابھی پرسوں صبح کی بات کی ہے نا! اور کل رات کسی وقت تمہارے ڈیڈی لندن سے واپس آ رہے ہیں۔ اسی لیے میرا دھیان ان کی طرف چلا گیا۔"

"بھی بھی قیاس آرائی اچھی کر لیتے ہو تم۔" فروزاں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس وقت اس کے دل کی دھڑکنیں اچانک بہت تیز ہو چکی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس نے موضوع بدلا۔ "خیر، چھوڑو، یہ بتاؤ آج کل کیا بنا رہے ہو؟"

اس طرح بات مصوری کی طرف چلی گئی اور پھر اس رنگ آمیزی کا قصہ، محبت آمیز جملوں تک پہنچا۔

اندھیرا پھیلنے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے جب وہ دونوں اس جگہ کی طرف واپس لوٹے جہاں ان کی کاریں کھڑی تھیں۔

جب فروزاں نے اپنی کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا تو احسن ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ بولا۔

"یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اب کب ملوگی۔"

"کل فون کروں گی، بتا دوں گی۔"

پھر ان دونوں میں "خدا حافظ" کا تبادلہ ہوا جس کے بعد فروزاں اپنی کار حرکت میں لے آئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ احسن اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔

فروزاں کی کار کچھ آگے بڑھی تو احسن اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فروزاں کو وہ وقت یاد آیا جب احسن نے اس کے "ڈیڈی" کا نام لیا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ پل بھر کے لیے اسے خیال آیا تھا کہ احسن کو اس بارے میں کسی طرح شاید کچھ معلوم ہو گیا ہے۔

لیکن بعد میں اس نے سوچ لیا تھا کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے فروزاں کے تصور میں اس پارک کا منظر ابھر آیا جہاں اس نے ایک ریوالور بہ دست نوجوان کو دیکھا تھا۔

گزشتہ شام سے اب تک فروزاں اپنے تصور میں اس نوجوان کو کئی بار دیکھ چکی تھی۔ اس نوجوان نے فروزاں کو فون بھی کیا تھا۔ اس کی آواز بھی فروزاں کے دماغ میں گونجتی رہی تھی اور وہ لمحہ بھی اس کے لیے ناقابل فراموش تھا جب تیس سے گولی چلائی گئی تھی اور ایک راہ گیر گولی سے زخمی ہو کر اس کے قریب ہی گرا تھا۔

وہ سب کچھ جو بھی ہوا تھا، نہایت خوف زدہ کر دینے والا معاملہ تھا لیکن فروزاں اتنی زیادہ نہیں ڈری تھی کہ وہ منصوبہ ختم کر دیتی جو اس نے بنایا تھا۔ اسی لیے وہ بعد میں شیر خاں سے بھی نہیں ملی تھی۔ ملتی تو اس صورت میں جب وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد رکوانا چاہتی لیکن وہ پریشان بہرحال تھی۔ اگر احسن نے فون پر بات کرتے ہوئے ملاقات پر بہت زیادہ اصرار نہ کیا ہوتا تو وہ اس سے ابھی دو ایک دن ملتی بھی نہیں۔ ان دونوں کی محبت لیلیٰ مجنوں کی وہ روایتی محبت نہیں تھی کہ انہیں ایک دوسرے کے بغیر پل بھر کو بھی قرار نہ ملتا ہو۔

ایک سگنل پر فروزاں کو اپنی کار روکنا پڑی۔ وہ بایاں ہاتھ اسٹیئرنگ پر اور دائیں ہاتھ کی کہنی کھڑکی پر رکھے اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔

موسم ان دنوں اتنا اچھا تھا کہ کار کا ائرکنڈیشنر چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ شام کو تو ہوا میں ہلکی سی خنکی بھی آ جاتی تھی اس لیے فروزاں نے دونوں طرف کی کھڑکی کے شیشے کھول لیے تھے۔

سگنل عین اسی وقت بند ہوا تھا جب فروزاں کی کار اس کے قریب پہنچی تھی۔ اسی لیے اس کے آگے کوئی گاڑی نہیں تھی لیکن عقب میں کاروں، ویگنوں اور موٹر سائیکلوں کی قطاریں لگ گئی تھیں۔

جب سگنل کی سرخ روشنی بجھنے کے ساتھ ہی زرد روشنی دکھائی دی، فروزاں کا ہاتھ "گیئر" پر پہنچ گیا جو نیوٹرل تھا۔ فروزاں اسے فرسٹ گیئر میں لائی ہی تھی کہ ایک چونکا دینے والا واقعہ پیش آیا۔

بائیں جانب کی کھڑکی سے ایک استخوانی ہاتھ اندر آیا جس نے بڑی تیزی سے "لاک" کھولا گیا اور دروازہ کھول کر ایک شخص تیزی سے اندر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک مجہول سا بوڑھا تھا جس کے جسم پر معمولی اور میلی سی قمیص پتلون تھی۔ پیروں میں عام سی چپلیں تھیں۔

چونکنے کے بعد جب فروزاں نے اس بوڑھے کو پہچانا تو اس کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔

"تم!" اس کے منہ سے نکلا۔

بوڑھے نے ڈھٹائی سے اپنے زرد دانت اس طرح نمایاں کیے جیسے بہت کھل کر مسکرایا ہو اور بہت خوش ہو۔

اس اثنا میں ٹریفک حرکت میں آ چکا تھا لیکن فروزاں اپنی کار حرکت میں لانا بھول گئی۔

"دراصل...." بوڑھے نے کہنا چاہا۔

اس وقت فروزاں کے پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیوں نے ہارن دینا شروع کر دیے تھے۔ ان آوازوں نے فروزاں کو چونکایا اور وہ تیزی سے گاڑی کو حرکت میں لے آئی۔

"دراصل۔" بوڑھے نے اپنی بات مکمل کی۔ "میں آج پریشان تھا۔ ادھر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا کہ تم نظر آ گئیں۔ یہ خوش قسمتی ہے میری کہ تم مل گئیں۔"

"تم کو اس طرح سرعام میری گاڑی میں نہیں آنا چاہیے تھا۔" فروزاں غصے سے بولی اور سگنل سے آگے نکلتے ہی کار بائیں جانب ایک پتلی سڑک پر موڑ لی جہاں برائے نام ٹریفک ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زیادہ لوگ اس مجہول بوڑھے کو اس کے ساتھ دیکھیں۔ اس کی وضع قطع ایسی تھی کہ اگر وہ عقبی سیٹ پر بیٹھتا تو لوگ اسے شوفر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے لیکن وہ فروزاں کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وضع قطع کے علاوہ اس کی شخصیت بھی ایسی نہیں تھی کہ اسے فروزاں کے طبقے سے متعلق سمجھا جا سکتا۔

"مجبوری تھی میری۔" بوڑھے نے فروزاں کو جواب دیا۔ "میری جیب آج بالکل خالی ہے۔"

"میں تمہیں ہر ماہ ایک معقول رقم باقاعدہ بھیجتی رہتی ہوں۔" فروزاں کی آواز میں غراہٹ سی تھی۔ "اور وہ تاریخ آنے میں ابھی چار پانچ دن باقی ہیں جب تمہیں یہ رقم بھیجی جاتی ہے۔"

"مہنگائی کی طرف بھی تو دیکھو، کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اب تمہیں اس رقم میں پچاس فیصد اضافہ کر دینا چاہیے۔" بوڑھے نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ فروزاں کو حکم دے رہا ہو۔

فروزاں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بوڑھا اس کے ساتھ کار میں بیٹھا رہے اس لیے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا پرس کھولا۔ اس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور بوڑھے کی گود میں پھینک دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کار کی رفتار تیزی سے کم کرنا شروع کی۔

"اب تم فوراً کار سے اتر جاؤ۔" وہ بولی۔

بوڑھے نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ وہ نوٹ گننے میں مصروف تھا۔

فروزاں نے کار سڑک کے کنارے روک دی۔

"یہ تو کم ہیں۔" بوڑھا بولا۔ وہ نوٹ گن چکا تھا۔

"اس وقت میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔" فروزاں نے کہا۔ "چار پانچ دن بعد تمہیں باقی رقم بھی مل جائے گی۔"

"پچاس فیصد اضافے کے ساتھ۔" بوڑھے کا لہجہ اس مرتبہ پھر ایسا ہو گیا جیسے حکم صادر کر رہا ہو۔

"بس اتر جاؤ اب۔" فروزاں نے دانت پیس کر کہا۔

"رقم پچاس فیصد اضافے کے ساتھ آنا چاہیے۔" بوڑھے نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اگر کم ہوئی تو مجھے تم سے ملنا پڑے گا۔"

فروزاں خاموش رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ بوڑھا جلد از جلد اس کی کار سے اتر جائے۔

"مجھے یقین ہے کہ تم آج کل کی مہنگائی کا خیال رکھو گی۔" بوڑھے نے کہا اور کار سے اتر گیا۔

فروزاں نے کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔ اس وقت اس کا دماغ غبار آلود سا ہو گیا تھا اس لیے وہ پیچھے آنے والی دو تین گاڑیوں کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکی۔ اگر اس کا دھیان ادھر جاتا تو وہ احسن کی کار پہچان لیتی۔

☆☆☆

اپنے گھر جانے کے لیے احسن کی واپسی کا راستہ بھی وہی تھا جس راہ سے فروزاں لوٹی تھی لیکن اس دوسری سڑک پر احسن صرف اس لیے مڑا تھا کہ فروزاں نے اپنی کار اس طرف موڑی تھی۔ احسن اس کا تعاقب ہرگز نہ کرتا، اگر اس نے سگنل کے پاس رکی ہوئی فروزاں کی کار میں اس بوڑھے کو بیٹھتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔

احسن اور فروزاں کی کاروں کے درمیان اس وقت دو ہی گاڑیاں تھیں اس لیے اس نے بوڑھے کی وضع قطع ہی نہیں، اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا اور اس کے رگ و پے میں حیرت سرایت کر گئی تھی۔ فروزاں سے اس قسم کے کسی بوڑھے کا تعلق اس کے لیے قطعی ناقابل فہم بات تھی۔ اس کے دماغ میں ہیجان سا برپا ہو گیا۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ فروزاں ان دنوں جس معاملے میں الجھی ہوئی تھی، اس سے کیا اس بوڑھے کا تعلق بھی ہو سکتا ہے؟

جب وہ بوڑھا فروزاں کی کار سے اترا اور فروزاں کی کار تیزی سے آگے بڑھ گئی تو احسن نے فوری طور پر اس بوڑھے ہی پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل اسے خیال تھا کہ فروزاں اسے اس بوڑھے کے بارے میں شاید کچھ نہ بتائے۔

کار سے اترنے کے بعد وہ بوڑھا فٹ پاتھ پر چڑھ کر آگے بڑھنے لگا۔ احسن کو اپنی کار کی رفتار رینگنے کی حد تک کم کر دینا پڑی۔ وہ الجھن میں بھی پڑ گیا کہ وہ بوڑھا نہ جانے کب تک اور کہاں تک پیدل چلتا رہے گا۔

www.pkdigest.com

بوڑھے کو شاید کوئی دھڑکا ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کرسکتا ہے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتا رہا۔

یکایک وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ یہ احسن کے لیے پریشانی کی بات تھی۔ اس گلی میں کار لے جانا ممکن نہیں تھا۔ مجبوراً اسے کار ایک کنارے کرکے روکنا پڑی۔ وہ ہر صورت میں اس بوڑھے پر نظر رکھنا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کار سے اتر کر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے لاک لگا دیا تھا۔ پھر وہ بڑی تیزی سے چلتا ہوا اس گلی میں داخل ہوا۔ یہ اس کے لیے اطمینان بخش بات ثابت ہوئی کہ بوڑھا اس قلیل وقفے میں اتنی دور نہیں نکلا تھا کہ احسن کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا۔

گلی سے دوسری سڑک پر نکلنے کے بعد بوڑھا ایک بس اسٹاپ پر کھڑا ہوگیا۔ وہاں بس کا انتظار کرنے والے دو تین افراد اور بھی تھے۔ وہیں ایک الیکٹرک پول تھا۔ احسن اس سے ٹیک لگا کر اس طرح کھڑا ہوگیا کہ بوڑھے کی نظر اس پر نہ پڑسکے۔

دور سے ایک بس آتی دکھائی دی۔ عین ممکن تھا کہ بوڑھا اسی میں سوار ہوتا۔ اس وقت احسن کو اچانک خیال آیا کہ اگر وہ بھی اس بوڑھے کے پیچھے بس میں سوار ہوا تو لوگوں کی نظریں اس کی طرف ضرور اٹھیں گی۔ اس کی وضع قطع ان جیسے لوگوں کی نہیں تھی جو بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ تراش کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ جوتے بھی اتنے ہی قیمتی تھے۔ کلائی پر گھڑی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ دائیں ہاتھ میں انگشتریاں بھی تھیں۔ اس کے لیے بس میں بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالے۔

ایک خالی آٹو رکشا آتے دیکھ کر احسن کے دماغ میں ایک خیال چمک گیا۔ اس نے اشارہ دے کر رکشا روک لیا۔ اسی وقت بس بھی وہاں آکر رکی۔ بوڑھا اسی میں سوار ہورہا تھا۔

احسن نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا رکو، بس کو آگے نکل جانے دو۔“

رکشے ڈرائیور ہنس کر بولا۔ ”بس میرے رکشے پر تو نہیں چڑھ جائے گی صاحب!“

”یہ بات نہیں۔“ احسن بولا۔ ”دراصل رکشا تمہیں اس بس کے پیچھے پیچھے رکھنا ہے۔“

بس اس وقت رکشے کے برابر سے آگے نکل رہی تھی۔ رکشا ڈرائیور نے اس پر نظر ڈالی۔ احسن نے محسوس کیا کہ ڈرائیور کی نظریں بس کے اگلے حصے کی طرف گئی تھیں جہاں لیڈیز کمپارٹمنٹ تھا۔ اس میں کئی عورتیں اور لڑکیاں بیٹھی تھیں جن کے چہرے احسن نہیں دیکھ سکا۔

رکشا آہستگی سے آگے بڑھا۔ ساتھ ہی رکشے والے نے سر موڑ کر احسن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ ”میں سمجھ گیا صاحب!“

احسن نے ہنس کر یہ تاثر دیا جیسے رکشے والے نے بالکل ٹھیک سمجھا ہو۔

بس کا تعاقب شروع ہوگیا۔ جب وہ کسی بس اسٹاپ پر رکنے لگتی تو رکشے والا اپنی رفتار بہت سست کردیتا۔

بیس پچیس منٹ بعد بس ایک اسٹاپ پر رکی تو احسن نے بوڑھے کو وہاں اترتے دیکھ لیا۔

”بس اب یہیں رک جاؤ۔“ احسن نے رکشے والے سے کہا۔

اس نے رکشا روک دیا۔ بس روانہ ہوچکی تھی۔ رکشے والے نے سر گھما کے احسن کی طرف دیکھا۔ احسن کی توجہ بوڑھے کی طرف تھی جو ایک بلڈنگ کے پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رکشے والے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ بوڑھے کی طرف اس نے بھی دیکھا تھا۔

”آپ خفیہ پولیس سے ہیں....؟“ رکشے والے نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں۔“ احسن کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی نظریں بوڑھے کو پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا دماغ یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ وہ بوڑھا اس بلڈنگ میں رہتا ہوگا۔ وہ بلڈنگ بہت شان دار تھی۔ اس کا فلیٹ بھی شان دار ہی ہونا چاہیے تھا۔ بوڑھا ان میں سے کسی فلیٹ کا مکین نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی وضع قطع گھریلو ملازم جیسی بھی نہیں تھی۔

رکشا... حرکت میں آیا۔

”ابھی رکو۔“ احسن نے جلدی سے کہا۔

”کنارے کرکے کھڑا کررہا ہوں صاحب!“ جواب ملا۔ ”آپ شاید انتظار کریں گے اس کا! کیا وہ کوئی بہت غلط آدمی ہے صاحب؟“

”یہی دیکھنا ہے۔“ احسن نے جواب دیا۔

”وہ یہاں تو نہیں رہتا ہوگا۔“ رکشے والا بولا۔ ”اس بڈھے کی ایسی حیثیت تو نہیں ہے۔“

”تم جانتے ہو اس بلڈنگ میں رہنے والوں کو؟ سب اچھے ہی لوگ رہتے ہیں؟“

”جن کے پاس پیسا ہوتا ہے، وہ سب اچھے ہی سمجھے جاتے ہیں صاحب! اس بلڈنگ میں تو ایک دلال بھی رہتا ہے۔ ایک درجن لڑکیاں تو ضرور ہوں گی اس کے پاس۔“

”بہت کچھ جانتے ہو تم تو۔“

”رکشے ٹیکسی والوں کی معلومات بہت ہوتی ہیں صاحب۔“

”اس دلال کا نام کیا ہے؟ یہ بھی جانتے ہو؟“

”ہاں صاحب! جگدیپ نام ہے اس کا۔“

”تو بوڑھا شاید اسی کے پاس گیا ہو۔“

”جگدیپ کی لڑکیاں بہت اونچے لوگوں میں جاتی ہیں صاحب! بڈھا اگر عیاش ہے تو اتنی مہنگی عیاشی نہیں کرسکتا۔ جگدیپ شراب بھی سپلائی کرتا ہے لیکن وہ بھی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ معمولی شراب نہیں بیچتا وہ۔“

احسن چپ رہا۔

”صاحب!“ رکشے والا بولا۔ ”میں سامنے کی دکان سے سگریٹ لے آؤں؟“

”لے آؤ! مگر ادھر کا خیال رکھنا۔ وہ شاید جلد ہی واپس آجائے۔“

”میں دیکھتا رہوں گا صاحب۔“

رکشے والا چلا گیا۔ احسن الجھن میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے! وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ بوڑھا جلد واپس لوٹے گا یا اسے دیر لگے گی۔ اس وقت احسن کے دماغ میں یہ خلش بھی تھی کہ اس بوڑھے سے فروزاں کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

رکشے والا سگریٹ سلگاتا ہوا واپس لوٹا۔ اسی وقت وہ بوڑھا بلڈنگ سے نکلتا نظر آیا۔ اس وقت اس کی بغل میں ایک پھولا ہوا براؤن لفافہ تھا۔

”یہ تو شاید بوتل لے کر آیا ہے صاحب!“ رکشا ڈرائیور تعجب سے بولا۔ ”اس بڈھے کی حالت تو ایسی نہیں ہے کہ قیمتی شراب پی سکے۔ کہیں سے مال تو ہاتھ نہیں لگ گیا اس کے؟“

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال چکرانے لگا تھا کہ وہ رقم بوڑھے کو فروزاں سے بھی مل سکتی تھی... مگر کیوں؟ احسن کے دماغ میں اس کا کوئی جواب نہیں آسکا۔

”رکشا آگے سے موڑ کر واپس لے آؤں صاحب؟“ رکشے والے نے پوچھا۔

احسن نے بھی دیکھ لیا تھا کہ بوڑھا سڑک پار کرکے دوسرے بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا تھا۔

احسن سے اثباتی جواب مل جانے کے رکشے والے نے وہی کیا جو کہا تھا۔ جب وہ رکشا موڑ کر لایا تو بوڑھا ایک بس میں سوار ہورہا تھا۔ رکشا اس بس کے تعاقب میں چل پڑا۔

احسن کے دماغ میں سوال ابھرا، اگر بوڑھے کو اتنی خاصی رقم مل گئی ہے تو وہ بس میں سفر کیوں کررہا ہے؟

اتفاق تھا کہ رکشے والا اس طرح بولا جیسے اس نے احسن کا دماغ پڑھ لیا ہو۔

”بڑھیا شراب تو اس نے خرید لی ہے صاحب!“ رکشے والے نے ایک بس اسٹاپ کے قریب رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ٹیکسی رکشا کے چکر میں نہیں پڑا۔ بس میں بیٹھنے والوں کو بس میں بیٹھنے کی عادت پڑجاتی ہے۔“

”ہوں۔“ احسن نے کچھ بولنا ضروری نہیں سمجھا۔

اس مرتبہ بس کا تعاقب آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ بس سے اترنے کے بعد بوڑھا پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ براؤن لفافہ اب بھی اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

جلد ہی بوڑھا ایک ایسے علاقے میں داخل ہوا جہاں چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جن کی دیواریں بدرنگ اور کھڑکیاں دروازے بوسیدہ تھے۔

بوڑھا ایک کوارٹر میں چلا گیا۔

رکشے والے نے سوالیہ نظروں سے احسن کی طرف دیکھا۔

”بس اب وہیں واپس چلو جہاں سے میں تمہارے رکشے میں بیٹھا تھا۔“ احسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”وہ قفل کھول کر کوارٹر میں گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یہیں رہتا ہے اور اکیلا رہتا ہے۔“

رکشا واپس موڑ لیا گیا۔ رکشا والا اتنی ہمت نہیں کرسکتا تھا کہ احسن سے اس معاملے کے بارے میں کوئی استفسار کرتا۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا کہ احسن کا تعلق کسی خفیہ ادارے سے ہے۔

جب احسن رکشے سے اترا تو اس نے رکشے والے کو نہایت معقول رقم دی لیکن بہت سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ ”تم اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔“

”بالکل نہیں صاحب!“ رکشے والے نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے اپنی شامت تو نہیں بلوانی!“

احسن مزید کچھ کہے بغیر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا گلی میں داخل ہوگیا۔ گلی سے دوسری سڑک پر نکلا جہاں اس نے اپنی کار چھوڑی تھی۔ کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بھی اس کا دماغ بہت الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

فروزاں کی کار بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ وہ یہ دیکھ کر چونک گئی کہ برآمدے میں دو آدمی خاکی وردی میں ملبوس کھڑے تھے۔ دونوں کے پاس جدید قسم کا اسلحہ تھا۔ عمریں چالیس سال کے لگ بھگ تھیں۔ ان کے قریب ہی

www.pkdigest.com

اکبر بھی موجود تھا۔
فروزاں نے کار برآمدے کے سامنے ہی روکی اور اتر کر برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے حیرت سے بولی۔ "کیا معاملہ ہے اکبر؟"
دونوں وردی پوش اکبر کی طرف دیکھنے لگے۔
"تم انہی کے باڈی گارڈ ہو۔" اکبر نے فروزاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ پھر فروزاں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "اندر چلو، بتاتا ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔"
فروزاں آگے بڑھی۔ معاملہ اس کی سمجھ میں آچکا تھا۔ وہ دونوں وردی پوش سیکیورٹی گارڈز تھے۔ ان کا تعلق کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی ہی سے ہو سکتا تھا۔
فروزاں اور اکبر گھر میں داخل ہوئے۔ فروزاں جھنجلائی ہوئی سی تھی۔
"تم اپنے طور پر ہی سب کچھ کر گزرے؟" وہ اکبر کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔
"صبح ہی میں نے یہ تجویز تمہارے سامنے رکھی تھی۔"
"اور میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔"
"لیکن میں کیسے نظر انداز کر دوں فروزاں!" اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ "حالات بتا رہے ہیں کہ تم کسی خطرے میں پڑ سکتی ہو۔ اس وقت تو میں بہت ہی پریشان ہو گیا تھا۔ تم کچھ بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھیں۔ تمہارے موبائل پر بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ تم نے اس کا سوئچ آف کر رکھا تھا اور شاید اب بھی آف ہو۔"
"اتفاقاً کسی طرح آف ہو گیا ہوگا۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے دھیان بھی نہیں گیا۔ ابھی واپس آتے ہوئے میں نے دیکھا تھا۔ اب آن ہے۔" فروزاں کا موڈ بگڑا رہا۔
"ان حالات میں تمہیں گھر سے اکیلا نہیں نکلنا چاہیے۔"
"میں قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔" فروزاں نے کہا اور مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
وہ واقعی خوف زدہ نہیں تھی۔ اگر خوف زدہ ہوتی تو تنہا احسن سے ملنے ساحلِ سمندر پر نہ چلی جاتی۔ البتہ وہ پریشان ضرور تھی۔ اس پراسرار نوجوان کا معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جس کی وجہ سے اکبر نے اس کے لیے باڈی گارڈز کا بندوبست کیا تھا۔
کمرے میں پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گئی۔ یہ وہ خود بھی سوچ چکی تھی کہ اسے احتیاط بہرحال برتنا ہوگی لیکن اسے یہ خیال بھی تھا کہ وہ فوری طور پر کسی خطرے میں نہیں پڑے گی۔ اسی خیال سے وہ بے خوف و خطر احسن سے ملنے چلی گئی تھی۔ اس نے اس انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ نوجوان اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا، صرف دھمکانا چاہتا ہے۔
نوجوان نے موبائل پر اس سے کہا تھا کہ اس نے گولی اسی پر چلائی تھی لیکن فروزاں کا خیال تھا کہ وہ گولی اسے صرف ڈرانے کے لیے چلائی گئی تھی۔
لیکن ڈرانا دھمکانا بھی کیوں؟
فروزاں کو یہ سوال پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس نے شیر خاں سے اپنے باپ طارق زنجانی کے سلسلے میں اس کی "خدمات" حاصل کی تھیں اور وہ نوجوان چاہتا تھا کہ فروزاں اس ارادے سے باز آجائے۔
آخر کیوں؟ فروزاں مسلسل سوچتی رہی۔ اس نوجوان کو طارق زنجانی سے آخر کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟ اور کیوں ہو سکتی تھی؟ وہ آخر تھا کون؟
اسی قسم کے سوالات کی دھمک فروزاں کا دماغ ہلائے دے رہی تھی۔
انٹرکام کے بزر کی آواز سن کر وہ چونکی۔ انٹرکام صرف اسی کے کمرے میں نہیں بلکہ طارق زنجانی اور اکبر کے علاوہ ڈرائنگ روم میں بھی لگا ہوا تھا۔
انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے وہ سمجھ چکی تھی کہ دوسری طرف سے اکبر کی آواز سنائی دے گی۔ اسے گھر کے کسی ملازم کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال درست ...... ہوا۔ وہ اکبر ہی تھا۔
"کھانا کب کھاؤ گی؟" اس نے فروزاں سے پوچھا اور پھر فوراً ہی کہا۔ "آج تم نے لنچ بھی نہیں کیا ہے۔"
"ابھی آٹھ بھی نہیں بجے ہیں۔" فروزاں منہ بنا کر بولی۔ "اور تم جانتے ہو کہ رات کا کھانا میں دس بجے سے پہلے نہیں کھاتی۔"
"یہ میں نے اس لیے پوچھ لیا کہ..." اکبر نے اپنی بات دہرائی۔ "آج تم نے لنچ نہیں کیا ہے۔"
"ایک دوست ہے میری۔ ابھی اسی کے پاس سے آئی ہوں۔ وہاں کچھ کھا لیا تھا۔"
"اچھا تو کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ باتوں میں دل... بہل جائے گا۔ سب کچھ سوچ سوچ کر مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"
فروزاں کو اندازہ تھا کہ اکبر کی حالت ایسی ہی ہوگی۔ وہ خود بھی ایسی ہی کیفیت میں تھی۔ اس نے کہا۔ "اچھا میں

پندرہ منٹ بعد آتی ہوں۔ ذرا آرام کرلوں۔"
"میں انتظار کر رہا ہوں۔" اکبر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
فروزاں ہی کو نہیں، یہ بات اکبر کو بھی معلوم تھی کہ طارق زنجانی نے ان دونوں کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس کے باوجود اکبر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فروزاں کی خواب گاہ میں پہنچ جاتا۔ فروزاں خود کو اتنا لیے دیے رکھتی تھی کہ اکبر ایک خاص حد سے تجاوز نہ کر سکے۔
فروزاں ذرا دیر آنکھیں بند کر کے اپنا دماغ پرسکون کرنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی مگر اسے موقع نہیں مل سکا۔ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا اور اس کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ کال اسی اجنبی نوجوان کی تھی۔ فروزاں نے یہ بات فوری طور پر اس لیے جان لی کہ وہ فون نمبر اس نے "اجنبی نوجوان" کے نام سے اپنے موبائل میں "فیڈ" کر لیا تھا۔
اس نے موبائل کان سے لگا لیا مگر کچھ بولی نہیں۔
"ہیلو!" دوسری طرف سے کہا گیا۔
فروزاں نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز تو اس کے دماغ میں مسلسل گونجتی رہی تھی۔
"بولو، کیا بات ہے؟" فروزاں کی آواز دھیمی تھی۔
دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آئی، پھر کہا گیا۔ "کچھ ڈری ہوئی سی آواز ہے تمہاری۔"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فروزاں نے لہجے میں تلخی پیدا کی۔ "میں خوف زدہ نہیں ہوتی۔"
"تمہاری آواز کچھ ایسی ہی تھی... خیر، میرا خیال ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز آگئی ہوگی۔ تم نے شیر خان کو فون کر دیا ہوگا۔"
فروزاں کے دماغ میں تیزی سے خیال ابھرا کہ اس نوجوان کا تعلق اگر شیر خاں سے ہوتا تو اسے یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے تھی کہ وہ شیر خاں کو فون کر چکی تھی یا نہیں۔ اس کے علاوہ غالباً وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ شیر خاں اس قسم کی باتیں فون پر کرنا پسند ہی نہیں کرتا۔
"جواب نہیں دیا تم نے؟" دوسری طرف سے آواز پھر آئی۔
"تم کو میرے اس معاملے سے کیا دلچسپی ہے؟" فروزاں نے تیز لہجے میں پوچھا۔
"میری دلچسپی طارق زنجانی سے ہے۔"
"مگر کیوں؟"
"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" اجنبی نوجوان نے کھردرے لہجے میں کہا۔
"پابند تو میں بھی نہیں ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔ تم پابند نہیں ہو، لیکن یہ بات میں کسی نہ کسی طرح کل صبح تک معلوم کر ہی لوں گا کہ تم اپنے ارادے سے باز آئی ہو یا نہیں۔"
"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ خود معلوم کر لیتا۔"
"اچھا خیر! تم جواب نہ دو، لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اگر تم باز نہیں آئی ہو تو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔"
اس سے پہلے کہ فروزاں کچھ کہتی، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
فروزاں نے موبائل کان سے ہٹایا اور اسے ہاتھ میں لیے اس طرح تکنے لگی جیسے بالکل خالی الذہن ہو گئی ہو، لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے تھے۔ وہ آرام کرنے کے لیے دوبارہ نہیں لیٹی اور کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔
اکبر اس کا منتظر تھا۔ وہ فروزاں کو دیکھتے ہی بولا۔ "تمہارے باڈی گارڈز کے لیے میں نے انیکسی کا ایک کمرا مخصوص کر دیا ہے۔"
فروزاں نے اس بات پر کوئی فوری ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے دماغ میں ان باتوں کا شور سا ہو رہا تھا جو کچھ ہی لمحوں پہلے موبائل پر ہو چکی تھیں، وہ بولی۔
"ابھی اس کا فون پھر آیا تھا۔"
"کس کا؟" اکبر کسی قدر چونکا۔
"وہی۔" فروزاں بولی۔ "جو نہیں چاہتا کہ وہ سب کچھ ہو، جو میں کرنا چاہتی ہوں۔"
اکبر کے چہرے پر تشویش کا تاثر ابھر آیا۔
فروزاں نے وہ باتیں دہرائیں، پھر بولی۔ "تم ان باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہو؟"
"میں سمجھا نہیں! کس قسم کا نتیجہ؟"
"کیا اس کی باتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کا شیر خاں سے کوئی تعلق نہیں ہے؟"
اکبر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "ہاں اس سے ظاہر تو ہوتا ہے کہ اسے تمہارے ارادے کا علم کسی اور ذریعے سے ہوا ہوگا، ورنہ اسے شیر خاں یا اس کے کسی آدمی سے معلوم ہو چکا ہوتا کہ تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا ہے۔"
"اب یہ سوال بہت اہم ہو گیا کہ اسے یہ بات کس سے معلوم ہوئی ہوگی؟" فروزاں بہت غور سے اکبر کی طرف

www.pkdigest.com

دیکھنے لگی۔

اکبر نے پہلو بدلا۔ ”تم اس طرح میری طرف کیوں دیکھنے لگیں؟ کیا تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو؟“

درحقیقت فروزاں کے ذہن میں یہی شبہ کلبلا رہا تھا لیکن وہ شبہ بہت کمزور اس لیے تھا کہ اکبر سے اس کی توقع بے جواز دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس معاملے میں فروزاں کا شریکِ کار تھا اور فروزاں جو کچھ کرنا چاہتی تھی، اس سے اکبر کا مفاد بھی وابستہ تھا۔ کم از کم ظاہری طور پر فروزاں نے اس سے اس کے مفاد کی بات کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے لیے فروزاں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

اکبر کی بات کے جواب میں فروزاں نے کہا۔ ”یہ بات نہیں اکبر! بس الجھن یہ ہے کہ شیر خاں اور اس کے ایک آدمی کے علاوہ اگر کوئی اس بارے میں جانتا ہے تو وہ صرف تم ہو یا میں ہوں، اور ہم دونوں ہی کسی کو یہ بات نہیں بتا سکتے۔ ایسی صورت میں کیا یہ ایک معما نہیں بن گیا؟ نہ میں، نہ تم، نہ شیر خاں، نہ اس کا وہ آدمی جسے ہمارے کام کے لیے شیر خاں نے مامور کیا ہے۔“

”ہوں۔“ اکبر نے سر ہلایا۔ ”بے شک یہ ایک معما تو ہے۔“ پھر وہ یکایک اس طرح چونکا جیسے اچانک کوئی خیال اس کے دماغ میں آیا ہو۔

فروزاں اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کوئی نکتہ سوجھا ہے تمہیں؟“

”ہاں فروزاں!“ اکبر نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”تمہیں فون کرنے والے نے یہ باتیں شاید اسی لیے کی ہوں۔“

”اسی لیے؟ کیا مطلب؟“

”تاکہ ہم سمجھ لیں کہ اس کو اس بات کا علم شیر خاں یا اس کے آدمی سے نہیں ہوا ہے۔“

”اوہ! گویا اسے اس کا علم شیر خاں یا اس کے آدمی ہی سے ہوا ہوگا اور اس نے اس طرح بات کر کے میری توجہ اس طرف سے ہٹانا چاہی ہے؟“

”کیا اس کا امکان نہیں؟“

فروزاں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”مجھے یہ نکتہ واقعی نہیں سوجھا تھا۔“

”تو اب اس پر غور کرو۔“

فروزاں نے ان باتوں کے دوران میں ہی غور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس کا دل و دماغ اب یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے جس کی طرف اکبر نے اشارہ کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس قسم کے معاملات میں شیر خاں جیسے لوگ اپنے ● کسی ”گاہک“ کو دھوکا نہیں دیتے اور شیر خاں کے کارندے بھی اپنے ماسٹر سے دغابازی نہیں کر سکتے۔

”بہت سوچنا پڑے گا اس پر۔“ فروزاں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ سوال ابھر آیا تھا کہ اسے یہ نکتہ بتا کر اکبر نے اس کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی کوشش تو نہیں کی ہے؟

اکبر کے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔

”چلو کھانا کھا لیتے ہیں۔“ فروزاں بولی۔ ”جتنا بھی کھایا جا سکے گا، کھا لوں گی۔ اس کے بعد میں سونا چاہتی ہوں۔“

”اتنی جلدی کیسے سو جاؤ گی؟“

”سوچتے سوچتے دماغ بہت تھک گیا ہے۔ شاید نیند آ ہی جائے۔“

”ایسا کر لو۔“ اکبر نے اس موضوع پر بات زیادہ آگے نہیں بڑھائی۔

کھانا کھانے کے بعد فروزاں اپنے کمرے میں لوٹتے لوٹتے رکی اور ڈائننگ روم کے دروازے پر کھڑے کھڑے اس نے موبائل پر اپنے شوفر سے رابطہ قائم کیا۔

عموماً وہ خود ہی اپنی کار ڈرائیو کرتی تھی لیکن اس کا ایک شوفر بہرحال تھا جس کی ذمے داری زیادہ تر گاڑی کی دیکھ بھال تک محدود رہتی تھی۔

”ناصر!“ فروزاں نے موبائل پر اپنے شوفر سے کہا۔ ”میری دوست شمسہ کا گھر تم نے دیکھا ہی ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ شمسہ تمہیں ایک لفافہ دے گی۔ وہ لے آؤ۔ میں شاید اس وقت تک سو چکی ہوں۔ تم وہ لفافہ اپنے پاس رکھ لینا۔ صبح لے لوں گی تم سے؟ کار کی چابی تو ہے نا تمہارے پاس؟“

”جی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

فروزاں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

قریب کھڑا اکبر بولا۔ ”تمہاری یہ دوست شمسہ وہی ہے نا جو کسی لیکچرار کی بیٹی ہے۔ بفرزون میں کہیں رہتی ہے؟“

”ہاں۔“ فروزاں نے جواب دیا۔ ”بہت پرانی دوست ہے میری۔ اس وقت ہماری عمریں گیارہ سال تھیں۔ ابتدائی تعلیم ہم نے ساتھ ہی حاصل کی تھی۔“

”ناصر کو بفرزون سے واپس آنے میں تو ڈیڑھ گھنٹے لگ جائیں گے۔ اس وقت تک تم تو کیا، شاید میں بھی سو چکا ہوں۔“

فروزاں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا اور بولی۔ ”اچھا میں جاتی ہوں، شب بخیر۔“

”شب بخیر فروزاں!“

فروزاں اپنے کمرے میں آ گئی۔ لیٹنے کے بجائے وہ ٹہلنے لگی۔ اس نے ناصر سے موبائل پر بات کرتے وقت گھڑی دیکھ لی تھی۔ کچھ دیر ٹہلتے ہوئے بھی وہ بار بار گھڑی دیکھتی رہی۔ دس منٹ بعد اسے یقین ہو گیا کہ ناصر اگر فوراً نہیں، تو اب روانہ ہو چکا ہوگا۔

فروزاں نے موبائل پر ناصر سے رابطہ کیا۔

”روانہ ہو گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں فوراً ہی روانہ ہو گیا تھا میڈم! گھر سے خاصی دور نکل آیا ہوں۔“

”اچھا تو اب زیادہ آگے نہ جانا۔“ فروزاں نے کہا۔ ”واپس آؤ، لیکن کار بنگلے میں نہ لانا۔ بنگلے کے پیچھے والی گلی میں آ جاؤ۔ وہیں میرا انتظار کرنا۔“

”بہتر ہے۔“ ناصر نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں استعجابی تاثر تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ اسے فروزاں سے ہدایت ہی عجیب ملی تھی۔

فروزاں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ادھیڑ عمر کا شوفر ناصر ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔ فروزاں کو اس کی شکل [illegible] تھا۔ یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ وہ فروزاں کی کوئی بات کسی کو بتا دیتا۔

فروزاں اس وقت جہاں جانا چاہتی تھی، اس کے لیے رازداری ضروری تھی۔ اگر وہ سامنے سے جاتی تو اس اکبر کی وجہ سے سیکیورٹی گارڈ کو بھی ساتھ لینا پڑتا۔ اس صورت میں رازداری ممکن نہیں تھی۔

کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکل گئی۔ بنگلے کا عقبی دروازہ گھر کی صفائی کرنے والے ملازمین استعمال کرتے تھے مگر فروزاں کے علم کے مطابق اس وقت کوئی ملازم وہ دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا۔

فروزاں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس طرف کیونکہ ٹریفک نہیں چلتا تھا اس لیے الیکٹرک پولز ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ وہاں روشنی بھی تھی۔ دونوں پولز کے عین درمیان کے کچھ حصے کو کسی حد تک تاریک ہی کہا جا سکتا تھا۔ فروزاں کی کار اسی جگہ کھڑی تھی۔ اس وقت وہاں دونوں جانب دور تک سناٹا تھا۔

فروزاں تیزی سے کار کے قریب پہنچی اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ ناصر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں چلنا ہے میڈم؟“

”میکڈونلڈ۔“ فروزاں نے جواب دیا۔

کار آہستگی سے حرکت میں آئی۔ میکڈونلڈ کا ایک ریستوران اس علاقے میں بھی کوئی ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔

کار چلتی رہی۔ فروزاں کا دماغ خیالات میں الجھا رہا۔

جلد ہی کار میکڈونلڈ کے سامنے رکی۔ ناصر نے جلدی سے اتر کر پچھلی نشست کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن فروزاں خود ہی کار سے باہر آ گئی۔ اس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے ناصر سے پوچھا۔ ”چابی، اگنیشن ہی میں ہے نا؟“

”جی۔“ ناصر کا جواب تھا۔

”یہ لو۔“ فروزاں نے اسے ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم ریسٹورنٹ میں کچھ کھا پی کر وقت گزارو۔ کار میں لے جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد تم باہر ہی ملنا۔ میں اتنی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔ اگر دیر لگی تو دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں ہوگی۔“

ناصر نے خاموشی سے نوٹ لے لیا۔ اس کے چہرے سے الجھن اب بھی آشکارا تھی لیکن اپنی الجھن رفع کرنے کے لیے وہ فروزاں سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

فروزاں نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ کار وہ بڑی تیزی سے حرکت میں لائی تھی۔ اسے کہیں جانے کے لیے یہ طریقہ اس لیے اختیار کرنا پڑا تھا کہ وہ سیکیورٹی گارڈز کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بیس منٹ میں ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئی جہاں کے مکانات اس کی نشان دہی کر رہے تھے کہ ان کے مکینوں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔

فروزاں نے ایک مکان کے سامنے کار روک دی۔ گاڑی بند کر کے وہ اتری۔

مکان کے دروازے پر پہنچ کے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں لگی ہوئی کال بیل کی مدھم سی آواز باہر تک آئی۔

فروزاں کو انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کے جسم پر معمولی لباس تھا۔

”کیسی ہو بوا؟“ فروزاں مکان میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”میں ٹھیک ہوں بیگم صاب!“ جواب دینے کے بعد

www.pkdigest.com

وہ دروازہ بند کرنے لگی۔
فروزاں اس طرف توجہ دیے بغیر تیزی سے ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں خواب گاہ کا سادہ سا فرنیچر تھا۔ اس کمرے میں پچاس پچپن سال کی ایک عورت بستر پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ وہ فروزاں کی آہٹ سن کر چونکی۔

''کون؟'' اس نے پوچھا۔ ''بوا؟''

عورت کی ویران آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ بصارت سے عاری تھیں۔

فروزاں نے جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے عورت کا ایک ہاتھ بڑی محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

عورت کے چہرے پر رنج والم کے تاثرات تھے۔ یکایک اس کے ہونٹوں پر پژمردہ سا تبسم ابھرا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔
''تم آگئیں فروزاں؟''

''کسی وجہ سے آج مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ آپ پریشان تو ہوئی ہوں گی؟''

''نہیں۔'' عورت نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''صابرہ نام ہے نا میرا! اس نام کے اثرات ہیں مجھ میں، صبر کرنا فطرت بن چکی ہے۔''

فروزاں کے چہرے پر دکھ کا تاثر ابھرا۔
''صرف صابرہ نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''صابرہ بیگم!''
''بیگم!'' اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔

''بے شک!'' فروزاں نے کہا اور قریب ہی موجود وہیل چیئر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آج شاید آپ بستر سے اٹھی ہی نہیں ہیں۔ میں وہیل چیئر پر بہت ہلکی سی گرد دیکھ رہی ہوں۔''

''ہاں، آج بستر سے اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ بوا نے تو بہت کہا تھا۔'' صابرہ بیگم نے جواب دیا۔

''یہ تو غلط بات ہے۔ ہر وقت بستر پر لیٹے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔'' فروزاں نے جواب دیا، اور پھر بوا کو پکارا۔

بوا شاید دروازے پر ہی تھی۔ وہ فوراً اندر آگئی۔

''وہیل چیئر صاف کر دو بوا۔'' فروزاں نے اس سے کہا۔
صابرہ بیگم کے چہرے پر رنج والم کی کیفیت برقرار رہی۔
بوا نے ایک کپڑے سے وہیل چیئر کی گرد صاف کر دی۔ فروزاں نے سہارا دے کر صابرہ بیگم کو وہیل چیئر پر بٹھایا۔ صابرہ بیگم کی دونوں ٹانگیں بہ ظاہر ٹھیک تھیں مگر ان میں جان یقیناً نہیں ہوگی ورنہ اسے وہیل چیئر پر بیٹھنے کے لیے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بوا، فروزاں کے اشارے پر کمرے سے چلی گئی۔
فروزاں وہیل چیئر کو کمرے میں ادھر سے ادھر گھمانے لگی۔
صابرہ بیگم پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''تم اسے چہل قدمی سمجھتی ہو؟''

فروزاں نے جواب دیا۔ ''چہل قدمی نہ سہی، لیکن جسم کو حرکت تو ملتی ہے۔ چوبیس گھنٹے بستر پر رہنا ٹھیک بات نہیں...''

اسی وقت بوا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے فروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں پوچھنا بھول گئی تھی۔ کھانا کتنی دیر بعد نکالوں؟''

''بیس منٹ بعد۔'' فروزاں نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔
بوا واپس چلی گئی۔
فروزاں نے اپنے گھر پر کھانا اسی لیے کم کھایا تھا کہ بعد میں وہ صابرہ بیگم کے ساتھ بھی کھا سکے۔

☆☆☆

پُراسرار بوڑھے کا کوارٹر دیکھنے کے بعد واپسی پر احسن سیدھا اپنے گھر جانے کے بجائے اپنے دوست عامر کے گھر پہنچ گیا۔ عامر سے اس کے تعلقات اتنے پرانے تھے کہ انہیں دوستی بھی کہا جا سکتا تھا۔ احسن کو اس سے ملنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ وہ اس بوڑھے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ عامر کے لیے یہ سب کچھ بہت آسان ہوتا۔ وہ حکومت کے ایک خفیہ ادارے میں ایک اہم منصب پر فائز تھا۔

''اس وقت اچانک کیسے بھول پڑے؟'' عامر حیرت سے بولا۔ ''مجھے یاد نہیں کہ تم ایک دن پہلے فون کیے بغیر مجھ سے ملنے آئے ہو۔''

''وہ فون میں اس لیے کیا کرتا تھا کہ تمہاری سرکاری مصروفیت میں کوئی رخنہ نہ پڑے لیکن اس وقت تم سے ایک بہت ضروری کام آپڑا ہے۔''

''خیریت تو ہے؟ تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟''

''پریشان نہیں، بس الجھا ہوا بہت ہوں۔ مجھے ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔ وہ ایک مفلوک الحال بوڑھا ہے۔'' احسن نے جواب دینے کے بعد اس بوڑھے کا بتایا۔

عامر حیرت سے بولا۔ ''اس قسم کے آدمی کے بارے میں تمہیں کرید کیوں ہے؟''

''یہ میرا ایک بہت نجی معاملہ ہے عامر! میں تم سے درخواست کروں گا کہ اس بارے میں مجھ سے استفسار نہ کرو۔ بعد میں کبھی میں تمہیں شاید اس بارے میں سب کچھ بتا دوں۔''

''اچھا!'' عامر نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''یہ میرے لیے کوئی مشکل کام تو بہر حال نہیں ہے۔''

''یہی سوچ کر تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں، وہ تمہارے ذریعے بہت آسانی اور رازداری سے ہو سکتا ہے۔''

عامر اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے کسی سے بات کر کے اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کا نمبر اور پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او کا نام پوچھا تھا۔

جب عامر موبائل پر دوسرا نمبر ملانے لگا تو احسن بول پڑا۔ ''تم اب پولیس اسٹیشن فون کر رہے ہو گے، لیکن ضروری نہیں کہ ایس ایچ او مل ہی جائے۔''

''جو بھی وہاں ہوگا، اس سے ایس ایچ او کا موبائل نمبر مل جائے گا۔ اتفاق ہے کہ یہ ایس ایچ او مجھے جانتا بھی ہے۔'' عامر نے موبائل کان سے لگا لیا۔

احسن جلدی سے بولا۔ ''رازداری بہت ضروری ہے۔''
عامر نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا اور موبائل پر بات کرنے لگا۔ ''میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے۔ اچھا ہوا تم فوراً ہی مل گئے۔ میں عامر بول رہا ہوں۔''
عامر نے اپنے محکمے کا حوالہ بھی دیا، پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد ہنس کر بولا۔ ''نہیں! یہ تمہارے لیے قطعاً اعزاز کی بات نہیں کہ میں نے تمہیں فون کیا ہے۔ میں کوئی گورنر جنرل نہیں ہوں بھائی... دراصل ایک چھوٹا سا کام آپڑا ہے تم سے! میں نے اپنی غرض سے فون کیا ہے۔ تمہارے علاقے کے ایک کوارٹر میں ایک بوڑھا رہتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں لیکن یہ کام اس طرح ہونا چاہیے کہ اس بوڑھے کو کچھ معلوم نہ ہو سکے۔''

احسن نے اس طرح سر ہلایا جیسے عامر کی بات سے مطمئن ہوا ہو۔

عامر نے ایس ایچ او کو بوڑھے کے کوارٹر کا نمبر بتایا، پھر کہا۔ ''غالباً تم خود تو یہ کام کرو گے نہیں، کسی سب انسپکٹر کو سونپو گے۔ بس یہ خیال رہے کہ وہ تمہارے اعتماد کا آدمی ہو۔ وہ کسی کو بھی یہ نہ بتائے کہ تم نے اس سے کیا کام لیا ہے۔ یہ کام وہ اپنے ڈیوٹی آورز کے بعد اور سادہ لباس میں کرے۔''

عامر نے جو بھی گفتگو کی، احسن اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔
موبائل بند کرنے کے بعد عامر نے اس سے کہا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی ایک سب انسپکٹر کو اس کام پر مامور کر دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ کام ہونے سے پہلے ہی تمہارا شکریہ۔'' احسن نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مجھے فون پر بتا دو گے۔''

''ہاں۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''جیسے ہی مجھے ایس ایچ او سے جو کچھ بھی معلوم ہوگا، میں تم سے موبائل پر رابطہ کر کے بتا دوں گا۔''

''اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔''
''ارے میری جان! چائے تو پی لو۔ تم نے آتے ہی ایسی بات شروع کی کہ مجھے خیال ہی نہیں آسکا۔''
عامر کا اصرار اتنا زیادہ تھا کہ احسن کو رکنا ہی پڑا۔
چائے پینے کے دوران میں عامر نے اشاروں کنایوں میں جاننا چاہا کہ احسن کو ایک غریب بوڑھے کی ذات سے کیا دلچسپی ہوگئی لیکن احسن اب بھی اسے ٹال گیا۔ وہ اگر بتاتا تو اسے فروزاں کا ذکر بھی کرنا پڑتا جو وہ اس وقت تک نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک سارا معاملہ اس پر پوری طرح واضح نہ ہو جاتا۔

چائے پی کر وہ عامر کے گھر سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا ذہن بدستور الجھا رہا۔ اس مفلوک الحال بوڑھے کا فروزاں کی کار میں بیٹھنا اس کے لیے ایک غیر معمولی معما تھا۔ یہ بات ممکن نظر نہیں آرہی تھی کہ وہ بوڑھا زبردستی فروزاں کی کار میں بیٹھ گیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کار سے اس کے اترنے کے بعد فروزاں ضرور شور مچاتی۔ یہ ناممکن تھا کہ اس نے خوف زدگی کے باعث شور نہ مچایا ہو۔ احسن جانتا تھا فروزاں کے اعصاب بہت مضبوط تھے۔ وہ کسی بات سے بھی خوف زدہ نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر فروزاں اس بوڑھے کو رقم کیوں دے گی؟
دماغ میں چکراتے ہوئے ان سوالوں کے جواب میں احسن کو بلیک میلنگ کا خیال آیا، لیکن یہ اور زیادہ الجھن کی بات تھی۔ فروزاں آخر کس وجہ سے بلیک میل ہو سکتی تھی؟
اپنے گھر پہنچنے تک احسن کا دماغ انہی خیالات میں الجھتا رہا۔ اس نے اس معاملے کی چھان بین عامر کے ذریعے صرف اس خیال سے کروائی تھی کہ فروزاں اسے شاید کچھ نہ بتاتی۔ احسن نے فروزاں کے انداز و اطوار سے بھی اندازہ لگا

www.pkdigest.com

لیا تھا کہ وہ ان دنوں کسی خاص معاملے میں الجھی ہوئی تھی۔

گھر پہنچ کر احسن سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں اس نے رنگ آمیزی کے کھیل کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے ایزل پر چڑھے ہوئے کینوس پر اس بوڑھے کا خاکہ بنانا شروع کیا۔ بوڑھے کے نقش و نگار اس کے دماغ میں نقش تھے۔ خاکہ بنانے کے بعد اس نے رنگ آمیزی شروع کی۔

بوڑھے کی تصویر بنانے کا خیال اسے گھر میں داخل ہوتے ہی آیا تھا لیکن اس کے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اس تصویر سے کیا فائدہ اٹھا سکے گا۔

تین گھنٹے مسلسل کام کر کے اس نے تصویر مکمل کر لی۔ اس کا مقصد کوئی شاہکار تخلیق کرنا نہیں تھا۔ اسے بس ایک ایسی تصویر بنانا تھی جو اسی بوڑھے کی تصویر معلوم ہو۔

بوڑھے کے بارے میں خیالات اس کے دماغ میں مسلسل چکراتے رہے تھے۔ موبائل فون کی گھنٹی نے ان خیالات کا تسلسل توڑا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر عامر کا نام دیکھا تو اسے کچھ حیرت ہوئی۔

''ہاں عامر!'' اس نے موبائل سے کان لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خیال نہیں تھا کہ تم مجھے اتنی جلدی فون کرو گے۔''

''دراصل ایس ایچ او نے میری نظر میں سرخ رو ہونے کے لیے یقیناً کسی ایسے آدمی کو مامور کیا ہوگا جو نہایت تیز طرار اور سمجھ دار ہوگا۔ ایس ایچ او نے مجھے ابھی فون کیا تھا۔ اس نے جو مختصر معلومات حاصل کی ہیں، ان معلومات کے ایک پہلو نے مجھے بھی چونکا دیا ہے۔''

''یعنی؟''

''وہ بوڑھا ہمیشہ سے فلاکت کی زندگی نہیں گزار رہا ہے۔ بیس بائیس سال پہلے وہ ایک کمپنی میں خاصے مناسب منصب پر کام کر رہا تھا۔ تنخواہ بھی اتنی تھی کہ وہ ایک کار اور ایک بنگلے کا مالک تھا۔'' عامر نے اتنا بتانے کے بعد پوچھا۔ ''تم جس لڑکی سے شادی کرنے والے ہو، اس کا نام فروزاں ہے نا؟ میرا خیال ہے کہ تم نے مجھے یہی نام بتایا تھا۔''

عامر کی زبان پر فروزاں کا نام آتے ہی احسن کا دوران خون کچھ تیز ہو گیا۔ ''ہاں!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

عامر نے پھر پوچھا۔ ''اور فروزاں کے والد مشہور کاروباری شخصیت طارق زنجانی ہیں۔''

''ہاں ہاں۔'' احسن بے تابی سے پہلو بدل کر بولا۔ ''لیکن یہ ذکر تم کہاں سے لے آئے؟''

''میرا خیال تھا کہ تم نے کیونکہ اس بوڑھے کے بارے میں جاننا چاہا تھا اس لیے تمہیں اس بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا۔ خیر، مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ بوڑھا اپنے اچھے حالات کے زمانے میں طارق زنجانی ہی کی کمپنی میں ایک ذمے دارانہ عہدے پر فائز تھا۔''

احسن کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی اور عامر ہی کو بولنے دیا۔

''اس بوڑھے کا نام ایاز ہے۔'' عامر کہہ رہا تھا۔ ''اسے ملازمت سے کیوں برطرف کیا گیا، اس کا علم ابھی نہیں ہو سکا ہے۔ ایاز شراب و شباب کا رسیا تھا۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس کی دلچسپیوں کا محور کئی لڑکیاں یا عورتیں تھیں۔ ملازمت سے برطرفی کے بعد وہ حد سے زیادہ شراب پینے لگا۔ اسے حسیناؤں نے بھی خوب لوٹا۔ اسے کسی طرح جوئے کی لت بھی پڑ گئی۔ وہ ریس بھی کھیلنے لگا۔ یہی عادات اس کی تباہی کا سبب بنیں... کار، بنگلا، بینک بیلنس سب کچھ ختم ہو گیا۔ پندرہ سال سے وہ غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔ شہر کے کئی علاقوں میں رہ چکا ہے۔ اب جس کوارٹر میں ہے، وہاں پانچ سال سے ہے۔''

عامر خاموش ہوا تو احسن بے تابی سے بولا۔ ''اور؟''

''اور کچھ نہیں۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''فی الحال اتنی ہی معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔''

''اس کی بیوی کہاں ہے؟ ابھی تم نے بتایا ہے نا کہ وہ شادی شدہ تھا؟''

''ہاں، یہ بتانا رہ گیا۔'' عامر بولا۔ ''شاید میرے ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ طلاق اس نے ملازمت چھوٹنے کے بعد دی تھی یا اس سے پہلے۔''

''بس؟'' عامر کے خاموش ہوتے ہی احسن بولا۔

''ہاں، فی الحال یہی معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ اگر تم ایاز کے اچھے دنوں کی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہو تو وہ شاید کل رات کو معلوم ہو سکے۔''

''کل رات کیوں؟''

''اس زمانے میں جاوید نامی ایک شخص طارق زنجانی کا خاص چپراسی تھا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ بھی بوڑھا ہو چکا ہو گا۔ وہ ایسی کوارٹروں میں سے ایک میں رہتا ہے جہاں ایک کوارٹر بوڑھے ایاز نے بھی کرائے پر لے رکھا ہے۔ جاوید ہی کی زبانی پاس پڑوس کے لوگوں کو ایاز کے بارے میں یہ سب باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ پاس پڑوس ہی کے لوگوں سے سب

انسپکٹر کو بھی ان باتوں کا علم ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ جاوید اس سے زیادہ بھی کچھ جانتا ہو جو اس نے کسی وجہ سے یا کسی وجہ کے بغیر ہی اس نے کچھ باتیں لوگوں کو نہ بتائی ہوں۔ اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے انتظار اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ایک بیٹی سے ملنے حیدرآباد گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کل رات کسی وقت متوقع ہے۔''

احسن سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ موبائل اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور دوسری طرف عامر اس کے بولنے کا انتظار کر رہا ہوگا۔

''ہیلو!'' عامر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''کیا کچھ سوچنے لگے؟''

''ہاں۔'' احسن نے ایک طویل سانس لی۔

عامر نے پوچھا۔ ''کیا بوڑھے ایاز کے معاملے میں تمہاری محبوبہ فروزاں بھی کہیں ملوث ہے؟''

''ہاں عامر! ایسی کچھ بات ہے تو سہی لیکن ابھی تم مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہ کرو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

''کیا بچکانا بات کی ہے تم نے۔'' عامر نے کچھ خفا ہو جانے کے سے انداز میں کہا۔ ''ہمارے تعلقات ایسے تو نہیں ہیں کہ شکر گزار ہونے جیسی رسمیات کا خیال رکھا جائے۔''

احسن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''دبس کچھ سوچنے لگا تھا اس لیے بے خیالی میں یہ الفاظ منہ سے نکل گئے۔''

عامر بولا۔ ''میری زندگی کے کچھ اصول ہیں۔ اگر میرے فرائض منصبی کا معاملہ نہ ہو تو میں اپنے قریب ترین عزیز کی، بلکہ کسی کی بھی نجی زندگی میں دخل اندازی کو اچھا نہیں سمجھتا۔''

احسن آہستہ سے ہنسا۔ ''تم بہت اچھے انسان ہو عامر۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا جس سے احسن نے یہ قطعاً نہیں سمجھا کہ اس کے آخری فقرے پر عامر ناراض ہو گیا ہوگا۔

اپنا موبائل بند کرنے کے بعد عامر سنجیدگی سے ان معلومات پر غور کرنے لگا جو اسے عامر سے حاصل ہوئی تھیں۔ ان معلومات میں یہ بات اہم نظر آئی تھی کہ بیس پچیس سال پہلے بوڑھے ایاز کے مالی حالات اچھے تھے اور وہ اس وقت طارق زنجانی کے دفتر میں ملازم تھا۔

بوڑھے ایاز کی ملازمت کیوں ختم ہوئی؟

اس نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی؟

احسن ان سوالوں کے جواب بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ جواب غالباً طارق زنجانی کے خاص چپراسی جاوید سے حاصل ہو سکتے تھے جس کے لیے اگلی رات تک انتظار کرنا ایک مجبوری تھی۔

احسن کو یہ سوال زیادہ اہم معلوم ہو رہا تھا کہ بوڑھے ایاز کی ملازمت کیوں ختم ہوئی؟ احسن کے لیے اس کی اہمیت یوں زیادہ تھی کہ طارق زنجانی کے دفتر سے الگ کیے جانے والے کا کچھ تعلق فروزاں سے تھا، یا اب بن گیا تھا۔

احسن یہ سب کچھ جاننے کے لیے اتنا بے چین ہو گیا تھا کہ اس نے خود جا کر بوڑھے ایاز سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے خیال میں شراب کے نشے میں دھت شخص کے منہ سے کچھ اگلوانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بس اتنا سوچنا ضروری تھا کہ اس سے کس حیثیت میں ملاقات کی جائے۔

احسن نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت بہت زیادہ گزر چکا تھا۔ بوڑھے ایاز کے گھر پہنچنے میں بھی کچھ وقت لگتا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس وقت تک نشے میں دھت ہو کر سو چکا ہو۔

کل صبح ملا جائے اس سے! احسن نے فیصلہ کیا اور اس کے بعد پھر سوچنے لگا کہ بوڑھے ایاز سے وہ کس حیثیت میں ملے اور پوچھ گچھ کرنے کا اس کے پاس کیا جواز ہے؟

ایک فیصلے تک پہنچنے میں احسن کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ فوراً اٹھا۔ اپنا کیمرا لے کر وہ اپنے اسٹوڈیو میں پہنچا۔ اس نے بوڑھے کی جو تصویر بنائی تھی، اس کے دو فوٹو لیے، اور پھر اپنے ڈارک روم میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دونوں فوٹو ڈیولپ کیے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے پھر سوچنا شروع کر دیا کہ بوڑھے ایاز سے پوچھ گچھ اس پر کوئی اہم راز افشا کر سکے گی۔

پوچھ گچھ کے لیے احسن نے جو طریقہ سوچا تھا، وہ غیر قانونی تھا لیکن اسے عامر کی وجہ سے تقویت حاصل تھی۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو عامر سارا معاملہ سنبھال لیتا۔ ویسے احسن کو امید تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

سوچتے سوچتے احسن کو کسی وقت نیند آ گئی۔ اس نے الارم لگا دیا تھا اس لیے بہت صبح اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ناشتا بڑی عجلت میں کیا اور پھر تیاری میں بھی جلدی کی۔ لباس کے انتخاب میں اس نے خیال رکھا کہ وہ بہت قیمتی نہ ہو۔ جوتا بھی اس نے ایسا پہنا جو بہت عرصے سے استعمال کرنا چھوڑ چکا تھا۔ اپنی انگلیوں سے اس نے انگشتریاں بھی اتار دی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی وضع قطع سے امیر آدمی نہ معلوم ہو۔ اس

www.pkdigest.com

طرح جب وہ گھر سے نکلا تو ملازمین نے اسے تعجب سے دیکھا۔ غالباً انہوں نے احسن کو اس حالت میں گھر سے باہر جاتے نہیں دیکھا تھا کہ اس کے گلے میں ٹائی بھی نہیں تھی۔

احسن نے اپنی کار بھی نہیں لی کیونکہ وہ بہت قیمتی تھی۔ سڑک پر آتے ہی اس نے ٹیکسی کی۔ دس منٹ میں ہی وہ ''فاروق موٹرز'' کے دفتر پہنچ گیا جس کا مالک اس کا ایک جاننے والا تھا۔ وہاں سے اس نے کرائے پر ایک ایسی کار لی جو بہت معمولی قسم کی تھی۔

فاروق موٹرز کے مالک کو اس پر حیرت ہوئی اور اس نے اپنی حیرت کا اظہار بھی کیا۔

جواب میں احسن نے ہنس کر کہا۔ ''کبھی کبھی زندگی کے اس پہلو کو بھی انجوائے کرنا چاہیے۔''

اس نے باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا اور عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ اسی علاقے کی طرف تھا جہاں بوڑھے ایاز کا کوارٹر تھا۔

ساڑھے نو بجے اس نے کار بوڑھے ایاز کے کوارٹر کے سامنے روکی۔ اس نے بہت عجلت کی تھی، پھر بھی یہاں تک پہنچتے پہنچتے ساڑھے نو بج گئے تھے۔ اس کے باوجود اس کا خیال تھا کہ بوڑھا ایاز ابھی کہیں گیا نہیں ہوگا۔ رات کو زیادہ پی جانے والے دوسرے دن جلدی نہیں اٹھتے۔

لیکن اس وقت احسن کو بڑی مایوسی ہوئی جب اس نے بوڑھے ایاز کے کوارٹر کے دروازے میں قفل پڑا ہوا دیکھا۔

اپنی کار کی طرف لوٹتے وقت اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک کھمبے سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ احسن ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔ نوجوان نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو کچھ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی بھی آ گئی۔

''کیوں بھئی!'' احسن نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ''یہ ایاز صاحب کیا اپنے گھر سے اتنی جلدی جاتے ہیں؟''

''ایاز صاحب!'' نوجوان کچھ طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ہنس پڑا۔

''کیوں؟'' احسن سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں نے تم سے ایک بات پوچھی اور تم جواب دینے کے بجائے ہنس رہے ہو؟''

''مسٹر!'' نوجوان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''اس شرابی جواری بوڑھے کو ایاز صاحب کہنے والے آپ پہلے آدمی ہو۔ پہلے کبھی آپ جیسا شریف آدمی اس سے ملنے نہیں آیا۔ آیا ہو تو ہم نے نہیں دیکھا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' احسن نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ ''لیکن کیا تم میرے سوال کا جواب نہیں دے سکتے؟''

''جواب بھی لے لو مسٹر!'' نوجوان نے کہا۔ ''اس کا کچھ بھروسا نہیں کہ وہ کب اپنے گھر میں ہو گا۔ جب وہ خوب شراب پی لیتا ہے تو آدھی رات کے بعد یہاں سے چلا جاتا ہے۔''

''کہاں چلا جاتا ہے؟''

''کسی جوے کے اڈے پر... لوگ یہی کہتے ہیں؟''

''کہاں ہے جوے کا اڈا؟''

''یہ مجھے کیا معلوم مسٹر!'' نوجوان نے منہ بنایا۔ ''میں اس کے پیچھے تو نہیں لگا رہتا۔''

''معلوم ہوتا ہے، یہاں رہنے والے اس کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے۔'' احسن نے نوجوان کو مزید کریدنے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

نوجوان کا منہ بنا رہا۔ ''شرابی، جواری کس کو اچھے لگتے ہیں مسٹر؟''

''تو یہاں کے لوگ اسے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے؟''

''نکلوا ہی دیتے اگر وہ یہاں کوئی پھڈا کرتا۔ وہ تو کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔'' نوجوان نے کہا اور پھر یکایک احسن کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اس بڈھے کو تو نہیں جانتے ہو مسٹر! اس سے ملنے کیوں آ گئے؟ کیا لگتا ہے وہ آپ کا؟''

''کچھ خاص نہیں لگتا، لیکن ایک زمانے میں اس کے حالات ایسے نہیں تھے۔ اس وقت اس کا گھر میرے گھر کے قریب تھا۔ میری عمر اس وقت دس بارہ سال تھی۔ میں پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ پھر بہت عرصے تک وہیں رہا۔ ابھی چند دن پہلے واپس آیا ہوں۔ کسی نے بتایا کہ ایاز صاحب تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ پھر کسی سے ان کا پتا بھی معلوم ہو گیا تو میں ان سے ملنے چلا آیا۔''

''آپ اس سے مل کر کیا کرو گے مسٹر؟'' نوجوان نے کہہ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''وہ آپ کو بھی جواری شرابی بنا دے گا۔''

احسن نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کی بیوی یہاں نہیں رہتی اس کے ساتھ؟''

''اس بدمعاش بڈھے نے اس بے چاری کو طلاق دے دی تھی۔ اپنے کو یہ جاوید خاں نے بتایا تھا۔ جاوید خاں بھی اسی محلے میں رہتا ہے۔''

احسن نے جاوید کا نام عامر سے بھی سنا تھا۔

''تم اسے بدمعاش کیوں کہہ رہے ہو؟'' احسن بولا۔

''ابھی تم ہی بتا چکے ہو کہ وہ یہاں کسی سے بات بھی نہیں کرتا۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے تو پھر وہ بدمعاش کیسے ہو گیا؟''

''بدمعاش تو وہ سالا ہے۔ جب اس کے حالات اچھے تھے، جب وہ چھوکریوں کے چکروں میں پڑا رہتا تھا۔ سالے نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور اپنی بچی تک کی پروا نہیں کی۔''

''بچی؟'' احسن کے منہ سے نکلا۔ ''بچی بھی تھی اس کی؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

نوجوان نے جواب دیا۔ ''جاوید خاں نے تو میرے کو یہی بتایا تھا۔''

اسی وقت ایک موٹر سائیکل قریب آ کر رکی۔ موٹر سائیکل سوار بھی نوجوان ہی تھا۔ وہ احسن سے بات کرتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔

''چل بھئی فلوش! میرے کو دیر ہو گئی ذرا سی؟''

''ذرا سی؟ ابے میں آدھے گھنٹے سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اچھا اب چل نا! نکل جلدی سے۔'' موٹر سائیکل والے نے ایک گہری نظر احسن پر بھی ڈالی۔

''اچھا مسٹر!'' نوجوان نے ہنس کر احسن سے کہا۔ ''اپن کو تو اب جانا ہے۔ آپ انتظار کرو اس بڈھے کا، وہ آتا [illegible] ہے، پر کب آئے... بیٹھ کے باتیں۔''

نوجوان جلدی سے آگے بڑھ کر موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔

وہ احسن کے دماغ میں ہلچل مچا گیا تھا۔ اس سے یہ ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی۔ بوڑھا ایاز کسی بچی کا باپ بھی تھا۔

ایاز کی بیوی شاید مر گئی ہو لیکن بچی کو تو زندہ ہونا چاہیے۔ وہ نہ جانے کہاں ہو گی؟

ایاز کے دماغ میں ایک ایسا شبہ ابھرا کہ اس کا سارا جسم کھنچا گیا۔

''نہیں۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹکا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے! وہ تو...'' اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور ذہنی انتشار کے عالم میں اپنی کار کی طرف بڑھا۔

اگر وہ موٹر سائیکل والا نہ ٹپک پڑتا تو شاید کچھ اور معلومات حاصل ہو جاتیں، احسن نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سوچا، پھر اس نے موبائل فون پر عامر سے رابطہ کیا۔

''خیریت؟'' دوسری طرف سے عامر نے پوچھا۔

''تم نے اس بوڑھے کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا تھا لیکن یہ بتانا شاید بھول گئے تھے کہ ایاز نے جب اپنی بیوی کو طلاق دی تھی تو اس کی ایک بچی بھی تھی۔''

''میں کوئی بات بتانا نہیں بھولا تھا۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''اگر بچی والی بات درست ہے تو ایس ایچ او کو بھی اس کا علم نہیں ہوا ہو گا ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتا۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''آج میں خود اس بوڑھے کے محلے میں گیا تھا۔ وہاں ایک نوجوان سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اسے بھی یہ بات اسی شخص سے معلوم ہوئی تھی جس کا نام تم جاوید بتا چکے ہو۔''

''ہو سکتا ہے جاوید نے یہ بات اسی نوجوان کو یا کچھ اور دو چار افراد کو بتائی ہو۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''ایس ایچ او نے جس آدمی کو چھان بین کے لیے بھیجا تھا، اس نے جن لوگوں سے معلومات حاصل کی ہوں گی، انہیں بچی کے بارے میں علم نہیں ہو گا۔ جاوید کی یہ بات پڑوس کے سب لوگوں کو معلوم نہیں ہو گی۔'' جواب دینے کے بعد عامر نے کہا۔ ''اس وقت تم نے میری الجھن اور بڑھا دی ہے۔''

''کیسے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس بوڑھے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

احسن نے ایک طویل سانس لی۔ ''یقیناً تمہیں الجھن ہو رہی ہو گی لیکن میرے دوست، بات کچھ ایسی ہے کہ میں ابھی اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا۔''

''میں نے اصرار بھی نہیں کیا کہ تم بتاؤ۔ بس اپنی الجھن کا اظہار کیا تھا۔''

''ممکن ہے کہ ایک آدھ دن میں معاملہ کچھ واضح ہو جائے۔ پھر شاید میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔''

''اس وقت کہاں ہو؟''

''گاڑی میں ہوں، گھر جا رہا ہوں۔''

''اپنا خیال رکھنا۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

احسن نے اپنا موبائل جیب میں ڈال لیا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو ملازمین نے اس معمولی سی کار کو بھی تعجب سے دیکھا جو احسن نے کرائے پر لی تھی۔

احسن نے وہ کار ابھی واپس نہیں کی تھی کہ وہ ایک بار پھر بوڑھے ایاز سے ملنے کے لیے اس کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد احسن نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

www.pkdigest.com

”اس وقت کیسے فون کرلیا؟“ فروزاں نے پوچھا۔
”یونہی! بس دل چاہا کہ تم سے ذرا دیر باتیں کی جائیں۔“
”میں بہت مصروف ہوں احسن! آج ڈیڈی لندن سے واپس آرہے ہیں۔ کل میری سالگرہ ہے۔ ڈیڈی کہہ کر گئے تھے کہ میں پارٹی کا اہتمام کرلوں لیکن مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ آج یاد آیا ہے۔ میں پارٹی کی تیاری کے سلسلے میں ملازمین کو ہدایات بھی دے رہی ہوں اور فون پر ہی لوگوں کو مدعو کررہی ہوں۔ تمہیں بھی کرتی لیکن تم نے خود ہی فون کر لیا۔ کل تم بھی آنا پارٹی میں۔“
”کس وقت؟“

فروزاں نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو نو بج کر دس منٹ پر پیدا ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت کیک کاٹتی ہوں۔ ساڑھے آٹھ بجے تک آجانا۔ آؤ گے نا؟“

”تم بلاؤ اور میں نہ آؤں؟“ احسن نے کہا۔ ”اچھا اب میں فون بند کرتا ہوں۔ تم اپنی مصروفیات جاری رکھو۔“
احسن نے رابطہ منقطع کردیا۔ قدرتی طور پر اس وقت اسے فروزاں کی سالگرہ کے علاوہ یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ اسے کیا تحفہ دے گا لیکن اس کا دماغ بوڑھے ایاز میں الجھا رہا جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک لڑکی کا باپ بھی تھا۔

احسن نے کھانا کھایا اور پھر کرائے کی کار میں گھر سے روانہ ہوگیا۔
یہ احسن کی دوسری کوشش تھی اور وہ بھی ناکام ہوئی۔ بوڑھے ایاز کا کوارٹر مقفل تھا۔
واپسی پر احسن زیادہ مایوس نہیں تھا۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ بوڑھے ایاز سے ضرور ملے گا۔ اس دوران میں وہ اس طریقہ کار پر بھی غور کرتا رہا جو اس نے بوڑھے ایاز سے ملنے کے لیے سوچا تھا۔ وہ خود کو ایک سرکاری ادارے کا فرد ظاہر کر کے ایاز سے پوچھ گچھ کرتا۔ اس نے ایاز کی جو تصویر بنائی تھی، اس کے فوٹو گراف اس کی جیب میں تھے جو وہ ایاز کو دکھاتا۔ اس حوالے سے اس نے ایک کہانی سوچی تھی، لیکن گھر واپس آتے ہوئے اس نے سوچتے سوچتے اپنے اس طریقہ کار کے بجائے ایک اور طریقہ سوچ لیا۔
دوسرے طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے کرائے کی معمولی کار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے وہ کار واپس کردی اور ٹیکسی کر کے گھر پہنچا۔
تیسری مرتبہ بوڑھے ایاز کے گھر جانے کے لیے وہ اس طرح تیار ہوا جیسے کسی بھی جگہ جانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔

تیار ہونے کے بعد اس نے وہ الماری کھولی جس میں اعلیٰ ترین شراب کی بوتلیں رکھی رہتی تھیں۔ اگرچہ وہ خود بہت کم اور کبھی کبھی پیتا تھا لیکن شراب کے دلدادہ دوستوں کے لیے چند بوتلیں ہر وقت رکھا کرتا تھا۔ اس نے اس میں سے ایک بوتل نکال کر پلاسٹک کی ایک تھیلی میں رکھی۔
اپنی قیمتی کار میں وہ بوڑھے ایاز کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت سات بجے تھے۔ اسے امید تھی کہ اس وقت بوڑھا اسے مل ہی جائے گا۔ اس نے اس علاقے کے جس نوجوان سے باتیں کی تھیں، اس نے یہی بتایا تھا کہ بوڑھا ایاز کسی نہ کسی وقت اپنے گھر ضرور آتا ہے۔
احسن کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بوڑھے کے کوارٹر کا دروازہ مقفل نہیں تھا۔
جب اس نے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی تو شراب کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی۔
پہلی دستک کا جواب نہ ملنے پر اس نے قدرے توقف سے دوسری دستک دی۔ اس مرتبہ جواب میں اندر سے ایک بلغم زدہ سی آواز آئی۔
”کون ہے؟“ لہجے میں حیرت تھی جس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ پہلے کسی نے وہ دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا ہوگا۔
احسن نے جواب دینے کے بجائے پھر دستک دی۔
اس مرتبہ اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کی طرف آرہی تھی۔ بوڑھا ایاز کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔
دروازہ کھلا۔ اب بوڑھا ایاز سامنے تھا۔ اس کے جسم پر میلی قمیص پتلون اور پیروں میں گھسے ہوئے سلیپر تھے۔ گریبان کے بٹن بھی کھلے ہوئے تھے۔ بال بکھرے بکھرے سے تھے۔ وہ حیرت سے احسن کی طرف دیکھنے لگا۔
”مجھے بختیاری کہتے ہیں۔“ احسن نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
احسن کے وزیٹنگ کارڈ پر اس کا پورا نام ”احسن بختیاری“ ہی ہوتا تھا۔
بوڑھے نے منہ بنایا۔ ”بختیاری کہتے ہوں، یا کچھ اور کہتے ہوں، مجھے اس سے کیا غرض؟“
”غرض یہ ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو میں ناپسند کرتا ہوں، اسے شاید آپ بھی ناپسند کرتے ہوں۔ اس شخص کا نام طارق زنجانی ہے۔“
بوڑھا ایاز چونک پڑا۔
احسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں، اگر آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں۔“

بوڑھے ایاز نے دو ایک لمحوں سے زیادہ نہیں سوچا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”آؤ!“ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ احسن کی اس وضع قطع سے بالکل مرعوب نہیں ہوا جس سے احسن کی امارت ظاہر ہو رہی تھی۔
احسن کے اندر داخل ہونے کے بعد بوڑھے ایاز نے دروازہ بند کرلیا۔
اس چھوٹے سے کمرے میں پڑے ہوئے چوبی صوفے خاصے سال خوردہ تھے۔ کشن بھی پچکے ہوئے اور میلے تھے۔ ان صوفوں کے درمیان ایک تپائی تھی جس میں شراب کا آدھا گلاس، شراب کی بوتل اور ایک پلیٹ میں کچھ چپس رکھے ہوئے تھے۔ پانی کا ایک جگ بھی تھا۔ شراب کی بوتل آدھی سے کچھ کم تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی احسن نے سمجھ لیا کہ آدھی بوتل بوڑھے ایاز نے گزشتہ روز ہی ختم کردی ہوگی اور اب گھر آکے دوبارہ پینے بیٹھا تھا۔ شاید اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔
احسن بڑی بے تکلفی سے ایک میلے صوفے پر بیٹھ گیا اور تھیلی سے شراب کی ایک بوتل نکالتا ہوا بولا۔ ”یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔ میری طرف سے دوستی کا پہلا تحفہ۔“
بوڑھے ایاز نے للچائی ہوئی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھا۔ وہ اس شراب سے کہیں گھٹیا تھی جو اس وقت بوڑھا ایاز پی رہا تھا۔
”دوستی!“ بوڑھا ایاز احسن کے سامنے بیٹھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”تم تو کوئی مال دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“
”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی بھی مشترک بات دوستی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ طارق زنجانی کو میں بھی ناپسند کرتا ہوں اور تم بھی۔“
”تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“
احسن نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”کیا دو گلاس اور ہوں گے؟“ وہ اپنی لائی ہوئی شراب کی بوتل کھولنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ہماری گفتگو کا آغاز جام ٹکرانے کے بعد ہو۔“
بوڑھا ایاز عجیب سے انداز میں ہنسا، پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ایک ہی گلاس تھا۔
”زیادہ گلاس کی مجھے ضرورت ہی نہیں پڑتی۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اور اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا۔“ اس نے میز سے شراب کا وہ گلاس اٹھایا جو وہ آدھا خالی کر چکا تھا۔ اگرچہ اس گلاس میں پانی ملی ہوئی شراب تھی لیکن بوڑھے ایاز نے وہ سب اپنی بوتل میں الٹ دی۔
”اب بناؤ۔“ اس نے خالی گلاس تپائی پر رکھتے ہوئے ایاز سے کہا۔
احسن نے دونوں گلاسوں میں ایک ایک پیگ کی مقدار انڈیلی۔
”میرا گلاس بھر دو۔“ بوڑھے ایاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”اوکے۔“ احسن نے اس کا گلاس بھرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ تو دل سے چاہتا تھا کہ ایاز کو جلد از جلد زیادہ سے زیادہ نشہ ہو جائے۔ اس صورت میں اس کی زبان زیادہ سے زیادہ کھلوانا آسان ہو جاتا ورنہ شاید وہ کسی مرحلے پر محتاط بھی ہو سکتا تھا۔
بوڑھے ایاز نے ندیدوں کی طرح گلاس اٹھایا اور ہلکی سی چسکی لینے کے بجائے ایک چھوٹا سا گھونٹ لے لیا۔ گھونٹ لینے کے بعد اسے ہلکا سا ٹھسکا لگا۔
”عمدہ ہے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں شراب کی تعریف کی، پھر غور سے احسن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”تم کیسے جانتے ہو کہ میں طارق زنجانی کو ناپسند کرتا ہوں؟“
”طارق زنجانی کی طرح میں بھی ایک بزنس مین ہوں۔“ احسن نے شراب کی ایک چسکی لے کر کہا۔ ”اس سے میری مسابقت چلتی رہتی ہے۔ کبھی میں اسے چوٹ دے دیتا ہوں، کبھی وہ مجھے چوٹ دے جاتا ہے، لیکن زیادہ تر وہی کامیاب رہتا ہے۔“
”بہت عیار ہے وہ۔“ بوڑھے ایاز کے لہجے سے شدید نفرت کا اظہار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرا گھونٹ بھی لیا۔
”ہاں۔“ احسن نے کہا۔ ”عیار تو وہ ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی کوئی خاص کمزوری معلوم ہو جائے تو میں اسے دبالوں۔ میرے سیکریٹری نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کی کمزوری کا علم کسی ایسے شخص سے ہو سکتا ہے جو پہلے کبھی اس کے قریب رہا ہو۔ اسی نے مجھے ایک شخص جاوید کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں طارق زنجانی کا خاص چپراسی تھا۔“
جاوید کے نام پر ایاز تھوڑا سا چونکا۔
”وہ تمہارے ہی محلے میں رہتا ہے۔“ احسن نے کہا۔
”ہاں۔“ بوڑھے ایاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”معلوم ہے مجھے۔“

www.pkdigest.com

''دراصل میرے سیکریٹری کا جاوید سے کوئی دور دراز کا رشتہ ہے۔ اسی نے مجھے جاوید سے ملایا تھا۔ جاوید مجھے طارق زنجانی کی کوئی کمزوری تو نہیں بتا سکا لیکن اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم طارق زنجانی کے دفتر میں کسی اچھے منصب پر فائز تھے اور بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلنے کے باوجود اس نے تمہیں فارغ کر دیا تھا۔''

اس وقت بوڑھے ایاز نے طارق زنجانی کو ایک گندی سی گالی دی۔ وہ اس وقت تک تین گھونٹ لے چکا تھا۔ گویا ایک پیگ سے کچھ زیادہ مقدار اس کے معدے میں جا چکی تھی اور اس سے پہلے بھی وہ ایک ڈیڑھ پیگ یقیناً پی چکا تھا۔ شراب میں شراب ملی تھی تو اس کا اثر بھی بڑھ گیا تھا۔

احسن چاہتا تھا کہ وہ اثر کچھ اور بڑھ جائے اس لیے وہ یہ کہہ کر اٹھا۔ ''میں سگریٹ کا پیکٹ کار میں ہی بھول آیا ہوں... ذرا وہ لے آؤں۔''

بوڑھے ایاز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یکا یک وہ سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آنے لگا۔ غالباً طارق زنجانی ہی کے حوالے سے کچھ یادیں اس کے دماغ میں چکرانے لگی تھیں۔

احسن نے سگریٹ کے بہانے اپنی کار میں کئی منٹ گزار دیے۔ شراب کی طرح سگریٹ بھی وہ کبھی کبھار ہی پیتا تھا لیکن ایک پیکٹ ہر وقت اس کی کار میں بھی پڑا رہتا تھا۔ اس نے کچھ وقت کار میں اس لیے گزارا کہ بوڑھا ایاز اس دوران میں شراب کے دو ایک گھونٹ اور لے لے۔

جب وہ کوارٹر میں واپس پہنچا تو بوڑھے ایاز کا گلاس آدھا ہو چکا تھا۔ غالباً طارق زنجانی کے تذکرے نے اسے اتنا جذباتی کیا تھا کہ اس نے جلدی جلدی کئی گھونٹ لے لیے تھے۔

''معاف کرنا ذرا دیر ہو گئی۔'' احسن نے اس سے کہا۔ ''سگریٹ کا پیکٹ مل ہی نہیں رہا تھا۔''

بوڑھے ایاز نے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا اور طارق زنجانی کو پھر ایک گندی سی گالی دینے کے بعد بولا۔ ''اس سے بڑا کمینہ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا۔''

احسن اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے بوڑھے ایاز پر شراب کا زیادہ سے زیادہ اثر ہو جائے۔

احسن کے سامنے ہی اس نے بغیر پانی کی شراب کا ایک بڑا گھونٹ لیا۔ اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ احسن نے اس وقت تک ایک گھونٹ سے زیادہ شراب نہیں پی تھی۔

''اس نے مجھ سے میری بیوی بھی چھین لی۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

''چھین لی؟'' احسن چونکا۔ ''جاوید نے تو بتایا تھا کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی؟''

''کیوں دی تھی؟'' بوڑھا ایاز ایسی غصیلی نظروں سے احسن کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ احسن ہی کو اس کا ذمے دار سمجھ رہا ہو۔

احسن سٹپٹا سا گیا۔

''کوئی سبب تھا اس کا۔'' بوڑھے ایاز نے دانت پیسے اور شراب کا ایک گھونٹ لیا۔ اب وہ نشے کی اس کیفیت میں تھا جہاں اسے خالص شراب کی تلخی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، اگر ہو رہی تھی تو اس کے چہرے پر اس کا تاثر نہیں آ پا رہا تھا۔

احسن نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ بوڑھے ایاز کی آنکھوں میں اب سرخی تیرنے لگی تھی۔ وہ یکا یک اپنا گلاس لے کر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے مشتعل انداز میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے جن باتوں کا اظہار کیا، وہ ایسی تھیں کہ احسن کو سکتہ سا ہو گیا۔

ایاز کی بیوی بہت خوب صورت تھی۔ سرزمین اودھ سے تعلق تھا اس کا! نام صابرہ بیگم تھا۔ ایاز سے شادی کرنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد وہ دنیا میں اس اعتبار سے تنہا رہ گئی کہ اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایک بچی کی ماں بن گئی تھی لیکن دیکھنے والے گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس ڈیڑھ سالہ بچی نے صابرہ بیگم کے بطن سے جنم لیا ہو گا۔ بائیس سال کی عمر میں بھی وہ سترہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ نظر آتی تھی۔

ایک شام ایاز اور صابرہ بیگم کسی شاپنگ سینٹر میں کچھ خریداری کر رہے تھے کہ وہاں طارق زنجانی سے آمنا سامنا ہو گیا۔

''اس شام وہ پہلی مرتبہ مجھ سے بڑی بے تکلفی سے ملا۔'' بوڑھا ایاز غصیلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''اس نے ظاہر کیا کہ وہ اپنی کمپنی میں کام کرنے والوں کو قطعاً کم تر درجے کی مخلوق نہیں سمجھتا۔ اس نے مجھے خوش قسمت کہا کہ میں صابرہ جیسی خوب صورت بیوی کا شوہر ہوں۔ اس کی یہ بات مجھے اس لیے بری نہیں لگی کہ ماڈرن طبقے میں اس قسم کی باتیں عام طور پر کہی جانے لگی تھیں۔ اس نے میری بچی فروزاں کو بھی صابرہ کی گود سے لے کر پیار کیا۔''

فروزاں کا نام آنے پر احسن کو شدید ذہنی جھٹکا لگا اور اس کے اعصاب جھنجنانے لگے۔

ایاز نے خوش ہو کر خود بھی اپنی بیوی کی بہت تعریف کی تھی اور طارق زنجانی کو بتایا کہ صابرہ صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نہایت سمجھ دار اور باذوق تھی۔ ادب کا مطالعہ کرنا اس کی ہابی تھی اور کلاسیکل موسیقی کی بھی سمجھ بوجھ رکھتی تھی مگر اس کے باوجود گھریلو کام بھی اس کی مرکز نگاہ رہتے تھے۔ اسے سینا پرونا، کھانا پکانا سب کچھ آتا تھا۔ وہ نئی سے نئی طرز کے کھانے بھی بہت اچھے پکاتی تھی۔

ایاز کی ان باتوں پر طارق زنجانی نے بڑی بے تکلفی سے کہا تھا کہ ایسی بات ہے تو ایاز کے گھر میں دعوت کھانا اس کی شدید خواہش ہو گی۔

بہ قول ایاز کہ اسے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ طارق زنجانی کے دل میں کھوٹ آ گیا تھا۔ خوب صورت صابرہ بیگم اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ وہ صرف اسی لیے ایاز پر مہربان ہوا تھا لیکن ایاز نے اسے دوسری ہی شام کھانے پر اپنے گھر مدعو کر لیا۔

طارق زنجانی دعوت میں آیا تو اس نے چلتے وقت صابرہ بیگم کو ایک قیمتی نیکلس، ایاز کو ایک سوٹ پیس تحفے میں دیا تھا۔ فروزاں کے لیے بھی اس نے کوئی چیز دی تھی جو اب ایاز کو یاد نہیں رہی تھی۔

کھانے کے دوران میں طارق زنجانی نے بتایا کہ تھوڑے ہی فاصلے پر اس کے کسی عزیز کا گھر ہے جہاں اس کا آنا جانا رہتا ہے اس لیے جب بھی وہ وہاں آیا کرے گا، ایاز کے گھر کا چکر بھی لگا لیا کرے گا۔

ایاز نے اس وقت بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے صابرہ بیگم کو ہدایت کی تھی کہ اگر اس کی عدم موجودگی میں بھی طارق زنجانی آئے تو وہ اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔

کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایاز کی عدم موجودگی میں بھی طارق زنجانی کئی مرتبہ اس کے گھر آیا۔

ایک مرتبہ ایاز اچانک گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں طارق زنجانی اور صابرہ بیگم قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ صابرہ بیگم کا ایک ہاتھ طارق زنجانی کے ہاتھ میں تھا۔ ایاز کو دیکھتے ہی صابرہ بیگم نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

ایاز کے بہ قول وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ طارق زنجانی اور اس کی بیوی کے معاملات اس حد تک بڑھ جائیں گے۔ وہ طارق زنجانی کے سامنے تو اپنا غصہ ضبط کر گیا لیکن اس کے جانے کے بعد وہ اپنی بیوی پر بگڑ گیا۔ صابرہ بیگم نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی لیکن ایاز نے اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کر دیے۔ اس نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ اسے طلاق دے دے گا۔

''شراب تو خیر میں اس وقت بھی پیتا تھا۔'' بوڑھے ایاز کے الفاظ احسن کی سماعت سے ٹکراتے رہے۔ ''مگر اس دن میں نے بہت زیادہ پی اور رات ہی کو گھر سے نکل کر ایک طوائف کے گھر چلا گیا۔ میں اس پر بالکل شرمندہ نہیں ہوں۔ میری بیوی اور طوائف میں کوئی فرق ہی نہیں رہا تھا۔''

احسن کی رائے بوڑھے ایاز کے خیال سے مختلف تھی لیکن اس نے کچھ کہنے کے بجائے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

ایاز نے بتایا کہ اس نے نشے میں طوائف کو بھی اپنی بیوی کے بارے میں بتا دیا۔ طوائف نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ اس قسم کی نام نہاد شریف عورتوں کو تو طلاق دے دینا ہی چاہیے۔

ایاز کا خیال تھا کہ طارق زنجانی نے قیمتی تحائف دے دے کر اس کی بیوی کو موہ لیا تھا۔

ایاز کی وہ رات طوائف ہی کے ساتھ گزری۔ وہ صبح کے قریب سو سکا تھا اس لیے جاگا بھی بہت دیر سے۔ ایاز کے بیان کے مطابق اس وقت ڈیڑھ دو بج چکے تھے۔ طوائف نے اسے بڑے اہتمام سے ناشتا کرایا اور بتایا کہ اس نے ایک شناسا وکیل کو فون کر دیا ہے تاکہ طلاق کے کاغذات تیار کیے جا سکیں۔ اس وقت ایاز نشے میں نہیں تھا۔ اپنے بیان کے مطابق وہ سوچنے لگا کہ طلاق دینے میں اتنی عجلت نہ کرے لیکن طوائف نے اسے شراب پلانا شروع کر دی۔ شراب کی گرمی اور طوائف کی باتوں نے ایاز کا دماغ الٹ دیا اور وہ پھر اپنے فیصلے پر قائم ہو گیا کہ صابرہ بیگم کو طلاق دے دے گا۔

وکیل پانچ چھ بجے کے قریب آیا۔ اس نے طلاق کے کاغذات تیار کیے۔ ایاز نے مہر کی رقم کا چیک کاٹ دیا۔ اس کی چیک بک بریف کیس میں رہتی تھی۔ بریف کیس اس کی کار میں تھا اور کار اس طوائف کے بنگلے کے احاطے میں کھڑی تھی۔

طلاق کے کاغذات لے کر اپنے گھر روانہ ہونے سے پہلے ایاز کے دل میں جانے کیا آئی کہ اس نے فون پر اپنی بیوی سے بات کی اور طنزاً کہا کہ اگر وہ اس وقت اپنے عاشق کے ساتھ ہو تو اسے رخصت کر دے کیونکہ وہ طلاق کے کاغذات لے کر گھر پہنچ رہا ہے۔

پھر وہ اپنی کار میں روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو صابرہ بیگم اس کے قدموں میں گر کر رونے لگی۔

''عیار، بدمعاش عورت۔'' بوڑھے ایاز نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ ''وہ رو کر اپنی معصومیت ثابت کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے طلاق کے کاغذات اس کے منہ پر مار دیے اور اسے اسی وقت اپنے گھر سے نکال دیا۔''

www.pkdigest.com

بوڑھے ایاز کی زبان میں اب ہلکی سی لکنت اور قدموں میں ڈگمگاہٹ آ گئی تھی۔ وہ صوفے پر آ بیٹھا۔ گلاس اس نے پٹخنے کے سے انداز میں تپائی پر رکھا۔ اس میں اب تھوڑی سی شراب باقی رہ گئی تھی۔ بوڑھے کی آنکھیں اب خاصی سرخ ہو چکی تھیں۔

احسن کے دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس نے بے اختیار پوچھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تمہاری ایک بچی بھی تھی؟''

''اسے بھی صابرہ لے گئی تھی۔'' بوڑھے ایاز نے جواب دیا۔ ''میں اسے کیسے سنبھال سکتا تھا۔ وہ اس وقت پورے دو سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔''

''پھر... پھر؟'' احسن کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''تمہاری بیوی گھر سے نکل کر کہاں گئی؟''

''اسی، اپنے عاشق کے پاس۔'' بوڑھے ایاز نے جواب دے کر گلاس کی باقی ماندہ شراب بھی اپنے حلق میں انڈیل لی، پھر بولا۔ ''مجھے فوراً تو اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ طارق زنجانی نے بہت خاموشی کے ساتھ اس سے نکاح کر لیا تھا۔''

''خاموشی کے ساتھ؟ کیا مطلب؟''

بوڑھے ایاز نے تلخی سے کہا۔ ''وہ دھوم دھام سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ سادگی سے نکاح کے باوجود کچھ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ اگر دھوم دھام کرتا تو بہت سے لوگ اس پر تھو تھو کرتے کہ وہ اپنی کمپنی میں کام کرنے والے ایک شخص کی بیوی کو لے اڑا تھا۔''

احسن نے پوچھا۔ ''تمہیں اپنی بچی کا خیال نہیں آیا؟''

''اولاد کا خیال کس باپ کو نہیں ہوگا؟'' ایاز نے احسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے صابرہ سے چھین بھی لیتا تو اس کی پرورش کیسے کرتا؟ اور قانوناً بھی میں بچی کو اس وقت تک نہیں لے سکتا تھا جب تک وہ بڑی نہیں ہو جاتی۔''

''کچھ سالوں بعد وہ بڑی تو ہو ہی گئی ہوگی؟'' احسن بہت زیادہ متجسس تھا۔ ''اب وہ کہاں ہے؟''

بوڑھے ایاز نے جواب دینے کے بجائے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ بوتل سے اس طرح ٹکرایا کہ وہ گرنے لگی۔ احسن نے اسے سنبھالا۔

''اب زیادہ نہ پیو دوست!'' وہ بولا۔ ''یہ میں واپس نہیں لے جاؤں گا، تمہارے لیے ہی لایا ہوں۔ اب کل پی لینا۔ کافی پی لی ہے تم نے! اس گلاس میں چار پیگ سے زیادہ ہی شراب آتی ہوگی، اور تم اس سے پہلے بھی پی رہے تھے۔''

بوڑھے ایاز نے احسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ بوتل میرے لیے ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟'' اسے خاصی چڑھ گئی تھی ورنہ وہ اس انداز میں بات نہیں کرتا۔

احسن کو ابھی کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا تھیں۔ اس نے بوڑھے ایاز کا موڈ خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اچھا! دیتا ہوں۔'' احسن نے بوتل کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھ سے باتیں تو کرتے رہو۔''

''کر تو رہا ہوں۔ اب کیا سر کے بل کھڑا ہو کے کروں؟''

''تم نے بچی کے بڑا ہونے کے بعد کیا کیا؟'' احسن نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

بوڑھے ایاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''صبر! اس کے بعد صبر کرنا پڑا تھا مجھے۔''

''کیا مطلب؟''

بوڑھے ایاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد میرے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ فروزاں بڑی ہو گئی تھی لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اسے طارق زنجانی ہی کے پاس رہنے دوں۔ وہ بڑے ناز و نعم میں پرورش پا رہی تھی۔ میں اس کی پرورش اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ طارق زنجانی کو فروزاں سے اتنی محبت کیوں ہو گئی تھی کہ اس نے صابرہ سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود فروزاں کو اپنے ساتھ رکھا۔''

احسن چونکا۔ ''اس نے تمہاری بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی؟''

''بہت بے وقوف آدمی معلوم ہوتے ہو تم!'' بوڑھے ایاز نے غصیلے انداز میں کہا۔ ''وہ اس وقت میری نہیں، اس کی بیوی تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' احسن نے جلدی سے کہا۔ ''تم تو اسے طلاق دے چکے تھے۔ یہ بتاؤ کہ علیحدگی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا طارق زنجانی نے بھی اسے طلاق دے دی تھی؟''

بوڑھے ایاز نے جواب دینے سے پہلے گلاس اٹھایا اور پھر منہ بنا کر بولا۔ ''یہ تو آدھا ہی ہے! پورا کیوں نہیں بھرا؟''

''کیا فرق پڑتا ہے؟'' احسن جلدی سے بولا۔ ''یہ ختم کر لو، پھر اور لے لینا۔''

''ہوں۔'' بوڑھے ایاز نے سر ہلایا اور پھر ایک گھونٹ لیا۔

''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے؟'' احسن نے اسے ٹوکا۔

''کس بات کا جواب نہیں دیا؟'' بوڑھا ایاز اسے گھورنے لگا۔

''علیحدگی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ طارق زنجانی نے اسے طلاق دے دی تھی؟''

''نہیں۔'' بوڑھے ایاز نے جواب دیا۔ ''طارق زنجانی تو اسے طلاق ہی دینا چاہتا تھا لیکن صابرہ اس سے طلاق نہیں لینا چاہتی تھی۔''

''طارق زنجانی طلاق کیوں دینا چاہتا تھا؟''

''بہت عیاش آدمی ہے وہ۔'' بوڑھے ایاز نے بڑی نفرت سے کہا۔ ''ایک اپاہج عورت کے ساتھ کیسے وقت گزارتا۔''

احسن چونکا۔

بوڑھے ایاز نے بات مکمل کی۔ ''اپاہج ہی نہیں۔ وہ نابینا بھی ہو گئی تھی۔''

''کیسے؟'' احسن بہت مضطرب ہو گیا۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا کار کا۔'' ایاز نے گلاس ہاتھ میں لیے لیے جواب دیا۔ ''شیشے کی کرچیاں آنکھوں میں گھس گئی تھیں۔ آپریشن سے وہ کرچیاں تو نکال دی گئیں لیکن بصارت زائل ہو گئی۔ دونوں ٹانگوں میں بھی کوئی ایسی خرابی ہو گئی کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی... اور وہیل چیئر اس کا مقدر بن گئے۔ اس کے بعد طارق زنجانی اسے کیسے برداشت کر سکتا تھا۔'' بوڑھے ایاز کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا اور وہ ایک گھونٹ لے کر بولا۔ ''طارق زنجانی ایک بے حد عیاش شخص ہے۔ پیسے کے زور پر اس نے کم عمر لڑکیوں کو بھی برباد کیا ہے۔ بہت سی عورتوں سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ صابرہ کے اپاہج ہونے کے بعد اس نے رات کے وقت عورتوں کو گھر لانا شروع کر دیا تھا۔ صابرہ یہ برداشت نہیں کر سکی۔ بات بڑھی تو طارق زنجانی اسے طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔ صابرہ طلاق نہیں، صرف علیحدگی چاہتی تھی۔ طارق زنجانی بڑا کمینہ ہے۔ اس نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس نے صابرہ کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ طلاق نہیں چاہتی تو وہ اس کے لیے الگ .... گھر کا بندوبست تو کر دے گا لیکن فروزاں کو اپنے ہی پاس رکھے گا۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ فروزاں سے بہت محبت کرنے لگا تھا اور کبھی خیال آتا ہے کہ فروزاں کو اس نے اپنے ساتھ صرف اس لیے رکھا کہ لوگ اسے صرف اس بنیاد پر کوئی دوش نہ دیں کہ بیٹی نے باپ کا ساتھ اسی لیے دیا ہوگا کہ ماں اچھی نہیں ہوگی۔'' بوڑھا ایاز کچھ رک رک کر لیکن مسلسل بولتا رہا۔ ''صابرہ نے بھی اس کی یہ شرط صرف اسی لیے منظور کی ہوگی کہ فروزاں کی زندگی اچھی گزر سکے، یا شاید اس نے طلاق سے بچنے کے لیے بیٹی کی جدائی گوارا کی ہو۔''

''صابرہ بیگم زندہ ہیں؟'' احسن نے اس وقت پوچھا جب ایاز شراب کا ایک گھونٹ لے رہا تھا۔

''ہاں۔'' بوڑھے ایاز نے آستین سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کم بخت شخص نے اسے ایک معمولی سا مکان دلایا ہے اور اخراجات کے لیے بھی بس اتنے ہی پیسے بھجواتا ہے کہ ایک ملازمہ کے ساتھ اس کا بس گزر بسر ہو جائے۔''

خاموش ہو کر ایاز نے آنکھیں بند کرتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ گلاس اس نے تپائی پر رکھ دیا تھا جس میں شراب ابھی باقی تھی۔

''صابرہ بیگم کہاں رہتی ہیں؟'' احسن سب کچھ جان لینے کے لیے بے قرار تھا۔ ''تم بعد میں ان سے ملے تھے؟''

بوڑھے ایاز نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے پپوٹے اب بہت بوجھل نظر آ رہے تھے۔ اس پر زیادہ شراب نے ایکا ایک گہرا اثر کیا تھا، یا پھر وہ اب تک خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اب اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

''کیا؟ کیا پوچھا تم نے؟'' سوال کرتے ہوئے بوڑھے ایاز کی پلکیں جھکنے لگی تھیں۔

احسن نے اپنا سوال کچھ اضافے کے ساتھ دہرایا۔ ''کیا تم بعد میں صابرہ بیگم یا اپنی بیٹی فروزاں سے ملتے رہے ہو؟''

بوڑھے ایاز نے اپنے سر کو عجیب سے انداز میں جنبش دی۔ احسن اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ منفی جنبش تھی یا اثباتی۔ لیکن اتنا اندازہ احسن کو تھا کہ بوڑھا ایاز فروزاں سے تو یقیناً ملتا رہا ہے۔

سر ہلانے کے بعد بوڑھا ایاز صوفے پر لڑھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بہت لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی حالت اب ایسی نہیں رہی تھی کہ وہ بات کر سکتا۔ احسن بہت مایوس ہوا۔ اب وہ بوڑھے ایاز سے کم از کم اس وقت کچھ اور معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

فروزاں نے اپنے موبائل پر اکبر کی کال ریسیو کی۔

''تم پُراسرار انداز میں گھر سے کہاں غائب ہو جاتی ہو۔'' اکبر بڑے تشویش زدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''کل بھی تم اسی طرح غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے تمہارے لیے سیکیورٹی گارڈز کا بندوبست اس لیے کیا تھا کہ تم کسی خطرے میں نہ پڑ جاؤ لیکن...''

www.pkdigest.com

فروزاں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ سیکیورٹی گارڈز کا بندوبست تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کر ڈالا تھا۔ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ ان دُم چھلوں کو اپنے ساتھ لگائے پھروں۔''

''تم غلطی پر ہو فروزاں! اس نامعلوم نوجوان کی طرف سے تمھیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' فروزاں نے کہا۔ ''صرف دھمکیاں مجھے خوف زدہ نہیں کرسکتیں۔''

''اس نے تم پر گولی چلائی تھی۔ وہ تمہاری ٹانگ زخمی کرنا چاہتا تھا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہیں گے کہ تم زخمی ہونے سے بچ گئیں۔''

''میں نہیں مانتی کہ میں بچ گئی تھی۔ بھری پُری سڑک پر گولی چلانے کی ہمت جن لوگوں میں ہوتی ہے، ان کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ ہاں البتہ یہ اس راہ گیر کی بدقسمتی ضرور ہے کہ وہ گولی کی زد پر آگیا۔''

''تم سے بحث نہیں کی جاسکتی۔'' اکبر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا، پھر اس نے پوچھا۔ ''اس وقت تم کہاں ہو؟''

''میں اپنی ایک دوست سے ملنے آئی ہوں۔'' فروزاں نے جواب دیا جو بالکل جھوٹ تھا۔ وہ اس وقت اپنی کسی دوست کے گھر نہیں بلکہ صابرہ بیگم کے کمرے میں اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

صابرہ بیگم خاموش لیٹی فروزاں کو تک رہی تھی۔

اکبر کی آواز آئی۔ ''دو گھنٹے بعد انکل کی فلائٹ ہے۔ اس سلسلے میں تم نے کیا سوچا ہے؟''

''سب کچھ تو تمھیں سمجھا چکی ہوں۔ ہم دونوں ہی انہیں ریسیو کرنے نہیں جائیں گے۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، اس پر عمل شروع کیا یا نہیں؟''

''ملازمین پر ظاہر ہوچکا ہے کہ میرے پیٹ میں شدید تکلیف ہے اس لیے ایئرپورٹ نہیں جاسکوں گا۔ میں نے ابھی فون کرکے ڈاکٹر کو بھی بلایا ہے۔''

''بس ٹھیک ہے۔ میں اب فون بند کررہی ہوں۔''

اکبر جلدی سے بولا۔ ''تم نے ایئرپورٹ نہ جانے کا کیا بہانہ سوچا ہے؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' فروزاں نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کردیا۔

''کیا معاملہ ہے بیٹی؟'' صابرہ بیگم نے تشویش سے پوچھا۔ ''تم پر کس نے گولی چلائی تھی؟''

''ارے وہ کچھ نہیں۔'' فروزاں شدید ذہنی دباؤ کے باوجود ہنس کر بولی۔ ''یہ اکبر بات کررہا تھا مجھ سے۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ لگے رہنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے میں نے اسے ڈرانے کے لیے اس سے کہہ دیا تھا کہ ایک سڑک پر کسی نے مجھ پر گولی چلائی تھی، کوئی میرا دشمن ہوگیا ہے اس لیے وہ میرا مطلب ہے کہ اکبر میرے ساتھ نہ رہا کرے۔''

صابرہ بیگم پھر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسی وقت فروزاں کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ فروزاں نے منہ بنا کر موبائل اٹھالیا جو اس نے اپنی گود میں ڈال لیا تھا۔ وہ سمجھی تھی کہ اکبر نے پھر کال کی ہوگی لیکن اس نے موبائل کی اسکرین پر احسن کا نام دیکھا۔

''ہاں احسن!'' فروزاں نے کال ریسیو کی۔

''میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔'' احسن کی آواز آئی۔

فروزاں نے محسوس کیا کہ احسن کی آواز میں کچھ ہیجان تھا۔

''ابھی کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' فروزاں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ایک ضروری، بلکہ بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''تو ابھی کرلو۔''

''ملاقات ضروری ہے۔''

www.pkdigest.com

''میں اس وقت تم سے ملنے کیسے آسکتی ہوں احسن! تمھیں معلوم ہے کہ آج رات ڈیڈی لندن سے واپس آرہے ہیں۔ انہیں لینے کے لیے مجھے ایئرپورٹ جانا ہے۔''

''فلائٹ آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ تم آدھے گھنٹے پہلے بھی روانہ ہوگی تو وقت پر ایئرپورٹ پہنچ جاؤ گی۔''

''میں اس وقت بہت مصروف ہوں احسن! ایئرپورٹ جانے کی تیاری کے علاوہ اس وقت یہ پریشانی بھی ہوئی ہے کہ اکبر کے پیٹ میں شدید تکلیف ہونے لگی ہے۔ ابھی ڈاکٹر کو بلایا ہے۔''

''اچھا!'' احسن کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''تو پھر کب مل سکتی ہو؟''

''اب آج رات تو ڈیڈی آئیں گے۔ ان سے نہ جانے کتنی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دیر سے سوئی تو کل صبح اٹھوں گی بھی دیر سے، میرا خیال ہے کہ میں تمھیں گیارہ بجے تک فون کرسکوں گی۔ فون پر ہم طے کرلیں گے کہ ملاقات کہاں ہوگی۔''

احسن کی آواز میں جو ہیجانی کیفیت تھی، اس نے فروزاں کو متجسس تو کردیا تھا لیکن وہ اس وقت احسن سے ملنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار تھی۔ کیونکہ اس

رات وہ سب کچھ ہونا تھا جس کے لیے اس نے شیر خاں کی خدمات حاصل کی تھیں۔

جب احسن سے اس کی گفتگو ختم ہوگئی تو صابرہ بیگم نے پوچھا۔ ''تم نے احسن سے شادی کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے؟''

فروزاں نے اس معاملے میں صابرہ بیگم کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہی تھا کہ اکبر سے میرا مزاج نہیں ملتا۔''

''لیکن طارق تو تمہاری شادی اسی سے کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں مناسب وقت آنے پر انکار کردوں گی۔''

فروزاں نے باتوں میں اور فروزاں کے ساتھ کھانا کھانے میں ایک گھنٹے سے زیادہ گزار دیا، پھر صابرہ بیگم سے کہا۔ ''میں ابھی آئی۔ کار میں ایک چیز بھول آئی ہوں۔''

صابرہ بیگم نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

فروزاں نے باہر آکے اپنی کار میں بیٹھنے کے بعد موبائل پر طارق زنجانی کے شوفر .... سے رابطہ کیا۔ گھر میں دو شوفر تھے۔ ان دونوں ہی کو موبائل دلادیے تھے۔ ان میں سے ایک شوفر فروزاں کا تھا۔ فروزاں کبھی کبھی خود بھی کار ڈرائیو کیا کرتی تھی لیکن طارق زنجانی نے بہت عرصے پہلے ڈرائیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔

موبائل پر رابطہ ہونے کے بعد فروزاں نے پوچھا۔ ''تم کیا کررہے ہو؟''

''کچھ نہیں چھوٹی بیگم! ابھی ابھی کھانا کھا کر اٹھا ہوں۔''

''ڈیڈی کی فلائٹ آنے میں چالیس منٹ رہ گئے ہیں۔ دس منٹ بعد تم ان کی کار لے کر ایئرپورٹ روانہ ہوجاؤ۔''

''آپ نہیں جائیں گی چھوٹی بیگم؟'' شوفر کے لہجے میں کچھ تعجب تھا۔

''جاؤں گی۔'' فروزاں نے کہا۔ ''لیکن میں وہاں اپنی کار میں پہنچ جاؤں گی۔ دراصل میں اپنی ایک دوست سے ملنے آئی تھی۔ یہاں سے روانہ ہونے لگی تو انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ نہ جانے کیا خرابی ہوئی ہے۔ میری دوست کا شوفر دیکھ رہا ہے کہ کیا خرابی ہوئی ہے۔ میں نے احتیاطاً تمھیں فون کیا ہے۔ شاید میری کار ٹھیک ہونے میں کچھ دیر لگ جائے اس لیے بہتر ہوگا کہ کم از کم تم تو وقت پر ایئرپورٹ پہنچ جاؤ۔ میں بھی شاید پہنچ ہی جاؤں گی لیکن اگر کچھ دیر ہوجائے تو ڈیڈی کو بتادینا۔''

''اچھا چھوٹی بیگم! میں دس منٹ میں روانہ ہوجاؤں گا۔ چھوٹے صاحب بھی ایئرپورٹ نہیں جارہے ہیں۔ ان کے پیٹ میں کچھ تکلیف ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر بھی آیا تھا۔''

''وہ سب مجھے معلوم ہے۔ فون پر بات ہوگئی تھی اکبر سے۔'' فروزاں نے جواب دیا، اور پھر تاکید کی۔ ''روانہ ہونے میں دیر بالکل نہیں کرنا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں چھوٹی بیگم!''

فروزاں نے رابطہ منقطع کردیا۔ اسے یہی ایک تدبیر سوجھی تھی جس پر عمل کرکے وہ ان گولیوں سے بچ سکتی تھی جو طارق زنجانی کی کار پر برستیں۔ اگر فروزاں طارق زنجانی کو ریسیو کرنے جاتی تو اسے طارق زنجانی ہی کے ساتھ گھر کی طرف لوٹنا پڑتا۔

موبائل ہاتھ میں لیے ہوئے وہ کار سے اتری تو اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک پرفیوم بھی تھا۔ اس کے جسم میں بڑھتی ہوئی ہیجانی کیفیت کا اثر اب اس کے چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔

''یہ لائی تھی میں آپ کے لیے اور کار میں ہی بھول گئی تھی۔'' فروزاں نے صابرہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوکر پرفیوم صابرہ بیگم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''اس قسم کی چیزیں مت لایا کرو میرے لیے۔'' صابرہ بیگم نے افسردگی سے کہا۔ ''اب دل نہیں چاہتا۔''

فروزاں کو جواب دینے کا موقع نہیں ملا کیونکہ بوا چائے لے آئی تھی۔

''ایئرپورٹ جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔'' فروزاں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''چائے پینے میں کچھ زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔'' صابرہ بیگم نے کہا۔

بوا اس وقت صابرہ بیگم کو کئی تکیوں کے سہارے کسی حد تک بٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کام میں فروزاں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''یہاں سے تیس یا پینتیس منٹ کی ڈرائیو ہے ایئرپورٹ کی۔'' فروزاں نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''پھر تو خاصا وقت ہے۔'' صابرہ بیگم نے کہا۔ ''چائے پینے میں اتنی دیر تو نہیں لگے گی۔''

''جی۔'' فروزاں کھوئے کھوئے سے انداز میں اتنا ہی کہہ سکی۔

جب فلائٹ پہنچنے میں بیس منٹ رہ گئے تو وہ اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوئی۔ اس نے اپنی رفتار دانستہ کم رکھی تھی کیونکہ اسے ایئرپورٹ نہیں پہنچنا تھا۔ اس نے موبائل فون پر طارق زنجانی کے شوفر سے رابطہ کیا۔

''میں راستے میں ہوں چھوٹی بیگم!'' شوفر نے

فروزاں کے سوال کے جواب میں کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' فروزاں نے کہا۔ ''لیکن میں ابھی روانہ نہیں ہو سکی ہوں۔ میری دوست کا شوفر بتا رہا ہے کہ کار ٹھیک ہونے میں دس منٹ اور لگیں گے۔ میں وقت پر ائیر پورٹ نہیں پہنچ سکوں گی۔ کوشش کروں گی کہ راستے میں کہیں جگہ مل جاؤں۔''
''بہتر ہے۔'' شوفر نے جواب دیا۔
فروزاں نے موبائل بند کر کے برابر کی سیٹ پر ڈال دیا۔
کار ادھر ادھر دوڑانے کے بعد وہ اسٹار گیٹ کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں فروزاں نے کار ایک ایسی جگہ کھڑی کی کہ ائیر پورٹ سے آنے والوں کی نظر اس کی کار پر نہ پڑ سکے۔
موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے چونک کر موبائل اٹھایا۔ وہ کال طارق زنجانی کی تھی۔
''آئی ایم سوری ڈیڈی!'' فروزاں نے موبائل کان سے لگا کر فوراً کہا۔
دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی، پھر کہا گیا۔ ''کوئی بات نہیں جان طارق! کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ تمہاری کار ٹھیک ہوئی یا نہیں؟''
''ٹھیک ہو گئی ہے ڈیڈی! میں اب روانہ ہو رہی ہوں۔''
''اب سیدھی گھر ہی پہنچو۔ یہاں آنے میں تو تمہیں دیر لگے گی۔ میں اب یہاں سے روانہ ہونے ہی والا ہوں۔''
یہ فروزاں کے علم میں تھا کہ ائیر پورٹ پر طارق زنجانی کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ ائیر پورٹ کے عملے اور فضائی کمپنی کے افسران سے اس کے اتنے اچھے تعلقات تھے کہ ساری رسمی کارروائیاں جھٹ پٹ ہو جاتی تھیں۔
''جی ہاں ڈیڈی۔'' فروزاں نے طارق زنجانی کو جواب دیا۔ ''میں اب گھر ہی پہنچتی ہوں۔''
''او کے۔'' دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
فروزاں نے موبائل بند کر کے پھر برابر کی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کی نظریں اس طرف لگی ہوئی تھیں جدھر سے طارق زنجانی کی کار آتی۔
شیر خاں نے فروزاں کو بتایا تھا کہ طارق زنجانی کے ساتھ واردات اس کے گھر پہنچنے سے پہلے، راستے ہی میں کسی جگہ ہو جائے گی۔
فروزاں دھڑکتے دل کے ساتھ طارق زنجانی کی کار کا انتظار کرتی رہی۔ ساتھ ہی وہ ارد گرد کے ماحول سے بھی باخبر تھی۔ پوری طرح چوکنا! وہ نڈر ہونے کے باوجود احتیاط ضروری سمجھتی تھی۔ وہ نوجوان اس کے دماغ سے محو نہیں ہوا تھا جو پارک میں ریوالور بہ دست اس کے سامنے آیا تھا۔ جو گولی ایک راہ گیر کو لگی تھی، اس نوجوان کے بہ قول اس نے وہ گولی فروزاں کو تنبیہ کرنے کے لیے چلائی تھی اور اس نوجوان نے دوبارہ فون کر کے بھی فروزاں کو دھمکیاں دی تھیں۔
فروزاں کے نڈر ہونے کا ایک پہلو یہ خیال بھی تھا کہ ''جو گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں'' لیکن یہ سوال اس کے دماغ میں برابر چکرا تا رہا تھا کہ اس نوجوان کو آخر طارق زنجانی سے ہمدردی کیوں تھی؟
پہلی مرتبہ یکا یک یہ خیال فروزاں کے دماغ میں آیا کہ اس نوجوان نے طارق زنجانی کو ''خطرے'' سے آگاہ نہ کر دیا ہو۔
فروزاں کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اسے خود پر غصہ آیا تھا کہ یہ بات اس کے دماغ میں پہلے ہی کیوں نہیں آئی۔ اب وہ سوچنے لگی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نوجوان نے طارق زنجانی کو ''سازش کرنے والی ہستی'' کا نام بھی بتا دیا ہو۔
نہیں۔
فروزاں نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے اپنا سر جھٹکا۔ اس نے ذرا ہی دیر پہلے موبائل فون پر جو مختصر گفتگو کی تھی، اس میں طارق زنجانی کا لب و لہجہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اپنے خلاف کی جانے والی سازش یا سازش کرنے والی ہستی سے واقف ہو گیا ہو۔
ان خیالات سے فروزاں کا دماغ اس وقت خالی ہوا جب اسے طارق زنجانی کی کار دکھائی دی۔ فروزاں کی مکمل توجہ اس کار پر مرکوز ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے اپنی کار کو حرکت دی۔ وہ طارق زنجانی کی کار کے تعاقب میں رہنا چاہتی تھی مگر اتنے فاصلے سے کہ درمیان میں اور بہت سی گاڑیاں بھی ہوں۔
تعاقب کا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ راستے میں کس جگہ وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے اس نے شیر خاں کی خدمات حاصل کی تھیں۔
اور اگر سب کچھ اس طرح نہ ہوا تو؟ فروزاں کے دماغ میں اندیشے نے پھر سر ابھارا۔ اس اندیشے کی وجہ وہی خیال تھا جو ذرا دیر پہلے فروزاں کے ذہن میں ابھرا تھا۔
فروزاں نے پھر اس اندیشے کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ وہ اس اندیشے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی۔ اس کے اعصاب پہلے سے زیادہ تن گئے لیکن اس نے یہ خیال برابر رکھا کہ درمیان میں کئی اور گاڑیاں ہونے کے باوجود طارق زنجانی کی کار اس کی نظروں سے

اوجھل نہ ہو سکے۔
لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ تعاقب کے اختتام تک اتنی گاڑیاں ان کے درمیان میں رہتیں۔ شاہراہ سے کچھ گاڑیاں مختلف سمتوں میں مڑ گئیں۔ اس وقت فروزاں نے درمیانی فاصلہ اور بڑھا دیا۔ اب اسے بڑے انہماک سے طارق زنجانی کی کار کی عقبی سرخ روشنیوں پر نظر رکھنا تھی۔
پھر جب طارق زنجانی کی کار اس رہائشی علاقے میں داخل ہوئی جہاں اس کا گھر تھا، تو اس کی اور فروزاں کی کار کے درمیان صرف ایک واٹر ٹینکر رہ گیا۔ فروزاں کوشش کرنے لگی کہ اپنی کار واٹر ٹینکر کی آڑ میں رکھتے ہوئے طارق زنجانی کی کار کی بائیں جانب کی سرخ روشنی پر نظر رکھے۔
درمیانی فاصلہ بہر حال بہت زیادہ تھا۔
ایک موقع پر فروزاں کو خیال آیا کہ اب طارق زنجانی کی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ وہ اس موڑ کے قریب پہنچ گئی تھی جہاں سے اسے لازمی طور پر ایک جانب مڑنا تھا۔
اب تک کچھ نہیں ہوا، اب تو گھر قریب آ گیا ہے۔
فروزاں نے بڑی تشویش سے سوچا۔
کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
فروزاں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ جب طارق زنجانی کی کار کے ساتھ کوئی کارروائی شروع ہو گی، وہ اپنا راستہ بدل کر تیزی سے گھر پہنچ جائے گی لیکن کچھ نہ ہونے کے باعث وہ اسی راہ پر آگے بڑھتی رہی۔
واٹر ٹینکر اس موڑ سے آگے نکل گیا جدھر طارق زنجانی کی کار مڑی تھی۔ جلد ہی وہ موڑ فروزاں کے قریب بھی آ گیا۔ اسی وقت فروزاں نے پے در پے دو فائروں کی آوازیں سنیں اور دو ایسے دھماکے بھی ہوئے جیسے ٹائر برسٹ ہوتے ہوں۔
فروزاں نے سمجھ لیا کہ اب کارروائی شروع ہو گئی۔ اس نے بریک لگائے۔ کار اس موڑ کے بالکل سامنے رکی۔ فروزاں نے جو کار رکی ہوئی دیکھی، وہ طارق زنجانی ہی کی تھی۔
دفعتاً خوف ناک دھماکے شروع ہو گئے۔ وہ آوازیں آٹو میٹک رائفل یا کلاشنکوف کی ہو سکتی تھیں۔
فروزاں نے بریک تو لگائے تھے مگر انجن بند نہیں کیا تھا۔ اس نے بریک سے پیر ہٹا کر ایکسلریٹر پر رکھ دیا اور دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ وہ اگلے موڑ سے اپنے گھر کی طرف جانا چاہتی تھی۔
دھماکے مسلسل سنائی دے رہے تھے جو فروزاں کے لیے ایک عجیب بات تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اس کے حسب منشا کام مکمل ہونے میں اتنی دیر نہیں لگنا چاہیے تھی۔
تین منٹ بعد فروزاں کی کار اپنے گھر کے پھاٹک پر تھی۔ اس وقت دھماکے سنائی دینا بند ہو گئے تھے۔
غالباً وہ دھماکے سن کر ہی چوکیدار پھاٹک کے ذیلی دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے فروزاں کی کار دیکھ کر جلدی سے پھاٹک کھول دیا۔ فروزاں کار اندر لے گئی۔ اس نے برآمدے کے سامنے کار روکی۔ اس نے اکبر کو برآمدے میں کھڑا دیکھا۔
''ڈیڈی ابھی نہیں پہنچے کیا؟'' فروزاں نے کار سے اتر کر برآمدے کی طرف بڑھتے اور اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا سوال دراصل اس ملازم کو سنانا چاہتی تھی جو قریب ہی موجود تھا۔
''ابھی تو نہیں پہنچے۔'' اکبر نے جواب دیا۔
''تمہاری طبیعت ٹھیک ہو گئی؟'' فروزاں نے برآمدے میں پہنچتے ہوئے کہا۔
''ہاں'' اکبر نے جواب دیا۔ ''میں دھماکوں کی آواز سن کر باہر آ گیا تھا۔ ابھی تو رکی ہیں ان کی آوازیں۔''
''کبھی کبھی یہ ہوتا رہتا ہے۔'' فروزاں نے بے پروائی ظاہر کی۔ ''کسی پولیس موبائل کو اگر کوئی مشتبہ شخص یا کار دکھائی دے جاتی ہے تو وہ اسے روکنے کے لیے فائر کھول دیتی ہے۔ چلو اندر چلو، ڈیڈی اب آتے ہی ہوں گے۔''
وہ اور اکبر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔
''کام ہو گیا۔'' اب فروزاں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیکن فائرنگ میری توقع سے زیادہ ہوئی ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ پولیس کو یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔''
''میں پولیس کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوں۔''
اکبر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ فروزاں مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگی۔ اکبر کچھ توقف سے بولا۔ ''میں نے سیکورٹی گارڈز کی چھٹی کر دی ہے۔ تمہارے رویے کی وجہ سے انہیں رکھے رہنا، بے جواز ہو گیا تھا۔''
''ٹھیک کیا تم نے۔'' فروزاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور ٹہلتی رہی۔
☆☆☆
اس رات احسن بہت پریشان تھا۔ اسے بوڑھے ایاز سے جو غیر معمولی معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کی وجہ سے

www.pkdigest.com

وہ فروزاں سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ انہی سب باتوں پر سوچتے اور الجھتے ہوئے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ موبائل فون کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ رات کے دو بجے اسے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بستر کی سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور اس کی اسکرین پر عامر کا نام دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے حیرت کے عالم میں کال ریسیو کی۔

''خیریت تو ہے عامر!'' اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری آواز سے اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم ابھی سوئے نہیں تھے۔'' دوسری طرف سے عامر نے کہا۔

احسن بولا۔ ''آواز تو تمہاری بھی یہی ظاہر کر رہی ہے کہ تم بھی ابھی سوئے نہیں تھے۔''

''میرا تو پیشہ ہی ایسا ہے کہ سونے جاگنے کا کوئی وقت طے نہیں ہوتا لیکن تمہارے جاگتے رہنے سے میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ تمہیں اطلاع مل چکی ہے۔''

''کیسی اطلاع؟''

''واقعی تم بے خبر ہو؟'' اس مرتبہ عامر کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ''میں تو تمہاری جاگتی ہوئی آواز سے یہی سمجھا تھا کہ فروزاں نے اس واقعے کے بعد تمہیں ضرور فون کیا ہو گا۔''

''کیسا واقعہ؟'' احسن اب بے چین ہو کر بستر سے اٹھ گیا۔

''کسی نے طارق زنجانی کو اغوا کر لیا ہے۔''

''کیا؟'' احسن کے ہاتھ سے موبائل گرتے گرتے بچا۔

''ہاں۔'' عامر نے کہا۔ ''مجھے یہی معلوم ہوا ہے۔ دراصل مجھے ایک کیس کے سلسلے میں کچھ معلومات درکار تھیں۔ اس کے لیے میں نے ایک پولیس آفیسر کو فون کیا تھا۔ طارق زنجانی کیونکہ ایک معروف بزنس مین ہیں اس لیے پولیس آفیسر نے مجھ سے اس واقعے کا تذکرہ بھی کیا۔''

''یہ کیسے ہوا؟'' احسن نے بے تابی سے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، کب؟ کہاں؟ کس نے اغوا کیا؟''

''یہ تو اب پولیس معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ کس نے اغوا کیا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ آج رات لندن سے آیا تھا۔ ائرپورٹ سے وہ اپنی کار میں گھر جا رہا تھا کہ اس کی کار پر فائرنگ کر کے اس کے ٹائر برسٹ کیے گئے پھر کچھ نامعلوم افراد اسے کار سے اتار کر اپنے ساتھ لے گئے۔''

''کار میں تو فروزاں بھی ہو گی؟'' احسن نے حواس باختگی کے عالم میں کہا۔

''مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق کار میں طارق زنجانی کے ساتھ صرف اس کا شوفر تھا۔''

''میں... میں ابھی فروزاں کو فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔''

''سنو احسن!'' عامر کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ ''تم نے میرے ذریعے سے ایک ایسے شخص کے بارے میں معلومات حاصل کروائی ہیں جو کبھی طارق زنجانی کا ملازم تھا۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم اس شخص میں دلچسپی کیوں لے رہے ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم مجھے وہ سب کچھ بتا دو جو تم نے مجھے نہیں بتایا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم کسی خاص چکر میں نہ پھنس جاؤ۔''

''میں کسی چکر میں نہیں پھنسوں گا۔'' احسن نے تیزی سے کہا۔ ''ابھی تو تم مجھے اجازت دو عامر! میں ابھی جا کر فروزاں سے ملوں گا، کل کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا۔''

''اچھا!'' عامر نے طویل سانس لی۔ ''جیسا تم مناسب سمجھو۔''

اس وقت دماغ میں ابھرنے والے بہت سے خیالات کے باعث احسن کے اعصاب جھنجھنانے لگے تھے۔ عامر سے بات کرنے کے بعد اس نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

''میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والی تھی احسن!'' فروزاں نے اس سے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''کسی نے ڈیڈی کو اغوا کر لیا ہے۔''

''مجھے ابھی اس کی اطلاع مل چکی ہے۔''

''کیسے؟ تمہیں اس وقت کس نے...''

''میں ابھی تمہارے گھر آ رہا ہوں۔'' احسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مگر...''

''اس وقت میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گا۔ اکبر کو بتا دینا کہ میں تمہارا امریکا کا دوست ہوں۔ تمہیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ڈرنے کی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ اس وقت اکبر سے تمہارا آمنا سامنا ہی نہیں ہو گا۔ پولیس ابھی ابھی یہاں سے رخصت ہوئی ہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ سے اکبر اتنا نروس ہو گیا... کہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا ہے۔''

''خیر، میں نے تمہیں بس اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ میں ابھی تم سے ملنے آ رہا ہوں۔''

احسن نے فروزاں کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور روانگی کے لیے جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ اس کے دماغ میں فروزاں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ لب ولہجہ کسی ایسی لڑکی کا نہیں تھا جس کا باپ اغوا کر لیا گیا ہو... گویا وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ طارق زنجانی اس کا باپ نہیں تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ فروزاں کے گھر میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ فروزاں کی حالت ایسی تھی جیسے وہ صدمے سے نڈھال ہو۔

''فروزاں!'' احسن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے جب تم موبائل فون پر مجھ سے بات کر رہی تھیں تو تمہارا لہجہ یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ تم کسی بڑے صدمے سے دوچار ہو چکی ہو۔ اب میرے سامنے تم یہ اداکاری نہ کرو تو بہتر ہو گا۔''

فروزاں نہ صرف چونکی بلکہ پلکیں جھپکائے بغیر احسن کو تکنے لگی۔

''آئی ایم سوری۔'' احسن نے نظریں جھکا لیں۔ ''مجھے کم از کم تم سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے لیکن حقیقت [illegible] کا سامنا کرنے سے جو گریز کرتا ہے، اسے زندگی میں اکثر ناکامیوں ہی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ تم میرے لیے ہو فروزاں، اور میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ تم طارق زنجانی جیسے شخص کی نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی بیٹی ہو جو اب غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔''

''احسن!'' فروزاں کی آواز کانپ گئی۔

''ہاں۔'' احسن نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس شخص کا نام ایاز ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

فروزاں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

احسن پھر بولا۔ ''مجھے سب کچھ صحیح صحیح بتا دو فروزاں! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جس بات کو راز میں رکھنا چاہو گی، وہ میرے سینے میں دفن رہے گی۔ مجھے بتاؤ کہ تم اس وقت طارق زنجانی کے ساتھ کیوں نہیں تھیں جب انہیں اغوا کیا گیا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم انہیں لینے ائرپورٹ جاؤ گی لیکن تم نہیں گئیں، کیوں فروزاں؟ کیا تمہیں علم تھا کہ طارق زنجانی کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آئے گا؟''

فروزاں احسن کی باتوں پر چونکی بھی اور پریشان بھی ہوئی لیکن اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا۔ اب اس کا چہرہ سپاٹ سا نظر آنے لگا۔ وہ بولی۔ ''احسن! میری ماں کے علاوہ تم واحد ہستی ہو جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، اور میں بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہوں جتنا تم مجھے چاہتی ہو۔ اسی لیے اگر تم مجھے ٹھیک ٹھیک سب کچھ بتا دو، اور تم سے کوئی بہت بڑی غلطی نہ ہوئی ہو، تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔ مجھے طارق زنجانی کے اغوا کے بارے میں بتاؤ۔''

''کیونکہ تم جان چکے ہو کہ وہ میرے والد نہیں، اس لیے تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ اس معاملے میں کہیں میرا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن میں تمہاری قسم کھا کر کہتی ہوں احسن کہ میں ان کے اغوا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے قطعی علم نہیں کہ انہیں اغوا کرنے والے کون ہیں اور انہیں کیوں اغوا کیا گیا ہے۔''

''مجھے علم ہوا ہے کہ شوفر انہیں لے کر آ رہا تھا۔ وہ شوفر کہاں ہے؟''

''اس وقت تو وہ سرونٹ کوارٹر میں ہو گا۔''

''اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی؟''

''نہیں۔'' فروزاں نے جواب دیا۔

''اس نے واقعہ کس طرح بیان کیا ہے؟''

''کار کے پہیوں پر دو فائر کیے گئے تھے۔'' فروزاں احسن کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کھوئے کھوئے سے انداز میں کہنے لگی۔ ''ایک موڑ قریب تھا اس لیے شوفر نے کار کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی اس نے بریک لگائے اور آسانی سے کار روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر جس جانب سے فائر کیے گئے تھے، ادھر سے کوئی شخص بڑی تیزی سے کار کے قریب آنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ کار کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دوسری جانب سے اس پر فائرنگ کی گئی۔ وہ پھرتی سے سڑک پر لیٹ گیا تاکہ گولیاں نہ لگ سکیں اور پھر تیزی سے رینگتا ہوا اسی طرف لوٹ گیا جدھر سے آیا تھا۔ کسی جگہ آڑ لینے کے بعد اس نے بھی اپنی رائفل سے فائرنگ شروع کی لیکن اس کے مقابلے پر کئی افراد تھے جو سامنے بھی نہیں تھے۔ بس بے تحاشا فائرنگ سے سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ کئی ہوں گے۔ وہ تنہا شخص ان کے مقابلے پر زیادہ دیر تک نہیں جما اور غالباً اس نے فرار ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ دوسری بار جس طرف سے فائرنگ شروع کی گئی تھی، ادھر سے تین افراد کار کے قریب آئے۔ وہی اس اغوا کے ذمے دار ہیں۔''

www.pkdigest.com

''یعنی وہ طارق زنجانی کو کار سے اتار کر اپنے ساتھ لے گئے؟''

''ہاں۔''

''ان کے پاس رائفلیں ہوں گی۔ اسی کے زور پر انہوں نے طارق زنجانی کو کار سے اترنے پر مجبور کیا ہوگا۔''

''ہاں۔''

''اور شوفر سے انہوں نے کچھ نہیں کہا؟''

''کچھ نہیں، لیکن وہ بے چارہ خوف سے کانپتا رہا۔ ان لوگوں کے غائب ہو جانے کے بعد اس نے موبائل فون پر مجھے اس واقعے سے آگاہ کرنا چاہا تھا لیکن اسی وقت ایک پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی۔ پولیس نے فائرنگ کی آواز سن کر ادھر کا رخ کیا تھا۔ فوری طور پر تو انہوں نے شوفر ہی کو گرفتار کر لیا، لیکن اس کا بیان سننے کے بعد وہ لوگ اسے لے کر یہاں آئے۔ مجھ سے اور اکبر سے پوچھ گچھ ہوئی۔ اکبر نے تو انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ پیٹ کی تکلیف کے باعث اپنے چچا کو ریسیو کرنے ائرپورٹ نہیں جا سکا تھا اور میں نے یہ بتایا کہ میں اس وقت اپنی ایک دوست کے گھر پر تھی جہاں اچانک میری کار خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میں ائرپورٹ نہیں جا سکی تھی۔ میں نے شوفر کو فون کر دیا تھا کہ وہ ائرپورٹ چلا جائے۔''

''اکبر کے بارے میں تم نے مجھے بھی بتایا تھا کہ وہ پیٹ کی تکلیف کے باعث ائرپورٹ نہیں جا سکے گا لیکن اپنے بارے میں تم نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ تم کسی دوست کے گھر پر تھیں۔''

''میں اس وقت تمہیں نہیں بتا سکتی تھی کہ میں کہاں تھی۔ پولیس بھی مجھ سے پوچھتی رہی کہ میں اپنی اس دوست کا نام پتا بتاؤں لیکن میں نے نہیں بتایا۔ اسی وجہ سے پولیس کو شبہ ہو گیا ہے کہ میں اور اکبر بھی اس معاملے میں کہیں نہ کہیں ملوث ہیں۔ وہ لوگ یہ کہہ کر گئے ہیں کہ مجھے اور اکبر کو جلد ہی کسی وقت پولیس ہیڈ کوارٹر طلب کیا جائے گا۔ اس پر میں نے صاف صاف اور دبنگ انداز میں کہہ دیا کہ ایسی صورت میں مجھے اگر کوئی بیان دینا ہوگا تو میں اپنے قانونی مشیر کے مشورے سے دوں گی۔ مطلب یہ کہ میں کوئی وکیل کر لوں گی۔ میں کوئی معمولی لڑکی تو ہوں نہیں کہ پولیس مجھے کسی ثبوت کے بغیر گرفتار کر سکے۔''

''شوفر کو انہوں نے چھوڑ دیا؟''

''ہاں، انہیں شوفر پر کوئی شبہ نہیں ہوا اور اگر ہوا ہے تو انہوں نے اسے کسی مصلحت سے چھوڑ دیا ہوگا۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ پولیس کے اس رویے کی وجہ سے اکبر بہت نروس ہو گیا ہے۔ دراصل پولیس آفیسر نے اشارتاً کہہ دیا تھا کہ پیٹ کی تکلیف محض ایک بہانہ بھی ہو سکتی ہے۔''

احسن بولا۔ ''تم نے پولیس کو اپنی دوست کا نام پتا کیوں نہیں بتایا؟''

''اس لیے کہ میں اس وقت اپنی کسی دوست کے گھر پر نہیں تھی۔''

''پھر کہاں تھیں؟''

فروزاں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ اب کچھ جذباتی ہو چلی تھی۔

''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی احسن!'' فروزاں بڑبڑانے کے سے انداز میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ''سب کچھ بتا دوں گی۔''

احسن اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ٹہلنے لگی۔ اس کی مٹھیاں کبھی کھلتی تھیں، کبھی بند ہو جاتی تھیں۔ یہ حرکت اس کے ذہنی انتشار کی طرف ایک واضح اشارہ تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بار بار تبدیل ہو رہے تھے۔ احسن خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہاں احسن!'' فروزاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایاز ہی میرا باپ ہے۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''میرا سگا باپ۔''

احسن نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم اپنے باپ کا ذکر اس طرح کر رہی ہو؟''

''وہ اسی قابل ہے کہ میں اس سے نفرت کروں۔ میں اپنی ماں کی تباہی کا بنیادی سبب اسی کو سمجھتی ہوں۔ اور طارق زنجانی، جنہیں میں ڈیڈی کہتی ہوں، وہ بھی میری ماں کی آج کی حالت کے ذمے دار ہیں۔''

''فروزاں!'' احسن حیرت سے بولا۔ ''تم تو مجھے بتایا کرتی تھیں کہ طارق زنجانی تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔''

''ہاں۔'' فروزاں ٹہلتے ہوئے بولتی رہی۔ ''اور میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ انہیں اپنی سوتیلی بیٹی سے اتنی محبت کیوں ہے؟''

''تم اگر شروع سے سب کچھ بتاؤ تبھی میری سمجھ میں کچھ آئے گا۔''

فروزاں چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میری ماں کا نام صابرہ بیگم ہے۔ ان کی شادی ایاز سے اس وقت ہوئی تھی جب وہ طارق زنجانی کے ادارے میں ملازم تھا۔''

یہ باتیں احسن کو معلوم ہو چکی تھیں لیکن وہ کچھ بولے بغیر خاموشی سے سنتا رہا۔

فروزاں کہہ رہی تھی۔ ''میرا باپ اس زمانے میں بھی کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ کئی سوسائٹی گرلز یا طوائفیں ایسی تھیں جن سے اس کا تعلق تھا لیکن میری ماں وہ سب کچھ برداشت کیا کرتی تھیں۔''

احسن خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے علم میں یہ بات بھی آ چکی تھی کہ ایاز اور صابرہ بیگم کا طارق زنجانی سے آمنا سامنا ایک شاپنگ سینٹر میں ہوا تھا۔

فروزاں نے بتایا کہ طارق زنجانی ایک دل پھینک شخص تھا، جس نے نہ جانے کتنی شادیاں کیں اور دل بھر جانے پر انہیں طلاقیں دیتا رہا۔ بعض عورتوں سے اس کے خفیہ تعلقات اب بھی تھے۔ اس نے شاپنگ سینٹر میں صابرہ بیگم کو دیکھا تو اس پر ریجھ گیا۔ اسے یہ موقع بھی ملا کہ ایاز کے گھر اس کا آنا جانا ہو گیا۔ ایاز نے صابرہ بیگم کو تاکید کی کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں بھی طارق زنجانی کا خیال رکھے۔ بعض اوقات وہ خود گھر میں ہوتا تو بھی اپنی عدم موجودگی ظاہر کرتا اور صرف صابرہ بیگم کو ہدایت کرتا کہ وہ جا کر طارق زنجانی کی خاطر مدارات کرے۔ دراصل وہ اس طرح طارق زنجانی کو خوش کر کے اپنی ترقی کی راہیں ہموار کرنا... چاہتا تھا۔ صابرہ بیگم دل ہی دل میں بہت کڑھتی تھی لیکن دنیا میں تنہا ہونے کے باعث اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ایک خاص حد تک طارق زنجانی کا خیال رکھے گی۔ خود ایاز بھی یہی چاہتا تھا کہ طارق زنجانی کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے لیکن طارق زنجانی بڑی آہستگی کے ساتھ صابرہ بیگم سے بے تکلف ہوتا رہا، اور ایک دن جبکہ ایاز واقعی گھر پر موجود نہیں تھا تو اس نے صابرہ بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ اتفاق تھا کہ عین اسی وقت ایاز بھی گھر پہنچ گیا اور اس نے یہ منظر دیکھ لیا۔ وہ سمجھا کہ صابرہ بیگم نے اسے دیکھ کر طارق زنجانی سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ وہ مغلوب الغضب ہو گیا۔ وہ طارق زنجانی کے جانے کے بعد صابرہ بیگم پر بگڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ صابرہ بیگم نے طارق زنجانی سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ اگرچہ اس قسم کے معاملات میں خود اس کا کردار بھی اچھا نہیں تھا لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کسی سے جسمانی طور پر قریب ہو۔ جب وہ بگڑا تو صابرہ بیگم نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن ایاز نے اس پر یقین نہیں کیا۔ وہ اس وقت شاید کچھ نشے میں بھی تھا۔ گرج برس کر وہ گھر سے چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ یہ بھی کہہ گیا تھا کہ وہ صابرہ بیگم کو طلاق دے دے گا۔ اس کے جانے کے بعد صابرہ بیگم رات بھر روتی رہی لیکن اپنی ڈھارس بھی بندھاتی رہتی کہ ایاز کا غصہ وقتی تھا اور وہ اسے طلاق نہیں دے گا لیکن دوسری شام ایاز کا فون آیا کہ اس نے طلاق کے کاغذات تیار کرا لیے ہیں اور وہ آ رہا ہے تاکہ صابرہ بیگم کو اپنے گھر سے نکال سکے۔ اس کا یہ فون ملنے کے بعد صابرہ بیگم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے طارق زنجانی کو فون کیا اور اس پر بہت بری طرح بگڑی کہ اس کی وجہ سے اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ جواب میں طارق زنجانی نے نرم لہجے میں بات کی اور اپنی محبت کا اظہار بھی کیا۔ اس پر صابرہ بیگم زیادہ بگڑی اور اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ایاز گھر پہنچا۔ وہ خاصے نشے میں تھا۔ اس نے طلاق کے کاغذات اور مہر کی رقم کا چیک صابرہ بیگم کو دے کر اسے حکم دیا کہ وہ فوراً اس کے گھر سے نکل جائے۔ صابرہ بیگم بہت روئی، گڑگڑائی لیکن ایاز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے دھکے دے کر صابرہ بیگم کو گھر سے نکال دیا۔

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے فروزاں آب دیدہ ہو گئی۔ ''میں اس وقت دو سال کی تھی۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔ ''ممی مجھے گود میں لیے ہوئے گھر سے نکلیں۔ رات کا وقت تھا۔ ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں جائیں۔ پریشانی کے عالم میں وہ سوچے سمجھے بغیر ایک طرف بڑھتی چلی جا رہی تھیں کہ ایک کار ان کے قریب آ کر رکی۔''

وہ کار طارق زنجانی کی تھی۔ اس نے صابرہ بیگم کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔ صابرہ بیگم اس سے سخت ناخوش تھی اور اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی لیکن پریشانی کے عالم میں اسے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ طوعاً و کرہاً طارق زنجانی کی کار میں بیٹھ گئی۔ طارق زنجانی نے کار چلا دی اور ایسی باتیں کرتا رہا جیسے وہ صابرہ بیگم کو دل و جان سے چاہنے لگا ہے۔ اس نے ایاز کو بھی برا بھلا کہا جس نے ایک نیک سیرت عورت کو طلاق دے دی تھی۔ اس کی باتیں ایسی تھیں کہ صابرہ بیگم پھر رونے لگی۔ طارق زنجانی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صابرہ بیگم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ صابرہ بیگم کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ اسے اندھیرے میں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ اس کی تباہی کا ایک سبب طارق زنجانی بھی تھا۔ صابرہ بیگم نے اس کی بات ایک شرط پر

www.pkdigest.com

مان لی کہ وہ شادی سے پہلے اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ طارق زنجانی نے اس کی بات مان لی۔ وہ صابرہ بیگم کو اپنے گھر لے گیا۔ صابرہ بیگم نے اسی گھر میں عدت کا زمانہ بھی گزارا اور اس عرصے میں اس نے طارق زنجانی کو اپنے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھنے دیا۔ ان دونوں کا نکاح عدت کی مدت گزر جانے کے بعد ہی ہوا تھا۔

''پھر؟'' فروزاں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''چار سال بعد میری ماں کے ساتھ پھر ایک المیہ ہوا۔ وہ خود کار ڈرائیو کرتی ہوئی شاید شاپنگ کے لیے جارہی تھیں کہ ایک خوفناک حادثہ ہوگیا۔ میں کار کی پچھلی سیٹ پر کھیل رہی تھی اس لیے مجھے تو بہت معمولی سی چوٹیں آئیں لیکن ممی...''

فروزاں سسکیاں لیتے ہوئے ایک صوفے پر گر پڑی۔

احسن اس کے قریب جا بیٹھا اور ہمدردی سے بولا۔ ''خود کو سنبھالو۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تم مجھے سب کچھ بتا رہی ہو۔ مجھے ایاز سے معلوم ہو چکا ہے کہ طارق زنجانی سے تمہاری ماں کی علیحدگی کن حالات میں ہوئی تھی۔ میں اب بھی حیران ہوں کہ طارق زنجانی کو تم سے اتنی محبت کیوں ہو گئی تھی۔''

''اس پر میں نے اس وقت سے سوچنا شروع کیا، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں طارق زنجانی کی بیٹی نہیں ہوں۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''جب میری ماں کو علیحدہ کیا گیا اس وقت تو میں بہت چھوٹی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے بتایا گیا کہ میری ماں کوئی اچھی خاتون نہیں تھیں۔ انہوں نے طارق زنجانی سے طلاق لینے کے بعد کسی اور سے شادی کرلی تھی اور وہ مجھے طارق زنجانی ہی کے پاس چھوڑ گئی تھیں کیونکہ ان کا دوسرا شوہر مجھے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ طارق زنجانی کے بہ قول وہ خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں ان سے جدا ہو جاؤں کیونکہ وہ مجھ سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔''

''تم پر یہ راز کب کھلا؟''

''کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے۔ دراصل اتنا زیادہ عرصہ یہ راز اس لیے نہیں کھل سکا کہ طارق زنجانی نے اپنے اس عہد کے تمام ملازمین کی چھٹی کردی تھی اور گھر میں نئے ملازمین رکھ لیے تھے۔ اگر کوئی پرانا ملازم یا ملازمہ ہوتی تو ان میں سے کسی نہ کسی کے منہ سے کبھی نہ کبھی کچھ نکل ہی جاتا۔ خود میرے دل میں بھی اپنی ماں کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی کیونکہ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، وہ مجھے بہت کم عمری ہی میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ایسی ماں کے لیے شاید کسی اولاد کے دل میں بھی کوئی جگہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نکاح کے بعد وہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی تھیں۔''

احسن نے پہلو بدلا۔ اس نے جو سوال کیا تھا، فروزاں اس کا جواب دینے کے بجائے دوسری باتوں کی طرف نکل گئی تھی۔ اس کے باوجود احسن تحمل سے سنتا رہا۔ آخر فروزاں خود ہی اصل بات کی طرف آگئی۔

''یہ راز کھلنے کی نوبت اس طرح آئی کہ میں کہیں جارہی تھی جب مجھے چند چھینکیں آگئیں۔ کار میں ٹشو پیپر کا باکس خالی ہو چکا تھا۔ میرے پرس میں دو چار ٹشو عموماً پڑے رہتے تھے لیکن اس وقت وہ بھی نہیں تھے۔ شاید قدرت ہی ایسا انتظام کررہی تھی کہ مجھ پر وہ راز آشکارا ہو۔ میں نے ٹشو باکس خریدنے کے لیے کار ایک جنرل اسٹور کے سامنے روکی۔ میں جب ٹشو باکس خرید رہی تھی تو میری نظر ایک ادھیڑ عمر عورت پر پڑی جو وہاں پہلے سے موجود تھی اور گھریلو ضروریات کا سامان خرید رہی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس معلوم ہوا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ چونکی اور کچھ گھبرا سی گئی۔ اس کے بعد اس نے اسٹور سے رخصت ہونے میں بہت عجلت کی اور اس دوران میں مجھ سے نظریں چراتی رہی۔ جب وہ رخصت ہوگئی تو دکان دار نے ... نکالا۔ آٹھ دس سال کا بچہ بھی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ دکان دار پر بگڑنے لگا کہ وہ اسے چاکلیٹ دینے کے بجائے بوا کو سامان دیتا رہا تھا اور اب میری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں ٹشو باکس لے کر دکان سے نکل آئی۔ میں جانتی تھی کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں بوا کا لفظ ملازماؤں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہاں ہمارے ملک میں بھی بعض گھرانوں میں یہ لفظ اب بھی بولا جاتا ہے۔ بچے کی زبان سے یہ لفظ سن کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ بچہ اس عورت کو ضرور جانتا ہوگا۔ کیونکہ وہ عورت مجھے مانوس معلوم ہوئی تھی اور وہ بھی مجھے دیکھ کر کچھ گھبرائی تھی اس لیے مجھے اس کے بارے میں تجسس ہوگیا تھا۔''

احسن کی دانست میں فروزاں جزئیات میں الجھ گئی تھی۔

فروزاں نے بات جاری رکھی۔ ''جب وہ بچہ دکان سے نکلا تو میں نے ہنس کر اس سے پوچھا کہ یہ بوا تھی کون، جس کی وجہ سے وہ دکان دار پر بگڑ گیا تھا۔''

احسن جلدی سے بولا۔ ''گویا اس بچے نے تمہیں بتا دیا

کہ وہ بوا کہاں رہتی تھی۔''

''ہاں۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''وہ مکان اس جنرل اسٹور سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ بچہ بھی وہیں رہتا ہے اس لیے وہ بوا کو جانتا تھا۔''

احسن نے پھر مداخلت کی۔ ''اس کے بعد تم بوا کے گھر گئیں؟''

''نہیں۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''کوئی جواز نہیں تھا اس کا! البتہ میں بعد میں اس کے بارے میں سوچتی ضرور رہی تھی۔ مجھے دھندلا سا خیال آیا کہ میں جب چھوٹی تھی، تو بھی کسی عورت کو بوا کہا کرتی تھی۔ پھر چند دن بعد جب میں اپنی خواب گاہ کی صفائی کررہی تھی تو مجھے بوا کی تصویر مل گئی۔''

''کہاں؟'' احسن نے بے ساختہ پوچھا۔

''میں تمہیں تمام جزوی باتیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہیں بعد میں کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''اسے تم میری عادت کہہ لو یا میری ہابی کہ میں بچپن سے آج تک اپنے نصاب کی کتابیں بلکہ بچپن سے لے کر اب تک جو چیزیں استعمال کی ہیں، وہ بڑی احتیاط سے جمع کرتی رہی ہوں۔ مجھے وہ تصویر دوسری جماعت کی ایک کتاب میں رکھی ہوئی ملی تھی۔ اس میں میری والدہ مجھے اپنی گود میں لیے ایک ... پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے قدموں میں قالین پر بوا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے خود کو تو بڑی آسانی سے اس لیے پہچان لیا کہ میری بچپن سے آج تک کی تصویریں گھر میں آج بھی موجود ہیں۔ میں تصویر میں کیونکہ ایک خوب صورت خاتون کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اس لیے میں سمجھ گئی کہ وہ میری ماں ہوں گی۔ بوا کو میں نے اس لیے پہچانا کہ اتنے برس گزر جانے کے باوجود اس کے نقش و نگار میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔''

''بعض لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔'' احسن بولا۔ ''بڑھتی ہوئی عمر ان کے نقش و نگار میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں لاتی، لیکن وہ تصویر تمہاری کتاب میں کہاں سے آگئی؟''

''یہ مجھے یاد نہیں۔ بس قیاس کرسکتی ہوں کہ بچپن میں وہ تصویر مجھے کہیں سے ملی ہوگی اور وہ میں اپنی کتاب میں رکھ کر بھول گئی ہوں گی۔''

''اچھا، پھر؟'' سب کچھ جان لینے کے لیے احسن کی بے تابی بہت زیادہ بڑھتی ہوئی تھی۔

''اس وقت مجھے خیال آیا کہ شاید میری ماں نے بوا کو اپنے ساتھ رکھا ہوگا اور وہ بھی اسی مکان میں رہتی ہوں گی۔ میرے دل میں ماں کے خلاف جذبات بہت شدید تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر واقعی وہ اسی گھر میں رہتی ہیں تو میں وہاں جاکر ان سے ملوں گی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالوں گی۔ میں نے ڈیڈی کو... میرا مطلب ہے طارق زنجانی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

فروزاں طارق زنجانی کو ڈیڈی کہنے کی عادی تھی اس لیے وہ لفظ اس کی زبان سے اس وقت بھی نکل گیا۔

''میں کار لے کر فوراً وہاں پہنچی۔'' فروزاں نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''دروازہ بوا ہی نے کھولا تھا اور مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ میں چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی کہ وہ صاحبہ کہاں ہیں جنہوں نے مجھے جنم دیا تھا۔'' فروزاں کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھر بہہ نکلے۔

احسن اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

فروزاں جب صابرہ بیگم سے ملی تھی تو انہوں نے رو رو کر اسے اصل حقائق سے آگاہ کیا لیکن اس سے وعدہ بھی لیا کہ وہ طارق زنجانی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ اسی سے فروزاں کو ایاز کے بارے میں بھی معلوم ہوا تھا۔ ایاز نے اس عرصے میں اپنی زندگی تباہ کرلی تھی۔ اسے نہ جانے کس طرح معلوم ہوگیا تھا کہ صابرہ بیگم وہاں رہتی تھی۔ وہ اس سے ملنے وہاں پہنچا تھا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ وہ صابرہ بیگم کو بلیک میل کرے۔

اس موقع پر احسن نے پوچھا۔ ''وہ انہیں کس طرح بلیک میل کرسکتا تھا؟''

''اس نے ممی کو دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے اصل حقائق سے آگاہ کردے گا لیکن ممی اس کے مطالبات اس حد تک پورے نہیں کرسکتی تھیں، جس حد تک وہ چاہتا تھا۔''

فروزاں نے مزید بتایا کہ طارق زنجانی ایک بندھی ٹکی رقم ہر ماہ ان کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا کرتا تھا۔

''وہ اس معمولی سے مکان میں کیوں رہتی ہیں؟'' احسن پوچھ بیٹھا۔ ''اور وہ طارق زنجانی سے زیادہ ماہانہ رقم بھی مانگ سکتی تھیں۔''

''انہوں نے خود ہی یہ گوارا نہیں کیا تھا۔'' فروزاں نے جواب دیا۔ ''ان کا خیال تھا کہ وہ کسی اچھے بنگلے میں پرتعیش زندگی گزاریں گی تو لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھیں گی کہ اس اپاہج عورت کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آگیا۔ خود میرا تو یہ خیال ہے احسن کہ ان کی سوچ غلط تھی لیکن بہر حال، انہوں نے ایسی ہی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ طارق زنجانی نے اپنے گھر کے سارے ملازمین نکال دیے

www.pkdigest.com

تھے مگر ان میں سے ایک بوا کو ممی نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ ایاز کا بس تھوڑا بہت مطالبہ پورا کر دیا کرتی تھیں۔"

"ایاز کو تو چاہیے تھا کہ وہ طارق زنجانی کو بلیک میل کرتا۔"

"وہ میرا باپ۔" فروزاں کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "غالباً ایک بزدل آدمی ہے۔ وہ طارق زنجانی سے ڈرتا ہے۔"

فروزاں مزید بولی۔ "میرے باپ نے ممی کو اپنے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا، اپنا پتا بھی بتا دیا تھا چنانچہ میں خود اس سے ملنے گئی۔ میرے دل میں اس کے لیے شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری ماں کے لیے پریشانی کا سبب بنتا رہے۔ میں نے.... کہہ دیا تھا میں خود آ کر ایک معقول رقم اسے دے دیا کروں گی۔ میں نے اپنا وعدہ ایفا بھی کیا لیکن شراب نوشی اور جوئے کی عادت کے باعث وہ رقم بھی اسے کم پڑتی رہتی ہے۔ وہ بیچ میں بھی مجھ سے مل کر کچھ رقم مانگ لیتا ہے۔"

احسن سمجھ گیا کہ اس دن فروزاں سے اس کی کار میں وہ اچانک ہی ملا ہوگا۔

ابھی تک فروزاں کو یہ سوال کرنے کا خیال نہیں آیا تھا کہ احسن کو ایاز کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا۔ شاید فروزاں کا دماغ زیادہ گمبھیر خیالات میں الجھا ہوا تھا۔

"دو ماہ سے زیادہ گزر جانے کے باوجود میں نے طارق زنجانی کو اس بات سے بے خبر ہی رکھا ہے۔" فروزاں بولی۔ "میں اپنی ماں سے کیا ہوا عہد نہیں توڑنا چاہتی لیکن میرے دل میں طارق زنجانی کے لیے وہ محبت نہیں رہی جو پہلے تھی، بلکہ اس محبت کی جگہ نفرت بتدریج بڑھ رہی تھی۔ کچھ دن پہلے ممی کے سر میں شدید تکلیف رہنے لگی تو میں ہی انہیں اسپتال لے گئی۔ وہاں یہ روح فرسا حقیقت میرے سامنے آئی کہ ممی کے دماغ میں رسولی ہو گئی تھی۔" فروزاں پھر جذباتی ہونے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رسولی پیدا ہونے کا سبب وہ حالات تھے جس میں اس کی ماں نے زندگی گزاری تھی اور سوچ سوچ کر اس کے دماغ میں رسولی پیدا ہو گئی۔ فروزاں کا خیال غلط تھا یا صحیح لیکن اس نے یہی سوچا تھا اور تب اس کے دل میں طارق زنجانی کے لیے... شدید نفرت پیدا ہو گئی۔

"ضروری تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر میری ماں کا آپریشن کر کے وہ رسولی نکال دی جائے۔ میں چاہتی تھی کہ اس آپریشن کے لیے میں انہیں بیرون ملک لے جاؤں۔ میں نے ان کی رپورٹس بھی امریکا میں اپنی دوست کو بھیج دی ہیں کہ وہ ان رپورٹس کی روشنی میں وہاں کے کسی ماہر سرجن سے مشورہ کرے۔"

"ان دنوں طارق زنجانی لندن میں تھے؟"

"ہاں۔" فروزاں نے جواب دیا۔ "اور اسی دوران میں ایک فیصلہ میں نے ایسا بھی کیا جسے تم شاید ایک خوفناک فیصلہ کہو گے۔"

"یعنی تم نے انہیں اغوا کروانے کا فیصلہ کیا؟"

"نہیں۔" فروزاں نے کہا۔ "میں ابھی تمہاری قسم کھا کر کہہ چکی ہوں کہ ان کے اغوا میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ انہیں اپاہج بنا دیا جائے۔ میری ماں کی طرح ان کی زندگی بھی بستر یا وہیل چیئر پر گزرے۔ ان کا سارا بزنس میرے ہاتھ میں آ جائے اور میں اپنی ماں کو امریکا لے جا سکوں۔"

احسن اس وقت دم بخودی کیفیت میں فروزاں کا منہ تک رہا تھا۔

فروزاں کے دانت بھینچے ہوئے تھے۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ "میں نے اکبر کے ذریعے ایک جرائم پیشہ شخص کا پتا لگایا۔ اس کا نام شیر خاں ہے۔"

فروزاں نے وہ سب کچھ بیان کیا جو اس نے شیر خاں سے ملاقات کے لیے کیا تھا۔

"پھر میں شیر خاں سے ملی۔" اس نے بتایا۔ "میں نے اسے اس کام کے لیے ایک بڑی رقم دی کہ جب طارق زنجانی لندن سے واپس آئے تو ائرپورٹ سے گھر تک کے راستے ہی میں کسی جگہ اس کی کار روک کر اس کی ٹانگوں پر اتنی گولیاں برسائی جائیں کہ پھر وہ کبھی کھڑا نہ ہو سکے۔"

"فروزاں۔" احسن پلکیں جھپکائے بغیر ہیجانی آواز میں بولا۔ "تمہیں اس جرائم پیشہ سے ملتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟"

"طارق زنجانی سے مجھے اتنی نفرت ہو گئی کہ میں اس کے خلاف کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"لیکن تمہیں تو وہ بے حد چاہتا ہے۔"

"میں اس چاہت پر لعنت بھیجتی ہوں جو مجھے اپنی ماں کے مصائب کے عوض ملے، لیکن وہ ہو نہیں سکا جو میں نے چاہا تھا۔ شوفر کے بیان کی روشنی میں یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ شیر خاں کے آدمی نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے ٹائر برسٹ کر کے کار روک لی تھی۔ قریب جا کر وہ طارق زنجانی کی ٹانگوں پر گولیاں بھی برساتا لیکن اسی وقت کوئی دوسرا گروپ ٹپک پڑا۔ ان لوگوں کی فائرنگ اتنی شدید تھی کہ

شیر خاں کے آدمی کو پسپا ہونا پڑا اور دوسرے گروپ کے لوگوں نے طارق زنجانی کو اغوا کر لیا۔ مجھے... شبہ تو ہے کہ یہ اغوا کون کروا سکتا ہے لیکن... میری سمجھ میں نہیں آ رہا... کہ اس نے طارق زنجانی کو اغوا کروانا کیوں ضروری سمجھا۔"

"وہ۔" احسن حواس باختگی کے عالم میں بولا۔ "وہ کون ہے؟"

"یہ بھی بتا دیتی ہوں۔" فروزاں نے کہا۔ "میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔"

اس نے اس نوجوان کا قصہ بھی دہرا دیا جو پہلی مرتبہ اسے ایک پارک میں نظر آیا تھا۔

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" احسن نے تشویش سے پوچھا۔

"میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکا کہ اسے ڈیڈی..."

فروزاں ایک دم رکی، پھر اس نے اپنی بات پوری کی۔ "اسے طارق زنجانی سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، اور کیوں؟"

"کیا شیر خاں کو اپنے آدمی کی ناکامی اور طارق زنجانی کے اغوا کا علم ہو گیا ہوگا؟"

"اسے تو اپنے آدمی ہی سے معلوم ہو جانا چاہیے لیکن میں بھی اسے فون پر بتا چکی ہوں۔ پولیس کے جانے کے بعد اور تمہاری کال آنے سے پہلے میں نے موبائل فون پر اس سے [illegible] کیا تھا۔ موبائل فون پر [illegible] کرنا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے اس لیے وہ خود کچھ نہیں بولا۔ میری بات سننے کے بعد اس نے لائن کاٹ دی تھی۔"

www.pkdigest.com

احسن اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ یہ اس کے تصور سے بھی ادھر کی بات تھی کہ فروزاں اس قسم کا کوئی اقدام کر سکتی ہے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر فروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس سلسلے میں پھر شیر خاں سے ملو گی؟"

"میں اس سے ملنا تو چاہتی ہوں لیکن یہ میرے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔" فروزاں کے لہجے میں پریشانی تھی۔ "پولیس کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ میری نگرانی کروائیں۔ ایسی صورت میں شیر خاں سے ملنا میرے لیے مزید پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔"

"پریشانیوں کا سامنا تو تم خود کر چکی ہو فروزاں! پولیس کو تم پر اور اکبر پر شبہ ہو گیا ہے۔ یہ معاملہ کوئی بھی رنگ لا سکتا ہے۔ شاید عامر میری خاطر کچھ کر سکے۔ مجھے ابھی جا کر اس سے ملنا ہوگا۔"

"یہ عامر کون ہے؟"

احسن نے اسے بتایا کہ اس کا وہ دوست ایک خفیہ ادارے میں کس منصب پر فائز ہے، فروزاں نے خاموشی سے سنا اور سوچ میں پڑ گئی۔

احسن کو فروزاں سے ابھی مزید کئی سوال کرنا تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فروزاں سے مکمل گفتگو کرنے کے بعد ہی عامر سے ملنے جائے۔

☆☆☆

"میں اور کیا کرتا بابا؟" اسی رات داراب شیر خاں سے کہہ رہا تھا۔ "میں اگر اس چویشن میں فرار نہ ہوتا تو مارا جاتا، تابڑ توڑ فائرنگ سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ کئی تھے۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے بچ گیا۔ میں نے سڑک پر تو خود کو بعد میں گرایا تھا، فائرنگ پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔"

شیر خاں کے چہرے سے تشویش کے ساتھ غور و فکر کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ وہ کچھ رک کر بڑبڑایا۔ "یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟"

"میں فوری طور پر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

"کیا وہ نوجوان؟" شیر خاں نے داراب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو فروزاں کو اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہتا تھا؟"

"شاید۔" داراب نے کہا، پھر بولا۔ "مجھے حیرت ہے کہ آپ اس کا پتا لگانے میں ناکام رہے ہیں۔"

"اگر اس کا تعلق کسی گروپ سے ہوتا تو یہ بات مجھے معلوم ہو چکی ہوتی لیکن جس طرح طارق زنجانی کو اغوا کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی گروپ ہی ہے۔ کوئی ایسا گروپ جو چند ہی دن پہلے ہمارے شہر میں آیا ہے اس لیے مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا۔"

"سوال یہ ہے بابا کہ اس نوجوان کو اگر طارق زنجانی سے کوئی ہمدردی ہے تو اس ہمدردی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اور اگر بات ہمدردی کی ہوتی تو طارق زنجانی کو مجھ سے بچا کر اسے اس کے گھر پہنچا دیا جاتا جبکہ آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ فروزاں نے آپ کو فون کیا تھا۔ اگر طارق زنجانی گھر پہنچ گیا ہوتا تو وہ آپ کو یہ بھی بتا دیتی۔"

شیر خاں نے سر ہلایا۔ "میں دوسرے ذریعے سے بھی تصدیق کر چکا ہوں کہ طارق زنجانی اپنے گھر نہیں پہنچا۔"

"کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے بابا کہ وہ نوجوان یا اس کا گروپ طارق زنجانی کو اغوا کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس کی کوشش تھی کہ اس میں کوئی رخنہ نہ پڑے، یعنی فروزاں اپنے ارادے سے باز آ جائے اور آپ سے کہہ دے کہ اب وہ اپنے باپ کو اپاہج نہیں بنانا چاہتی۔"

''سب سے اہم سوال تو یہی آتا ہے۔ آخر اس نوجوان کو فروزاں کے عزائم کا علم کیسے ہوا؟''

''میرا خیال تو بار بار اکبر کی طرف جا رہا ہے لیکن آپ اسے کند ذہن شخص سمجھتے ہیں۔''

''اگر میں اب اپنی یہ رائے تبدیل کرلوں تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ اکبر یہ سب کچھ کیوں کرے گا۔ فروزاں کو مجھ تک پہنچانے میں بنیادی کردار تو وہی تھا۔''

''شاید وہ کوئی دہرا کھیل، کھیل رہا ہو؟''

''وہ کیا کھیل ہوسکتا ہے؟'' شیر خاں نے کہتے ہوئے داراب کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا لیکن داراب کچھ سوچتا ہوا فرش کی طرف دیکھنے لگا۔

''بہرحال۔'' شیر خاں پھر بولا۔ ''تم نے پہلی مرتبہ اپنا ریکارڈ خراب کیا ہے۔ پہلے کبھی تم کسی ایسے کام میں ناکام نہیں ہوئے جو میں نے تمہیں سونپا ہو۔''

''مجھے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ ایسی کوئی سچویشن بن جائے گی۔''

''تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔'' شیر خاں نے زور دے کر کہا۔ ''یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فروزاں کو دھمکانے والے ایک نامعلوم نوجوان کی شخصیت علم میں آ چکی تھی۔''

داراب نے نظریں جھکا لیں۔

''خیر۔'' شیر خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آنے والے دو ایک دن یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ اب تم جاؤ۔ میں بھی اب سوؤں گا۔''

داراب سوچ میں ڈوبا ہوا شیر خاں کے دفتری کمرے سے نکل آیا۔ اس کا رخ دوسری منزل کے زینے کی طرف تھا۔ ہوٹل کی اسی منزل کا ایک کمرا داراب کے لیے مخصوص تھا۔

کمرے میں پہنچ کر داراب بستر پر نہیں لیٹا۔ وہ ٹہلتا اور کچھ سوچتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے یقین تھا کہ شیر خاں اب سو چکا ہوگا۔ وہ سونے کا ارادہ ظاہر کرچکا تھا اور داراب کو یہ بات معلوم تھی کہ جب وہ سونے کے ارادے سے بستر پر لیٹتا تھا تو اسے نیند آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔

داراب اپنے کمرے سے نکلا۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی اس لیے ہوٹل کی عمارت پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ سکوت اور ویرانی، لیکن اس کے باوجود داراب نے یہ احتیاط برتی کہ وہ کسی ملازم کی بھی نظر میں آئے بغیر ہوٹل سے باہر نکل جائے۔

داراب کو اپنے اس مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ ذرا دیر بعد ہی اس کی موٹر سائیکل تنگ اور پیچیدہ راستوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ وہ راستے اختیار کرنے کا سبب یہ تھا کہ وہ کسی پولیس موبائل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تیز رفتار موٹر سائیکل کی رفتار بیس منٹ بعد تیزی سے کم ہوئی اور پھر وہ ایک ایسے مکان کے سامنے رکی جو زیرِ تعمیر علاقے میں تھا۔

موٹر سائیکل ایک تاریک گوشے میں کھڑی کرکے وہ مکان کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اس نے بہت آہستگی سے کھٹکھٹایا تھا لیکن اندر سے فوراً پوچھا گیا۔ ''کون؟''

داراب نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اندر سے فوراً دروازہ کھول دیا گیا۔ داراب اندر داخل ہوا دروازہ بند کرلیا گیا۔ وہاں تین آدمی موجود تھے جو صورت شکل اور وضع قطع سے اچھے آدمی معلوم نہیں ہو رہے تھے۔

''تم لوگوں کی گاڑی کہاں ہے؟'' داراب نے پوچھا۔

''یہاں سے کچھ ہی دور، ایک محفوظ جگہ پر ہے۔''

داراب نے اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی جو وہ اپنے کمرے سے لے کر چلا تھا۔

''یہ لو۔'' اس نے گڈی ان میں سے ایک آدمی کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تم تینوں کا معاوضہ ہے۔ اب تم تینوں جاسکتے ہو۔ اسے اسی کمرے میں بند کیا ہے نا جہاں میں نے کہا تھا؟''

اس سوال کا جواب اثبات میں دیا گیا۔

داراب پھر بولا۔ ''ایک بار پھر یہ تاکید کررہا ہوں کہ تم تینوں یہ راز اپنے سینوں میں دفن رکھنا۔ اگر کبھی یہ بات کھل گئی تو....'' وہ ذرا سا رکا، پھر بولا۔ ''مجھے تو بابا کے عتاب کا نشانہ بننا ہی پڑے گا لیکن وہ تم تینوں کا بھی بہت برا حشر کریں گے۔''

''ہم جانتے ہیں۔'' انہی میں سے ایک بولا۔

''بس اب جاؤ۔''

ان تینوں کو رخصت کرکے داراب نے بیرونی دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پھر اس مکان کے ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچا جو باہر سے مقفل تھا۔ قفل کی چابی دروازے کے پاس ہی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ داراب نے وہ چابی اٹھا کر قفل کھولا۔ فوراً ہی اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیزی سے چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا ہو۔

''پیچھے ہٹ جائیے مسٹر زنجانی!'' داراب سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ ''میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اس لیے آپ کی کوئی بھی غلط حرکت آپ کی موت کا سبب تو نہیں بنے گی لیکن کئی گولیاں آپ کے جسم کے مختلف حصوں کو زخمی ضرور کردیں گی۔''

پھر جب داراب دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نال طارق زنجانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس کمرے میں ایک کرسی کے سوا کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔

داراب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کرسی میں نے یہاں اس لیے رکھوا دی تھی کہ جب تک میں یہاں آؤں، آپ صرف ٹہلتے نہ رہیں۔ اس کرسی پر بیٹھ کر آرام بھی کرسکیں۔''

طارق زنجانی اعصابی طور پر ایک مضبوط شخص تھا۔ اس نے داراب کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تو مجھے اغوا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں یہاں کرسی پر بیٹھا رہوں؟''

''نہیں۔'' داراب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اغوا کا مقصد تو آپ کی بہتری ہے۔''

''بہت خوب۔'' طارق زنجانی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری بہتری غالباً اس میں ہوگی کہ تم زرِ تاوان لے کر مجھے رہا کرنا چاہتے ہوگے؟''

''آپ غلط سمجھے ہیں۔'' داراب نے کہا۔ ''آپ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ آپ کے خلاف کیا سازش ہوئی تھی اور اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ سازش کامیاب بھی ہو جاتی۔''

طارق زنجانی اسے گھورنے لگا۔ ''کیا سازش ہوئی تھی میرے خلاف؟ اور تم میرے اتنے ہمدرد کیوں بن گئے کہ سازش سے بچانے کے لیے مجھے اغوا کروایا۔ اگر یہ سب کچھ سازش سے بچانے کے لیے تھا تو مجھے میرے گھر بھیج دینے کے بجائے یہاں کیوں قید کردیا گیا؟''

''اس لیے کہ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''آخر تم ہو کون؟''

''آپ کو شاید یقین نہ آئے، لیکن جب میں آپ کو کچھ یاد دلاؤں گا تو میرا خیال ہے کہ آپ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ویسے یہ میری خواہش نہیں ہے کہ آپ یقین کریں۔ میں تو آپ کے سامنے بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایک مجبوری کی وجہ سے ایسا ہوا۔''

طارق زنجانی اسے گھورتا رہا۔ اس کے خوف زدہ نہ ہونے کی وجہ اس کے اعصاب کی مضبوطی کے علاوہ اس کا یہ خیال بھی ہوسکتا تھا کہ وہ لوگ اگر اسے مارنا چاہتے تو مار چکے ہوتے۔ انہوں نے اسے زندہ اسی لیے رکھا تھا کہ اس کے عوض تاوان میں کوئی بڑی رقم وصول کرسکیں۔

''کمرے میں آنے سے پہلے میں نے آپ کو مسٹر زنجانی کہہ کر مخاطب کیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔'' داراب نے کہا اور پھر یکایک اس کے لہجے میں افسردگی آگئی۔ ''میں فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں کیونکہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔''

طارق زنجانی چونک پڑا۔

''ہاں۔'' داراب پھر بولا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، شادیاں کرنا اور پھر ان عورتوں کو طلاق دے کر چھوڑ دینا آپ کے مزاج کا ایک حصہ رہا ہے۔ آپ یقیناً بھولے نہیں ہوں گے کہ آپ نے لاہور میں بھی ایک شادی کی تھی۔ اس عورت کا نام قدسیہ تھا جو میری ماں تھی۔''

طارق زنجانی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''آٹھ سال بعد آپ نے اسے طلاق دے دی۔'' داراب کہتا رہا۔ ''میں اس وقت سات سال کا تھا۔ ماں مجھے ساتھ لے گئی۔ آپ کا مزاج بہت عجیب و غریب ہے، بہت غیر معمولی! آپ ایک ایسی لڑکی کو تو بے حد چاہتے ہیں جو دراصل آپ کی بیٹی نہیں لیکن آپ نے میری پروا نہیں کی، اپنے سگے بیٹے کی پروا نہیں کی۔ میری ماں مجھے لے کر چلی گئی۔ اگرچہ شادیاں کرنا اور طلاقیں دینا شاید آپ کی عادت ہے لیکن میری ماں کو جو طلاق دی گئی، اس کا قصوروار میں آپ کو نہیں ٹھہراؤں گا۔ ماں نے آپ سے طلاق لینے کے بعد کسی اور سے شادی کرلی تھی۔ مجھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ میں نے میٹرک تک پڑھا۔ میری ماں مجھے بتایا کرتی تھی کہ میرا باپ، یعنی آپ ایک برے آدمی نہیں تھے لیکن میٹرک تک پڑھتے پڑھتے مجھے اندازہ ہو گیا کہ دراصل میری ماں ہی ایک اچھی عورت نہیں تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ دوسرے مردوں سے بھی تعلقات رکھتی تھی۔ جس آدمی سے اس نے آپ کے بعد شادی کی تھی، وہ اس کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھی۔ جب اس شخص کو اس کا علم ہوا تو اس نے بھی میری ماں کو طلاق دے دی۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ اس کے بعد وہ کسی کے بچے کی ماں نہیں بنی۔ پھر تیسری شادی اس کی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو دلال تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی اپنا ذریعۂ آمدنی بنایا اور میری ماں خوشی خوشی بنی رہی۔ وہ تھی ہی ایسی عورت! میٹرک تک پہنچتے

پہنچتے مجھے اس کا یقین ہو گیا۔ اس سے پہلے بس میرے شبہات بڑھتے رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے ساتھ بھی بے وفائی کرتی رہی ہوگی مگر کیونکہ آپ کراچی میں رہتے ہیں اور لاہور کبھی کبھی آتے تھے اس لیے میری ماں کی حرکات کا علم آپ کو آٹھ سال بعد ہوا ہوگا۔ تبھی آپ نے اسے طلاق دی۔ میں نے جب فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا تو میں نے اپنی ماں کو ایک شخص کے ساتھ ایسی حالت میں دیکھا کہ میرا خون کھول گیا۔ گھر میں ایک گنڈاسا تھا۔ اسی سے میں نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور لاہور سے کراچی بھاگ آیا۔"

طارق زنجانی کی حالت اب ایسی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

داراب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چہرے پر افسردہ تاثرات کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ریوالور اب اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "کراچی میں میری ملاقات یہاں کے ایک بڑے کرمنل گروپ کے سرغنہ سے ہوئی۔ میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب اس کا ذکر کرتے ہوئے میں اسے ماسٹر کہوں گا۔ ماسٹر نے مجھے پناہ دی۔ اسی نے مجھے نہ صرف قانون کی گرفت میں آنے سے بچایا بلکہ لاہور میں میری ماں اور اس کے آشنا کے قتل کی پولیس فائل بھی بند کروا دی۔ اس کے وسائل اور تعلقات اتنے ہیں کہ وہ کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ کبھی جیل نہیں گیا۔ مجھے علم نہیں کہ ابتدا میں وہ خود کس قسم کے جرائم کرتا تھا لیکن اب اس نے ایک بہت بڑا گروہ بنا لیا ہے۔ اب وہ صرف اپنے آدمیوں سے کام لیتا ہے۔ انہی کاموں کے لیے اس نے میری تربیت بھی کی۔ میں اس کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ میں اب تک بہت سے جرم کر چکا ہوں اور اپنے ان کاموں میں اتنا طاق ہو چکا ہوں کہ ماسٹر اپنے آدمیوں میں مجھے ہی سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے اور میں اس کا نہایت سعادت مند شاگرد ہوں۔ گروہ کے بعض لوگ تو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ میں اس کا بیٹا ہی ہوں۔"

دم بہ خود طارق زنجانی اس طرح وہ سب کچھ سن رہا تھا جیسے کوئی بچہ کوئی حیرت انگیز کہانی سنا رہا ہو۔

داراب کچھ رک رک کر بولتا رہا۔ "میڈیکل سائنس اب اتنی آگے جا چکی ہے کہ اگر مجھے آپ کی دولت کی ہوس ہوتی تو میں خود کو آپ کا بیٹا ثابت بھی کر دیتا لیکن مجھے آپ کی دولت اور آپ کی جھوٹی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنی دنیا میں بہت خوش ہوں۔ مجھے شاید صحیح طریقے سے بولنا نہ آتا ہو لیکن میں کہوں گا کہ آپ کی دنیا کے لوگ اچھے کاموں میں بھی بے ایمانی کرتے ہیں جبکہ میری دنیا میں وہ کام بھی ایمان داری سے کیے جاتے ہیں جن کو آپ کے معاشرے میں برا کام کہا جاتا ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" طارق زنجانی نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"میرا نام آپ نے تو شاید بختیار رکھا تھا لیکن۔" داراب نے طارق زنجانی کو چونکتے دیکھا تو پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اب شاید آپ کو یقین آیا کہ میں واقعی آپ کا بیٹا ہوں۔ خیر، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ماسٹر نے میرا نام داراب رکھا تھا۔ اب بھی مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔ اسی نام سے میرا شناختی کارڈ بھی ہے۔ اس میں میرے باپ کے نام کے بجائے میرے ماسٹر نے اپنا نام لکھوایا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ جیسے شخص کی ولدیت کے خانے میں آپ کا نام لکھا جائے۔"

"تم نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟" طارق زنجانی نے پوچھا۔

"ایک لڑکی نے میرے ماسٹر سے رابطہ کیا تھا۔" داراب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنے لگا۔ "اس نے ماسٹر کو اس کام کی ایک بڑی رقم دی تھی کہ وہ آپ کی ٹانگیں گولیوں سے چھلنی کروا دے۔"

"کیوں؟" طارق زنجانی کے لہجے میں حیرت آ گئی، پھر اس نے پوچھا۔ "کون تھی وہ لڑکی؟"

"یہ بھی بتاؤں گا۔" داراب نے کہا۔ "لیکن میں آپ کو پہلے سارا قصہ سنانا... چاہتا ہوں۔ میں اس شہر میں آنے کے بعد آپ سے واقف ہو گیا تھا۔ جب آپ نے میری ماں کو طلاق دی تھی تو میں سات سال کا تھا۔ آپ کے نقش و نگار میرے ذہن میں کچھ دھندلا تو گئے تھے لیکن جب میں نے آپ کو دیکھا تو وہ نقش و نگار میرے ذہن میں پوری طرح ابھر آئے۔ آپ کا نام تو مجھے معلوم ہی تھا۔ یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ آپ کراچی کے ایک نامور بزنس مین ہیں۔ میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو میرے دل میں محبت کی بڑی شدید لہر اٹھی تھی۔ بہت جی چاہا تھا کہ آپ کے سینے سے جا لگوں لیکن میں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ میں بعد میں بھی کبھی آپ کے گھر یا دفتر کے چکر لگا کر آپ کو دیکھ لیا کرتا تھا لیکن میں نے اپنی یہ خواہش سختی سے دبا لی تھی کہ ایک بیٹے کی حیثیت سے کبھی آپ کے سامنے جاؤں۔ آج مجھے یہ سب کچھ اس لیے کرنا پڑا ہے کہ آپ میری کچھ اور باتوں پر بھی یقین کر لیں جو میں ابھی آپ سے کہوں گا۔"

"تم مجھے کسی لڑکی کے بارے میں بتا رہے تھے۔" طارق زنجانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں۔" داراب نے کہا۔ "اس لڑکی نے جس کام کے لیے میرے ماسٹر کی خدمات حاصل کی تھیں، اس کا وہ کام ماسٹر نے میرے سپرد کیا تھا اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مجھے آپ کی ٹانگیں چھلنی کرنا ہیں تو میری جان نکل گئی۔ میرے دل و دماغ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ میں آپ کو اپاہج بنا دوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ماسٹر کو آپ کے بارے میں بتاتا۔ ماسٹر کا اصول ہے کہ جب ہم کوئی کام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اسے انجام دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں، اگر ہمارا کوئی رشتے دار بھی اس میں حائل ہو تو اس کی پروا نہ کریں۔ ماسٹر کے اس اصول کی وجہ سے میں ایک بہت بڑے امتحان میں پڑ گیا۔ اس کے بعد میں نے اس لڑکی ہی کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تاکہ وہ اپنے اس عزم سے باز آ جائے جس کی تکمیل کے لیے اس نے ماسٹر کو ایک رقم دی تھی۔ اگر وہ ماسٹر سے کہہ [illegible] ارادہ بدل دیا ہے تو ماسٹر اس سے ملی ہوئی رقم کا نصف حصہ اسے واپس کر دیتا جو اس کا ایک اصول ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ضدی لڑکی باز نہیں آئی۔ میں ماسٹر سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کام نہیں کروں گا اس لیے اسے دکھانے کے لیے مجھے ایک ڈراما کرنا پڑا۔ آپ کی کار کے ٹائر برسٹ کر کے میں آپ کی کار کی طرف بڑھا۔ جیسے میں آپ کی ٹانگ پر فائرنگ کر کے آپ کی ٹانگیں بے کار کر دوں گا لیکن اسی وقت ایک جانب سے فائر ہونے لگے۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ فائرنگ مجھ پر کی جا رہی ہو لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ جن تین آدمیوں نے فائرنگ کی تھی اور جنہوں نے آپ کو اغوا کیا تھا، وہ میرے ہی گروہ کے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں ایک بڑی رقم دے کر اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ یہ سارا ڈراما ماسٹر کے علم میں نہیں ہے۔ اگر کبھی اس کے علم میں آ گیا تو میری شامت بھی آ جائے گی اور ان تینوں کا بھی بہت برا حشر ہوگا۔"

"تم سچ مچ قدسیہ کے بیٹے ہو۔" طارق زنجانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تمہارے بچپن کے نقش و نگار میرے دماغ میں اچھی طرح ابھر آئے ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" داراب نے کہا۔ "میں اب آپ سے یا آپ کی دنیا کے قریب نہیں ہونا چاہتا۔ نہ ہو سکتا ہوں۔ ہم جیسے لوگ جب جس راہ پر چل پڑتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اب واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے ہے۔" طارق زنجانی نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "تم طارق زنجانی کے بیٹے ہو، اور طارق زنجانی اس ملک میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" داراب نے تلخی سے کہا۔ "آپ کی دنیا میں بہت بے ایمانیاں ہوتی ہیں۔ میں اس دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ جانا چاہوں بھی تو نہیں جا سکتا۔ ماسٹر مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، لیکن اسے شدت سے احساس ہو جائے گا کہ میری زندگی اس کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ مجھے ختم کر دیا جائے گا۔"

"میں تمہیں یہاں سے بہت دور بھیج دوں گا۔" طارق زنجانی نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "امریکا یا جنوبی امریکا کے کسی ملک میں۔ تم وہاں محفوظ رہو گے۔ میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتا بیٹے! یقین کرو، میں تمہیں کبھی نہیں بھولا۔ قدسیہ جب تمہیں لے گئی تھی تو میں نشے میں تھا۔ میں نے بعد میں صرف تمہاری خاطر قدسیہ کو تلاش کروانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس وقت میرا اثر رسوخ اور تعلقات اتنے نہیں تھے جتنے اب ہیں۔ اب میں تمہیں..."

داراب نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔ "پلیز! اب آپ میری کچھ باتیں سن لیجیے! میں وہی باتیں کرنے کے لیے آپ کے سامنے آیا ہوں۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ نے کئی شادیاں خفیہ طور پر کی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میری ماں نے مجھے سچ بتایا تھا یا غلط، لیکن میں آپ کی اس شادی سے ضرور واقف ہوں جو آپ نے صابرہ بیگم سے کی تھی۔ آپ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ نہایت افسوسناک ہے۔ آپ نے بس یہ ایک اچھا کام کیا کہ ان کی بچی کو اپنے پاس رکھا اور اس کی پرورش اپنی بیٹیوں ہی کی طرح کی۔ آپ فروزاں سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن آپ کی یہ محبت رائگاں جا چکی ہے۔ فروزاں کو بھی آپ سے محبت تھی لیکن جب سے اسے اپنی ماں کا علم ہوا ہے، اس کی محبت نفرت میں بدلتی چلی گئی ہے۔"

طارق زنجانی چونکا۔ "کیا وہی مجھے اپاہج بنوانے کے لیے تمہارے ماسٹر کے پاس گئی تھی؟"

"ہاں۔" داراب نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ چاہتی ہے

کہ اب آپ بھی اس کی ماں کی طرح اپاہجوں کی طرح زندگی گزاریں۔ میں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی، اسے خوفناک حد تک ڈرایا دھمکایا تھا لیکن اس کے دل میں جاگی ہوئی نفرت اتنی طاقتور ہے کہ وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔"

طارق زنجانی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

داراب کہتا رہا۔ "میں نہیں جانتا کہ اس کی نفرت اتنی شدید کیوں ہوگی ہے لیکن میں آپ سے ایک توقع رکھتا ہوں۔ اب آپ اپنی زندگی کی ایک طویل اور شاید کامیاب اننگ کھیل چکے ہیں۔ اب آپ ایک بہت اچھا انسان ہونے کا ثبوت دیجیے گا۔ اگر آپ میری، اپنے بیٹے کی پہلی اور آخری خواہش پوری کر دیں تو بہت اچھا ہو۔ آپ فروزاں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کیجیے گا۔ وہ میری سگی بہن نہ سہی لیکن آپ ہی کی طرح میں بھی اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ دنیا میں شاید ایسے لوگ ہوتے ہیں جن سے بھی کو محبت ہو جاتی ہو گی۔ فروزاں بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کے لیے اس کا غیظ و غضب ایک فطری بات ہے۔ ماں کے لیے تو کوئی بھی تڑپ سکتا ہے۔ لڑکوں کی بہ نسبت خصوصاً لڑکیوں کو اپنی ماں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ اسی محبت نے فروزاں کو آپ کے خلاف کر دیا ہے۔ اپنی ماں کی حالت دیکھ کر اس کا دل زخمی ہو گیا ہے۔ آپ اس کے زخم پر مرہم رکھیے گا۔ صابرہ بیگم کو پھر اپنے قریب کر لیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ فروزاں کے زخم مندمل ہو جائیں گے وہ پھر آپ سے محبت کرنے لگے گی۔ بس! مجھے آپ سے صرف اتنا ہی کہنا تھا۔ میں آپ کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا ہوں۔ آپ بہت ندامت محسوس کر رہے ہیں، لیکن خدا کے لیے میری باتوں کے جواب میں یہ فلمی مکالمہ نہ بولیے گا کہ میں نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔"

طارق زنجانی کے ہونٹوں پر پژمردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

داراب خاموش نہیں رہا۔ "صبح اب قریب ہے۔ مجھے جانا چاہیے۔ میں کمرا بند کر کے نہیں جاؤں گا۔ آپ یہاں کچھ وقت اور گزاریے! روشنی ہو جائے تو باہر نکلیے گا۔ کوئی ٹیکسی رکشا آپ کو مل ہی جائے گا۔"

"رک جاؤ میرے بیٹے!" طارق زنجانی جذباتی لہجے میں بولا۔ "اب مجھ سے دور نہ جاؤ۔ میں تمہیں..." طارق زنجانی کی آواز اتنی گلوگیر ہو گئی کہ الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔

پہلی مرتبہ داراب کے چہرے پر بے حد اداس سی مسکراہٹ آئی لیکن اس نے مزید کچھ کہے بغیر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔

موٹر سائیکل ایک بار پھر فراٹے بھرنے لگی۔

صبح کی روشنی پھیلنے میں چند منٹ باقی تھے جب وہ ہوٹل کے ..... کمرے میں تھا۔

بستر پر چت لیٹے ہوئے داراب کے چہرے پر اب بھی اداسی تھی۔ نیند کا دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ اس وقت چونکا جب اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال کرنے والا شیر خاں تھا۔

"تم سو تو نہیں رہے تھے؟" شیر خاں کے لہجے میں نرمی تھی۔

"نہیں بابا! آج میری آنکھ ہی نہیں لگی۔"

"تو فوراً میرے پاس آؤ۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

داراب عجلت میں اٹھا۔ وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ اس فوری طلبی کا پس منظر کیا ہوگا۔

اس وقت صبح کے سات بج چکے تھے۔ داراب شیر خاں کی خواب گاہ میں پہنچا۔ شیر خاں کا وہ کمرا ہوٹل ہی میں اس کے دفتری کمرے سے متصل تھا۔ شیر خاں اس وقت اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک اسپول ریکارڈر رکھا تھا۔ شیر خاں کے پاس بڑے بڑے اساتذہ کے گائے ہوئے راگوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔

داراب نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ شیر خاں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے بابا!" داراب مسکرایا۔ "اس وقت آپ عموماً وہ راگ سنا کرتے ہیں جس کا نام آپ نے... ہاں! یاد آ گیا۔ بھیرو بتایا تھا۔"

"ہوں۔" شیر خاں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے اسپول ریکارڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آن کر دو۔"

"آپ نے اتنی صبح صبح کیسے بلا لیا بابا؟" داراب نے اسپول ریکارڈر آن کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو طارق زنجانی کے بارے میں کوئی اطلاع..." وہ ایک جھٹکے سے خاموش ہو گیا۔ وہ جھٹکا اس کے دل و دماغ بلکہ سارے جسم ہی کو لگا تھا۔ اسپول ریکارڈر سے ابھرنے والی آوازیں طارق زنجانی اور داراب کی تھیں۔ داراب اس سے جو باتیں کر کے آیا تھا، وہی اسپول میں بھری ہوئی تھیں۔

داراب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بری طرح گھبرا

گیا لیکن شیر خاں کے ہونٹوں پر اس وقت بھی مسکراہٹ تھی۔

داراب نے کچھ بولنا چاہا لیکن بول نہیں سکا۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

شیر خاں مسکراتا ہوا بولا۔ "ریکارڈر میں تمہاری وہ ساری باتیں بھری ہوئی ہیں جو تم نے طارق زنجانی سے کی تھیں۔ اگر تم وہ ساری باتیں نہ سننا چاہو تو اسپول ریکارڈر بند کر دو۔"

داراب نے اسپول ریکارڈر بند کیا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ حلق میں کانٹے پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے دوبارہ شیر خاں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی کھڑا ہوا تھا۔

"داراب!" شیر خاں نرمی سے بولتا رہا۔ "تم نے آدمیوں کا انتخاب کرنے میں غلطی کی تھی، بلکہ تم جو بھی انتخاب کرتے غلط ہوتا۔ تم کسی کو کتنی بھی بڑی رقم دو، وہ مجھ سے غداری نہیں کر سکتا۔ مجھے انہوں نے کل شام ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے تم پر اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور ان تینوں کو بھی تاکید کر دی کہ وہ بالکل ویسا ہی کریں جیسا تم ان سے چاہتے تھے۔ دراصل میں دیکھنا چاہتا تھا داراب کہ تمہیں آخر سوجھی کیا ہے، تم یہ ڈراما کیوں کرنا چاہتے ہو، تمہیں طارق زنجانی سے کیا ہمدردی ہے؟"

داراب کی بدتو یہ حالت رہی کہ اگر کاٹو تو جسم سے لہو نہ نکلے۔ اگرچہ داراب نرم لہجے میں باتیں کر رہا تھا لیکن داراب کے لیے وہ نرمی ہی حد درجہ خوف زدہ کر دینے والی تھی۔ وہ خود بہت دلیر تھا لیکن دنیا میں اگر کسی کے سامنے اس کی روح لرز جاتی تھی، وہ صرف شیر خاں تھا۔

"بابا!" وہ بہ مشکل بول سکا۔ "یہ میری پہلی غلطی ہے کہ میں نے اپنے پیشے میں ایک رشتے کا خیال رکھا۔"

شیر خاں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر داراب کے قریب آیا۔ اس نے اپنے دونوں وزنی ہاتھ داراب کے شانوں پر رکھ دیے اور بولا۔ "میں نے تمہاری یہ غلطی اس لیے معاف کر دی ہے میرے بچے کہ تم نے اپنے اصلی باپ کی پیشکشیں ٹھکرا دیں اور اپنے اس نقلی باپ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ تم نے میرا دل نہیں توڑا۔ تمہاری جدائی مجھے بہت شاق گزرتی میرے بیٹے!"

داراب چونکے ہوئے انداز میں شیر خاں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔" شیر خاں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "تیری جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی میرے بیٹے!"

"بابا!" داراب کے منہ سے نکلا اور شیر خاں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "تو میرے دل کی ٹھنڈک ہے داراب! میں نے پہلے کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا لیکن تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ مجھے تجھ سے کتنی محبت ہے۔"

یہ داراب کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ اس نے شیر خاں کی جذبات سے بوجھل آواز سنی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ خود اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

شیر خاں بڑی محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "طارق زنجانی اب شاید اپنے گھر پہنچنے ہی والا ہوگا۔ تمہیں اس کے گھر کے معاملات پر نظر رکھنا چاہیے۔ تم نے اتنا سب کچھ کیا ہے۔ اب تمہیں دیکھنا بھی چاہیے کہ نتائج تمہاری خواہش کے مطابق نکلتے ہیں یا نہیں۔"

"بابا!" داراب نے شیر خاں کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے باپ نے وہ سب کچھ نہ کیا، جو میں چاہتا ہوں تو پھر ساری زندگی اپاہج کی حیثیت سے گزارنا اس کا مقدر ہو جائے گا۔ میں فروزاں کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ اپنے باپ کی یہ غلطی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔"

"تو جاؤ، جا کر صورتِ حال پر نظر رکھو۔" شیر خاں نے داراب کی پیشانی چومی اور اسے رخصت کر دیا۔

اس وقت داراب ایک کار میں طارق زنجانی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کی کار طارق زنجانی کے گھر کے سامنے سے گزری۔ اس نے پولیس کی دو موبائل گھر کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھیں اور الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی کار کی رفتار آہستہ کر دی۔ اسی وقت اس کے موبائل فون پر شیر خاں کی کال آئی۔ اس نے داراب سے کہا۔

"مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ طارق زنجانی اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔"

"ایسا معلوم تو ہوتا ہے بابا! میں نے ابھی ابھی پولیس کی دو گاڑیاں اس کے گھر میں جاتے دیکھی ہیں۔"

شیر خاں ہنسا۔ "کیا تم اس کی وجہ سے پریشان ہو؟"

"نہیں۔" داراب نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ طارق زنجانی کا اثر رسوخ اور تعلقات کتنے وسیع ہیں۔ میں بس اس الجھن میں پڑ گیا تھا کہ اس سارے معاملے سے طارق زنجانی خود کو کس طرح نکالیں گے۔"

"مجھے اچھا لگا کہ طارق زنجانی کا ذکر اب تم احترام سے کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا بھی الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ کسی طرح بھی سارا معاملہ دبا دے گا۔" "اچھا بس! میں نے

تمھیں صرف یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔"
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
کچھ آگے نکل جانے کے بعد داراب نے اپنی کار واپس موڑی۔ آدھے گھنٹے تک وہ طارق زنجانی کے گھر کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ اسی دوران میں پولیس کی گاڑیاں واپس جا چکی تھیں۔ داراب نے فروزاں کی کار باہر نکلتے دیکھی۔ اس کے برابر میں طارق زنجانی بیٹھا ہوا تھا۔ فروزاں بہت خوش نظر آرہی تھی۔
داراب نے کار کا تعاقب کیا۔
فروزاں کی کار صابرہ بیگم کے گھر کے سامنے جا کر رکی۔ فروزاں اور طارق زنجانی گھر کے اندر چلے گئے۔
داراب نے سمجھ لیا کہ طارق زنجانی نے فروزاں کو سب کچھ بتانے کے ساتھ ساتھ اپنی شرمندگی کا اظہار کیا ہوگا اور صابرہ بیگم کو دوبارہ اپنے پاس لانے پر آمادگی بھی ظاہر کی ہوگی۔
داراب گھر کی نگرانی کر رہا تھا کہ اس نے وہاں ایک ایمبولینس آکر رکتے دیکھی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں صابرہ بیگم دنیا سے رخصت تو نہیں ہوگئی!
لیکن ایسا نہیں تھا۔ صابرہ بیگم وہیل چیئر پر گھر سے باہر آرہی تھی۔ فروزاں اور طارق زنجانی وہیل چیئر کے پیچھے پیچھے تھے۔
صابرہ بیگم کو اس وہیل چیئر پر شہر کے سب سے بڑے اسپتال لے جایا گیا۔ وہ وہاں داخل کر دی گئی۔
اسپتال میں کام کرنے والوں میں سے کئی ایسے تھے جن سے داراب کو اسپتال کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس نے معلوم کر لیا کہ صابرہ بیگم کے دماغ میں رسولی ہو گئی تھی۔ اسے آپریشن کے لیے امریکا لے جایا جانا تھا۔ اسے امریکا لے جانے کی تیاری میں جو دو ایک دن یا دو چار دن لگتے، اس عرصے کے لیے اسے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا تاکہ وہاں اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔
دوسرے دن کے اخبارات میں طارق زنجانی کا بیان شائع ہوا۔ بیان میں اس نے بتایا تھا کہ اسے اغوا کرنے والے اس کے عوض ایک بھاری تاوان وصول کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ان کی گرفت سے نکل کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنے چھٹکارے اور فرار کے لیے اس نے ایک مناسب کہانی گھڑ لی تھی۔
اسی دن شیر خان نے داراب کو بتایا۔ "طارق زنجانی نے اپنے بھتیجے اکبر کو اپنے گھر سے رخصت کر دیا ہے اور اسے تاکید کر دی ہے کہ وہ آئندہ اس گھر کا رخ نہ کرے۔ میں نے اسے اپنے ایک آدمی کے ذریعے پیغام بھجوا دیا ہے کہ اگر اس نے کسی سے فروزاں کے عزائم کا ذکر کیا یا کسی کے سامنے میرا نام لیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔"
"یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔" داراب نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پولیس ان لوگوں کو تلاش تو کرے گی جنھوں نے اسے اغوا کیا تھا۔"
"طارق زنجانی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ سارا معاملہ دبوا دے گا۔ وزیرِ داخلہ اس کا بچپن کا دوست ہے۔ یہ ساری کہانی یہیں ختم ہو جائے گی۔"
شیر خان کا خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ اخبارات نے اس بارے میں کوئی اور خبر شائع نہیں کی۔
چوتھے دن داراب نے فروزاں، طارق زنجانی اور صابرہ بیگم کو اس طیارے میں سوار ہوتے دیکھا جو امریکا جا رہا تھا۔
چند ماہ بعد اخبارات میں خبر آئی کہ وہ تینوں امریکا سے لوٹ آئے تھے۔ صابرہ بیگم کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اس کے دماغ سے رسولی نکال دی گئی تھی۔
پھر ایک ماہ بعد شیر خاں نے داراب کو چونکا دیا۔
"فروزاں آئی تھی۔"
"کب؟" داراب نے چونک کر پوچھا۔
"آج ہی۔" شیر خاں نے جواب دیا۔ "وہ وعدہ کر کے گئی ہے کہ آئندہ کبھی نہ تو اس طرف کا رخ کرے گی اور نہ کبھی اس کی زبان پر میرا نام آئے گا لیکن تمہارے لیے وہ ایک دعوت نامہ اور ایک رقعہ چھوڑ گئی ہے۔"
وہ دعوت نامہ احسن سے فروزاں کی شادی کا تھا۔
رقعے کی تحریر مختصر لیکن پُراثر تھی۔ فروزاں نے لکھا تھا۔
"بھیا! میری شادی میں ضرور آنا۔ تم سے میرا رشتہ پس دیوار کا ہے لیکن دیواریں کوئی رشتہ ختم نہیں کر سکتیں۔ تم سے میرا ایک رشتہ بہت بڑا ہے کہ تم میری، میری ماں کی اور میرے والد کی زندگی میں ایک نیا اور خوش گوار موڑ لے آئے۔ اگر تم نے میری شادی میں شرکت نہ کی تو مجھے بہت رنج ہوگا۔ اس کے بعد تم ہم لوگوں سے ملو یا نہ ملو، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے ... تمہاری بہن، فروزاں۔"
یہ سطریں پڑھتے ہوئے داراب کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اسے سچ مچ ایسا لگا جیسے اچانک اسے ایک بہن مل گئی ہو۔

وہ دونوں ایک قریبی ریستوران میں ڈنر ختم کرنے کے بعد اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہے تھے۔ ویٹر کھانے کے برتن سمیٹ کر جانے لگا تبھی ٹام نے غور سے کولن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا بات ہے... تم کچھ فکرمند نظر آرہے ہو؟ کیا اگلے ویک اینڈ کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"
"تم ایسا سوچ سکتے ہو۔" کولن نے جواب دیا۔ "دراصل میں 'روزمیری ز بے بی' کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے۔ یہ ایک ایسے ایکٹر کی کہانی ہے جو براڈوے میں ایک اہم رول حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی کو آگے بڑھاتا ہے لیکن مجھے اس کا انجام یاد نہیں رہا۔"
"وہ دونوں ہالی ووڈ چلے جاتے ہیں اور بیورلے ہلز کی شان دار رہائش گاہ میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں۔" ٹام نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس کا لڑکا بھی پروڈیوسر بن جاتا ہے۔ ابتدا میں لوگ اس کی مذہبی رزمیہ نظموں کی وجہ سے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں لیکن ہم سیکس کی حسِ مزاح کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔"
"میرا خیال ہے کہ یہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے۔" کولن نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔
"تم بھی ان کے ساتھ ہی جاؤ گے، اگر یہ رول حاصل کرنے میں ناکام رہے۔" ٹام نے اسے اکسانے کی کوشش

چونکا دینے والے انجام کی ایک دلچسپ قتل کہانی

تنویر ریاض

آخری نکتہ

قتل کی ایک واردات کی روداد ... اس نے نہایت باریک بینی سے اپنے منصوبے کو تشکیل دیا تھا ... مگر قدرت کے کارخانے میں اس کے لیے کچھ اور ہی ترتیب دیا ہوا تھا۔

www.pkdigest.com

کی۔ ”تم چھبیس سال کے ہو چکے ہو اور ابھی تک معاون کرداروں پر گزارہ کررہے ہو۔ اگر یہی حال رہا تو دو چار برس بعد کسی کو تمہارا نام بھی یاد نہیں رہے گا۔ اس لیے تمہیں فریڈی کے نئے ڈرامے میں یہ مرکزی کردار ضرور کرنا چاہیے۔“

”تم کیا چاہتے ہو... میں زبردستی کروں یا اسے جان سے ماردوں؟“

”یہ انسانیت پر احسانِ عظیم ہوگا۔“ ٹام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی یہ کام کرسکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہاری مدد درکار ہوگی۔“

”جانتے ہو اعانتِ جرم کرنے والا بھی شریک مجرم سمجھا جاتا ہے۔“

”زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں۔“ ٹام نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہم ویک اینڈ سے پہلے اس منصوبے پر ایک بار پھر غور کریں گے۔“

☆☆☆

وہ دونوں فریڈ لیکٹن کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے جو براڈوے کی کامیاب ٹیم لیکٹن اینڈ لیکٹن کا مصنف اور ہدایت کار تھا۔ اس کی بیوی ویرا نے پروڈیوسر کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی اور وہ دونوں نصف درجن سے زیادہ کامیاب ڈرامے پیش کرچکے تھے۔ اخبارات میں اس کی ذہانت اور فطانت کے چرچے تھے تو نجی محفلوں میں لوگ دل کھول کر اس کی برائیاں کرتے۔ مقبولیت اور کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے کئی دشمن بھی بنا لیے تھے اور اس کے حاسدوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا تاہم وہ ثابت قدمی سے اپنے کام میں لگا رہا اور قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہوتی رہی۔

اس کی بدقسمتی کا آغاز اس وقت ہوا جب اس نے غیر معروف اداکار ٹام ہیرنگٹن کو اپنے گزشتہ ڈرامے میں مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا۔ اس ڈرامے سے ٹام کی قسمت کھل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ میٹنی شوز کا مقبول اداکار بن گیا۔ ٹام کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا لیکن یہ خوشی اس وقت مایوسی اور پھر غصے میں بدل گئی جب اسے ایک دوسری کمپنی سے انتہائی پرکشش پیش کش ہوئی لیکن وکیل نے اسے بتایا کہ وہ یہ پیش کش قبول نہیں کرسکتا کیونکہ معاہدے کے مطابق وہ مسٹر لیکٹن کے ساتھ ایک اور ڈرامے میں کام کرنے کا پابند ہے۔ ٹام کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ لیکٹن اینڈ لیکٹن کے ساتھ دو ڈراموں میں کام کرنے کا معاہدہ کرچکا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس معاہدے کی تکمیل تک وہ کسی دوسری جگہ لیکٹن اینڈ لیکٹن کی اجازت کے بغیر کام نہیں کرسکتا۔ اس کے وکیل نے یہ بھی واضح کردیا تھا کہ مستقبل قریب میں اسے ایسی اجازت ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وکیل کے کہنے کے مطابق یہ معاہدہ صرف اسی صورت میں ختم ہوسکتا تھا جب دونوں میں سے کوئی ایک فریق اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائے۔ تب وکیل کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی ٹام نے فیصلہ کرلیا کہ وہ یہاں وہ ضرور جائے گا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ فریق ثانی کو جہنم کا راستہ دکھا دیا جائے۔

نیویارک تھیٹر میں کام کرنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح فریڈ لیکٹن نے ویسٹ پورٹ میں دوسرا گھر لے رکھا تھا جو گرانڈ سینٹرل اسٹیشن سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس گھر کی دیکھ بھال اور صفائی کے لیے انہوں نے روزا اور نز کو ملازمہ کے طور پر رکھا ہوا تھا اور دونوں میاں بیوی اکثر و بیشتر اپنا ویک اینڈ یہیں گزارتے تھے۔ معمول کے مطابق وہ ہفتے کی صبح گرانڈ سینٹرل اسٹیشن پہنچا اور اس نے ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے اے ٹی ایم کے ذریعے دو سو ڈالرز نکالے جو بیس بیس کے نوٹوں کی شکل میں تھے۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو روزا صفائی مکمل کرکے جانے ہی والی تھی۔

فریڈ سیدھا ماسٹر بیڈروم میں چلا گیا اور اس نے اپنا پرس، چابیاں اور ریزگاری نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر اس نے سوٹ اور ٹائی سے نجات حاصل کرکے شرٹ اور جینز پہنی اور ٹپ جانے کے ارادے سے پرس اٹھایا۔ ویرا حسبِ معمول ہیئر ڈریسر کے پاس گئی ہوئی تھی اور شام سے پہلے اس کی آمد ممکن نہ تھی۔ فریڈ نے احتیاطاً اپنا پرس کھول کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں صرف پانچ ڈالر کا نوٹ پڑا ہوا ہے۔ اے ٹی ایم سے نکالے ہوئے دو سو ڈالرز غائب تھے۔ اس کا دھیان فوراً ہی روزا کی طرف گیا کیونکہ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو روزا ہی صفائی کررہی تھی۔ فریڈ نے فوراً ہی پولیس کو فون کیا اور چند منٹوں بعد روزا اپنے شوہر الیونزو کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں موجود تھی۔ وہاں روزا اور فریڈ کے درمیان جھڑپ بھی ہوئی۔ روزا کا کہنا تھا کہ اس نے فریڈ کے پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جبکہ فریڈ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ سب لوگوں کو اس چوری کے بارے میں بتائے گا تاکہ جن لوگوں نے اسے کام پر رکھا ہوا ہے، وہ بھی محتاط ہوجائیں۔ اس پر الیونزو مشتعل ہوگیا اور اس نے فریڈ کو جان سے مارنے کی دھمکی دے ڈالی۔ روزا یا اس کے شوہر کے پاس سے رقم برآمد نہیں ہوئی۔ اس لیے پولیس نے مزید فساد سے بچنے کے لیے دونوں فریقین کو گھر بھیج دیا اور دو سو ڈالرز کی چوری کا کیس سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔

گرم مزاج میکسیکن الیونزو نے فریڈ کو جان سے مار دینے کی دھمکی پولیس آفیسرز کی موجودگی میں دی تھی۔ جب فریڈ نے اپنے قریبی دوستوں کو یہ بات بتائی تو سب نے ہی اسے الیونزو سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔ جب ٹام نے یہ واقعہ سنا تو اس کے ذہن کی بتیاں روشن ہونا شروع ہوگئیں اور وہ سوچنے لگا کہ اگر فریڈ کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو سب سے پہلے الیونزو پر ہی شک کیا جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے منصوبے کا تانا بانا بننا شروع کردیا۔ فریڈ نے ساری کہانی تو لوگوں کو سنادی لیکن اصل بات چھپا گیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس نے اے ٹی ایم سے پیسے نکالنے کے بعد انہیں پرس کے بجائے پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ جب اس نے وہ سوٹ دوبارہ پہنا تو رقم اس میں موجود تھی لیکن اس نے یہ بات پولیس کو نہیں بتائی اور نہ ہی روزا سے معافی مانگی۔

ٹام ان تمام واقعات کا بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے آلۂ قتل کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ فریڈ نے یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔ الیونزو کی دھمکی نے اسے پریشان کردیا تھا چنانچہ دوستوں کے مشورے پر اس نے اپنی حفاظت کے لیے ایک گن کا بندوبست کرلیا جو اس کے مین ہٹن والے اپارٹمنٹ میں بے کار پڑی ہوئی تھی اور اب اس کی ضرورت ویسٹ پورٹ والے گھر میں محسوس ہورہی تھی جسے وہ اپنے ہمراہ لے جانے کا ارادہ کررہا تھا۔ یہ اطلاع ٹام کو بھی پہنچ گئی۔ مقتول اپنے قتل کے سارے سامان خود ہی مہیا کررہا تھا۔ جائے وقوعہ، مشتبہ قاتل اور آلۂ قتل سب کچھ موجود تھا۔ کیا کبھی کسی قاتل کو اس طرح پکی پکائی ہانڈی ملی ہوگی؟

کئی راتیں جاگنے کے بعد ٹام ایک ایسا منصوبہ بنانے میں کامیاب ہوگیا جو اس کے خیال میں ہر لحاظ سے مکمل اور بے خطر تھا لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور کولن ڈیلینی سے بہتر کوئی اور شخص اس کام کے لیے مناسب نہیں تھا۔ کولن ایک معمولی اداکار تھا اور براڈوے کے ڈراموں میں ثانوی کردار ادا کرکے دن گزار رہا تھا۔ اسے شدت سے اس دن کا انتظار تھا جب ٹام ہیرنگٹن کی طرح قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو اور وہ کسی ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کرسکے۔ ٹام اور کولن کے درمیان گہری شناسائی ہونے کے باوجود ایک فاصلہ تھا۔ ٹام بہرحال ایک اسٹار بن چکا تھا اور اب اس کی نظریں ہالی ووڈ پر تھیں جبکہ... بے چارہ کولن ابھی تک براڈوے میں ہی ہاتھ پاؤں ماررہا تھا۔ اس فاصلے کے باوجود ٹام سمجھتا تھا کہ کولن ہی اس کے منصوبے میں معاون کے لیے بہترین ثابت ہوسکتا ہے۔

فریڈ لیکٹن اپنے نئے ڈرامے کو آخری شکل دینے میں مصروف تھا جس کی آئندہ چھ ہفتوں میں ریہرسل شروع ہونے والی تھی۔ ادھر ٹام کو اس کے ایجنٹ نے اطلاع دی تھی کہ ہالی ووڈ کا پروڈیوسر اسے ایک مہینے کی مہلت دینے کے لیے تیار ہے۔ اس دوران وہ اپنا مسئلہ حل کرلے ورنہ یہ رول کسی دوسرے ایکٹر کو دے دیا جائے گا۔ ٹام کے پاس بہت کم وقت رہ گیا تھا لہٰذا اس نے الٹی گنتی شروع کردی۔

☆☆☆

ویرا لیکٹن کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو نوجوان مردوں کی رفاقت پسند کرتی ہیں۔ تاہم براڈوے کی کامیاب پروڈیوسر ہونے کے باوجود وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ دبلا پتلا جسم، لمبی ٹانگیں اور گھونسلا نما بال جنہیں وہ ہر ہفتے ہیئر ڈریسر کے پاس جاکر سنوارتی۔ ٹام نے ویرا سے کولن کا تعارف کروایا اور سفارش کی کہ اسے نئے ڈرامے کے لیے اسٹیج منیجر کے طور پر رکھ لیا جائے۔ کولن کے پاس اس کام کا مناسب تجربہ نہیں تھا لیکن وہ عورتوں کو کمپنی دینے کے فن سے واقف تھا لہٰذا اسے بہ آسانی یہ ملازمت مل گئی۔ کولن کے پاس اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ

ہر ضرورت مند اپنے دلی مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے

خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کررہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کررہا ہو ☆ بالوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان / شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ دوستی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer

ماہر عملیات و تعویزات این اے جوہری
0300-2222567

نہیں تھے۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

"ٹام! میں تمہارے اس احسان کا بدلہ کس طرح ادا کر سکتا ہوں؟"

"اس دنیا میں ہر آدمی کی قدر و قیمت ہے۔" ٹام نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم میرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ آج شام میرے اپارٹمنٹ پر آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی میری طرف سے چائنیز ڈنر بھی۔"

"یہ دعوت تو میری طرف سے ہونی چاہیے۔" کولن نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی سہی۔" ٹام مسکراتے ہوئے بولا۔

دوسری بوتل کھلنے تک کولن پوری طرح ٹام کے منصوبے کی جزئیات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اسے یہ سب جان کر حیرانی تو ہوئی لیکن وہ بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ اس منصوبے میں اس کا کوئی عملی کردار نہیں تھا۔ اسے صرف ٹام کے ساتھ تعاون کرنا تھا اور اس کے عوض اسے لنگٹن اینڈ لینگٹن کے ڈراموں میں مرکزی کردار مل سکتے تھے۔ ٹام کی اس پیش کش نے کولن کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کر لی تھی اور اس کے لیے اس پیش کش کو ٹھکرانا ممکن نہیں تھا۔

"فریڈ کے مرنے کے بعد میرا معاہدہ بھی ختم ہو جائے گا اور ویرا ہی سیاہ و سفید کی مالک ہوگی۔ تم اسے پسند آتے ہو اور بہ آسانی میری جگہ لے سکتے ہو۔"

"لیکن اسے تو کسی بڑے اسٹار کی ضرورت ہوگی۔" کولن نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ٹام نے سر ہلایا اور بولا۔ "فریڈی کے کامیڈی ڈرامے اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی بڑے نام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی باصلاحیت اور خوش شکل اداکار اس کے کرداروں میں فٹ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اور کچھ دوسرے اداکار اس کے ڈراموں کے ذریعے اپنا کیریئر شروع کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ویرا بھی نئے لوگوں کو دریافت کر کے لطف اندوز ہوتی ہے۔ اس طرح اسے پرانے ایکٹرز کو نیچا دکھانے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ذاتی زندگی میں بھی نت نئے رنگ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ تم تو ویسے بھی اس کی نظروں میں ہو اور اگلے ویک اینڈ پر تمہیں ویسٹ پورٹ جانا ہوگا اور اس کے بعد تم ہر ویک اینڈ پر وہاں جاتے رہو گے تاکہ اسکرپٹ کا مطالعہ کر سکو... کیونکہ فریڈی ریہرسل شروع کرنے سے پہلے اس پہلو پر خاص توجہ دیتا ہے۔"

"فرض کرو کہ فریڈ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ویرا اس نئے ڈرامے پر کام روک دیتی ہے اور سب کچھ بھلا کر اپنے شوہر کا سوگ منانے بیٹھ جاتی ہے تو پھر میرا چانس کس طرح بنے گا؟"

"ویرا اور سوگ!" ٹام نے تعجب سے کہا۔ "پیارے دوست! وہ تو فریڈی کی یاد میں اسٹیج پر ہی میموریل سروس کرے گی اور اس کی شان میں قصیدہ خوانی کرنے کے بعد اعلان کرے گی کہ وہ فریڈ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے فوراً ہی اس کا نیا ڈراما شروع کر رہی ہے... اور یہ اعلان سنتے ہی سامعین اپنی نشستوں پر کھڑے ہو کر ویرا کے لیے تالیاں بجانا شروع کر دیں گے۔ تم نے وہ مشہور ڈائیلاگ تو سنا ہوگا کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب لوگ یہاں اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ فریڈ کا کردار ختم ہونے والا ہے۔ اس کی جگہ ویرا آجائے گی۔ بالکل اسی طرح میرے جانے کے بعد تم مرکزی کردار ادا کرنے آجاؤ گے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔"

اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا پھر کولن کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب ہمیں ایک بار پھر اپنے منصوبے کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ تمہارے دماغ میں مزید سوالات ابھریں، میں ہر پہلو کی اچھی طرح وضاحت کر دینا چاہتا ہوں... اور ہاں، میرے ہالی ووڈ چلے جانے کے بعد تم یہاں کوئی کرایہ ادا کیے بغیر رہ سکتے ہو، جب تک میں واپس نہیں آجاتا۔"

www.pkdigest.com

☆☆☆

ٹام اچھی طرح جانتا تھا کہ جب بھی کسی نئے ڈرامے پر کام ہو رہا ہو تو فریڈ کی ویسٹ پورٹ والی رہائش گاہ کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس سلسلے میں فریڈ لنگٹن اور اس کے مہمان جمعے کی شام کو وہاں چلے جاتے اور ویرا ہفتے کے روز ہیئر ڈریسر سے فارغ ہونے کے بعد آجاتی۔ فی الحال اس کے مہمانوں میں ڈرامے کے مرکزی اداکار ٹام ہیرنگٹن اور اسٹیج منیجر کولن کا نام ہی شامل تھا۔ فریڈ کا خیال تھا کہ اس مرحلے پر کولن کی موجودگی ضروری نہیں لیکن ٹام نے اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر اندازہ لگا لیا تھا کہ ویرا اس بات پر اصرار کرے گی اور چاہے گی کہ کولن شروع سے ہی ٹیم کا حصہ رہے۔

ٹام نے جو منصوبہ بنایا، اس کے مطابق پہلے ویک اینڈ پر وہ اور کولن، فریڈ کے ہمراہ ویسٹ پورٹ آتے۔ اسی دوران موقع پا کر ٹام اپنے ساتھی کولن کو وہ جگہ دکھاتا جہاں فریڈ نے اپنی حفاظت کے لیے گن رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے ویک اینڈ تک فریڈ اور کولن ایک دوسرے کے قریب آچکے ہوتے جبکہ

تیسرا ویک اینڈ فریڈ کی زندگی کا آخری دن ہوتا۔ اس ویک اینڈ پر کولن پروگرام کے مطابق فریڈ سے گرانڈ سینٹرل اسٹیشن پر ملتا اور اسے بتاتا کہ ٹام کسی ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکا اور اب وہ ہفتے کے روز ویرا کے ساتھ ہی ویسٹ پورٹ پہنچ جائے گا۔ چونکہ ایلونزو کے خطرے کے پیش نظر فریڈ ویسٹ پورٹ والے گھر میں اکیلا رہتے ہوئے گھبراتا تھا، اس لیے اسے کولن کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

منصوبے کے مطابق کولن کو پہلے ویک اینڈ پر ہی یہ ذمے داری سونپ دی جاتی کہ وہ ہفتے کی شام پانچ بجے ویرا کو لینے اسٹیشن پہنچ جائے۔ اسی طرح آنے والے دنوں میں بھی کولن کو ہی یہ ڈیوٹی ادا کرنا تھی۔ تیسرے ویک اینڈ پر بھی کولن کو یہی ڈیوٹی انجام دینی تھی۔ وہ معمول کے مطابق ویرا اور ٹام کو لینے کے لیے گھر سے نکلتا لیکن اس سے پہلے فریڈ کی گن کو ڈیسک کی دراز سے نکال کر لان میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے کسی ایک کے کشن میں چھپاتا تھا۔ اس لان کا دروازہ فریڈ کے دفتر میں کھلتا تھا۔

ویرا ٹرین سے اترنے کے بعد کولن کو اطلاع دیتی کہ ٹام نے فون پر اسے اپنے لیٹ ہونے کی اطلاع دے دی تھی اور اب وہ سوا پانچ بجے کی ٹرین سے روانہ ہوگا۔ یہ سننے کے بعد کولن یہ تجویز پیش کرتا کہ گھر جانے کے بجائے وہ دونوں وہیں بیٹھ کر ڈرنک لیتے ہیں اور پھر ٹام کو بھی ساتھ ہی لے چلیں گے کیونکہ اگر وہ ویرا کو چھوڑنے گھر جاتا ہے تو اسے فوراً ہی ٹام کو لینے کے لیے اسٹیشن پر واپس آنا ہوگا جس میں کسی وجہ سے تاخیر بھی ہو سکتی ہے۔ ویرا یہ تجویز سن کر خوش ہو جائے گی کہ اس طرح اسے کولن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل سکے گا۔ وہ فریڈ کو فون کر کے بتا دے گی کہ صورت حال کیا ہے۔

منصوبہ کچھ یوں تھا کہ ٹام اس سے پہلے ہی ٹرین کے ذریعے ویسٹ پورٹ پہنچ چکا ہوگا۔ وہ پیدل چل کر فریڈ کے گھر تک جائے گا اور صحن کے پیچھے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جائے گا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی اسے وہاں دیکھ لے گا کیونکہ فریڈ کھلی فضا میں آنے سے کتراتا تھا اور اس وقت تک گھر سے باہر نہیں نکلتا جب تک کہ اسے ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا ہوگا اور اس کی پشت صحن کی جانب ہوگی۔ ٹام کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہ ویرا کی کال ہوگی۔ فریڈ فون پر بات کر کے جیسے ہی ریسیور رکھے گا تو ٹام اندر داخل ہو کر اپنا کام دکھا دے گا۔ پھر وہ پیدل ہی اسٹیشن کی جانب روانہ ہو جائے گا اور گن کو کسی نالے میں پھینک دے گا۔ اسٹیشن پر اس کی ملاقات کولن اور ویرا سے ہوگی۔ وہ یہی ظاہر کرے گا کہ سوا پانچ بجے کی ٹرین سے آیا ہے پھر وہ، ویرا اور کولن گھر کی جانب روانہ ہو جائیں گے جہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوگا کہ فریڈ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔

☆☆☆

"ویرا پانچ بجے کے قریب فون پر فریڈ سے بات کرے گی اور ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ جب ہم گھر پہنچیں گے تو فریڈ ہمیں مردہ حالت میں ملے گا۔ اس دوران تم اور ویرا کسی پب میں بیٹھے ڈرنک کر رہے ہو گے جبکہ میں ٹرین میں سفر کر رہا ہوں گا۔ اس طرح ہم تینوں کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ثابت ہو سکے گی۔ میرے خیال میں یہ مکمل فول پروف پلان ہے۔" ٹام نے اپنے منصوبے کی جزئیات سے کولن کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویرا کو پب میں بھی لوگ جانتے ہیں لہٰذا اگر ضرورت پڑی تو ایک درجن سے زیادہ لوگ اس کی وہاں موجودگی کی گواہی دے سکتے ہیں۔ اسی طرح میں نے بھی اپنے ایک دوست کو تیار کر لیا ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پر یہ بیان دے سکتا ہے کہ اس نے مجھے گرانڈ سینٹرل اسٹیشن پر اس وقت دیکھا جب میں سوا پانچ بجے والی ٹرین میں سوار ہو رہا تھا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ ایلونزو کی دھمکی کے پیش نظر پولیس سب سے پہلے اسی پر شک کرے گی۔"

کولن کے ذہن میں اب بھی کئی سوال گونج رہے تھے اور وہ منصوبے کی کامیابی کے بارے میں کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھا۔ اس نے اپنے شبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پلان میں بہت سی باتوں کا انحصار چانس یا قسمت پر ہے۔ مثلاً یہی کہ مجھے وہ گن میز کی دراز سے نکال کر صحن میں رکھی کرسی میں چھپانی ہوگی۔ ضروری تو نہیں کہ فریڈ کی نظروں میں آئے بغیر میں یہ کام کر سکوں۔ موقع ملنے پر ہی ایسا ممکن ہے۔"

"فریڈ کو ناشتا کرنے کے بعد آرام کرنے کی عادت ہے۔ اس دوران وہ آدھ گھنٹے تک اخبار کا مطالعہ کرتا ہے اور یہی اس کام کے لیے مناسب وقت ہوگا۔"

کولن نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔ "ضروری تو نہیں کہ ویرا طے شدہ وقت پر ہیئر ڈریسر کے یہاں سے فارغ ہو کر چار بجے والی ٹرین سے ویسٹ پورٹ کے لیے روانہ ہو جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ میرے ساتھ ڈرنک کرنے پر رضامند ہو جائے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں پہلے اسے گھر چھوڑ کر آؤں اور بعد میں تمہیں اسٹیشن سے لے لوں۔"

"ویرا ہر ہفتے لازماً ہیئر ڈریسر کے پاس جاتی ہے اور اس کے ٹائم ٹیبل میں کبھی بھی ایک منٹ کی تاخیر نہیں ہوئی۔"

اس لیے یہ تو طے ہے کہ وہ لازماً پونے چار بجے والی ٹرین سے روانہ ہوگی اور اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ تمہارے ساتھ کہیں بیٹھ کر ڈرنک سے لطف اندوز ہوسکے۔ انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ ویرا کو فون کرنے کا خیال نہ آئے یا وہ اس کی ضرورت محسوس نہ کرے... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فریڈ کسی وجہ سے وہ کال ریسیو ہی نہ کرسکے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ باتھ روم میں ہو یا کہیں چلا گیا ہو۔" کولن نے ایک اور خدشہ ظاہر کیا۔

ٹام نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "ہر منصوبے میں غلطی یا دھوکے کا احتمال تو ہوتا ہی ہے، خواہ وہ کتنا ہی فول پروف کیوں نہ ہو۔ لیکن ہمیں چانس تو لینا ہی ہوگا کیونکہ میرے پاس اس معاہدے سے جان چھڑانے کا یہی ایک راستہ ہے اور اسی صورت میں تم بھی اسٹیج میجر سے اسٹار بننے کی امید کرسکتے ہو۔ البتہ تمہیں ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا اور وہ یہ کہ ویرا کو اس وقت تک پب میں بٹھائے رکھو، جب تک سوا پانچ بجے والی ٹرین آکر چلی نہ جائے۔ میں تمہیں پلیٹ فارم پر ہی مل جاؤں گا۔"

کولن غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ٹام نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "گھر سے اسٹیشن تک کا پیدل فاصلہ ایک گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔ میں صبح کی سیر کے دوران دو مرتبہ اس کی پریکٹس کرچکا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اتنے ہی وقت میں یہ فاصلہ طے کرلوں گا۔ اگر ویرا پانچ بجنے کے کچھ دیر بعد فریڈ کو فون کرتی ہے اور اس کے چند منٹ بعد میں اپنا کام ختم کرلیتا ہوں تو ٹرین کے روانہ ہونے سے چند منٹ بعد میں اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور تم تھوڑی دیر بعد وہاں آؤ گے۔ تمہیں ساڑھے چھ بجے یا اس سے چند منٹ بعد تک پب میں ہی رہنا ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟ اس پورے پلان میں ٹائمنگ کی بڑی اہمیت ہے۔"

☆☆☆

سراغ رساں سام ایڈلر بڑے غور سے فریڈ کی لاش دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غم و رنج کے تاثرات نمایاں تھے۔ فریڈ سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ البتہ براڈوے کے ایک معروف ڈراما نگار اور ہدایت کار کو اس بے دردی سے قتل کردینا اس کے نزدیک انتہائی افسوس ناک تھا۔ ویسے تو وہ ہر کسی کے قتل پر اداس اور رنجیدہ ہوجاتا تھا اور قاتل تک پہنچنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کردیتا تھا۔ اس حوالے سے اس کا ریکارڈ بہت شان دار تھا۔ اس وقت بھی وہ لاش کے پاس کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ فریڈ کی کسی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟ وہ الگ تھلگ زندگی گزارنے اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ سام کے ذہن میں الیوترو اور رز کی دھمکی بھی گونج رہی تھی لیکن اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ غیرقانونی طور پر مقیم میکسیکن ایسی حرکت کرسکتا ہے۔

ایڈلر نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ متعلقہ افراد کے آنے تک کمرے کی کسی چیز کو نہ چھیڑا جائے۔ اسے میڈیکل ایگزامنر اور تفتیشی ٹیم کی آمد کا انتظار تھا۔ جائے واردات پر پہنچنے والا وہ پہلا شخص تھا کیونکہ جس وقت فریڈ کے قتل کی اطلاع ملی، وہ پولیس اسٹیشن پر ہی موجود تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر دو پولیس آفیسرز کو ساتھ لیا اور چند منٹ بعد ہی فریڈ کے گھر پہنچ گیا۔

سام ایڈلر نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگالیا کہ فریڈ کو سر کی پشت پر گولی ماری گئی ہے اور وہ فوراً ہی دم توڑ گیا۔ اس کا چہرہ میز کی سطح سے ٹکرایا تھا جہاں اس کے لکھے ہوئے ڈرامے کے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ کچن کی طرف کھلنے والا دروازہ اس کی پشت پر تھا اور اگر فریڈ نے قاتل کے قدموں کی آہٹ سنی بھی ہوگی تو اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے اور یہ جاننے کی بھی مہلت نہیں ملی ہوگی کہ اس دنیا میں وہ کون شخص ہے جو اس سے اتنی نفرت کرتا ہے اور اسے قتل کرنے چلا آیا۔

ایڈلر فی الحال اپنے ذہن پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے [illegible] وہ جگہ چھوڑ دی اور بیٹھک روم میں چلا آیا جہاں فریڈ کی بیوہ ویرا اور اس کے دو مہمان ٹام اور کولن غم زدہ صورت بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ویرا جانی پہچانی شخصیت تھی جبکہ ٹام بھی ایکٹر کے طور پر لوگوں کی نظروں میں آچکا تھا۔ البتہ ایڈلر کو تیسرے شخص یعنی کولن کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں بلکہ اس وقت تو وہ اس کا نام بھی بھول گیا تھا۔ وہ تینوں ایک کاؤچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ویرا درمیان میں تھی جبکہ دونوں مرد اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور کولن نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ سکتے کی کیفیت میں ہے اور کسی بھی لمحے آنسوؤں کا دریا بہادے گی۔

ایڈلر نے اپنی جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور اسے آن کرتے ہوئے بولا۔ "بیان ریکارڈ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں۔ کم از کم اس طرح وقت کی بچت ہوجاتی ہے۔"

اس کی بات سن کر ان تینوں نے اس طویل قامت شخص کو دیکھا جو ان کے گرد منڈلا رہا تھا جبکہ وردی میں ملبوس دونوں پولیس آفیسرز کمرے کے دروازے پر پہرا دے رہے تھے۔

"معاف کیجیے، مسز لیکنگٹن! میں آپ سے کچھ سوالات

کرنا چاہوں گا، اس سے پہلے کہ وقت گزرنے کے ساتھ حقائق دھندلا جائیں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے تجربے کی بنا پر یہ سب کہنا پڑ رہا ہے۔"

ویرا نے رضامندی کے انداز میں سر ہلایا اور بلا تامل بولی۔ "ہمارے گھر میں ایک ملازمہ روزا اور رز کام کرتی ہے۔ اس کے شوہر نے..."

"میں اس واقعے کے بارے میں جانتا ہوں مسز لیکنگٹن!" ایڈلر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "فی الحال میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس سہ پہر آپ اور آپ کے مہمان کہاں تھے؟"

"شاید میں اس کی وضاحت کرسکوں۔" کولن جلدی سے بولا۔ اسے ویرا سے ہمدردی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ دکھ کی اس گھڑی میں اسے کوئی ناخوش گوار فریضہ سرانجام دینا پڑے۔

"ٹھیک ہے۔ تم ہی بتاؤ۔" ایڈلر نے کہا۔

"میرا نام کولن ڈیلینی ہے اور مجھے مسٹر لیکنگٹن یا مسز لیکنگٹن نے ملازمت دی تھی۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔ "معاف کرنا۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ اس لیے ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں میں سے کس نے مجھے ملازم رکھا تھا۔"

"میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں مسٹر کولن!" ایڈلر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ جو کچھ تم اس واقعے کے بارے میں جانتے ہو۔"

کولن نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "میں اور مسز لیکنگٹن کل ہی یہاں آگئے تھے جبکہ مسٹر لیکنگٹن اور ٹام آج پہنچے ہیں۔ میں ان دونوں کو لینے کے لیے پانچ بجے اسٹیشن پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹام اس ٹرین پر مسٹر لیکنگٹن کے ساتھ نہیں آیا۔"

"میں وقت پر وہ ٹرین نہ پکڑ سکا۔" ٹام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اس لیے مسز لیکنگٹن کو فون کرکے بتادیا تھا کہ دوسری ٹرین سے آجاؤں گا جو سوا پانچ بجے وہاں سے چلتی ہے۔"

کولن نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے اور مسز لیکنگٹن نے سوچا کہ گھر واپس جانے سے بہتر ہے کہ ٹام کے پہنچنے کا انتظار کرلیا جائے۔ اس لیے ہم دونوں وقت گزاری کے لیے ایک بار میں چلے گئے۔ مسٹر لیکنگٹن نے مسز لیکنگٹن کو فون کرکے بتادیا تھا کہ ٹام دوسری ٹرین سے آرہا ہے اور ہم اس کے ساتھ ہی گھر واپس آئیں گے۔"

"تمہاری مسٹر لیکنگٹن سے بات ہوئی تھی؟" ایڈلر نے ویرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور اس وقت وہ بالکل ٹھیک تھا۔" ویرا بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو ایڈلر کو لگا......... کہ کہیں وہ دھاڑیں مار مار کر رونا نہ شروع کردے۔ وہ تفتیشی ٹیم اور میڈیکل ایگزامنر کے پہنچنے سے پہلے اس سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسز لیکنگٹن وہ ساری کارروائی دیکھے جو تفتیشی ٹیم اور میڈیکل ایگزامنر کے آنے کے بعد ہونے والی تھی۔

"تم نے فریڈ سے کس وقت بات کی تھی؟" ایڈلر نے پوچھا۔

"پانچ بجے کے قریب۔" ویرا کے بجائے کولن نے جواب دیا۔ "جب وہ ٹرین سے اتری اور ہم دونوں نے پب میں بیٹھ کر ٹام کا انتظار کرنے پر اتفاق کیا۔"

ایڈلر نے ٹام پر اپنی نظریں جمادیں اور بولا۔ "تم یہاں کب پہنچے؟"

"میں گرانڈ سینٹرل سے سوا پانچ بجے والی ٹرین میں سوار ہوا اور یہاں تقریباً ساڑھے چھ بجے پہنچا۔ اس کے بعد ہم سیدھے گھر چلے آئے۔"

ان بیانات کو ریکارڈ کرنے کے بعد ایڈلر کو میڈیکل ایگزامنر سے فریڈ کی موت کا وقت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ فریڈ کو پانچ اور ساڑھے چھ بجے کے درمیان قتل کیا گیا۔ وہ مزید کچھ پوچھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں اور ایمبولینس کے ہارن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے فریڈ کے گھر کی جانب چلی آرہی تھیں۔ اس نے ٹام اور کولن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مسز لیکنگٹن کو ان کے بیڈ روم تک پہنچادو۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اس دوران ہم اپنی کارروائی مکمل کریں گے۔ ہمیں بھی ڈرنک کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔"

وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، بالکل اسی انداز میں جیسے کسی قیدی کو رہائی کا حکم مل جائے.... کولن نے ویرا کا بازو تھاما اور اسے بیڈروم کی طرف لے جانے لگا جبکہ ٹام سیدھا ڈرنک کیبنٹ کی جانب گیا اور اپنی پسندیدہ شراب کی بوتل نکال لی۔

"تم برف لینے کے لیے کچن میں جاسکتے ہو۔" ایڈلر نے ٹام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہر کمرے میں ایک چھوٹا فریج موجود ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم یہاں باقاعدگی سے آتے رہتے ہو۔ اسی لیے تمہارے پاس اتنی معلومات ہیں۔" ایڈلر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مسز لیکنگٹن نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی

www.pkdigest.com

اسلحہ وغیرہ تو ضرور رکھا ہوگا؟"

"میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" ٹام نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "مسٹر لینکلن اپنے ذاتی معاملات کسی سے شیئر نہیں کرتے تھے اور ویسے بھی میری آمدورفت ان کے دفتر تک ہی محدود تھی۔"

ویرا نے اپنے کمرے میں پہنچ کر رونے دھونے اور آرام کرنے کے بجائے اپنے وکیل کو فون کرنے کو ترجیح دی۔ ٹام نے اس دوران دو گلاس تیار کیے اور ان میں سے ایک کولن کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے ویرا کے لیے بھی ایک گلاس بنایا اور جیسے ہی وہ فون سے فارغ ہوئی، اس نے وہ گلاس ویرا کو تھما دیا۔

"یہ خبر پھیلتے ہی...... میڈیا کے لوگ دوڑے چلے آئیں گے۔ میں ان لوگوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔ تم ان سے بات کرو گے ٹام... کیونکہ تم ان سے نمٹنا جانتے ہو۔ مجھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں میرا وکیل کل صبح ایک بیان جاری کر دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" کولن نے ہمدردی جتائی۔

"قاتل کے گرفتار ہونے تک میں چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔" ویرا تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اس میکسیکن کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہو؟"

"تمہیں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے کو پولیس اور اپنے وکیل کے لیے چھوڑ دو۔" ٹام نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن میں چپ نہیں رہ سکتی۔" ویرا نے احتجاج کیا۔

"کم آن ویرا۔" ٹام نے اسے تھپکی دی۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔ جب تک...... میڈیا کے لوگ یہاں سے نہ چلے جائیں، اس وقت تک تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی جس کی وجہ سے ان کے سوالوں کی زد میں آ جاؤ۔"

"فریڈ مر گیا ہے ٹام!" ویرا روتے ہوئے بولی۔

ٹام نے اس کے لیے ایک اور گلاس بنایا اور اپنا گلاس بلند کرتے ہوئے بولا۔ "بادشاہ مر گیا ہے... خدا ملکہ کو سلامت رکھے۔"

ویرا ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ٹام اپنے بیڈ روم میں تنہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ فریڈ کی لاش ایمبولینس میں رکھی جا رہی تھی۔ وہ اس گھر اور دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا۔ جیسے ہی ایمبولینس وہاں سے روانہ ہوئی، ٹام نے گنگنانا شروع کر دیا۔

"کیلی فورنیا... میں آ رہا ہوں۔"

پولیس اسٹیشن میں سراغ رساں ایڈلر اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا رپورٹ مکمل کر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے ٹیپ ریکارڈر کو پلے بیک کرتا تاکہ ویرا، ٹام اور کولن کے بیانات ذہن نشین کر سکے۔ اسے انہی جوابات کی روشنی میں اپنی رپورٹ مرتب کرنا تھی۔ اسی دوران دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور سارجنٹ رک اینڈرسن بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہو گیا۔ ایڈلر کو اس کی آمد اچھی نہیں لگی کیونکہ اس وقت وہ اپنی رپورٹ لکھنے میں مصروف تھا اور ویسے بھی اس نے سارجنٹ کو نہیں بلایا تھا اور وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی آفیسر بن بلائے اس کے کمرے میں داخل ہو۔ اس نے ناگواری سے سارجنٹ کی طرف دیکھا لیکن سارجنٹ نے اس کے رویے پر دھیان نہیں دیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا۔ مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ شہر چلا گیا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ... کسی مشہور شخصیت کا قتل ہو گیا ہے۔"

"ہاں، اس کا نام فریڈ لینکلن ہے... مشہور ڈراما نگار اور ہدایت کار۔ میں اسی حادثے کی رپورٹ لکھ رہا ہوں۔"

"سوری! مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوتے وقت میں تمہاری مدد کے لیے یہاں موجود نہ تھا۔ میں نے تو جلدی آنے کی بہت کوشش کی لیکن عین وقت پر ایک مسئلہ ہو گیا۔ دراصل آج شام گرانڈ سینٹرل اسٹیشن کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ گو کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا لیکن اس کی وجہ سے ٹرینوں کی آمدورفت ضرور متاثر ہوئی۔ میں سوا پانچ بجے کی ٹرین سے آ رہا تھا لیکن سات بجے تک سروس بحال نہیں ہو سکی۔"

سام ایڈلر کا ہاتھ چلتے چلتے رک گیا۔ رک کے آخری فقروں نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے اپنی کرسی گھمائی اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ آج شام گرانڈ سینٹرل سے سوا پانچ بجے کی ٹرین روانہ نہیں ہو سکی اور میں اسی وجہ سے لیٹ ہو گیا۔"

سام ایڈلر کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات یک لخت نرم پڑ گئے۔ رک نے لمحہ بھر میں قتل کا وہ پیچیدہ معاملہ سلجھا دیا تھا۔ اس بے چارے کو سوا پانچ بجے کی ٹرین منسوخ ہونے سے پریشانی ہوئی تھی اور ٹام کا بیان تھا کہ وہ اسی ٹرین سے ویسٹ پورٹ پہنچا تھا! یہ اہم نکتہ تھا۔ ویسے بھی مشکوک افراد سے سچ اگلوانے میں سام کو مہارت حاصل تھی۔

جذبۂ انسانیت کا غماز اختصار کے پیرائے میں پر اثر قصہ

بقائے انسانیت کے لیے کوشاں ایک سائنس داں کی ایجاد کا احوال ...... وہ ہر صورت دنیا سے ہتھیاروں کا خاتمہ چاہتا تھا۔

محسن

رضوانہ منظر

آئیون میز پر جھکا انہماک سے یادداشتوں کی موٹی کاپی میں لکھ رہا تھا۔ میں سامنے مہر بہ لب بیٹھا تھا۔ میں اس کی ذہنی مصروفیت میں کبھی مداخلت نہیں کرتا۔ آفس میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ معاً باہر فضا فائرنگ کی آواز سے گونجنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ گولیاں ہمارے کانوں کے قریب سے گزر رہی ہیں۔ آئیون کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چیں بہ جبیں ہو کر میری طرف دیکھا۔

"مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ یونیورسٹی اور شہری دفاع کی ٹیموں کے درمیان فائرنگ کے مقابلے کا دن تھا۔ دونوں ٹیمیں پوری تیاری کر کے آئی تھیں۔

"اسلحے کی دوڑ ملکوں کے ساتھ پبلک میں بھی سرایت کر گئی ہے۔" آئیون نے جزبز ہو کر کہا۔ "اسے ختم ہونا چاہیے۔ انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے اور سائنٹیفک ریسرچ کے کاموں کے لیے بھی ضروری ہے۔"

"اسلحے کا استعمال ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔" میں نے کہا۔ "وقت کی رفتار اور ترقی کے مدارج کے ساتھ ساتھ اسلحے کی شکلیں اور تکنیک کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔ اب امن کے لیے ہر قسم کے اسلحے سے چھٹکارا ضروری ہے۔ خصوصاً ایٹمی اسلحے سے۔" آئیون نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔ جنگوں میں بارودی اسلحے سے شاداب آبادیاں منٹوں میں کھنڈر بن جاتی ہیں۔ آئے دن شہروں میں سیکڑوں گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ انسانیت نوحہ خواں ہے۔ سفاکی اور بربریت کو ختم کرنا ہوگا۔"

"کون کرے گا؟ کس طرح کرے گا؟ بارودی اسلحہ بالادستی کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"میں کروں گا۔" اس نے عزم سے کہا تو میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس روز مجھے اس کے ذہنی توازن میں گڑبڑ محسوس ہوئی۔

آئیون لوک ہارٹ اس دور کا ایک بڑا سائنس داں اور ریسرچ اسکالر تھا۔ اس کے تحقیقی کاموں اور تجربات کا بہت شہرہ تھا۔ ہم عصروں میں اسے امتیازی مقام حاصل تھا۔ حکومت بھی کبھی کبھی اس سے مشورے طلب کرتی تھی۔ اس نے کثیر سرمائے سے اپنی ذاتی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی۔ کئی برس پہلے میں فارغ التحصیل ہو کر اس کی تجربہ گاہ میں ملازم ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے مجھ پر پورا اعتماد ہوتا گیا اور اب میں اس کا معتبر

خاص تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ البتہ جب تک اسے اپنی کسی تھیوری کی کامیابی کا یقین نہ ہو جاتا، اسے مجھ پر ظاہر نہیں کرتا۔ میں نے بھی اس سے وفاداری پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔

آئیون کہنے لگا۔ ”میں نے ایک عنصر دریافت کیا ہے۔ اس کی بہت معمولی سی مقدار ہوا میں چھوڑ دی جائے تو کم از کم ایک فرلانگ تک آکسیجن؛ جلنے سلگنے والی اشیا پر اپنا اثر ختم کر دے گی یعنی اس میں وہ خاصیت مفقود ہو جائے گی جو آگ پکڑنے والی اشیا کو جلنے سلگنے میں مدد دیتی ہے... جب تک کہ مزید تازہ ہوا اس جگہ کی آکسیجن پر سے اس عنصر کا اثر ختم نہ کر دے۔ اس کا نام میں نے ”مومائین“ رکھا ہے۔“

میں بے یقینی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جینئس ریسرچ اسکالر تھا لیکن اس کی یہ بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر وہ ایک کونے میں گیا اور وہاں سے ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا دریچے کے قریب لے آیا۔ اس پر شیشے کا ایک چوکور مرتبان رکھا ہوا تھا۔ اس پر ائر ٹائٹ ڈھکن تھا اور وہ اندر سے خالی نظر آتا تھا۔

”میں تمہیں عملی مظاہرہ کر کے دکھاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور پانچ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں مرتبان کا ڈھکن اٹھا کر دوبارہ بند کر دیا۔ مزید ایک منٹ گزر گیا۔

سامنے گراؤنڈ میں فائرنگ اچانک رک گئی۔ اس وقت یونیورسٹی ٹیم کی باری تھی اور اس کے اراکین رائفلوں کو ہلانے جلانے اور گھمانے پھرانے لگے تھے۔ ان پر جھنجلاہٹ طاری لگتی تھی۔

”دیکھا؟“ آئیون نے تفاخر سے کہا۔ ”کارتوس کام نہیں کر رہے ہیں۔ ان میں جو بارود ہے، اس کی سلگنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آکسیجن کی قوتِ کارکردگی متاثر ہوئی ہے چونکہ اس پر ”مومائین“ کا سخت دباؤ ہے۔“

”اب یہ رائفلیں کبھی کام نہیں کریں گی؟“ میں نے اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”کریں گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب آکسیجن پر ”مومائین“ کا دباؤ ختم ہو جائے گا۔ وہ صاف ہو جائے گی لیکن اس میں کافی دیر لگے گی۔ تب تک یہ لوگ مایوس ہو کر اپنا یہ بھیانک کھیل ختم کر چکے ہوں گے۔“

”شان دار... تمہاری مثال دنیا میں نہیں ملے گی۔“ میں نے ستائش کے ساتھ اعتراف کیا۔

”کیا اس طرح آتشیں اسلحے کو کم از کم وقتی طور پر ناکارہ نہیں بنایا جا سکتا؟“ وہ بولا۔ ”کسی کو اصل بات کا علم نہیں ہوگا اور رفتہ رفتہ آتشیں اسلحے کا استعمال کم ہوتا چلا جائے گا۔“

میں آئیون کے آفس سے نکلا تو پروفیسر آرم برسٹر ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔ وہ فیکلٹی میں مشیر کے عہدے پر فائز تھا۔ نیشنل گارڈ میں اعزازی کرنل تھا اور یونیورسٹی رائفل ٹیم کا کوچ بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ظریفانہ لہجے میں کہا۔

”اپنی رائفلوں کے لیے نئے کارتوس حاصل کرو۔ کسی نے تمہارے ہاتھ پرانے اور ناکارہ کارتوس فروخت کر دیے ہیں۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ ہمارے کارتوس ناکارہ ہیں؟“ اس نے غصے سے کہا۔ معاً اس کی آنکھوں سے شبہ جھلکنے لگا۔ میرا اس کے ساتھ مذاق بھی نہیں رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں آئیون کا معتمدِ خاص ہوں اور اس کے بارے میں متفقہ رائے تھی کہ وہ جینئس نت نئے تجربے کرتا رہتا ہے۔ اس کی ریسرچ گاہ گراؤنڈ سے ایک فرلانگ دور بھی نہیں تھی۔

”آئیون کوئی تجربہ کر رہا ہے؟“ آرم نے رک کر کہا۔

نہ جانے اس وقت میری مت کیوں ماری گئی۔ میں بھول بیٹھا کہ آئیون سے میری وفاداری غیر مشروط اور دائمی ہے۔ میں نے کہہ دیا۔ ”اس نے ایک میکرو مولیکیول عنصر دریافت کیا ہے اور اس کا نام ”مومائین“ رکھا ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے۔“

www.pkdigest.com

مجھے نہیں معلوم تھا کہ آرم اسی وقت آئیون سے ملنے دوڑ پڑے گا۔ میرے روکتے روکتے وہ زقندیں لگانے لگا۔ لامحالہ مجھے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔ اندر جاتے ہی اس نے آئیون سے کہا۔ ”مومائین کیا بلا ہے؟“

آئیون کا مجھے بے نقط سنانا جائز بات تھی۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

”انہیں کچھ نہ کہو۔ انہوں نے مجھے بتا کر ٹھیک ہی کیا ہے۔“ آرم نے میری طرف داری کی۔ ”اب تم کھل کر میرے ساتھ بات کرو پروفیسر۔“

آئیون نے غیر معمولی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور مرتبان کا ڈھکن تھوڑا سا اٹھا کر تیلی اندر کی۔ وہ فوراً بجھ گئی۔

”مومائین کا کام دیکھا؟“ اس نے تمسخرانہ انداز سے کہا۔

آرم غصے سے بولا۔ ”اگر تم اس طرح اس نامراد چیز کو ہوا میں پھیلاتے رہے تو رائفل چلانا ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔“

”میں نے اب تک اس نکتے پر توجہ نہیں دی ہے۔“ آئیون نے سکون سے کہا۔

”تم جانتے ہو، کیا کر رہے ہو؟“ آرم بھنا گیا۔

”میرا کام ریسرچ کرنا ہے اور اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی بات کو سائنس دانوں اور عام لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے۔“ آئیون نے آرم کے غصے کی پروا کیے بغیر کہا۔

آرم نے مدد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بے بسی ظاہر کرنے کے لیے نفی میں سر ہلا کر اسے مایوس کر دیا۔ وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا لیکن یہ گڑبڑ کا آغاز تھا۔

دریچے سے میں نے اسے ایڈمنسٹریشن بلاک میں داخل ہوتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریٹر ہیگل اور ایک اجنبی کے ساتھ برآمد ہوا اور تینوں ہماری طرف آئے۔

”آرم اپنے ساتھ ہیگل کو لا رہا ہے۔“ میں نے آئیون کو بتایا۔

”آنے دو۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا۔

تینوں کمرے میں داخل ہوئے تو آرم اور ہیگل کے مؤدبانہ رویے سے میں نے محسوس کیا کہ تیسرا فرد کوئی وی آئی پی ہے۔ وہ سرخ چہرے اور درمیانے قد کا گنجا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھتری تھی۔

”یہ ہیں ڈاکٹر پروفیسر آئیون لوک ہارٹ۔“ ہیگل نے آئیون کو وی آئی پی سے متعارف کرایا۔ اس کے لہجے میں آئیون کے لیے ستائش بھی تھی اور ناگواری بھی۔ ”انہیں سائنٹیفک ریسرچ میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ آنے والے سال نوبل پرائز انہیں مل جائے لیکن... لیکن کبھی کبھی ان کی صلاحیت غلط رخ اختیار کر لیتی ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر لیکن پھسل جانے والا شخص اتنے بڑے انعام کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟“ وی آئی پی نے کہا۔

”اس اعزازی خطاب کا شکریہ۔“ آئیون نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

ہیگل جلدی سے بولا۔ ”اور یہ مسٹر فریڈرک فلر ہیں۔ فلر فاؤنڈیشن کے بانی۔“

”اس کے علاوہ میں یونیورسٹی بورڈ آف ٹرسٹیز کا چیئرمین اور فلر فائر آرمز لمیٹڈ کا پریذیڈنٹ بھی ہوں۔“ فلر نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”تعلیمی ادارے کے کرتا دھرتا اور اسلحہ سازی کے سربراہ؟“ میں درمیان میں بول پڑا۔

”تو جوانوں کو اسلحے کے استعمال کی ٹریننگ دلوانا جرم کی بات تو نہیں ہے؟“ فلر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”قطعی بری بات نہیں۔“ آئیون طنز سے بولا۔ ”یونیورسٹی سے ڈاکٹرز، انجینئرز، ٹیچرز نکلتے ہیں تو انہیں گولی چلانے کا فن بھی آنا چاہیے۔“

”تم نے ہماری رائفلیں ناکارہ کیوں بنا دیں؟“ فلر نے بھڑک کر براہِ راست حملہ کیا۔

”مجھے رائفلیں اور گولیوں کا شور پسند نہیں ہے۔“ آئیون نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

فلر غصے سے کانپنے لگا اور آرم دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہیگل نے آواز کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ”آئیون! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ رائفل ٹیمیں ہمارے طلبا کو اسلحے اور انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا درس دیتی ہیں؟ بچپن میں ٹی وی دیکھ کر اور کھلونا پستولوں سے کھیل کر وہ جو جھوٹے تصورات رکھتے ہیں وہ اصلی رائفلیں چلانے سے ختم ہو جاتے ہیں۔“

”وہ اس کی فیس ادا کرتے ہیں۔“ فلر نے لقمہ دیا۔

آرم زور لگا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور گلا پھاڑ کر بولا۔ ”اور نازی جرمنی میں کیا ہوا؟ ہٹلر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لوگوں سے گنیں چھین لیں۔“

”میں جانتا ہوں، تم کیا سوچ رہے ہو؟“ فلر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”یہی کہ رائفلوں سے لوگوں کی جانیں لی جاتی ہیں لیکن موت تو دوسرے طریقوں سے بھی آتی ہے۔ مثلاً میں اس چھڑی سے تمہاری کھوپڑی توڑ کر تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا سکتا ہوں۔“

”پلیز! چھڑی کو تو زحمت دینا۔“ آئیون بولا۔

فلر نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ معاً وہ گھوما اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ آرم بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ ہیگل نے آئیون سے کہا۔ ”مجھے بھی اسلحے سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں ہے لیکن اس ظالم، خود غرض دنیا میں اس کی ضرورت ہے۔“

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ اس کی کیفیت سے آئیون بھی متاثر نظر آ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، آرم واپس آ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے اضطراب سے کہا۔ ”مسٹر ہیگل! تمہارے آفس پر اسٹوڈنٹس نے قبضہ کر لیا ہے۔“

”میرے آفس پر؟ وہ کیوں؟“ ہیگل نے چونک کر قدرے گھبراہٹ سے کہا۔

''ان کا مطالبہ ہے کہ ڈاکٹر آئیون کو ان کے عہدے پر بحال کیا جائے۔'' آرم نے جواب دیا۔
''لیکن انہیں معطل کس نے کیا ہے؟'' ہیگل نے حیران ہو کر کہا۔
میں نے اچھا مشورہ دینے کا موقع دیکھ کر کہا۔ ''آپ انہیں معطل کر دیں تاکہ بحال کیا جا سکے۔''
میرا فقرہ مکمل ہوتے ہوتے ہیگل باہر نکل گیا۔ میں آئیون کی طرف مڑا۔ ''تم نے اپنے اور دوسروں کے لیے مصیبت کھڑی کر دی۔''
آئیون نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور میز پر جا کر بیٹھ گیا اور ایک کتاب کھول لی۔ اپنی موجودگی وہاں فضول دیکھ کر میں نے اپنی راہ لی۔
اگلے روز طلبا نے ہیگل کا آفس خالی کر دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن میرا اطمینان قائم نہ رہ سکا۔ چار بجے پینٹاگون سے ایک سہ رکنی ٹیم آ پہنچی۔ ٹیم کے سربراہ جنرل شا نے بتایا کہ اسے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کی طرف سے بات چیت کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ اسے میری موجودگی پر اعتراض تھا لیکن آئیون نے اس کی چلنے نہ دی اور کہا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ مجھے وہاں سے ہٹانے کا مطلب یہ ہوگا کہ بات چیت نہیں ہو گی۔ اپنی اہمیت جان کر مجھے نشہ سا آ گیا۔ جنرل شا یقیناً خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا ہوگا۔
''جو کچھ میں نے سنا ہے اگر وہ سچ ہے مسٹر لوک ہارٹ۔'' اس نے بات اس طرح شروع کی جیسے اس کے جبڑے بل نہیں رہے ہوں، مٹھیاں کھل بند ہو رہی ہوں۔ ''تو ملک کی سیکیورٹی تمہارے ٹیسٹ ٹیوبوں میں ہے۔''
''میں 'موما ئین' نلکیوں میں رکھتا ہوں۔'' آئیون نے جواب دیا۔
''ٹیسٹ ٹیوب ہوں یا نلکیاں... اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' جنرل شا جز بز ہو کر بولا۔ ''میرا مطالبہ ہے کہ تم اپنا فارمولا ہمارے حوالے کر دو۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔''
''کس کی؟'' آئیون نے سرسری طور پر کہا۔
''ہمارے عوام کی، قوم کی... اور کس کی؟'' جنرل شا پھنکارا۔
''اچھا؟'' آئیون نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''میں فارمولا بخوشی تمہیں دے دوں گا۔''
مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''
''اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے بھی لوگوں کی زندگی اور موت کے سوال سے اتنی ہی دلچسپی ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔
''تمہیں اس کا معقول معاوضہ ملے گا۔'' جنرل شا خوش ہو گیا۔
''مجھے کسی معاوضے کی ضرورت نہیں ہے۔'' آئیون نے جواب دیا۔
''یہ ہوئی نا حب الوطنی کی بات! تم گریٹ ہو مسٹر لوک ہارٹ۔'' جنرل شا جیسے اس کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ ''لیکن ہم درخواست کریں گے کہ تم معاوضہ قبول کر لو۔ تم اس کے ہر سینٹ کے مستحق ہو۔ البتہ 'موما ئین' کے کلیتاً حقوق پینٹاگون کے پاس ہوں گے۔''
''مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے۔'' آئیون نے کہا۔
''ایک اور بات۔'' جنرل شا نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ہم 'موما ئین' کی ریسرچ پر تمہارا ریکارڈ اور اس کی تیاری سے متعلق سارا مواد بھی لے لیں گے۔''
''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا سر۔'' آئیون نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے اپنے کاغذات کی متعدد نقلیں تیار کر لی تھیں۔ انہیں انگلینڈ، فرانس، چین بھجوا دیا ہے۔ ایک کاپی جریدہ انٹرنیشنل جرنل آف اپلائڈ کیمسٹری میں اشاعت کے لیے دے دی ہے۔ میرا بنیادی مقصد امن اور بقائے نسل انسانی کی خاطر بارودی اسلحے کے استعمال کو روکنا ہے۔''
جنرل شا بغلیں جھانکنے لگا۔
بعد میں، میں نے آئیون کا ہاتھ مسرت سے دباتے ہوئے کہا۔ ''میں دل میں خوامخواہ تمہارے لیے غلط رائے قائم کر بیٹھا تھا۔ یہی سمجھا تھا کہ تم پینٹاگون کے سامنے جھک گئے ہو لیکن تم نے اپنی آن قائم رکھی۔ جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔''
''مجھے اس میں شبہ ہے۔'' آئیون نے ٹکا سا جواب دیا۔ ''کوئی سائنس داں 'موما ئین' کا توڑ دریافت کر لے گا۔ جنگی اسلحے کی نت نئی قسمیں دریافت ہوں گی۔ میں نے صرف نچلی سطح پر بارودی اسلحے کے استعمال کو روکنے کے لیے قدم اٹھایا ہے۔ کم از کم گلی کوچوں میں فائرنگ کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ معصوم ہرنوں، بے ضرر پرندوں اور مخالف سیاست دانوں کی جانیں بچ جائیں گی۔''
میں سوچ رہا تھا، کیا امریکی فوجی ہائی کمان کی آرزو کا غنچہ بن کھلے مرجھا گیا... کیا امریکی فوجیں سائنٹیفک طریقے سے دشمن کے بارودی اسلحہ کو جامد کر دیں گی؟

محبت گزیدہ

کاشف زبیر

طویل انتظار کے بعد جو بھی شے دسترس میں آجائے ...... اس کی خوشی کا کوئی حاصل نہیں ہوتا ...... اور نہ ہی اس کا کوئی نعم البدل ہو سکتا ہے۔ ایک اداکارہ کا ماجرا جسے زندگی کے آخری لمحات میں زیست کی رعنائی مل گئی تھی۔

خوف و دہشت کے ماحول میں جنم لینے والا زندگی اور موت کا کھیل

سلی پارکر ہالی ووڈ کی ایک معروف اداکارہ تھی بلکہ اب بھی ہے لیکن اس کی شہرت کا سورج نصف النہار پر پہنچنے کے بعد اب زوال کی طرف گامزن تھا۔ اگرچہ عوام میں اس کی مقبولیت اور محبوبیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن ہالی ووڈ کے مخصوص حلقوں میں اس کی پہلے جیسی مانگ نہیں رہی تھی۔ حسن و جمال کا مجسمہ کہلانے والی سلی اب چالیس کی ہو چکی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی دل کشی میں کوئی کمی آئی تھی۔ اس کے چاہنے والوں کا کہنا تھا کہ اس کا حسن و شباب پہلے سے کہیں دو آتشہ ہو گیا ہے۔ اگر اس کے حسن میں کہیں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ اب پوری ہو گئی تھی۔ اس پر مرنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کم سے کم اس طیارے میں سوار ہالی ووڈ کے ایک درجن مشہور ترین لوگوں میں سے دس اس پر فدا تھے اور چھ افراد ایسے تھے جنہوں نے اسے بارہا یقین دلایا تھا کہ اس کے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔ ان میں معروف

www.pkdigest.com

ہدایت کار ٹام برٹن بھی تھا جس کے کریڈٹ پر لاتعداد کامیاب فلمیں تھیں۔ جوائے لاک جیسا نامور پروڈیوسر بھی تھا جس کی فلمیں شروع ہونے سے پہلے منہ مانگے داموں بک جاتی تھیں۔ گیری کوک جیسا ہیرو جس پر ایک زمانہ مرتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ سلی پر مرتا ہے۔ ولیم کیٹ جیسا لاجواب اسکرپٹ رائٹر تھا جس کے لکھے جملے عوام کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس سلی کے حسن کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

سلی نے اپنے کیریئر کے مختلف ادوار میں ان چاہنے والوں کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ اب بھی وہ کسی کسی پر مہربان ہو جاتی تو وہ اپنی اس خوش نصیبی پر ناز کرتا۔ اگرچہ ان تعلقات میں پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی اور اب یہ صرف ایک آدھ رات یا دن تک محدود ہو گئے تھے لیکن تعلقات برقرار تھے۔ یہ بات وہ سب جانتے تھے لیکن کوئی دوسرے سے حسد نہیں کرتا تھا۔

ماضی میں سلی کے حصے میں ہمیشہ بڑے بجٹ کی فلمیں آتی تھیں۔ کوئی بھی بڑا کردار تخلیق کرتے ہوئے سب سے پہلے سلی سے رابطہ کیا جاتا اور اگر وہ انکار کرتی، تب کسی اور اداکارہ سے رجوع کیا جاتا۔ مگر اب پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ سلی کی مانگ میں کمی آئی تھی بلکہ بات یہ تھی کہ زمانہ بدل رہا ہے اور لوگوں کا فلم بینی کا ذوق بدل گیا ہے۔ آج کل نئی اداکارائیں جو کم بجٹ کی فلموں میں جلوہ گر ہو رہی ہیں، وہ زیادہ کامیاب جا رہی ہیں اور باکس آفس پر ان کی فلمیں زیادہ بزنس کر رہی ہیں۔ اس لیے سلی کے لیے بنائی جانے والی فلموں میں کمی آ گئی تھی۔

حسن و جمال کے ساتھ سلی اداکاری میں بھی مکمل تھی۔ کسی بھی قسم کی اداکاری ہو اور کیسا ہی کردار کیوں نہ ہو، وہ اس میں اپنی اداکاری سے جان ڈال دیتی.... مگر مسئلہ یہ تھا کہ سلی معاوضہ بہت زیادہ لیتی تھی اور آج کل اتنا زیادہ معاوضہ رسک شمار ہوتا ہے۔ فلموں کی کامیابی کا تناسب بہت کم رہ گیا ہے اور بڑے بجٹ کی فلموں کو انشورنس کے مسائل کا سامنا ہے۔ یہی بات تھی کہ سلی بھی بہت سارے بڑے اداکاروں کی طرح فارغ تھی کیونکہ ان کے بجٹ کے مطابق فلمیں نہیں بن رہی تھیں۔

جوائے لاک نے میکسیکو کے پس منظر میں ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا ہدایت کار اس نے ٹام برٹن کو لیا۔ ہیرو گیری تھا اور اس فلم کا اسکرپٹ ولیم نے لکھا تھا۔ ظاہر ہے، ہیروئن سلی تھی۔ جوائے لاک نے فیصلہ کیا کہ فلم کی شوٹنگ وہ اصل مقام پر کرے گا۔ یہ میکسیکو کی خانہ جنگی کے دور کی فلم تھی۔ میکسیکو کا علاقہ ہیر میلون اس کا مرکز تھا جہاں خانہ جنگی کے بڑے معرکے ہوئے تھے۔ فلم ایک جنگجو سردار کی بیٹی کے گرد گھومتی ہے جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد گروہ کی قیادت کرتی ہے اور اپنے مخالفوں کو شکست فاش دیتی ہے۔ جنگجو شہزادی کا کردار سلی ادا کر رہی تھی۔ سلی یہ کردار پا کر بہت خوش تھی۔ ایک تو اسے کئی برسوں سے بہت کم کام مل رہا تھا، دوسرے یہ کہ کوئی اہم کردار کیے اسے بہت عرصہ بیت گیا تھا۔ اسے بھی احساس تھا کہ وہ اپنے کیریئر کے آخری حصے میں ہے۔ اس کے بعد اسے مرکزی کردار ملنا بند ہو جائیں گے۔ اس لیے جب جوائے نے اس سے اس فلم کے بارے میں بات کی تو وہ فوراً راضی ہو گئی اور اس نے معاوضے کے معاملے میں بھی کوئی اصرار نہیں کیا۔

جوائے نے میکسیکو جانے کے لیے ایک چھوٹا بوئنگ طیارہ چارٹرڈ کرایا تھا، اس میں اس کی پوری ٹیم اور تمام اداکار بھی شامل تھے۔ مقامی باشندوں کا بندوبست ایک مقامی شوبزنس ایجنسی کرتی۔ تمام انتظامات مکمل کر کے وہ روانہ ہوئے۔ شوٹنگ ایک مہینے کی تھی، اس کے بعد واپس آ کر وہ اسٹوڈیوز میں شوٹنگ کرتے۔ جوائے کی خواہش تھی کہ اسی موسم گرما میں [illegible] فلم ریلیز کر دیا جائے کیونکہ [illegible] اقتصادی [illegible] بیچارے امریکیوں میں مہنگی تفریح کرنے کی سکت نہیں رہی تھی اس لیے اس سال انہوں نے ریکارڈ سینما ٹکٹ لیے تھے۔ یہ تفریح ان کی پہنچ میں تھی۔

ان کا طیارہ لاس اینجلس سے روانہ ہوا تو سلی کے ساتھ اتفاق سے گیری بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے سلی کو دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم چالیس کے پاس ہو۔ یقین کرو، تم مجھے بالکل ویسی لگ رہی ہو جیسی آج سے بیس برس پہلے تھیں۔“

سلی شرما گئی۔ ”اب بناؤ مت... مجھے پتا ہے میری بڑھتی عمر کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔“

”ممکن ہے لیکن اس سے تمہاری خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔“

یہ طیارہ جوائے کی فرمائش پر اندر سے خاص طور سے آرائش کیا گیا تھا اور اس میں نہ صرف بڑی شاہانہ نشستیں لگائی گئی تھیں بلکہ برتھیں بھی تھیں۔ اگر کوئی لیٹ کر آرام کرنا چاہے تو کر سکتا تھا۔ کمپنی نے چھ افراد کے عملے کے ساتھ دو اضافی ایئر ہوسٹس بھی دی تھیں۔ مسافروں کی تعداد کل بیس تھی اور طیارے میں سو سے زیادہ افراد کی گنجائش تھی اس لیے سب بہت کھل کر اور آرام سے سفر کر رہے تھے۔ طیارے میں ایک بار بھی تھا جہاں سے سب اپنی پسند کی شراب لے سکتے تھے۔ لاس اینجلس سے ہیر میلون کا فاصلہ کوئی بارہ سو کلومیٹر تھا اور طیارہ ڈھائی گھنٹے بعد ہیر میلون کے ایئرپورٹ پر اتر جاتا۔

گیری طیارے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ اس نے سلی سے کہا۔ ”یہ جوائے نے فضول خرچی نہیں کی ہے؟ ڈھائی گھنٹے کا سفر تو ہے، ہم نے کون سا ایک مہینا اس طیارے میں رہنا ہے۔“

سلی مسکرائی۔ ”جوائے کا فنانسر شورڈ ہے۔“

”اچھا۔“ گیری نے گہری سانس لی۔ ”تبھی یہ کنجوس اتنا سخی بنا ہوا ہے۔“

گیری کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جوائے سے خوش نہیں ہے۔ اصل میں جوائے نے اسے جو معاوضہ دیا تھا، وہ اس کے عام معاوضے سے تیس فی صد کم تھا اور گیری کی بھی وہی مجبوری تھی۔ وہ اپنے کیریئر کے آخری حصے میں تھا اور اسے بھی سلی کی طرح کسی بڑی فلم کی ضرورت تھی۔ دو نشست آگے ولیم اور ٹام سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان کا موضوع سلی اور گیری تھے۔ ولیم کہہ رہا تھا۔ ”یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے... حالانکہ اس سے ہم کام لیتے ہیں۔“

[illegible] خوب صورت شکل کے اور ہے ہی کیا، ورنہ اس کے سر میں کسی گنجل کا دماغ ہے۔“

”تم نے دیکھا، طیارے میں آتے ہی اس نے سلی کے ساتھ والی نشست پر قبضہ کر لیا۔“

”یہ سلی پر اپنا حق سمجھتا ہے۔“ ٹام کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”اس کا تو میں دماغ درست کر دوں گا۔“

دونوں گیری کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔ ان سے کچھ دور جوائے اور شورڈ بیٹھے تھے۔ شورڈ کا اس شوٹنگ پر آنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن جب اس نے سنا کہ فلم میں سلی ہیروئن ہو گی تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ کیلیفورنیا میں اس کا سلی کون ویلی میں کمپیوٹرز کا بہت بڑا بزنس تھا۔ اس کی درجنوں کے حساب سے کمپنیوں میں ہزاروں افراد ملازم تھے۔ اس لحاظ سے اس کے کاروبار کو توجہ درکار تھی لیکن وہ اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر صرف سلی کی خاطر شوٹنگ پر آ گیا تھا۔ وہ بھی گیری پر سلگ رہا تھا۔ اس نے جوائے سے کہا۔

”کیا اس کردار کے لیے گیری کو لینا ضروری تھا؟“

”ہاں، اس کردار کے لیے وہی سب سے موزوں ہیرو ہے۔“ جوائے نے کہا۔ ”ویسے اس کا کردار ثانوی ہے اور اصل کردار سلی کا ہے۔“

”مختصر مختصر“

- بعض عورتیں کاربار ک نہیں کرتیں... وہ گویا اسے لاوارث چھوڑ کر جاتی ہیں۔
- نظر کمزور ہونے کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی... فائدہ یہ ہے کہ فٹ پاتھ پر چلتے وقت لڑکیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ نقصان یہ ہے کہ وہ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر ہوتی ہیں۔
- اگر کوئی عورت غیبت نہیں کرتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی دوست نہیں ہے۔

”سلی کتنی شاندار عورت ہے۔“ شورڈ نے وہسکی کا گھونٹ لے کر کہا۔ ”میں نے اس عمر کی اتنی حسین عورت آج تک نہیں دیکھی ہے۔“

ایک زمانے میں شورڈ سے بھی سلی کے تعلقات رہے تھے۔ جذباتی اور جسمانی تعلقات کے معاملے میں سلی خاصی سادہ سی عورت تھی۔ جو اس سے محبت کا دعویٰ کرتا، وہ اس سے تھی ہو جاتی... اور مزے کی بات یہ تھی کہ جب دل بھر جانے پر وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا تو سلی بھی خوش دلی سے پیچھے ہٹ جایا کرتی۔ وہ کسی پر زبردستی مسلط ہونے کی قائل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اپنے تمام عاشقوں سے بہت اچھے تعلقات تھے اور آج بھی کوئی اس سے پرانے تعلق کی یاد منانے کی فرمائش کرتا تو وہ ممکن حد تک اس کی فرمائش پوری کر دیا کرتی۔ ایک بار اس نے ایک انٹرویو میں اپنے بہت سے معاشقوں کے بارے میں کہا۔

”میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ محبت نہ تو محدود ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطلب کسی ایک شخص سے شادی کر لینا ہے۔ آپ کو کئی افراد سے محبت ہو سکتی ہے اور کئی افراد آپ سے محبت کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

انٹرویو لینے والا صحافی قطعی حیران نہیں ہوا کیونکہ ہالی ووڈ کے نامور فلمی ستاروں نے اس کے سامنے اس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب اور ماورائے اخلاق دعوے کیے ہوئے تھے۔ اس نے انٹرویو پر سرخی جمائی۔

”محبت پر یقین رکھنے والی فن کارہ!“

سب سے اہم بات یہ تھی کہ سلی نے جن لوگوں سے بھی

تعلقات رکھے، ان سے آج تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ حالانکہ یہ سب بہت دولت مند اور اثر رسوخ والے لوگ تھے۔ حد یہ کہ وہ ان سے معمولی تحفے بھی نہیں لیتی تھی۔ اس نے جو بنایا تھا اپنی کمائی اور محنت سے بنایا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے علم میں یہ بات تھی لیکن ان میں سے سب اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ آج کل کے دور میں... جب ہیروئنیں خود کو ارزاں ہی اس لیے کرتی ہیں کہ اضافی دولت حاصل کر سکیں۔

سلی نے شورڈ کی دولت سے کچھ نہیں لیا۔ اس نے جوائے سے بھی کوئی کردار نہیں مانگا۔ ٹام سے بھی مطالبہ نہیں کیا کہ فلم میں اس کے کردار کو نمایاں کرے۔ ولیم سے بھی اپنے لیے خاص طور سے مکالمے نہیں لکھوائے۔ وہ میرٹ پر کام کرنے کی قائل تھی اور ان لوگوں سے اپنے تعلق کو صرف محبت اور دوستی تک محدود رکھتی تھی۔ گیری کے ساتھ اس کی جوڑی مشہور تھی اور دونوں نے مل کر باکس آفس کو کئی مشہور ترین فلمیں دی تھیں۔ لیکن سلی نے گیری پر بھی انحصار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنے بل بوتے پر آگے بڑھتی رہی۔

سلی نے ہالی ووڈ سے بے حساب دولت اور شہرت کمائی۔ نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا میں اس کے بے شمار پرستار تھے لیکن سلی اپنا اثاثہ اپنے دوستوں کی محبت کو قرار دیتی تھی۔ اس نے کئی بار اعتراف کیا کہ ہالی ووڈ کی اداکارہ ہونے کے باوجود اسے واحد خوف یہی تھا کہ اس کے دوست اور ان کی محبت اس سے نہ چھن جائے۔ اسے یہ فخر بھی تھا کہ اس کے یہ دوست اس کی خاطر ایک دوسرے سے حسد نہیں کرتے۔

طیارے کی پچھلی نشستوں پر نسبتاً غیر اہم افراد بیٹھے تھے۔ ان میں ٹام کا اسسٹنٹ میک اور سلی کا میک اپ مین جوزیو تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ جوزیو گزشتہ پندرہ سال سے سلی کے ساتھ تھا اور وہ اس کا میک اپ مین ہی نہیں بلکہ اس کی جسمانی آرائش کا ذمے دار بھی تھا۔ وہ سر کے بال سے لے کر پاؤں کے ناخن تک سلی کے جسم کے ایک ایک حصے کو حسین رکھنے کا ذمے دار تھا اور سلی کو اعتراف تھا کہ اس عمر میں بھی وہ نوجوان لڑکیوں جیسا حسن رکھتی ہے تو اس میں جوزیو کی محنت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

میک ابھی نوجوان تھا اور اسے پہلی بار کسی بڑی فلم میں ہدایت کار کا نائب بننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اس نے جوزیو سے کہا۔

''میں نے جب اس فیلڈ میں آنے کا سوچا، تب ہی میرا خواب تھا کہ میں سلی کی کسی فلم میں کام کروں۔''

جوزیو نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم ہیرو لگتے ہو پھر تم نے اس شعبے میں طبع آزمائی کیوں نہیں کی؟''

میک نے شانے اچکائے۔ ''مجھے اداکاری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے ہمیشہ سے ہدایت کاری میں دلچسپی رہی ہے۔''

جوزیو نے سر ہلایا۔ ''آدمی کو وہی کام کرنا چاہیے جس سے اسے دلچسپی ہو۔''

میک نے شروع میں بہت دھکے کھائے تھے اور پورے دو سال تک اسے کہیں کام نہیں ملا۔ پھر ایک فلم میں اسے تیسرے درجے کے اسسٹنٹ کا کام مل گیا... عملاً وہ سیٹ بوائے تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور لگا رہا۔ بالآخر قسمت اس پر مہربان ہوئی اور اسے ٹام نے اپنا نائب بنا لیا۔ یہ اس کی دوسری فلم تھی۔ اس سے پہلے والی فلم میں سلی نہیں تھی۔ اب تک وہ سلی کو دور دور سے دیکھتا رہا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرتا۔ وہ اس موقعے پر بہت مسرور تھا۔

کچھ دیر بعد سلی واش روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے پاس سے گزری تو میک اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے جوزیو سے کہا۔ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں... اگر مجھے سلی کے بارے میں معلوم نہ ہوتا اور وہ میرے لیے انجان ہوتی تو میں بھی اسے بائیس برس سے زیادہ کا نہ سمجھتا۔''

''اصل میں انسان کے سب سے بڑے دو دشمن ہیں، ایک حسد اور دوسری نفرت... سلی ان دونوں سے دور رہتی ہے۔ وہ کسی سے حسد نہیں کرتی۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے کسی کے خلاف کوئی بات نہیں سنی اور وہ کسی سے نفرت بھی نہیں کرتی۔ اس کے جتنے بھی جاننے والے ہیں، وہ سب اس کے دوست ہیں۔ وہ صرف محبت کی قائل ہے۔''

جب سلی واپس جانے لگی، تب بھی میک نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ سلی اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر رک گئی۔ ''کیسے ہو میک؟... مجھے ٹام نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ تمہیں مبارک ہو۔''

''شکریہ مس سلی!'' میک نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سلی اس طرح اس سے بات کرے گی۔

''مجھے امید ہے کہ تم ایک دن بڑے ہدایت کار ہو گے۔''

میک کھل اٹھا۔ ''مجھے بھی امید ہے اور میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ تم میری ہدایت کاری میں کام کرو۔''

سلی دل کش انداز میں مسکرائی۔ ''ایسا ممکن ہے۔''

سلی کے جانے کے بعد میک مسرور نظر آنے لگا۔ ''یہ واقعی بہت اچھی ہے۔''

طیارے میں سب اپنی اپنی محفل جما کر بیٹھے تھے اور سب کی خواہش تھی کہ سلی ان کے پاس بیٹھے۔ وہ سب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے سب کے پاس بیٹھ رہی تھی اور جب وہ آ کر ولیم کے پاس بیٹھی تو پائلٹ نے ہیر سیلون پہنچنے کا اعلان کر دیا۔ ہیر سیلون میں ائرپورٹ تو تھا لیکن یہ انٹرنیشنل نہیں تھا۔ یہاں طیارہ اتارنے کی اجازت حاصل کرنا پڑی۔ یہ طیارہ ایک مہینے کے لیے لیا گیا تھا اور ان کی واپسی تک یہ اسی ائرپورٹ پر کھڑا رہتا۔

☆☆☆

جس وقت طیارہ ہیر سیلون کے ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، رن وے سے ذرا دور ایک ویران سڑک پر ایک بڑی اور طاقت ور وین کھڑی تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں صرف ڈرائیور تھا لیکن پیچھے نصف درجن مسلح افراد تھے۔ ان کے پاس خودکار رائفلوں سے لے کر دستی بم اور آتش گیر بم تک تھے۔ وہ چھ افراد بالکل تیار بیٹھے تھے۔ ان کو ڈرائیور کے اشارے کا انتظار تھا۔ ان کا تعلق میکسیکو کے ایک بدنام منشیات فروش ریکٹ کول ڈاؤن سے تھا اور اس ریکٹ کا سربراہ کارلوس ڈرادو جیل میں تھا جہاں اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا اور امکان تھا کہ اسے سزائے موت سنا دی جائے گی۔

ڈرائیور اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ اس کا نام ماریو تھا اور وہ ریکٹ میں کارلوس کا سب سے وفادار ساتھی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت گروہ کے دوسرے بڑے کارلوس کی زندگی سے مایوس ہو کر گروہ کے حصے بخرے کرنے کی سوچ رہے تھے، اس وقت ماریو نے کارلوس کو رہا کرانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس وقت وہ اسی منصوبے پر عمل درآمد کرنے جا رہا تھا۔ جیسے ہی طیارہ رن وے کی طرف آیا، ماریو نے گھوم کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ہوشیار ہو جاؤ۔''

اس نے وین اسٹارٹ کی اور اسے گھما کر اس رن وے کے متوازی لے آیا جس پر طیارہ لینڈ کرنے والا تھا... اور جب طیارے نے رن وے کو چھوا تو وین اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ یہ اس قسم کی وین تھی جو طیاروں کی لینڈنگ کے دوران ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں پائلٹ کو خبردار کر سکیں اور کسی حادثے کی صورت میں مدد کرنے والوں کی راہنمائی کر سکیں۔ اس لیے پائلٹ سمیت کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ طیارہ اب رکنے والا تھا اور وین بتدریج اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ سلی اتفاق سے اسی طرف بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی، اس نے ولیم سے کہا۔

''یہ وین ہمارے طیارے کے کچھ زیادہ ہی نزدیک نہیں آ گئی ہے؟''

ولیم نے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ طیارہ ویسے بھی رکنے والا ہے۔''

جیسے ہی طیارہ آ کر رکا، وین گھوم کے اس کے اگلے والے دروازے کے عین نیچے آ رکی۔ اس طرح کہ اس کی چھت دروازے سے کچھ ہی نیچے رہ گئی تھی۔ فوراً ہی وین کا عقبی دروازہ کھلا اور اس میں موجود چھ افراد نکل کر پھرتی سے سیڑھی کے ذریعے وین کی چھت پر چڑھ گئے۔ طیارے کی طرف سیڑھی آ رہی تھی لیکن وہ ابھی کچھ دور تھی۔ مسلح افراد نے اوپر چڑھتے ہی طیارے کا دروازہ باہر سے کھول دیا اور اندر داخل ہو گئے۔ آخری آدمی نے اوپر جانے سے پہلے وین کی چھت پر زور سے پاؤں مارا اور اس کے طیارے میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے وین چلا دی۔ اس نے وین گھما کر اس کا رخ آنے والی سیڑھی کی طرف کیا اور اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے خود دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔ وہ قلابازیاں کھا کر وہ کھڑا ہو گیا اور واپس طیارے کی طرف دوڑا۔ سیڑھی لانے والے نے تصادم سے بچنے کی کوشش کی لیکن وین سیڑھی سے جا ٹکرائی اور اسے کچھ دور تک رگڑتی چلی گئی پھر سیڑھی الٹ گئی۔ اس دوران میں ڈرائیور طیارے کے کھلے دروازے کے نیچے آ گیا تھا۔ اس نے سیٹی بجائی تو اوپر سے ایک رسی کی سیڑھی نیچے آئی اور وہ اس کی مدد سے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے طیارے میں جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

☆☆☆

طیارے میں موجود لوگوں کو ذرا تاخیر سے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ ابھی سیٹ بیلٹ کھول رہے تھے۔ سامنے والے حصے میں سب سے پہلے ایک ائر ہوسٹس نے آنے والوں کو دیکھا اور انہوں نے سب سے پہلے اسے ہی قابو کیا۔ ایک آدمی نے اس کی گردن پر رائفل کی نال رکھ دی اور آہستہ سے بولا۔ ''آواز نہ نکلے۔''

ائر ہوسٹس دہشت کے مارے پہلے ہی بے بس ہو گئی تھی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ جیسے ہی ماریو اندر آیا اور طیارے کا دروازہ بند ہوا، ماریو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کاک پٹ کی طرف بڑھا اور اس کے باقی ساتھی طیارے کے پچھلے حصے کی طرف چلے گئے۔ کاک پٹ میں داخل ہوتے ہی ماریو نے پستول کیپٹن کے سر پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اب اس طیارے کا باس میں ہوں... تمہیں کوئی اعتراض؟''

کیپٹن بھی ساکت رہ گیا۔ اس کے کو پائلٹ کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ کیپٹن نے جلد خود پر قابو پا لیا اور بولا۔ ''نہیں... جو تم کہو گے ہم وہی کریں گے۔''

www.pkdigest.com

"گڈ! پہلے مجھے طیارے میں ایندھن کی پوزیشن بتاؤ... جھوٹ مت بولنا۔"

کیپٹن نے بتایا۔ "ابھی طیارے میں اتنا ایندھن ہے کہ ہم واپس لاس اینجلس جا سکتے ہیں۔"

"گڈ! اب تم کنٹرول ٹاور کو اطلاع دیے بغیر طیارے کو واپس موڑو اور لاس اینجلس کی طرف پرواز کرو۔"

"مجھے پرواز کے لیے اجازت کی ضرورت ہوگی۔"

"جو کہا جا رہا ہے وہ کرو... ورنہ میرا خیال ہے کہ تمہارا نائب بھی طیارہ اڑا سکتا ہے۔"

اس دھمکی نے کیپٹن کو مجبور کر دیا اور اس نے طیارے کو رن وے پر واپسی کے لیے گھمانا شروع کیا۔ فوراً ہی کنٹرول ٹاور سے ریڈیو پر کہا گیا۔ "فلائٹ اے تھری تھری فور... یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

ماریو نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا۔ رن وے پر آتے ہی اس کی رفتار میں اضافہ ہوا اور دو منٹ بعد طیارہ پھر سے فضا میں تھا۔ جب طیارہ تیس ہزار فٹ کے فلائٹ لیول پر آیا تو ماریو نے ریڈیو آن کر دیا۔ کنٹرول ٹاور سے مستقل طیارے کے پائلٹ کو مخاطب کیا جا رہا تھا۔ ماریو نے مائک کا بٹن دبایا۔ "طیارے کو ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔"

کنٹرول ٹاور سے پوچھا گیا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"فی الحال تو ہم امریکا جانا چاہتے ہیں۔" ماریو نے کہا۔ "ہم پوری طرح مسلح ہیں اور ہمارے راستے میں کسی رکاوٹ کا مطلب طیارے کی تباہی ہوگا۔"

"کوئی تمہارا راستہ نہیں روک رہا۔" کنٹرول ٹاور نے کہا۔ "لیکن امریکی حکومت کے کسی اقدام کی ذمے داری ہم پر نہیں ہوگی۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ ہمیں ایندھن درکار ہوگا۔"

"اس کے لیے تمہیں کسی ائرپورٹ پر لینڈ کرنا ہوگا۔"

"میں جلد تمہیں بتاتا ہوں کہ ہم کس ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے۔ ہمیں وہاں ایندھن کا ٹرک تیار ملنا چاہیے۔"

ماریو نے بات کر کے ریڈیو بند کر دیا اور کیپٹن کو ایک نقشہ دیا۔ اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "ہمیں اس ائرپورٹ پر اترنا ہے۔"

کیپٹن نے نقشہ دیکھا۔ "یہاں تک پہنچنے میں ہمیں چالیس منٹ لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ماریو نے کہا اور اپنے ساتھی کو کاک پٹ میں چھوڑ کر باہر آیا جہاں اس کے ساتھیوں نے تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ یہ جہاز کا درمیانی حصہ تھا۔ دو آدمی پیچھے تھے اور ایک سامنے تھا جبکہ ایک مستقل چکر لگا رہا تھا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ خاص طور سے کلی کا خوف سے برا حال تھا اور وہ بار بار ولیم سے سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔

"یہ ہمیں مار تو نہیں دیں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" ولیم نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے طیارہ ہائی جیک کیوں کیا ہے؟"

یہ سوال سب کے ذہنوں میں تھا لیکن جوائے اور شورذ سمیت کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہائی جیکرز سے یہ سوال کر سکیں۔ ماریو نے ان کا جائزہ لیا اور خاص طور سے کلی کو دیکھا پھر مسکرایا۔ "میں تمہارا فین ہوں۔"

کلی نے اس کی بات پر ہمت کی۔ "تم نے طیارہ کیوں ہائی جیک کیا ہے؟"

"کیونکہ اس میں امریکا کے معروف ترین فلمی ستارے موجود ہیں۔"

جوائے نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ "تم نے صرف اس لیے طیارہ اغوا کیا ہے؟"

ماریو نے گھوم کر اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ "یہاں صرف وہ بولے گا جس سے میں بات کروں۔"

جوائے [illegible] ماریو دوبارہ کلی کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں نے تمہاری پہلی فلم اس وقت دیکھی تھی جب میں صرف بارہ سال کا تھا اور اس فلم میں تم نے ایک اسپینش لڑکی کا کردار ادا کیا تھا جس کا باپ غدار اور انگریزوں کا غلام ہوتا ہے۔"

"شکریہ..." کلی کو ذرا حوصلہ ہوا۔ "لیکن اس کے لیے طیارہ...؟"

"اس موضوع پر بعد میں بات ہوگی۔ ابھی میں تم لوگوں کو کچھ باتیں بتا دوں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے پاس بم بھی ہیں اور ان میں سے ایک بم بھی پھٹ گیا تو اس طیارے کو تباہ ہونے سے صرف خدا ہی بچا سکتا ہے۔"

ماریو کی بات سن کر ان کے چہرے مزید سفید ہو گئے۔ اپنی بات کا خاطر خواہ ردعمل دیکھ کر ماریو نے بات آگے بڑھائی۔ "دوسرے ہم مرنے اور مارنے کے مشن پر ہیں اس لیے تم لوگوں کی طرف سے کوئی بھی حرکت صرف تمہارے لیے نقصان دہ ہوگی۔"

"ہم میں سے کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔" شورذ نے ماریو کو یقین دلایا۔ "تم بھی ہمیں تکلیف مت دینا۔"

"اس کا انحصار تم لوگوں پر ہے اگر تم شرافت سے رہو گے اور ہمارے مطالبات تسلیم کر لیے گئے تو تمہیں کچھ نہیں ہو

گا اور تم ہنسی خوشی اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ گے۔"

"تمہارے مطالبات کیا ہیں؟" ولیم نے احمقانہ انداز میں پوچھا جس پر ماریو نے اسے گھورا تو وہ اپنی جگہ دبک گیا۔ ان سے بات کرنے کے دوران ماریو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ واپس کاک پٹ میں آیا اور اس نے ریڈیو آن کر کے کنٹرول ٹاور سے کہا۔ "بیس منٹ بعد طیارہ موگاچی کے ائرپورٹ پر اترے گا اور وہاں اس وقت تک فیول ٹینکر موجود ہونا چاہیے۔"

"موگاچی ایک چھوٹا سا ائرپورٹ ہے وہاں اتنے بڑے طیارے کو فیول دینے والا ٹینکر موجود نہیں ہوگا۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" ماریو بے پروائی سے بولا۔ "مجھے ٹھیک بیس منٹ بعد ائرپورٹ پر ٹینکر چاہیے۔ تاخیر کے نتیجے میں جو ہوگا اس کی ذمے داری تم لوگوں پر ہوگی... اور جس وقت طیارہ لینڈ کرے، رن وے پر اس کے آس پاس کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"کوئی نہیں ہوگا اور ہم ٹینکر لانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے چند منٹ کی تاخیر..."

"ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ اکیسواں منٹ ہوتے ہی ایک یرغمالی مارا جائے گا۔" ماریو نے سرد لہجے میں کہا۔ "یاد رہے کہ [illegible] میکسیکن نہیں بلکہ امریکن [illegible]"

یہ بات میکسیکو والے بھی جانتے تھے کہ ایک امریکی اور ایک میکسیکن کی قدر و قیمت میں کیا فرق ہے۔ میکسیکو میں ہر سال منشیات فروش دس ہزار سے زیادہ افراد کو قتل کر دیتے تھے۔ ہر سال ایک ہزار میکسیکن باشندے غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرتے ہوئے امریکن رینجرز کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے تھے۔ ان لوگوں کا کہیں کوئی حساب نہیں ہوتا تھا لیکن اگر امریکا میں منشیات فروش کسی ایک فرد کو بھی قتل کر دیتے تو اس کی تحقیقات سرحد پار تک کی جاتی۔

جب طیارہ موگاچی کے ائرپورٹ پر اترا تو رن وے پر ایک فیول ٹینکر پہلے سے موجود تھا۔ ماریو نے کنٹرول ٹاور کو خبردار کر دیا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے ورنہ ہم مرنے مارنے کے لیے آئے ہیں۔"

ممکن ہے طیارے میں میکسیکن باشندے ہوتے تو کمانڈوز حملہ کر کے ہائی جیکرز کو قابو کرنے کی کوشش کرتے لیکن امریکیوں نے ان کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ اس لیے انہوں نے صرف فیول ٹینکر بھیجا تھا اور اس نے طیارے کو ایندھن فراہم کر دیا۔ یہ اتنا ایندھن تھا کہ طیارہ اوقیانوس عبور کر کے یورپ تک جا سکتا تھا۔ جیسے ہی ٹینکر طیارے سے دور ہوا، کیپٹن نے ماریو کے حکم پر اسے پرواز کے لیے گھمانا شروع کر دیا اور دو منٹ بعد طیارہ پھر فضا میں تھا۔ جب وہ تیس ہزار کی بلندی پر پہنچے تو ماریو نے اگلا حکم دیا۔ "طیارے کو میامی کی طرف موڑ لو۔"

"میامی یہاں سے کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور ہے۔" کیپٹن نے طیارے کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ "ہمیں میامی تک پہنچنے میں سوا تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن خیال رہے کہ خلیج میکسیکو عبور کرنے کے دوران تم نے امریکی پانی سے دور رہنا ہے۔"

کیپٹن اس کے خدشات سمجھ رہا تھا۔ ماریو کو بجا طور پر ڈر تھا کہ امریکی سمندری حدود میں داخل ہونے کی صورت میں ان کو امریکی جنگی طیارے گھیر سکتے ہیں۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکی ہائی جیکنگ کے بارے میں بہت حساس ہو گئے تھے اور ماریو کو خطرہ تھا کہ وہ کہیں طیارے کو گرا نہ دیں۔ دنیا کی اس واحد سپر پاور سے فی الحال کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور وہ جھوٹ بھی بولتی تو ساری دنیا اسے سچ مانتی۔ اس لیے اس نے خاص طور سے کیپٹن کو ہدایت کی تھی کہ وہ امریکی سمندری حدود سے دور رہے۔ کیپٹن یہ بات سمجھ نہیں پایا... کہ وہ ایک طرف تو اسے میامی کی طرف لے جا رہا ہے اور دوسری طرف اسے امریکی حدود سے دور رہنے کو کہہ رہا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس بارے میں سوال کیا تو ماریو نے اس سے کہا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے... بس اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں سمندر میں رہنا ہے، کہیں بھی خشکی کے اوپر طیارہ نہیں لانا۔"

"اس صورت میں طیارے کو میکسیکو کی فضائی حدود سے زیادہ دیر گزرنا پڑے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ماریو نے کہا۔ "بس اتنا خیال رکھنا کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔"

کیپٹن، ماریو کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ اسے اپنا منصوبہ اچھی طرح معلوم ہے اور وہ اسی کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ اسے دھوکا دینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس نے طیارے کا رخ ماریو کی مرضی کے مطابق رکھا۔ اس کے باوجود اسے خدشہ تھا کہ اگر ان ہائی جیکروں کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ اس سمیت سب کو قتل کر دیں گے۔ یہی خدشات اندر کیبن میں موجود کلی کے دل میں بھی آ رہے تھے۔ اس نے ولیم سے کہا۔ "اگر ان لوگوں کے مطالبات نہ مانے گئے تو یہ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔"

ولیم بہادر بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سلی کا خدشہ سن کر اس کی بھی حالت خراب ہوگئی۔ اسے خدا پر زیادہ یقین نہیں تھا لیکن اس وقت اس نے کانپتے لہجے میں سلی سے کہا۔ ''ایسی باتیں مت کرو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نکالے۔''

سلی نے کہا۔ ''ممکن ہے خدا ہماری مدد کرے لیکن یہ لوگ بھی تو اس امید پر آئے ہیں کہ خدا ان کی مدد کرے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''یہی کہ ہمیں ذہنی طور پر کسی بھی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ممکن ہے ہم بچ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سب ہی مارے جائیں۔''

''اگر ایسا ہے تو ذہنی طور پر تیاری کا فائدہ؟'' ولیم سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

سلی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ہمت نکلو گے۔''

''میں کم ہمت نہیں ہوں لیکن ہم ان مسلح ہائی جیکرز کے مقابلے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

''ہم کچھ کر نہیں سکتے لیکن ہمیں خود کو ان کے رحم و کرم پر بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' سلی بولی۔ اس کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا تھا۔ اس پر نشستوں کے درمیان میں ٹہلتا ہوا ہائی جیکر ان کے پاس آگیا اور اس نے بگڑی انگریزی میں کہا۔

''اپنا منہ بند رکھو۔''

اس کے جانے کے بعد ولیم نے سرگوشی میں کہا۔ ''خدا کے لیے اب بات مت کرنا، یہ لوگ بہت خطرناک لگ رہے ہیں۔''

سلی نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے ابتدائی خوف پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ہائی جیکرز ایک تو سارے جوان ہیں اور دوسرے وہ میکسیکن ہیں۔ ان میں سے کوئی باہر کا نہیں تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ انہوں نے ایک امریکی طیارہ کیوں اغوا کیا...؟ سلی نے دوسری قطار میں بیٹھے جوائے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، انہوں نے امریکی طیارہ کیوں اغوا کیا ہے؟''

''ممکن ہے ان کو امریکی حکومت سے کچھ مطالبات منوانے ہوں۔'' جوائے نے سوچ کر جواب دیا۔

''اگر انہوں نے امریکی حکومت سے کچھ منوانا ہے تو ہم خطرے میں ہیں۔'' جوائے کے برابر میں بیٹھا شورڈ بولا۔ ''ہائی جیکرز کے بارے میں امریکی حکومت کی پالیسی واضح ہے۔ وہ کبھی ان کی بات نہیں مانے گی۔''

''چاہے یہ ہمیں مار دیں؟'' ولیم گھبرا کر بولا۔

''ظاہر ہے۔'' سلی نے کہا۔ اسی دوران میں ٹہلنے والا ہائی جیکر ان کے پاس آگیا تو وہ سب خاموش ہوگئے۔ اس کے آگے جانے کے بعد ٹام جو ایک قطار پیچھے تھا، وہ بولا۔

''مجھے شک ہے کہ یہ منشیات کے اسمگلر ہیں اور انہوں نے امریکی حکومت سے کوئی مطالبہ منوانا ہے۔''

''دعا کرو کہ ایسا نہ ہو کیونکہ امریکی حکومت کبھی نہیں مانے گی اور یہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

ان کی آپس میں بحث جاری تھی۔ طیارے کو اغوا ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے اور اس وقت طیارہ خلیج میکسیکو میں پرواز کر رہا تھا۔ ماریو کبھی کیبن میں آجاتا اور کبھی کاک پٹ کا چکر لگاتا..... وہ کیپٹن پر مستقل نظر رکھے ہوئے تھا کہ وہ طیارے کو غلط سمت میں لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ ڈھائی گھنٹے بعد کیپٹن نے اس سے کہا۔ ''اب ہم امریکی سمندری حدود کے پاس ہیں اور اگر اسی سمت میں پرواز کرتے رہے تو جلد امریکی سمندری حدود میں داخل ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، یہاں سے تم طیارے کو کیوبا کی طرف موڑ لو لیکن اس سے پہلے اسے دو ہزار فٹ کی بلندی پر لے آؤ۔''

کیپٹن پریشان ہوگیا۔ ''اس علاقے میں چھوٹا فضائی ٹریفک بہت زیادہ ہے اور طیارے کے کسی دوسرے طیارے سے ٹکرانے کا امکان ہے۔''

''کوئی بات نہیں، ہم یہ خطرہ مول لیں گے لیکن طیارے کو کسی ریڈار پر نہیں آنا چاہیے۔''

مجبوراً کیپٹن نے طیارے کا رخ کیوبا کی طرف موڑتے ہوئے اس کی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ ذرا دیر بعد طیارہ سمندر سے دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور نیچے سمندر میں تیرتی کشتیاں تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کیپٹن نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے بعد ہوانا میں ہوں گے لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ کیوبن حکومت ایک امریکی طیارے کو وہاں لینڈ کرنے کی اجازت دے گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ جب وہ ہوانا کی فضاؤں میں داخل ہوئے تو کیوبن کنٹرول ٹاور سے ان کو وارننگ دی گئی کہ وہ طیارہ واپس لے جائیں، ان کو یہاں لینڈنگ کی اجازت نہیں ملے گی۔ مگر ماریو نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کیوبن حکومت کو دھمکی دی کہ اگر طیارے کو لینڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تو وہ اس وقت تک ہوانا کی فضاؤں میں چکر لگاتا رہے گا جب تک اس کا ایندھن ختم نہیں ہو جاتا۔ کیپٹن نے اس کی ہدایت پر طیارے کو ائرپورٹ کے اوپر چکر

دینا شروع کر دیا۔ نیچے رن وے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے اسے بند کر دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹے کی کشمکش کے بعد کیوبن حکومت نے طیارے کو لینڈ کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے لیے امریکی حکومت نے بھی اس سے درخواست کی تھی۔ طیارے کا ایندھن ختم ہونے کے قریب تھا۔ طیارے نے ایک الگ تھلگ رن وے پر لینڈ کیا اور اس کے دو سو گز کے دائرے سے ہر چیز کو ہٹا لیا گیا کیونکہ رات قریب تھی اس لیے چاروں طرف تیز اسپاٹ لائٹس لگا دی گئی تھیں۔ یہ سب ماریو کے مطالبے پر کیا گیا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ طیارے کے آس پاس کوئی آیا یا کوئی مشکوک سرگرمی ہوئی تو وہ طیارے کو بموں سے اڑا دیں گے۔

اب ماریو سے مذاکرات کرنے کے لیے ریڈیو پر براہ راست امریکا اور میکسیکو کے نمائندے آگئے تھے۔ انہوں نے ماریو سے اس کا مطالبہ پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے تین مطالبے ہیں۔ ایک میکسیکو میں قید کارلوس کو رہا کیا جائے۔ دوسرے امریکی جیلوں میں قید ہمارے سات ساتھیوں کو رہا کر کے ان کو یہاں کیوبا پہنچایا جائے... اور تیسرا ہمیں امریکی حکومت تاوان کے دس کروڑ ڈالرز ادا کرے۔''

ماریو کو بتایا گیا کہ اس کے مطالبات پر غور کر کے جلد اسے بتایا جائے گا۔ ماریو نے ان سے کہا۔ ''تم لوگ جلدی غور کر لو ورنہ ہمارے پاس کچھ دوسرے آپشن بھی ہیں۔''

سرکاری حکام سمجھ رہے تھے کہ ہائی جیکرز کے پاس دوسرے آپشن کیا ہوتے ہیں۔ وہ مسافروں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور طیارے کو دھمکی کے مطابق بم سے اڑا دیں گے۔ کیوبن حکام نے طیارے میں تازہ کھانے اور پانی کی فراہمی کی پیش کش کی لیکن ماریو نے رات کی تاریکی میں کوئی بھی چیز لینے سے انکار کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ ان چیزوں کی فراہمی کی آڑ میں کمانڈوز اندر نہ گھس آئیں اور وہ مارے جائیں۔ طیارے میں کھانے پینے کا خاصا سامان موجود تھا۔ ماریو اور اس کے ساتھی اس موقعے پر پوری طرح ہوشیار تھے۔ انہوں نے طیارے کے داخلی دروازے کے ساتھ بم لگا دیے تھے۔ اب کوئی بھی ان دروازوں کو کھولنے کی کوشش کرتا تو یہ بم پھٹ جاتے اور آنے والے مارے جاتے۔

سلی اور دوسرے لوگ بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے لیکن ان کو اپنی جگہ سے اٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ باتھ روم جانے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی اور جسے ایک بار اجازت مل جاتی تو اس سے کہا جاتا کہ وہ اب دوبارہ جانے کی بات نہ کرے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ ہائی جیکرز کے سرکاری حکام سے کیا مذاکرات چل رہے ہیں اور ان کا کیا نتیجہ برآمد ہونے والا ہے۔ سلی کو ماریو نامی شخص بہت خطرناک لگ رہا تھا۔ اس کا نام یوں پتا چلا کہ اس کے ایک ساتھی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

سلی باتھ روم سے آنے کے بعد جوائے کے پاس آگئی۔ ان سب میں وہی تھا جو کچھ حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ باقی تو سب سہمے بیٹھے تھے۔ سلی نے جوائے کے پاس بیٹھتے ہی پوچھا۔

''انہوں نے طیارہ کس مقصد کے تحت اغوا کیا ہے؟''

''ظاہر ہے۔'' جوائے بولا۔

''اگر ان کا مقصد پورا نہ ہوا تو یہ کیا کر سکتے ہیں؟''

جوائے خود ہائی جیکرز کے بارے میں کئی فلمیں بنا چکا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کے حالات میں ہائی جیکرز کا کیا ردِعمل ہوتا ہے... اور وہ یرغمالیوں کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ سلی کو ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہوگا... میں نے ہائی جیکنگ کے بارے میں ایک مضمون پڑھا ہے اس میں اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ عام طور سے ہائی جیکرز اپنے کاز کو شہرت دینے کے لیے یہ حرکت کرتے ہیں اور مسافروں کو نقصان پہنچانے سے گریز کرتے ہیں۔''

''لیکن کچھ واقعات میں مسافروں کو نقصان ہوتا ہے۔'' سلی نے اصرار کیا۔

''ہاں ہوتا تو ہے لیکن ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔'' جوائے نے نرمی سے کہا۔

سلی بظاہر تو عقل سے عاری ایک حسین اداکارہ تھی جیسی کہ ہالی وڈ کی اکثر اداکارائیں ہوتی ہیں لیکن اندر سے وہ حساس اور معاملات کو سمجھنے والی ذہین عورت تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ہائی جیکرز کسی سیاسی کاز کے لیے کام نہیں کر رہے بلکہ ان کے میکسیکو یا امریکا کی حکومت سے کچھ مطالبات ہیں اور اس صورت میں امکان یہی تھا کہ نوبت مرنے مارنے کی حد تک آجائے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کو چھڑانے کے لیے کمانڈوز آپریشن کرتے اور اس میں نہ جانے کون بچتا اور کون مارا جاتا؟ ان لوگوں کو پتا نہیں تھا کہ طیارہ کیوبا میں ہے۔ وہ اسے میکسیکو یا امریکا کا کوئی ائرپورٹ سمجھ رہے تھے۔ ائرپورٹ کی ساری روشنیاں بجھا دی گئی تھیں اور صرف طیارے کے آس پاس روشنی تھی اس لیے ان کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں؟

ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جس موضوع

www.pkdigest.com

پر فلمیں بناتے رہے تھے، وہی حالات ان کے ساتھ بھی پیش آسکتے ہیں۔ ان کا طیارہ بھی ہائی جیک ہوسکتا ہے اور ان کی زندگیاں ہائی جیکرز کے رحم وکرم پر ہوسکتی ہیں۔ سلی نے آہستہ سے کہا۔ ''ہمارا طیارہ اغوا ہونے کی خبر اس وقت ہاٹ کیک بنی ہوگی۔''

''ہاں لیکن اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' جوائے نے باہر دیکھا۔ ''ہم جس مشکل میں ہیں، اس سے ہمیں صرف خدا ہی نکال سکتا ہے۔''

لیکن سلی کا خیال مختلف تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان کے اغوا کی جتنی زیادہ کوریج ہوگی، حکومت پر اتنا ہی دباؤ آئے گا اور وہ ہائی جیکرز کے مطالبات کو سنجیدگی سے لے گی۔ دوسری صورت میں ممکن تھا کہ امریکی حکومت ان کا مطالبہ ماننے سے انکار کردے اور ان کی جان کی پروا نہ کرے۔ طیارے کے باہر جہاں روشنی تاریکی سے مل رہی تھی، وہاں بھی کبھی کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ شاید یہ سیکیورٹی والے تھے لیکن کوئی روشنی کی حد میں نہیں آرہا تھا۔

کسی وقت سلی کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک وہ چونکی، اس نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ خواب ڈراؤنا ہی تھا۔ کیبن میں تقریباً سب ہی سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ باہر صبح کی روشنی نمودار ہونے والی تھی اور ہلکا سا اجالا ہوگیا تھا۔ ہائی جیکرز اسی طرح مستعد تھے اور انہوں نے ان کی نگرانی کرنے میں ذرا سی کوتاہی نہیں دکھائی تھی۔ اس وقت بھی وہ کیبن میں موجود تھے مگر ان کا سربراہ ماریو نظر نہیں آرہا تھا۔

ماریو اس وقت کاک پٹ میں امریکی اور میکسیکن نمائندے سے بات کررہا تھا۔ اس کے مطالبات پر غور کیا جارہا تھا۔ ماریو نے اس بار سخت اور فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔ ''تم لوگوں کے پاس دس بجے تک کی مہلت ہے۔ یعنی اب سے چار گھنٹے کے اندر ہمارے مطالبات نہیں مانے گئے تو ہم ہر دس منٹ بعد ایک یرغمالی کو قتل کرنا شروع کردیں گے۔''

سرکاری نمائندے ماریو کو سمجھانے کی کوشش کررہے تھے لیکن اس نے یہ کہہ کر ریڈیو بند کردیا کہ اب وہ ان سے نو بج کر پچاس منٹ پر بات کرے گا اور ان کا جواب اس کے ردعمل کا تعین کرے گا۔ ماریو نے ریڈیو بند کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو الرٹ کردیا۔ اس نے کیپٹن اور اس کے کو پائلٹ کو بھی کاک پٹ سے نکال کر مسافروں والے حصے میں بھیج دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس کے الٹی میٹم کا الٹا اثر بھی ہوسکتا ہے اور طیارہ ان کے قبضے سے چھڑانے کے لیے آپریشن بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیش نظر وہ طیارے کو یہاں لائے تھے کہ یہاں کم سے کم امریکی کمانڈوز آکر کارروائی نہیں کرسکتے تھے۔ اسی طرح کیوبا کی حکومت بھی بلاوجہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جو اس کی ساکھ کو نقصان پہنچائے۔ اس کے باوجود ماریو اور اس کے ساتھی ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔

ماریو کیبن میں آیا تو ائر ہوسٹس اس کے ایک ساتھی کی نگرانی میں سب کو ناشتا دے رہی تھی۔ انہوں نے بھی ناشتا کیا۔ ماریو نے محسوس کیا کہ یرغمالی کیپٹن اور کو پائلٹ کے کیبن میں آنے سے پریشان لگ رہے ہیں۔ شاید ان کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ معاملات آخری موڑ کی طرف جارہے ہیں اور اب ان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے بیشتر لوگوں نے برائے نام ہی کھایا۔ ان میں سے اکثر شراب پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ماریو اور اس کے ساتھیوں نے ان کو پینے کی آزادی دے رکھی تھی۔ ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ پی پی کر وہ ست ہوجائیں اور ان کے لیے مسئلہ نہ بنیں۔ واقعی ان میں سے کئی مدہوش ہوگئے تھے۔

ماریو اور اس کے ساتھیوں نے شروع سے طے کرلیا تھا کہ مسافروں کو تمام معاملات سے بے خبر رکھنا ہے کیونکہ اگر ان کو مطالبات [illegible] معاملات کا پتا چلتا تو وہ [illegible] خوف [illegible] تھے اس لیے مسافروں کو بے خبر رکھنا ہی بہترین پالیسی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ماریو پر بھی اضطراب طاری ہورہا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ ان کے مطالبات اتنی آسانی سے نہیں مانے جائیں گے اور ان کو کچھ خوں ریزی کرنا پڑے گی۔ یہ بھی طے تھا کہ ان کو تشدد سے ہر صورت بچنا ہوگا۔ ورنہ کوئی ملک ان کو پناہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

ساڑھے نو بجے ماریو کاک پٹ میں آگیا۔ اس نے پونے دس بجے ریڈیو آن کردیا۔ فوراً ہی اسے کنٹرول ٹاور کی طرف سے پیغام ملنے لگا کہ وہ ریڈیو آن کرکے سرکاری حکام سے بات کرے۔ چند منٹ بعد امریکی نمائندہ ریڈیو پر تھا۔ اس نے ماریو سے کہا۔ ''ہم مجرموں کو چھوڑنے کا مطالبہ قبول نہیں کرسکتے لیکن تمہیں دس کروڑ ڈالرز تاوان دینے کو تیار ہیں۔''

اب تک ماریو بڑے ٹھنڈے انداز میں بات کررہا تھا۔ ایک تو اس کا مقصد ان لوگوں کو نرم تاثر دینا تھا کہ وہ رات میں کمانڈو آپریشن کرنے کا نہ سوچیں، دوسرے وہ [illegible] مزاج آدمی تھا لیکن اس وقت وہ پھٹ پڑا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''جہنم میں گئے تمہارے دس کروڑ ڈالرز...

ہمیں اپنے ساتھی چاہئیں۔''

''ہماری حکومت ماننے کو تیار نہیں ہے۔'' امریکی نمائندے نے معذرت کی۔ ''لیکن ہم بات جاری رکھ سکتے ہیں۔''

''بھاڑ میں گئی تمہاری بات... اب تمہاری حکومت دوسرے طریقے سے مانے گی۔ اگر دس بجے تک تم لوگوں نے مطالبات نہ مانے تو اس کے بیس منٹ بعد پہلا یرغمالی قتل کردیا جائے گا۔'' ماریو نے کہا اور مائک رکھ دیا۔ اس نے ریڈیو آن رکھا تھا اس لیے وہ ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ اسے پکار رہے تھے لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ یرغمالیوں میں سے کسے قتل کرے۔ اس نے اپنا ایک ساتھی کاک پٹ میں چھوڑا اور خود کیبن میں آیا۔ اس نے تمام مسافروں کا بغور جائزہ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس کو قتل کیا جائے تو امریکی حکومت پر زیادہ اثر ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب معاملہ امریکی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ جو فیصلہ کرے گی، وہ میکسیکو کی حکومت کا فیصلہ بھی ہوگا۔ اس لیے اسے امریکیوں کو مجبور کرنا تھا۔

اس کے دیکھنے کے انداز سے ہی سب سہم گئے۔ ان کو ایسا لگا جیسے وہ بھیڑیں ہوں اور کوئی قسائی ان کا جائزہ لے رہا ہو۔ پھر ماریو کی نظر سلی پر آکر رک گئی اور اس نے اسے منتخب کرلیا کیونکہ وہ ان سب میں [illegible] سب سے زیادہ مقبول تھی اور پورا امریکا اس کا پرستار تھا۔ دوسرے وہ عورت تھی۔ اس کے مرنے سے امریکی حکومت بدنامی سے بچنے کے لیے ان کے آگے جھک جاتی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ پلٹا اور کاک پٹ کی طرف چل پڑا۔ اب اسے امریکیوں سے آخری بات کرنا تھی۔

''اس نے مجھے منتخب کرلیا ہے۔'' سلی نے ماریو کے جاتے ہی آہستہ سے جوائے سے کہا۔

جوائے نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے چن لیا ہے۔'' سلی نے اس بار واضح الفاظ میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' جوائے بڑبڑا گیا۔ ''لگتا ہے تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔''

''تم نے غور نہیں کیا، وہ ہم میں سے کسی کو منتخب کرنے آیا تھا۔ شاید ان کے مطالبات ماننے سے انکار کردیا گیا ہے اور اب یہ تشدد کے ذریعے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کریں گے۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے کہا نا، تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیں قسائی کی نظر سے دیکھ کر گیا ہے اور مجھ پر اس نے سب سے آخر میں نظر ڈالی تھی۔ اس نے مجھے ٹارگٹ کیا اور چلا گیا۔''

جوائے سہم گیا۔ ''میرے خدا... یعنی بات تشدد تک آگئی ہے۔''

سلی نے سر ہلایا۔ ''مجھے اسی بات کی توقع تھی۔ اب دیکھو، یہ مجھے لینے کب آتا ہے۔'' اس کے لہجے سے فکرمندی عیاں تھی۔ وہ اب تک پرسکون تھی جیسے اپنے نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بات کررہی ہو مگر وہ کب تک پرسکون رہ سکتی تھی۔ جوائے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم فکر مت کرو... خدا نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا۔''

''نہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ میرا وقت آگیا ہے۔'' سلی نے نفی میں سر ہلایا۔

سرگوشیوں میں بات سب میں پھیل گئی اور اکثر یہ سوچ کر سہم گئے کہ سلی کے بعد ان کی باری بھی آئے گی۔

☆☆☆

ماریو کا چہرہ بگڑ گیا... اور اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو، ہم بے بس ہیں؟ نہیں، ہم تمہیں بتادیں گے کہ ہم بے بس نہیں ہیں۔ اپنے انکار کا نتیجہ دیکھنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ تم لوگوں نے کیمرے طیارے پر مرکوز کر رکھے ہوں گے۔'' اس کا لہجہ زہریلا ہوگیا اور اس نے مائک سیٹ پر پھینک دیا۔ وہ پلٹ کر کیبن میں آیا۔ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔ اس نے جاتے ہی سلی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کر کھڑا کردیا۔

''وحشی۔'' وہ کراہی۔ ''چھوڑو مجھے۔''

ماریو نے سلی کو کھڑا کیا تو باقی سب بھی کھڑے ہوگئے۔ ماریو نے سلی کا بازو پکڑے رکھا اور دہاڑ کر بولا۔ ''سب بیٹھ جاؤ، کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھے ورنہ...''

''تم سلی کو کہاں لے جارہے ہو؟'' جوائے نے ہمت کرکے پوچھا۔

ماریو نے کڑے تیور سے اسے گھورا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری حکومت نے ہمارے مطالبات ماننے سے انکار کردیا ہے، اب اسے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔''

''لیکن اس میں سلی کا کیا قصور ہے؟'' عقب سے میک نے کہا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا جبکہ باقی ماریو کی دہاڑ سن کر بیٹھ گئے تھے۔

''اس کا قصور ہے کہ یہ امریکی ہے۔''

''امریکی تو ہم سب بھی ہیں۔''

www.pkdigest.com

ماریو کے ایک ساتھی نے آکر میک کو دھکا دے کر اس کی نشست پر بٹھا دیا۔ وہ سب مستعد ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی نے ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو وہ اسے اڑانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اب شورڈ نے ہمت کی اور بولا۔

''کسی یرغمالی کو مار دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو ہم امریکی حکام سے بات کریں؟''

''یہ لوگ زبان سے سمجھنے والے نہیں ہیں۔'' ماریو نے کہا۔ ''اب میں ان کو جو زبان سمجھاؤں گا وہ یہ اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔''

سلی اب تک بہادری کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن جب اسے احساس ہوا کہ اس کی موت قریب ہے تو وہ مزاحمت کرنے لگی۔ اس نے روتے ہوئے ماریو سے کہا۔ ''پلیز! مجھے چھوڑ دو۔''

''میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا... تمہاری موت امریکیوں کو مجبور کرے گی کہ وہ ہماری بات مانیں۔ اور تم فکر مت کرو، تمہاری موت کا منظر ساری دنیا دیکھے گی۔ میں تمہیں طیارے کے دروازے پر شوٹ کروں گا۔ تم مرنے کے بعد بھی اسکرین پر رہو گی۔'' ماریو بے رحمانہ لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔

سلی لرزنے لگی۔ ''میں ہی کیوں؟''

''تم کیوں نہیں!'' ماریو نے اس سے سوال کیا۔ ''فرض کرو اگر تم نہیں تو کون؟''

ماریو کے اس سوال نے سب کی ہوائیاں اڑا دیں... کہ سلی نہیں تو کون؟... سب اپنی اپنی جگہ دبک گئے۔ صورت حال کی سنگینی ان کو بھی ہوش میں لے آئی تھی جو حلق تک شراب پی چکے تھے۔ ماریو سب کو دیکھ رہا تھا اور وہ جسے دیکھتا... وہ یوں نظریں جھکا لیتا جیسے شتر مرغ ریت میں گردن دبا کر سمجھتا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ ماریو نے سب کا جائزہ لینے کے بعد سلی سے کہا۔

''اگر ان میں سے کوئی تمہاری جگہ لینے کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

سلی روتے روتے بولی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

لیکن ماریو کی بات نے وہاں دھماکا کر دیا۔ سب کا سانس رک گیا تھا۔ وہ سمجھے کہ سلی جس کی طرف اشارہ کرے گی ماریو اسے اس کی جگہ لے جائے گا۔ ماریو ان لوگوں کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''مطلب واضح ہے، اگر ان میں سے کوئی خود کو تمہاری جگہ پیش کر دے تو تمہاری جان بخشی ہو جائے گی۔''

سلی نے پُرامید نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''ان میں سے کوئی... میری جگہ؟''

''ہاں، میں نے پڑھا ہے کہ یہ سب تمہارے چاہنے والوں میں سے ہیں... تو کیا تمہاری جگہ جان نہیں دے سکتے؟''

سلی نے ان لوگوں کو دیکھا جو اس کی چاہت کے دعوے دار تھے اور اس پر جان لٹانے کی بات کرتے تھے۔ سلی نے ان سے کبھی ان کی محبت کے سوا کچھ نہیں مانگا تھا۔ آج اسے ان کی ضرورت تھی اور وہ سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سلی نے گیری کی طرف دیکھا جو اس کی خلوتوں کا سب سے زیادہ ساتھی رہا تھا۔

''گیری... پلیز!''

مگر گیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سلی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اب ولیم اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ سلی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بہت بڑا بڑا نہیں لکھا تھا۔ اس نے بنا شرمائے اور اس سے نظریں چرائے انکار کر دیا۔ سلی نے پُرامید نظروں سے ٹام، جوائے اور شورڈ کی طرف دیکھا۔ یہ سب اس کے عاشق تھے بلکہ اب بھی محبت کے دعوے کرتے تھے۔ جوائے نے شرمندگی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ٹام نے آہستہ سے کہا۔

''سلی! میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن تمہاری خاطر جان نہیں دے سکتا۔''

شورڈ نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے سپاٹ لہجے میں سلی کو بتا دیا۔ ''میں نے تم سے کبھی محبت ہی نہیں کی، وہ بس ایک جسمانی تعلق تھا۔''

''شکریہ!'' سلی تلخی سے بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم میں اتنی اخلاقی جرأت تو ہے کہ تم سچ بول سکو۔ ان سب میں شاید سچ بولنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔'' اس نے باقی سب کو دیکھا۔ ''تم سب نے مجھ سے نہیں، میرے حسن سے محبت کی تھی... تمہیں صرف میرے جسم سے مطلب تھا۔''

سلی کا سچ ان سب کے چہروں پر نظر آ رہا تھا جو آج کھل گیا تھا۔ انہوں نے سلی کو صرف ایک سلیبرٹی جانا تھا۔ اس کی حیثیت ایک عورت سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ خوش قسمت تھے کہ صرف محبت کا دعویٰ کر کے اس کی خوش رنگ قربت سے لطف اندوز ہوتے رہے... سلی نے بدلے میں ان سے کچھ نہیں چاہا تو یہ اسے اس کی محبت نہیں بے وقوفی سمجھتے تھے۔ جو بات وہ برسوں سے دل میں کہتے آئے تھے مگر سلی بے خبر رہی، آج وہ ان کے بنا کہے جان گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے ہٹ گئے تھے۔ وہ جان گئی تھی، وہ اس سے محبت کرتے ہی نہیں تھے

بلکہ اسے استعمال کرتے تھے۔ سلی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ صدمہ اس کے لیے موت کے خوف سے زیادہ اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ اس نے ماریو کی طرف دیکھا۔

''ان میں سے کوئی میرے لیے جان نہیں دے گا۔''

ماریو طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''یہ تو سب تمہارے عاشق ہیں۔''

''خدا کے لیے... اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو مگر مجھے ذہنی اذیت مت دو۔'' سلی کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

ماریو سنجیدہ ہو گیا۔ ''معاف کرنا، میں واقعی تمہارے ساتھ دُہری زیادتی کر رہا ہوں۔''

سلی نے آنکھیں صاف کیں اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ موت کو سامنے دیکھ کر اس کا خوف ختم ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی تو میک کھڑا ہو گیا۔ ماریو کا ساتھی پھر اس کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے اس نے ماریو سے کہا۔ ''رک جاؤ... تم اس کی جگہ مجھے لے جاؤ۔''

سلی سمیت سب نے ناقابلِ یقین نظروں سے میک کی طرف دیکھا۔ سلی نے کہا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے... تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میک نے سر ہلایا۔ ''مجھے معلوم ہے... میں تمہاری جگہ موت قبول کرنے کو تیار ہوں۔''

ماریو نے تمسخرانہ نظروں سے میک کو دیکھا۔ ''شاید تم جذباتی ہو رہے ہو لیکن نوجوان... گولی سے مرنا بڑا تکلیف دہ کام ہے۔''

میک کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر وہ بیٹھا نہیں۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں سلی کی جگہ لینا چاہتا ہوں۔''

سلی تڑپ کر آگے آئی۔ ''لیکن کیوں... تم مجھے کیوں بچا رہے ہو؟''

میک نے اسے دیکھا۔ ''میں تم سے محبت کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میں تمہارا پرستار ہوں اور تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میں تمہیں یوں بے بسی سے مرتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''تم پاگل ہو... تمہاری عمر مرنے والی نہیں ہے۔''

''شاید میں پاگل ہوں لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں اور میں نے بڑی مشکل سے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میک اپنی نشست سے نکل آیا۔ اس نے ماریو سے کہا۔ ''تم مجھے لے چلو۔''

ماریو، سلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ ان میں سے کوئی تم سے محبت نہیں کرتا لیکن اس نوجوان نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ تمہیں مبارک ہو، اس دنیا میں کم سے کم ایک فرد تو تم سے سچی محبت کرتا ہے۔''

ماریو نے میک کو طیارے کے سامنے والے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ آگے بڑھا تھا کہ عقب سے سلی چلائی۔

''رک جاؤ۔''

ماریو رک گیا۔ اس نے ناگواری سے سلی کی طرف دیکھا اور غرایا۔ ''اب کیا بات ہے؟ میرے پاس ان ڈراموں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''اسے چھوڑ دو، میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''نہیں۔'' میک تیز لہجے میں بولا۔ ''تم نہیں جاؤ گی۔''

سلی اس کے پاس آئی۔ اس نے میک کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''نہیں لڑکے... میں نے اس دنیا میں سب دیکھ لیا ہے اور میں خوش قسمت ہوں کہ میں نے ایک محبت کرنے والا بھی دیکھ لیا ہے۔ تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔''

میک نے کچھ کہنا چاہا لیکن سلی نے اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر وہ اس سے الگ ہو گئی اور اس نے ماریو سے کہا۔ ''چلو۔''

''نہیں۔'' میک نے تڑپ کر کہنا چاہا لیکن ماریو کے ساتھی نے اسے دھکیل کر اس کی نشست پر بٹھا دیا۔ سلی نے جانے سے پہلے اسے دیکھا اور ماریو کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اس کا ایک ساتھی طیارے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ سلی نے سامنے دیکھا۔ دور تک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ اس کے آخری لمحات کی کوریج کے لیے جمع تھے۔ درجنوں کے حساب سے ٹی وی کیمرے اور سیکڑوں اسٹل کیمرے مصروف تھے۔ ماریو اس کے پیچھے یوں کھڑا تھا کہ وہ طیارے کے باہر سے نظر نہ آ سکے۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اسنائپر اسے نشانہ نہ بنا لے۔ سلی نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہاں مجھے مرتا دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہیں۔''

''اس سے زیادہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔'' ماریو بولا۔ ''ویسے تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟''

سلی نے گہری سانس لی۔ ''اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو مجھے امید ہے کہ میری موت کے بعد امریکی حکومت ہتھیار ڈال دے گی اور تمہارے مطالبات مان لیے جائیں گے۔ شاید کسی اور کی موت کا یہ اثر نہ ہو...''

ماریو اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر سلی نے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ جب اس دنیا سے جاؤں تو کم سے کم میرا ایک چاہنے والا تو ہو۔''

ماریو نے پستول اس کی پشت پر رکھ دیا۔ ''اس کا گواہ میں ہوں۔ تمہارا کم سے کم ایک چاہنے والا اس دنیا میں ہے۔''

فائر کی آواز آئی تو اندر کیبن میں میک سسکیاں لے کر رونے لگا۔

www.pkdigest.com

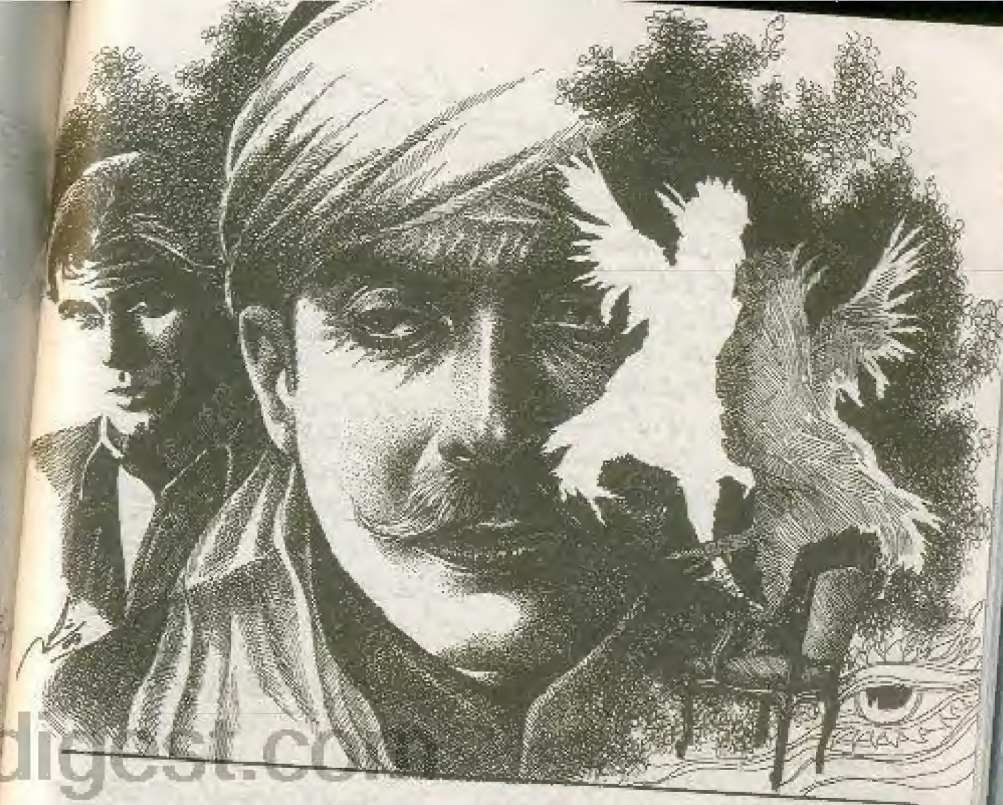

بارہویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون
کے بھی کتنی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشی کا تجزیہ کرکے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسرشاہی، جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

کمرے میں موجود تمام نفوس ڈاکٹر ماریا کا جملہ مکمل ہونے کے انتظار میں اپنی سانسیں روکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ماریا نے ان سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی اور مسکراتی ہوئی بولی۔ ”آپ لوگوں کے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ میں اپنے ساتھ گلوکوز اور ضروری انجکشن وغیرہ لے کر آئی ہوں۔ میں انہیں ابھی ڈرپ لگا دیتی ہوں۔ الٹیوں کی وجہ سے جسم میں پانی کی جو کمی ہوگئی ہے، وہ پوری ہو جائے گی۔“ ڈاکٹر ماریا جوں جوں بولتی جا رہی تھی، وہاں موجود افراد کے چہروں کی رنگت میں تغیر آتا جا رہا تھا۔ چودھرائن ناہید کے چہرے کی گھبراہٹ بہ تدریج اطمینان کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ کشور کے چہرے کی زردی میں بھی کمی واقع ہوئی تھی جبکہ وڈی چودھرائن کے چہرے پر مایوسی کے رنگ تھے۔ وہ تو منتظر تھی کہ کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس کے ذریعے وہ سوکن کو ذلیل کرنے کا موقع نکال سکے لیکن ڈاکٹر ماریا کے الفاظ اس کی اس خواہش کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ اس کی کیفیت سے بے نیاز ڈاکٹر ماریا نے اپنی بات جاری رکھی ہوئی تھی۔ ”یہ ڈائریا کی بالکل ابتدائی اسٹیج ہے۔ ایک آدھ میڈیسن اور ڈرپ سے معاملہ سنبھل جائے گا۔ الٹیوں کی وجہ سے انہیں ڈی ہائیڈریشن ہوگئی ہے۔ میں گلوکوز چڑھاؤں گی تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ڈاکٹر ماریا کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی مصروف عمل تھے۔ اپنا بڑا سا بیگ کھول کر وہ اس میں سے ٹریٹمنٹ کا سامان نکالتی جا رہی تھی۔

ادھر وڈی چودھرائن پر اوس پڑ گئی تھی۔ تاجور کی زبانی اس نے کشور کے لاہور کے قیام کے عرصے میں اس کے چلنے کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے وہ شک میں پڑ گئی تھی۔ تاجور نے اسے بتایا تھا کہ کشور نے کسی نئی نویلی دلہن کی طرح ہاتھ پیروں پر مہندی لگا رکھی تھی۔ اگرچہ اس بات کو کشور کی ذہنی کیفیت کی خرابی سے جوڑا گیا تھا لیکن وڈی چودھرائن کھٹک سی گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ کشور کوئی گل کھلا چکی ہے اور اس کا نتیجہ آج سامنے آنے والا ہے... لیکن خلاف توقع بات کچھ اور ہی نکلی تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے بتایا تھا کہ کشور ڈائریا کا شکار ہوئی ہے اور اس اطلاع کو سن کر وڈی چودھرائن کو مایوسی ہوئی تھی۔ سوتن کو نیچا دکھانے کا ایک سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ حویلی کی خواتین میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ چودھری کے بعد حویلی میں اس کا ہی سکہ چلتا تھا لیکن سوتن کا جلاپا اس عمر میں بھی اس کے دل میں برقرار تھا۔ چودھرائن ناہید اگرچہ اس کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پھر بھی وڈی چودھرائن اسے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اپنی ملازمۂ خاص رجے کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ کشور کے پاس موبائل ہے، وہ مسلسل کھوج میں لگی ہوئی تھی کہ کشور کو کسی طرح رنگے ہاتھوں پکڑ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے رجے کی بیٹیوں پچھی اور شادو کو کشور کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس وقت امید بندھی تھی کہ شاید کچھ ایسا سامنے آجائے جسے کشور کی مشکوک سرگرمیوں کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کو ڈرپ لگانے کی تیاریوں میں مصروف چھوڑ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو بیٹھ ناہید اپنی دھی کے پاس۔ میں تو اب آرام کرنے جا رہی ہوں۔ نہ جانے کیا الا بلا کھا کر بیٹھی ہے کڑی کہ آدھی رات ویلے پریشانی کھڑی کر دی ہے۔“ وہ مغرورانہ انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پچھی اور شادو بھی گئیں۔

”آپ بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں چھوٹی چودھرائن! میں ہوں یہاں پر ان کی دیکھ بھال کے لیے۔ جانے سے پہلے اطلاع کر دوں گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو آپ کسی ملازمہ کو ان کے پاس بھیج دیجیے گا۔ ویسے تو میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے انہیں انجکشن لگا دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ [illegible] جائیں گی اور آرام سے سو جائیں گی۔ اس لیے میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گی کہ فکر نہ کریں اور آرام سے جا کر سو جائیں۔“ وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے چودھرائن ناہید سے کہا تو وہ بھی فوراً ہی باہر نکل گئی۔ حویلی کی پرتعیش زندگی میں جہاں دن رات ملازمائیں خدمت کے لیے حاضر رہتی تھیں، ماؤں میں شمار خواتین کو خود سے ہاتھ پیر ہلانے کی قطعی عادت نہیں رہی تھی۔ ان کے بچے ملازماؤں کی گود میں پل کر بڑے ہوئے تھے اور انہیں عادت نہیں تھی کہ بیماری آزاری میں بچوں کے سرہانے بیٹھ کر خدمت کریں۔ اس وقت بھی چودھرائن ناہید نے کشور کے کمرے میں رکنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک ایک قابل ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے کشور کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ خود کو بے آرام کرنے کے بجائے اس نے ڈاکٹر ماریا کے مشورے کو قبول کرنا بہتر سمجھا۔

کشور نے اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکلنے کا منظر دیکھا تو کرب سے آنکھیں موند لیں۔ محبتوں کے معاملے میں وہ سدا افلاس رہی تھی۔ قیمتی ساز و سامان سے بھری اس حویلی میں ہر طرح کا آرام تھا لیکن رشتوں کے درمیان وہ جذبہ نہیں تھا جو انہیں ایسی پائیداری بخشتا کہ وہ آفتاب کی طرف بڑھنے والے اپنے قدموں کو روک پاتی۔ اس کی پیاسی روح کو سیراب کرنے والا جام محبت آفتاب کے پاس تھا چنانچہ وہ ہر خطرے کو پس پشت ڈال کر اس کی اور سفر کرنے پر خود کو مجبور پاتی تھی۔ آفتاب کی زندگی میں آمد کے بعد اس نے جانا تھا کہ خوشی کیا ہوتی ہے اور زندگی کب پیاری لگتی ہے۔ آفتاب کی محبت اس کی ساری زندگی کی محرومیوں کا مداوا بن گئی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اپنی سگی ماں کی بے نیازی کو دیکھا تو یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ جو کچھ میں کر گزری ہوں، وہ قطعی جائز اور مناسب ہے۔ وہ رشتے جنہیں میری پروا نہیں، میں ان کی خاطر سدا محرومیوں کو اپنی جان سے کیوں لگا کر رکھوں؟

”فی الحال تو میں نے آپ کو مشکل سے بچا لیا ہے لیکن آگے کیا ہوگا یہ آپ نے سوچا ہے یا نہیں؟“ خیالات میں غلطاں و پیچاں کشور کے کانوں سے ڈاکٹر ماریا کی آواز ٹکرائی تو وہ بری طرح چونکی اور ناسمجھی کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر ماریا کا جملہ کچھ مبہم لیکن کافی معنی خیز تھا۔ وہ جو ذرا مطمئن ہو چکی تھی، ایک بار پھر پریشان ہوگئی۔

”کک... کیا مطلب؟“ اٹکتے ہوئے اس نے ڈاکٹر ماریا سے پوچھا۔

”مطلب تو آپ مجھ سے [illegible] جانتی ہوں گی۔ میں ڈاکٹر ہوں، [illegible] نے آپ کے [illegible] کا سراغ لگایا ہے، آپ خود اس سے کیسے ناواقف ہو سکتی ہیں؟ آپ کی رضامندی کے بغیر تو آپ کے جسم میں ایک نئے وجود کی داغ بیل نہیں ڈالی گئی ہوگی؟“ ڈاکٹر ماریا کا طرز تخاطب اگرچہ ویسا ہی تھا جیسا حویلی کی کسی خاتون سے بات کرتے ہوئے ہونا چاہیے تھا لیکن اس احترام کے ساتھ ایک محسوس کن کھیلا پن بھی تھا۔ کشور کو اس کے لہجے و انداز کی کسی ادا پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی، وہ تو ابھی ابھی ڈاکٹر ماریا کے کیے گئے انکشاف سے اٹھنے والے طوفان کی زد میں تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے کیسی خبر سنائی تھی؟ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس خبر کو سن کر خوش ہو یا اس خوف سے تھنے جس نے دل کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اپنے محبوب شوہر کی نشانی کے اپنے وجود میں سانس لینے کی خبر نے فطری طور پر ہر عورت کی طرح اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی خوش گوار سا انتشار برپا کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی راز کھل جانے کا خوف بھی جڑا تھا، سو وہ پوری طرح خوش ہونے میں ناکام تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے ہی یہ خبر حویلی والوں کو ملے گی، حویلی میں طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ حویلی کا قانون بغیر کسی چوں چرا کے [illegible] موت تجویز کر دے گا۔ وہ زندگی جو ابھی کچھ عرصے سے ہی اچھی لگنے لگی تھی، اس سے محروم ہو جانا اب اسے منظور نہیں تھا... خصوصاً یہ جاننے کے بعد کہ وہ کائنات کے سب سے عظیم رتبے پر فائز ہونے والی ہے، اسے زندگی کی اور بھی شدت سے خواہش ہونے لگی تھی۔

”پلیز ڈاکٹر! میرے اس راز کو راز ہی رکھیے گا۔ اگر یہاں کسی کو اس بات کا علم ہو گیا تو یہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

”او کے! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی لیکن سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ آخر کب تک؟ یہ کوئی چھپنے والی بات تو نہیں۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گی لیکن کچھ عرصے بعد آپ کا جسم خود بولنے لگے گا۔ اس وقت آپ کیا کریں گی؟“ ڈاکٹر ماریا کا سوال بالکل منطقی تھا۔

”میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لوں گی۔ بس مجھے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔“ وہ خود بھی ابھی اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے نہیں کر سکی تھی، سو ڈاکٹر ماریا کو کیا بتاتی۔ فی الحال تو اسے تھوڑی سی مہلت مل جانے کی ہی آرزو تھی تاکہ اس مسئلے پر غور و خوض کر سکے۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ اتنا کو آپریٹ کر سکتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ چند ضروری دوائیں وغیرہ بھی میں آپ تک پہنچا دوں گی۔ پراپر ڈائٹ اور میڈیسن لیتی رہیں تو امید ہے کہ آپ کی حالت سنبھلی رہے گی۔ اس عرصے میں آپ اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کر لیجیے گا۔“ ڈاکٹر ماریا کشور کے اندازے سے کہیں بڑھ کر اس کی مددگار رہی تھی۔

”تھینک یو ویری مچ ڈاکٹر!“ کشور نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔

”شکریے کی کوئی بات نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ جس ماحول میں رہ رہی ہیں، وہاں اگر کسی کو اس بات کا علم ہو گیا تو آپ کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے انسانی جان کو بچانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ آپ نے اپنی معاشرتی اور مذہبی حدود کو توڑا ہے تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ میں بہرحال ڈاکٹر ہونے کے ناتے دو انسانی جانوں کا تحفظ زیادہ ضروری سمجھتی ہوں۔“ ڈاکٹر ماریا کے انداز میں بے نیازی سی در آئی تھی۔

”آپ کی اس ہمدردی کے لیے ایک بار پھر بہت

بہت شکریہ ڈاکٹر... البتہ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرے وجود میں پلنے والے بچے کے باپ سے میرا نکاح ہوا ہے۔" کشور نے ڈاکٹر ماریا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھی۔

"یہ تو بہت اچھا ہے کہ آپ کا بچہ جائز ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ حویلی کے مکین ہرگز بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ آپ کا نکاح ہو چکا ہے اور یقینی طور پر یہ نکاح کسی ایسے شخص سے ہوا ہوگا جو حویلی والوں کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔" ڈاکٹر ماریا کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس نے اس کم عمری میں بھی ایک دنیا دیکھ رکھی ہے اور حالات کا بالکل ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر سکتی ہے۔ کشور کے پاس اس کی باتوں کے جواب میں ایک خاموش اعتراف کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"اگر آپ چاہیں تو مجھے اپنا مکمل رازداں بنا سکتی ہیں۔ میں آپ کے ہسبنڈ سے مل کر آپ کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوئی صورت نکال سکتی ہوں۔" ڈاکٹر ماریا نے اسے پیشکش کی تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ڈاکٹر ماریا اپنے رویّے سے بہت مہربان ثابت ہو رہی تھی لیکن پہلی بار میں کسی پر اتنا اعتماد کر لینا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ اگر کسی موقع پر ڈاکٹر ماریا کی زبان پر سچ آ جاتا تو آفتاب کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی، چنانچہ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ کا شکریہ ڈاکٹر لیکن فی الحال میں اس معاملے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ میری آفر بہرحال برقرار رہے گی۔" ڈاکٹر ماریا مسکراتے ہوئے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"کل صبح میں آپ کی دوائیں اور ڈائٹ شیڈول بھجوا دوں گی۔ احتیاط کے ساتھ اپنا خیال رکھیے گا۔" اپنا بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے وہ کشور سے بولی اور کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"اگر آپ کہیں تو کسی ملازمہ کو آپ کے پاس بھیج دوں؟" باہر نکلنے سے پہلے اس نے کشور سے سوال کیا۔

"نہیں، میں اس وقت بالکل اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔" کشور نے انکار کیا تو ڈاکٹر ماریا شانے اچکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد کشور نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو گرداب میں گھرا محسوس کر رہی تھی۔ اس گرداب سے باہر نکلنے کا طریقہ سوچتے سوچتے اس کا سر بُری طرح چکرانے لگا۔

☆☆☆

دفتر میں بیٹھے ایک فائل کے مطالعے میں مصروف شہریار نے یک دم ہی فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے احساس نے اسے لاہور سے واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سجاد رانا کی موت کے بعد وہ اپنے شانوں پر خاندان کی ذمے داری کے بوجھ کو محسوس کر رہا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ جس سیٹ پر بیٹھا تھا اس کے بھی بہت سے تقاضے تھے۔ اس کے شانوں پر اپنے زیرِ نگیں ضلع کے سیکڑوں خاندانوں کا بوجھ دھرا تھا، چنانچہ وہ اپنے خاندان کو مصلحتاً نظر انداز کر کے واپس نور کوٹ لوٹ آیا تھا۔ اسے یہاں رہ کر بہت سے معاملات کی نگرانی کرنی تھی۔ پیر آباد، نور پور اور اللہ آباد میں جاری ترقیاتی منصوبے اس کی عدم توجہ کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ جاتے تو اسے ساری زندگی افسوس رہتا۔ اس نے صرف افسری کا شوق پورا کرنے کے لیے اسسٹنٹ کمشنر کی ذمے داریاں قبول نہیں کی تھیں۔ وہ ایک حساس طبع اور پُرجوش جوان تھا جو کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔ جس کے دل میں لوگوں کو اپنی ذات سے بھلائی پہنچانے کی امنگ تھی۔ اس امنگ نے اسے چودھری افتخار جیسے مگرمچھ سے بیر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چودھری نے اس تھوڑے سے عرصے میں ہی اسے اچھا خاصا زچ کر دیا تھا۔ اس کے منصوبے اور ارادے چودھری کے مفادات کے خلاف تھے چنانچہ پہلے تو اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اس کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی اور اشاروں کنایوں میں اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ شہریار نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ براہِ راست چودھری سے تصادم کی نوبت نہ آئے لیکن اس کوشش میں بہرحال وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ نتیجہ چودھری سے چپقلش کی صورت میں ہی نکلا۔

اسے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد چودھری اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا جس کی سب سے بڑی مثال بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر اسے کھانے میں نشہ آور شے کھلانے کے بعد اس کی ڈاکٹر ماریا کے ساتھ قابلِ اعتراض تصاویر اتارنے کی صورت میں موجود تھی۔ اگر ڈاکٹر ماریا اس سے تعاون نہیں کرتی تو وہ بری طرح چودھری کی اس چال میں پھنس جاتا۔ ڈاکٹر ماریا کے تعاون کے بعد وہ اس قابل ہو سکا تھا کہ ان خوفناک تصویروں کو حاصل کر کے ضائع کر سکے لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ یہ

کوئی آخری وار نہیں تھا جو چودھری نے اس پر کیا تھا۔ وہ جب تک چودھری کے مفادات کے خلاف کام کرتا رہتا، چودھری کی نظروں میں کھٹکتا رہتا۔

پیر آباد سمیت اردگرد کے کسی بھی گاؤں میں کسی سہولت کی فراہمی اور تعلیم کا پھیلاؤ چودھری کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ چودھری اور اس جیسے دوسرے افراد رعایا پر اسی وقت تک حکمرانی کر سکتے تھے جب تک ان کا شعور سویا رہتا۔ شعور کو سلائے رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے اور زندگی کی بنیادی ضروریات اتنی ترسا ترسا کر فراہم کی جائیں کہ وہ ان ضروریات کے حصول میں ہی الجھ کر رہ جائیں۔ شہریار اپنے ضلع کے عوام کو ان دونوں طرح کی مشکلات سے نکالنے کا خواہاں تھا چنانچہ اس کی اور چودھری کی عداوت تو لازمی تھی۔ اس عداوت نے شہریار کے احساسِ ذمے داری کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ تھوڑا بہت ڈھیلا پڑ بھی جاتا لیکن موجودہ صورتِ حال نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس کے پاس کسی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ وہ ذاتی طور پر بے حد دکھی اور رنجیدہ ہونے کے باوجود اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک بار پھر میدان میں اتر آیا تھا۔ خاندانی ذمے داریوں کے مقابلے میں فرائض کی انجام دہی زیادہ ضروری تھی، خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کا خاندان بہرحال کوئی لاوارث اور بے سہارا خاندان نہیں تھا۔ بہت سے رشتے دار اور دوست تھے جو ان مشکل گھڑیوں میں دلاسے کے لیے رانا ہاؤس آتے جاتے رہتے تھے۔ خود وہ بھی ان سے مکمل طور پر غافل نہیں تھا۔ رابطوں کی آسانی نے کم از کم اتنی مدد تو کی تھی کہ وہ جب چاہتا فون پر لاہور بات کر لیتا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے بھی جایا جا سکتا تھا چنانچہ وہ بہت اچھی طرح ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد وہاں سے واپس آ گیا تھا لیکن یہ طے تھا کہ جو عظیم دکھ ملا تھا اس کے حصار سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس وقت بھی اسے اچانک بہت شدت سے سجاد رانا کی یاد آئی تھی اور وہ اپنا کام روک کر بیٹھ جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سگے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کرنے والے سجاد رانا کی موت کا صدمہ ایسا نہیں تھا جس کے اثر سے وہ خود کو آسانی سے نکال سکتا۔ سینے میں اٹھتے جوار بھاٹے کے زیرِ اثر آنکھیں بند کیے بیٹھے کتنا وقت گزرا، وہ اندازہ نہیں کر سکا۔ انٹرکام بجا تو وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں عبدالمنان! بولو کیا بات ہے؟" اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ خیال یہی تھا کہ کوئی بے وقت کا ملاقاتی اے سی صاحب سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے آیا ہوگا۔ پوسٹنگ کو کافی وقت گزر جانے کے باوجود ابھی تک یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ اس کے سرد رویّے کے باوجود بھی بعض ڈھیٹ قسم کے ملاقاتی قسمت آزمائی کے خیال سے چلے آتے تھے۔

"اللہ آباد سے ایک بہت بری خبر آئی ہے سر! آپ کو اس کے بارے میں بتانا تھا۔" عبدالمنان کا جواب خلافِ توقع تھا۔

"میرے آفس میں آ جاؤ۔" اس نے مختصر جواب دے کر انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔ اللہ آباد سے کسی بری خبر کے بارے میں سن کر وہ خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اللہ آباد سے جڑی کوئی بھی بات اب تک خوش کن ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اللہ آباد وہی گاؤں تھا جہاں شاہنواز نامی شخص نے دینی مدرسے کے نام پر معصوم اور بھولے بھالے ذہنوں کی برین واشنگ کر کے ان سے وطن کے خلاف کارروائیاں کروانے کا اڈا کھول رکھا تھا۔ بعد میں واقعات و شواہد سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ شاہنواز کوئی عالمِ دین یا مفتی وغیرہ نہیں تھا بلکہ پڑوسی ملک سے تعلق رکھنے والا ان کی کسی خفیہ ایجنسی کا رکن تھا جو اس پس ماندہ سے گاؤں میں بیٹھ کر اپنے ملک کے مفاد میں کام کر رہا تھا۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے ذہن کو بھٹکا کر انہیں پاکستان کے خلاف ہی استعمال کرنے سے بڑھ کر بھلا کس بات سے بھارت کا مفاد وابستہ ہو سکتا تھا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ اللہ آباد سے تعلق رکھنے والے جوشیلے نوجوان عبدالمتین کو شہریار نے عین اس وقت شناخت کر لیا جب وہ نور پور میں اسپتال و اسکول کی تعمیر سے تعلق رکھنے والی افتتاحی تقریب میں خودکش حملہ آور کی صورت میں ظاہر ہوا۔

شہریار، عبدالمتین کو نور پور والے حادثے سے پہلے سے جانتا تھا۔ عبدالمتین وہ نوجوان تھا جس کی بہن کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ لڑکی کا باپ شہریار کے پاس اس کے اغوا کے سلسلے میں شکایت کرنے آیا تھا لیکن اس وقت ایس پی رفیق تارڑ اور اس کے ماتحت نے شہریار کو گمراہ کر کے الٹی کہانی سنا دی تھی۔ اصل حقائق بہت بعد میں شہریار کے سامنے آئے لیکن اس وقت تک عبدالمتین کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور قانون کی بے نیازی نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا کہ وہ شاہنواز کا آلۂ کار بن کر نور پور کی افتتاحی تقریب میں خودکش حملہ کرنے پہنچ گیا۔ اس حادثے میں خودکش حملہ آور عبدالمتین سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ حالات و واقعات کی کڑیاں جوڑتا ہوا شہریار اللہ آباد میں واقع شاہنواز کے مدرسے تک پہنچا تو

www.pkdigest.com

شاہنواز وہاں نہیں تھا لیکن ایسے ثبوت ضرور مل گئے جن سے اس کا پڑوسی ملک سے تعلق ظاہر ہو گیا۔ اس موقع پر شاہنواز کی شخصیت پر سے پردہ اٹھنے کے علاوہ وہیر آباد کی مسجد کے مفرور امام غلام محمد کے بارے میں بھی پتا چلا تھا۔ قوم لوط کی باقیات میں شامل غلام محمد نے بھی ایک امام اور معلم کی شخصیت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ ماہ بانو کا اکلوتا بھائی اس کی اندھی ہوس کا نشانہ بن کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ غلام محمد اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر اللہ آباد میں شاہنواز کے مدرسے میں ہی چھپا تھا اور پھر شہریار اور اس کی ٹیم کے چھاپا مارنے سے قبل ہی وہاں سے بھی فرار ہو گیا تھا۔ اتنے بہت سارے ناخوش گوار واقعات کے ساتھ جڑے اللہ آباد کے نام والے گاؤں سے ایک اور بری خبر کے بارے میں سن کر شہریار مضطرب ہو اٹھا اور بے چینی سے عبدالمنان کے اپنے دفتر میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ عبدالمنان کو وہاں پہنچنے میں ایک منٹ سے بھی قلیل وقت ہی لگا ہوگا لیکن اس قلیل وقفے میں بھی اس کی بے قراری دیدنی تھی۔

"ہاں عبدالمنان! بولو کیا مسئلہ ہے؟ کیا خبر آئی ہے اللہ آباد سے؟" عبدالمنان اندر آیا تو اس نے اس کے چہرے کے گمبھیر تاثرات کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عبدالمنان اچھا خاصا سیلف کنٹرولڈ آدمی تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے سے جو کیفیت جھلک رہی تھی، اسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کوئی بہت ہی اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے۔

"خبر بہت افسوسناک ہے سر! میں تو سن کر کانپ اٹھا ہوں کہ سگے ماں باپ بھی اتنے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ اللہ آباد میں رہنے والے ایک جوڑے نے اپنے ہاتھوں سے اپنے دو بچوں کو ہلاک کر کے گھر میں ہی دفن کر رکھا تھا۔ رات وہ اپنے تیسرے بچے کو بھی ذبح کرنے جا رہے تھے کہ پڑوسیوں کو علم ہو گیا اور انہوں نے دخل اندازی کر کے انہیں اس مذموم حرکت سے روکا۔ اب وہ دونوں میاں بیوی تھانے میں ہیں اور ان سے اس حرکت کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔" عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع واقعی لرزہ خیز تھی۔ ماں باپ جیسے عظیم رشتے کا یہ بھیانک روپ بے حد دل دہلا دینے والا تھا۔ اس خبر کو سن کر کوئی بھی صاحب دل شخص رنج محسوس نہ کرتا، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ والدین جو اپنی اولاد کی پیدائش سے بھی پہلے سے اس کے متعلق سوچنا، خواب دیکھنا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہی اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ انسان کوئی جانور بھی پالے تو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اسے کسی ضرورت کے تحت خود سے جدا کرتے ہوئے دکھی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے بچوں کو جن کی اس نے قدم قدم پر حفاظت کی ہوتی ہے... زمانے کے سرد و گرم سہہ کر انہیں ہر سختی سے بچانے کی کوشش کی ہوتی ہے، انہیں اس بے دردی سے کیسے ہلاک کیا جا سکتا ہے؟

"اس جوڑے کے پڑوسیوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ لوگ اپنے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے جا رہے ہیں؟" دکھ کے شدید احساس کے تحت شہریار نے واقعے کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سوال کیا۔

"پڑوسی بچے کی ماں کے بلند آواز میں رونے پر جاگے تھے۔ آدھی رات کے وقت انہوں نے اچانک عورت کے زور زور سے بین کرنے کی آوازیں سنیں تو وہ نیند سے جاگ کر اس کے گھر کی طرف بھاگے اور گھر کا دروازہ بجایا لیکن دروازہ نہیں کھولا گیا۔ البتہ اندر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے عورت کا شوہر اس کا منہ دبا کر اسے پیٹ رہا ہو۔ پڑوسیوں کو تشویش ہوئی اور ایک لڑکے نے دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں عجیب منظر دیکھا۔ گھر کے صحن میں ایک تازہ قبر کھدی ہوئی تھی اور قبر کے قریب چھوٹا بچہ رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ابھی ٹھنسا ہوا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ ایک پڑوسی، بچے کو بندشوں سے آزاد کرنے لگا جبکہ باقی اندر کی طرف لپکے جہاں دونوں میاں بیوی موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شوہر ایک ہاتھ میں تیز دھار چھری اور دوسرے میں بیوی کے بال جکڑے کھڑا تھا۔ اس نے عورت کو اس حد تک خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکال پا رہی تھی۔ پڑوسیوں نے بڑی مشکل سے مرد کو قابو کیا پھر آس پاس کی عورتوں نے مل کر عورت کو سنبھالا۔ بڑی دیر بعد کہیں جا کر وہ اس لائق ہو سکی کہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس کے بچے کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور پہلے بھی دو بچوں کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔"

"ویری سیڈ... یہ تو واقعی بے حد المناک صورت حال ہے جس کی اچھی طرح تحقیق ہونی چاہیے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ پہلے دو بچوں کی ہلاکت کا پڑوسیوں کو کیوں علم نہیں ہو سکا؟ گاؤں دیہات میں تو لوگ ایک دوسرے سے اتنے غافل نہیں رہتے کہ انہیں ایک دوسرے کے حالات کا علم نہ ہو سکے۔ کم از کم لوگوں کو پہلے دو بچوں کے غیاب پر تو ضرور چونکنا چاہیے تھا۔" شہریار نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"اب تک جو صورت حال سامنے آئی ہے، اس کے

مطابق مجرم بہت چالاک اور منصوبہ ساز آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس نے سارا کام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا۔ پہلے بچے کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے اردگرد یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ بچے کو اس کی ضد پر گجرانوالہ میں اس کی خالہ کے گھر رہنے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔ دوسرے بچے کے بارے میں بھی اس نے یہی بہانہ کیا کہ بڑے بچے کا دل خالہ کے گھر بہت زیادہ لگ گیا ہے اور وہ واپس نہیں آنا چاہتا جبکہ دوسرا بھی وہاں جانا چاہتا تھا اس لیے میں اسے بھی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ بچے کی خالہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ بچوں کو مستقل اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انہیں اسکول میں داخل کروا کر ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دے۔ مجرم اپنے اردگرد والوں پر یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ان کی خالہ کی یہ پیشکش قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یعنی اس نے مستقبل کے لیے پوری پیش بندی کر لی تھی کہ آس پاس والے طویل عرصے تک اس پر شک نہ کر سکیں۔"

"او مائی گاڈ! یہ تو بالکل ناقابل یقین صورت حال ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ آخر ایک باپ اس حد تک اپنی اولاد کا دشمن کیوں بن گیا... کہیں وہ شخص نفسیاتی مریض تو نہیں ہے؟" ساری تفصیلات سن کر شہریار نے خیال آرائی کی۔

"اس بارے میں ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے سر! اس شخص نے اس ہولناک واقعے کے پس منظر میں موجود اصل وجہ کے سلسلے میں ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔ پڑوسیوں وغیرہ سے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق وہ ایک بے حد جذباتی اور جوشیلا آدمی ہے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے تو اسے اتنا نہیں دیکھا گیا لیکن دیگر معاملات میں اس کا جوش و خروش دیدنی ہوتا تھا۔ عرس میں شرکت کرنا، خاص مواقعوں پر گاؤں کو سجانا، وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بزرگ کی قبر پر حاضری دینا اور کسی بھی پیر، مرشد یا ولی کی شان میں معمولی سے بھی گستاخانہ کلمات سن کر کہنے والے کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے پر تل جانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ کسی بھی شخص کی کسی کرامت کا معمولی شہرہ ہو جانے پر وہ اس سے گہری عقیدت پیدا کر لیتا تھا۔ گاؤں والوں کے نزدیک بنیادی طور پر وہ ایک شریف آدمی ہے جس کی حد سے بڑھ کر مذہبی حساسیت کے علاوہ اس میں کوئی خامی نہیں تھی اور بہرحال اس کی اس حساسیت کو بھی لوگ بری نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔" عبدالمنان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ شہریار کو اطلاع دینے سے قبل خود ذاتی طور پر واقعے کی تمام تفصیلات حاصل کر چکا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا جسے اندازہ تھا کہ اس کا افسر اس سے کسی واقعے کے کن کن پہلوؤں سے متعلق سوال جواب کر سکتا ہے اس لیے ہر معاملے میں اپنی معلومات ممکنہ حد تک مکمل رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

"ان دونوں میاں بیوی کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟" شہریار نے سوال کیا۔

"وہ لوگ یہیں نورکوٹ میں موجود ہیں۔ مرد تھانے میں ہے جبکہ عورت کی حالت کافی خراب تھی اس لیے اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے اسے سکون آور ادویات دی ہیں تاکہ وہ ذہنی طور پر سنبھل سکے۔ بچ جانے والے بچے کو بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔" عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا۔

"میں ان دونوں میاں بیوی سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ واقعے کا اصل محرک جان سکوں۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ ہمیں اس کی گہرائی میں جانا ہوگا تاکہ آئندہ کے لیے سدباب کیا جا سکے۔" وہ اس وقت بے انتہا سنجیدہ تھا اور پوری سنجیدگی سے اس واقعے کی تحقیقات کروانا چاہتا تھا۔ اس نوعیت کے کچھ واقعات پہلے بھی اخبارات کے ذریعے اس کے علم میں آتے رہے تھے جن پر افسوس کرنے کے علاوہ وہ عملی طور پر کچھ نہیں کر سکا تھا۔ ان واقعات کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے تھے لیکن اللہ آباد تو اس کے زیر نگیں تھا، چنانچہ وہاں پیش آنے والے اس افسوسناک واقعے کی مکمل تحقیق وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

"آپ جب چاہیں چل سکتے ہیں سر! میں اسپتال اور تھانے دونوں جگہ ملاقات کا انتظام کروا دوں گا۔ اس وقت تک ویسے بھی میڈیا والے بھی متحرک ہو چکے ہوں گے۔ جائے حادثہ پر ان کا پہنچنا لازمی ہے۔ وہاں بھی اب تک کھدائی وغیرہ کر کے پہلے ہلاک کیے جانے والے دونوں بچوں کی لاشیں دریافت کر لی گئی ہوں گی۔ میڈیا کو تو اپنے مطلب کی بہت سی خبریں مل جائیں گی وہاں سے۔"

"پہلے جن دو بچوں کو ہلاک کیا گیا تھا، ان کی قبریں کہاں بنائی تھیں ان میاں بیوی نے؟" عبدالمنان کا جواب سن کر شہریار کو خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

"دونوں بچوں کی قبریں بھی گھر کے آنگن میں ہی بنائی گئی تھیں مگر قبریں بناتے ہوئے یہ احتیاط کی گئی تھی کہ انہیں لیول میں رکھا گیا اور پھر ان پر پھولوں اور سبزیوں کے پودے لگا کر انہیں کیاری کی شکل دے دی گئی۔ اسی لیے تو اردگرد والوں کو شبہ نہیں ہو سکا کہ گھر کے آنگن میں دو معصوم

www.pkdigest.com

بچوں کی قبریں موجود ہیں۔"

"یہ سب کرنے کے لیے تو بہت زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ہوا وہ اتفاقاً یا اچانک ہوا۔ سب کچھ پری پلانڈ تھا اور اب یہی معلوم کرنا ہے کہ ایک باپ نے ایسا منصوبہ کیونکر ترتیب دیا۔ میرے خیال میں ہم پہلے اسپتال چلتے ہیں۔ عورت نے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے وقت جس طرح کا ری ایکشن ظاہر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مرحلے پر آکر ٹوٹ گئی تھی اور اگر ہم کوشش کریں تو اس سے پورا سچ اگلوا سکتے ہیں۔" شہریار نے خیال ظاہر کیا جس کی عبدالمنان نے تائید کی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! ہمیں واقعی اس عورت سے ملاقات کرکے اصل صورتِ حال جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"اوکے... تو تم انتظامات کرلو۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اسپتال چلیں گے... اور ہاں، آرڈر کردو کہ عورت سے میڈیا والوں کو دور رکھا جائے۔ میڈیا کے لوگوں کی یلغار سے وہ گھبرا کر بدک بھی سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بہت نرمی اور احتیاط سے اس معاملے کو ہینڈل کرکے اصل صورتِ حال معلوم کی جائے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ابھی آپ کے آرڈرز پہنچا دیتا ہوں۔ سنا ہے آج ایس پی صاحب بھی کسی نجی دورے پر ضلع سے باہر ہیں اس لیے اس واقعے کو مکمل طور پر آپ ہی کو دیکھنا ہوگا۔" عبدالمنان اسے ایک اور اہم اطلاع دے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ شہریار کے پاس فی الحال آدھے گھنٹے کا وقت تھا۔ اس درمیانی وقفے کو ضائع کرنے کے بجائے وہ خود کو کمپوز کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اس فائل کی طرف متوجہ ہوگیا جو کچھ دیر قبل اس کے زیرِ مطالعہ تھی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ اسپتال کے لیے روانہ ہوگئے۔ اسپتال میں حسبِ توقع میڈیا کے نمائندے موجود تھے اور اس کوشش میں تھے کہ انہیں ملزمہ سے ملنے کا موقع مل جائے۔ شہریار اور عبدالمنان اسپتال پہنچے تو صحافی برادری نے انہیں بھی گھیرنے کی کوشش کی۔

"یقیناً یہ ایک نہایت افسوس ناک واقعہ ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اس واقعے پر گہرا رنج محسوس کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ واقعے کی حقیقی وجوہات معلوم کرسکوں۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہوا تو ہم میڈیا کو بھی ضرور تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔" شہریار نے یہ مختصر بیان دیا اور صحافیوں کے سوالات کو نظر انداز کرتا ہوا عبدالمنان کے ساتھ اسپتال کے عملے کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں مقتول بچوں کی ماں اور اپنے خاوند کی شریکِ جرم بتول بی بی کو رکھا گیا تھا۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبدالمنان کی طرف جھک کر اس سے کوئی سوال کیا جس کے جواب میں عبدالمنان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے مثبت جواب پر اطمینان محسوس کرتا ہوا شہریار لیڈی ایم آر او کے پیچھے کمرے میں داخل ہوگیا۔ لیڈی ایم آر او کے علاوہ ان کے ساتھ اسپتال کے عملے کے جو افراد تھے، انہیں باہر رکنے کی ہدایت کردی گئی تھی۔ سفید چادر بچھے بیڈ پر ایک دبلی پتلی قریباً تیس سال کی سانولی سی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ عورت کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بتول بی بی! ضلع کے اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل صاحب تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" لیڈی ڈاکٹر نے اسے مخاطب کیا تو اس نے بنا چونکے نظریں پھیر کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد ویرانی اور وحشت تھی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی بی بی؟ یہاں اسپتال میں آپ کا خیال تو رکھا جارہا ہے؟" شہریار نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کرکے پوچھا تو اس کی ویران آنکھوں میں حیرانی کی لہر سی دوڑ گئی۔ یقیناً گرفتاری کے بعد سے اب تک وہ مسلسل لوگوں سے لعن طعن ہی سن رہی تھی، ایسے میں کسی نے نرم لہجے میں بات کی تو وہ حیران رہ گئی اور سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دے کر شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

"آپ کے بچوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس پر مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ اپنے شوہر کے جبر کے سامنے مجبور ہوگئی تھیں ورنہ میں جانتا ہوں کہ کوئی ماں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے یا ان کے قتل میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ کے شوہر نے آپ کے بچوں کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیوں اور کس کے کہنے پر کیا؟" وہ عورت کے بیڈ کے قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور بے حد نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا لیکن عورت نے اس کی نرمی کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا اور سر کو زور زور سے نفی میں حرکت دینے لگی۔

"دیکھیں مجھے معلوم ہے کہ اصل مجرم آپ کا شوہر ہے۔ اگر آپ اس کے فعل میں دل سے شامل ہوتیں تو تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے موقع پر ہرگز بھی احتجاج نہیں کرتیں۔ یقیناً جو کچھ ہوا، وہ کسی مجبوری کی وجہ سے ہوا... لیکن جب تک آپ ہمیں اپنی اس مجبوری کے متعلق بتائیں گی نہیں، ہم اس ظلم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکیں گے۔" شہریار نے عبدالمنان کو خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے عورت کو سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ عبدالمنان اس کے اشارے پر دروازے کی طرف لپکا اور دوسری طرف اپنے انتظار میں کھڑے شخص کی گود سے ایک تقریباً تین سال کے بچے کو لے کر واپس عورت کے بیڈ کی طرف بڑھا۔ بچے کو دیکھتے ہی عورت تیزی سے اٹھ کر بیٹھی اور اسے اپنی گود میں لینے کے لیے بانہیں پھیلا دیں۔ شہریار کے اشارے پر عبدالمنان نے بچہ اس کے حوالے کردیا۔ بچے کو گود میں لے کر بتول بی بی اسے بے تحاشا چومنے لگی۔

"یہ بچہ آج صرف اس لیے زندہ ہے کہ آپ نے عین وقت پر اپنے شوہر کے ظلم کے خلاف احتجاج کرڈالا۔ اگر آپ کل رات بھی پہلے کی طرح خاموش رہتیں تو اس بچے کی بھی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح گھر کے آنگن میں قبر بن چکی ہوتی اور آپ اپنی اولاد کو پیار کرنے کے لیے ترس جاتیں۔" بتول بی بی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اسے احساس دلایا تو وہ رو پڑی اور مزید شدت کے ساتھ بچے کو پیار کرنے لگی۔

"مجھے افسوس ہے کہ یہ بچہ بچ تو گیا ہے لیکن اسے اپنے ماں باپ کے سائے سے دور رہنا پڑے گا۔ یہ کسی رفاہی ادارے میں رہ کر بڑا ہوگا اور بڑا ہونے کے بعد اس سوال کا جواب ڈھونڈتا رہے گا کہ اس کے والدین نے اس کے بھائیوں کو کیوں قتل کیا؟ اس بچے کی زندگی اپنے والدین کی شقی القلبی کے طعنے سنتے ہوئے گزرے گی اور ہو سکتا ہے کہ ردِعمل میں یہ خود بھی کوئی خطرناک مجرم یا جنونی قاتل بن جائے۔"

"رب نہ کرے۔" شہریار کی بات سن کر عورت دہل کر بولی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ رب نہ کرے یہ بچہ کوئی مجرم، ڈاکو یا قاتل بنے۔ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتائیں۔" شہریار نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

"اصل واقعہ تو میں آپ بھی سمجھ نہیں آیا۔ میرا خاوند نذیر محمد بڑا جذباتی اور اللہ والوں سے محبت کرنے والا آدمی ہے۔ کوئی اللہ والا اسے کچھ کہہ دے تو ضرور اس کی گل مانتا تھا۔ اس چکر میں کبھی اس کے چھوٹے موٹے ہنڈے بھی ہو جاتے تھے۔ کئی واری ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنی ساری آمدنی کسی مزار یا درگاہ پر دے دی۔ ہمیں لوگوں سے قرض ادھار لے کر یا فاقے کرکے گزارہ کرنا پڑا۔ ایسے موقعوں پر اگر میں نذیر محمد کو کچھ کہتی بھی تو وہ میری نہیں سنتا تھا۔ کہتا تھا تنگی یہ ادھر کی سختی آگے کی آسانی ہے۔ اللہ والوں کو خوش رکھیں گے اور ان کی گل مانیں گے تو آخرت میں بخشے جائیں گے۔ میں ہر واری اس کی گل مان جاتی تھی۔ خیر، ہمارے گاؤں میں شاہنواز صاحب نے مدرسہ کھول لیا۔ سارے ہی گاؤں والے ان کی وڈی تریف (تعریف) کرتے تھے۔ نذیر محمد تو ان کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ کہتا تھا، میں نے شاہنواز صاحب جیسا دریا دل، نیک اور سمجھدار آدمی کہیں اور کوئی دوجا نہیں دیکھا۔ سارا وقت وہ انہی کے گن گاتا رہتا تھا۔ میں بھی دو ایک دفعہ ان سے ملنے گئی تھی۔ مینوں بھی وہ وڈے چنگے لگے۔ میرے بچوں کو تو وڈا پیار کرتے تھے۔ ان کا دم کیا ہوا پانی میں اپنے کسی بیمار بچے کو پلا دیتی تو وہ فوراً بھلا چنگا ہو جاتا۔ ہور بھی جس معاملے میں ہم نے ان سے رائے لی، ہمیں فیدہ (فائدہ) ہی ہوا۔ میں اور نذیر محمد تو ان کے پکے مرید بن گئے تھے۔ وہ جو کہتے ہم مانتے، پر فیر ایک ایسی گل ہوئی کہ میں شاہنواز صاحب کی گل ماننے سے کانپ گئی پر نذیر محمد ذرا نہ گھبرایا، ہور بولا کہ ہم وہی کریں گے جس کا ہمیں شاہنواز صاحب نے مشورہ دیا ہے۔" بتول بی بی یہاں تک بتانے کے بعد بری طرح ہانپنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میلوں دور سے دوڑتی ہوئی آرہی ہو۔ یقیناً شدید جذباتی انتشار نے اس کی یہ حالت کردی تھی اور اس کے دماغ میں وہ واقعات گردش کررہے تھے جن کے بارے میں سوچنا بحیثیت ماں اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔

"شاہنواز نے تمہیں اور نذیر محمد کو کیا مشورہ دیا تھا؟ کیا اس نے کہا تھا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو ہلاک کردو؟" کسی حد تک بات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے عورت سے تیز لہجے میں پوچھا۔

"انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ جس طرح وہ اپنے رب کے حکم پر اپنے پیارے بیٹے کی قربانی دینے کے لیے دل سے تیار ہوگئے تھے، اسی طرح ہمیں بھی اپنے بچوں کی قربانی دینی ہوگی۔ یہ قربانی دے کر ہم اللہ کی نظر میں سب سے اچھے ہو جائیں گے اور وہ ہمیں جنت میں وڈی چنگی جگہ دے گا۔ ادھر سونے کے محل ہوں گے، اچھے اچھے کھانے ہوں گے اور ہر وہ چیز ملے گی جس کو ہمارا جی کرے گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ جنت میں ہمیں ہمارے بچے بھی واپس مل جائیں گے۔" بتول بی بی خود کو سنبھال چکی تھی اور اب بڑی عقیدت مندی سے بتا رہی تھی۔

www.pkdigest.com

''کیوں، شاہنواز کے پاس کیا وحی آئی تھی جو اس نے تم لوگوں سے یہ سب کچھ کہا؟'' شاہنواز وہ شخص تھا جس کی وجہ سے پہلے ہی عبدالمتین سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ جو اپنے ساتھ گاؤں کے دو نوجوانوں کو لے کر غائب ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کا ایجنٹ ہے، چنانچہ اس کے بارے میں یہ جان کر کہ اس نے بتول بی بی اور نذیر محمد جیسے اَن پڑھ اور اندھے عقیدے رکھنے والے لوگوں کے ذہنوں کو اس بربریت کے راستے پر ڈالا تھا، وہ برداشت نہیں کر سکا اور بے حد غصے سے بولا۔

''وحی تو پیغمبروں پر آتی ہے جی، پر اللہ والوں کے پاس بھی بڑی کرامتیں ہوتی ہیں۔ وہ اشاروں سے بھی بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ شاہنواز صاحب نے بھی سمجھ لیا تھا۔ نذیر محمد نے انہیں اپنا ایک خواب سنایا تھا۔ خواب سن کر شاہنواز صاحب بولے کہ نذیر محمد! تیرا یہ خواب تو حضرت ابراہیمؑ کے خواب جیسا ہے۔ تجھے ان کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ فیر دیکھنا تجھ پر رب کی کیسی رحمت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر نوچندی جمعرات کو یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ نذیر محمد حکم سن کر رو دیا تو بڑا، پر اس نے کہا کہ رب کے حکم سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں۔ یہ تو میرا اونچا نصیب ہے کہ رب نے مجھے اس کام کے لیے چنا جس کے لیے پہلے وہ اپنے ایک نبی کو چن چکا ہے۔ بس فیر اس نے ویسا ہی کیا جیسا اسے شاہنواز صاحب نے بتایا تھا۔ میں بھی اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر رب کی مرضی میں راضی ہو گئی تھی، پر اس واری مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مدرسے پر چھاپے کے بعد ویسے ہی میرا جی کچھ کھٹک گیا تھا، پر نذیر محمد اپنے عقیدے میں پکا رہا۔ کہنے لگا اللہ والوں کو دنیادار لوگ اسی طرح تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے چکر میں پڑ کر ہمیں کسی اللہ والے کے خلاف دل میں میل نہیں لانا چاہیے۔''

بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد شاہنواز کا کردار اور بھی کھل کر واضح ہو گیا تھا۔ دین داری اور بزرگی کی آڑ میں وہ شخص معصوم گاؤں والوں کی برین واشنگ کا کام کرتا رہا تھا۔ اس نے جس شخص کے مزاج میں ذرا بھی فتنے کے لیے گنجائش پائی، اسے راہ سے بھٹکا دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ بھٹکنے والا یہی سمجھتا رہا کہ وہ فلاح کی راہ پر چل رہا ہے۔ عبدالمتین والا واقعہ اتنا پرانا نہیں ہوا تھا کہ کسی کے ذہن سے نکل جاتا اور اب یہ واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ کم علم اور جذباتی دیہاتی نذیر محمد کو شاہنواز نے اس طرح گمراہ کیا تھا کہ وہ خود کو سنتِ ابراہیمی کا پیروکار سمجھتے ہوئے اپنے دو معصوم بچوں کی جان لے بیٹھا۔ اگر نذیر محمد میں ذرا بھی فہم و شعور ہوتا تو اپنے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے لیکن عام آدمی کے خواب کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی رحیم و غفور نہیں۔ اللہ نے تو حضرت ابراہیمؑ کی بھی محض آزمائش کی تھی۔ باپ کے ہاتھ بیٹے کے خون سے بہر حال رنگنے نہیں دیے تھے۔ اس کی سوچ اور عمل دونوں غلط تھے... جس کا اور اک تدر کھتے ہوئے اس نے اپنی دونوں اولاد کو ہلاک کر ڈالا اور اس کے بعد تیسرے کی قربانی بھی دینے چلا تھا۔ اس طرح کی اندھی عقیدت مندی کو نفسیاتی عارضے کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بتول بی بی کی زبانی معلوم ہونے والے حقائق نے شہریار سمیت عبدالمنان اور لیڈی ڈاکٹر کو بھی اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔ جو لرزہ خیز حقیقت سامنے آئی تھی، اس نے ذہنوں میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ جانے شاہنواز نے اور کتنے ذہنوں میں گمراہی کا بیج بویا ہوگا اور یہ بیج ایک دن پھر کسی طاقتور درخت کی صورت میں ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

''شاہنواز کے بارے میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ اس کا پڑوسی ملک سے بھی کوئی تعلق بنتا ہے، اس کی تمام منفی کارروائیوں [illegible] والوں کو تفصیلات [illegible] حقائق سامنے آئیں تو شاید لوگوں میں [illegible] ہو سکے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر گاؤں میں دینی تعلیم کے لیے مستند علما کی تعیناتی ہو سکے۔ عالمِ دین کا کردار معاشرے کی تعمیر کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے لیکن اکثر ہم اس بات کو نظر انداز کر کے نیم خواندہ یا پھر سازشی افراد کو اپنا دینی راہنما بنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ پھر اس طرح کے بھیانک واقعات کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔'' بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق کو سن کر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے شہریار اس کے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے عبدالمنان کو سب سے پہلا حکم یہی دیا۔

''اوکے سر! میڈیا والوں کو تو میں ابھی فوری طور پر بریف کر دوں گا، باقی آگے کی جو پلاننگ آپ کے ذہن میں ہے اس کے لیے ظاہر ہے کچھ وقت اور وسائل درکار ہوں گے جس کے لیے میرا مکمل تعاون آپ کو ہر وقت حاصل رہے گا۔'' عبدالمنان نے مستعدی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''ایسا کرنا کہ اس واقعے پر آفتاب کو اسپیشلی کچھ لکھنے کے لیے ضرور کہنا۔ وہ حساس اور درد مند فطرت رکھنے والا آدمی ہے اس لیے اس کی تحریر میں خاصی اثر انگیزی پائی جاتی

ہے۔'' شہریار نے ایک اور ہدایت جاری کی جس سے ظاہر ہے عبدالمنان کو اتفاق ہی کرنا تھا لیکن اس کے کسی بھی طرح کے ردِعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی ڈی ایس پی منظور تیز تیز چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب چلا آیا۔ اس وقت وہ لوگ اسپتال کی عمارت سے باہر نکل چکے تھے اور گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ لوگ یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے اور نذیر محمد سے ملاقات کریں گے۔ اس ملاقات کے بعد ہی میڈیا والوں کو واقعے کے متعلق بریفنگ دی جاتی لیکن ڈی ایس پی منظور چہرے پر جس طرح کے تاثرات سجائے اور جس انداز میں سامنے آیا تھا، اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

''ابھی ابھی تھانے سے میرے پاس فون آیا ہے سر! مجھے افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' شہریار متوجہ ہوا تو ڈی ایس پی منظور نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''خیریت، کیا خبر آئی ہے تھانے سے؟'' شہریار کا ماتھا ٹھنکا۔

''خبر آئی ہے کہ ایک سپاہی نے ملزم نذیر محمد کو فائرنگ کر کے لاک اپ میں ہی ہلاک کر دیا ہے۔ اصل میں سپاہی بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور جذبات میں یہ حرکت کر بیٹھا۔ تھانے کے دوسرے عملے نے اس سپاہی کو گرفتار کر لیا ہے لیکن وہ خود کو مجرم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ایک برے آدمی کو اس کے صحیح انجام تک پہنچایا ہے، چنانچہ یہ قتل جرم نہیں بلکہ جہاد کہلائے گا۔'' ڈی ایس پی منظور کی بات سن کر شہریار کا بے ساختہ دل چاہا کہ اپنے سر کے بال نوچ لے۔ عوام کی یہ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے کبھی بھی کام کرنے والوں کو صحیح پلاننگ کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ اب بھی جانے اور کون کون سے حقائق تھے جو نذیر محمد کی موت کے بعد ہمیشہ کے لیے پردے میں چلے گئے تھے۔ وہ زندہ رہتا تو شاید اس سے شاہنواز کے بارے میں کوئی کلیو مل جاتا لیکن اب تو خالی لکیر پیٹنے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم اباجی!'' ائرپورٹ پر چیکنگ کے طویل مرحلے سے گزر کر چودھری افتخار ارائیول لاؤنج میں پہنچا تو اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ سامنے اس کا بڑا اور چہیتا بیٹا چودھری مراد لبوں پر مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کر رہا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ مراد کے نیویارک کے قیام کے عرصے میں چودھری جب بھی وہاں آیا تھا، مراد اس کے استقبال کے لیے ضرور پہنچا تھا۔ خود وہ بھی ارائیول لاؤنج میں داخل ہوتے ہی بیٹے کو متلاشی نظروں سے کھوجنے لگتا تھا لیکن آج ذرا مختلف صورتِ حال تھی۔ وہ اپنے ہم سفر ڈیوڈ کی وجہ سے بری طرح الجھ گیا تھا۔ ڈیوڈ جو ابتدا میں ایک اچھا ہم سفر اور دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی محسوس ہوا تھا، اچانک ہی خطرناک لگنے لگا تھا۔ چودھری نے اپنی عیار فطرت کی وجہ سے بھانپ لیا تھا کہ ڈیوڈ کا اس سے ملنا اور ماہ بانو کی تصویریں دکھانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری کے لیے ماہ بانو کی کیا اہمیت ہے اور اب شاید وہ ماہ بانو کے بدلے اس سے کوئی ڈیل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چودھری کو کھانے پر مدعو بھی کیا تھا... کہ کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس ملاقات کا ایجنڈا کیا ہوگا، چودھری نہیں جانتا تھا لیکن اتنا بہر حال سمجھتا تھا کہ ڈیوڈ اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ کام یا مقصد کیا ہو سکتا ہے، اس سوال نے چودھری کو الجھا رکھا تھا۔ اسی الجھن میں گھرے ہونے کی وجہ سے اسے مراد شاہ کا خیال نہیں رہا تھا۔ وہ چیکنگ کے مراحل سے گزر کر ارائیول لاؤنج میں پہنچنے تک ڈیوڈ کو کھوجنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن وہ تو جہاز سے اترنے کے بعد گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چودھری کو اس کی کہیں ایک جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔

''خیریت تو ہے اباجی! آپ کچھ پریشان پریشان سے لگ رہے ہیں؟'' مراد شاہ نے فوراً ہی اس کی کیفیت بھانپ لی۔

''کوئی پریشانی نہیں پتر! بس ادھر یہ لوگ ہم پاکستانیوں کی ایسے چیکنگ کرتے ہیں کہ طبیعت بُری ہونے لگتی ہے۔ اپنے ملک میں ہم اچھے بھلے عزت دار آدمی ہیں۔ لوگ جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں لیکن یہ گورے، بندے کی ساری عزت خاک میں رول دیتے ہیں۔'' چودھری نے خود کو سنبھالتے ہوئے بہانہ بنایا تو مراد شاہ مسکرا دیا۔ یہ شکوہ تو چودھری ہر بار نیویارک آمد کے موقع پر کرتا تھا اور اب تو صورتِ حال ماضی کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈا کرنے والے امریکی اپنے پروپیگنڈے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ہر مقام پر مسلمانوں کے لیے بے حد سختی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اس سختی کے پیچھے ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ردِعمل میں مسلمان بھی کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ ساری دنیا پر جنگ مسلط کرنے والے اپنے

بجز کائے گئے شعلوں کی آنچ اپنے دامن میں لگنے سے سدا خوف زدہ رہتے تھے چنانچہ ان کے حفاظتی اقدامات میں بھی اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

''جانے دیں اباجی! اپنا جی میلا نہ کریں۔ ہر جگہ کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہاں والے ہمارے لوگوں کے لیے ذرا روکھی طبیعت کے ہیں، پر آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اپنے علاقے میں تو آپ کی بڑی عزت ہے نا۔'' مراد شاہ نے باپ کی دل جوئی کی کوشش کی اور انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

''سو تو ہے۔ اسی واسطے تو میں تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ واپس اپنے گاؤں آجا۔ دنیا کا کون سا آرام ہے جو اُدھر نہیں ہے۔ اپنی حویلی میں ہر سہولت موجود ہے۔ فیر اُدھر رہ کر کسی کی نوکری شوکری بھی نہیں کرنی پڑتی۔ رب کے کرم سے ہمارے بڑوں نے اتنا چھوڑا ہے کہ سات پیڑھیوں تک بھی بیٹھ کر کھائیں تو کم نہیں پڑے گا۔ تُو نے خوامخواہ کی ضد لگا کر گوروں کی نوکری کر رکھی ہے ورنہ تیرے لیے تو وہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ پچاسیوں بندے تیرے آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر گھومیں۔'' چودھری نے اپنی ہر بار کہی جانے والی بات ایک بار پھر بیٹے کے سامنے دہرائی۔

''آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے اباجی! لیکن میں کیا کروں میرا مزاج ہی ذرا مختلف ہے۔ مجھے لوگوں کا اپنے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا۔ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے۔ میں اپنے جیسے انسانوں کو اپنی غلامی کرتا دیکھتا ہوں تو دل برا ہونے لگتا ہے۔''

''فیر وہی گل۔ تجھ میں اور ان جاہل مزارعوں میں وڈا فرق ہے۔ تُو چودھری افتخار کا پتر، اس کی جائیداد کا جانشین ہے۔ تُو اور وہ مزارعے دونوں ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تجھے اللہ نے حکمرانی کے لیے بنایا ہے اور انہیں غلامی کے لیے۔ اگر اللہ سب کو ایک جیسا دیکھنا چاہتا تو فیر آپ ہی سب کو برابری سے مال و دولت اور مقام دیتا۔ اللہ نے آپ بندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے، پر تیرے جیسے نوجوانوں پر سوشلسٹ بننے کا بھوت سوار رہتا ہے۔ خیر اوہ لے جتنے دن چاہے بہال... آخر کو ایک دن تجھے میری گل سمجھ آہی جائے گی۔'' بیٹے کا جواب چودھری کو پسند نہیں آیا اور وہ اپنی طرف سے دلیلیں دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں مانتا ہوں کہ اللہ نے بندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ انسانوں میں سے کچھ کو برتر اور کچھ کو کم تر رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے ہاں تو روپے پیسے کی بنیاد پر برتری اور کم تری ہے ہی نہیں۔ اس کے نزدیک تو بس وہ برتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ معاشی اور معاشرتی تقسیم کے ذریعے تو بس وہ ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ جو اس آزمائش میں پورا اترے گا، وہی اللہ کے نزدیک بلند اور کامیاب ہوگا۔''

''چل چھڈ۔ رہنے دے اس گل کو۔ تیری گل سن کر مجھے لگتا ہے کہ جیسے تو امریکا میں نہیں، سعودی عرب کے کسی مدرسے میں رہ رہا ہے جہاں تجھے یہ سب سکھایا جاتا ہے۔''

چودھری کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے موضوع ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔ مراد نے بھی باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ دین صرف سعودی عرب کے مدرسوں میں نہیں سکھایا جاتا۔ فطرت میں بھلائی اور دل میں نیک خواہشات رکھنے والے کو ہر جگہ راہنمائی مل جاتی ہے۔ وہ نیویارک جیسے آزادانہ مزاج رکھنے والے شہر میں رہ کر ایسی باتیں کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کے احباب کا حلقہ انسانی حقوق کا شعور رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا۔ ان افراد میں بہت سے اچھے مسلمان بھی تھے اور کچھ غیر مسلم... لیکن اچھے انسان بھی۔ چنانچہ وہ اگر اپنی پرورش کے ابتدائی عرصے میں خود کو ملنے والی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے کچھ بگڑا بھی تھا تو ان چند سالوں میں بالکل سدھر گیا تھا۔

''شاہدہ اور علینہ گھر پر بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ جس وقت میں ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تھا، میں نے فون پر ان دونوں کو اطلاع دے دی تھی۔ مجھے آج آفس میں ضروری کام نہیں ہوتا تو میں چھٹی کر لیتا اور ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ ہی ائرپورٹ لاتا لیکن مصروفیت کچھ ایسی تھی کہ مجھے آفس سے نکل کر سیدھا یہاں آنا پڑا۔'' موضوع گفتگو بدلنے کے لیے مراد شاہ، چودھری کو اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی بیوی شاہدہ اس کی سگی پھوپی کی بیٹی تھی جس کو وہ باپ کی خواہش پر بیاہ کر اپنے ساتھ امریکا لے آیا تھا۔ کم تعلیم یافتہ شاہدہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن مراد شاہ نے سمجھ داری اور بردباری کا ثبوت دیتے ہوئے بیوی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی راہ نکال لی تھی۔ اگرچہ بیوی اور اپنے درمیان موجود ذہنی فرق کی وجہ سے بعض اوقات اسے شدید احساسِ تنہائی بھی ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی یہ بات شاہدہ پر ظاہر نہیں کی تھی اور یوں وہ دونوں اپنی بیٹی علینہ کے ساتھ کافی مناسب

www.pkdigest.com

زندگی گزار رہے تھے۔ علینہ کی عمر تین سال ہو چکی تھی اور اس کا وجود دونوں میاں بیوی کے لیے خوشی کا باعث تھا۔

’’نوکری کی یہی تو برائی ہوتی ہے کہ بندہ پابند ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس کی جگہ تو اپنے گاؤں میں ہوتا تو ایسی کوئی مجبوری آڑے نہیں آتی۔‘‘ مراد کی بات سن کر چودھری کو ایک نکتہ مل گیا چنانچہ اس نے فوراً ہی اسے جتا دیا۔ مراد اس کی بات سن کر خفیف سا مسکرا دیا اور جواب میں کچھ کہے بغیر ڈرائیو کرتا رہا۔ نیویارک جیسے مصروف شہر کے ٹریفک میں اپنی گاڑی چلانے کے لیے اچھی خاصی حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ برسوں یہاں رہنے کی وجہ سے وہ اس ٹریفک کا عادی ہو گیا تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے ہوئے آخر کار وہ لوگ مراد شاہ کے لگژری اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ مراد کی یہاں ٹھیک ٹھاک ملازمت تھی لیکن یہ شاندار اپارٹمنٹ بہرحال اسے چودھری نے ہی خرید کر دیا تھا ورنہ خود مراد تو شاید ابھی تک کسی کرائے کے اپارٹمنٹ میں ہی رہ رہا ہوتا۔ اپارٹمنٹ پہنچ کر چودھری کی بہو اور پوتی سے ملاقات ہوئی تو ان میں لگ کر وہ اپنی ذہنی الجھن کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھا۔ شاہدہ نے اس کے لیے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے مشرقی کھانا تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اسے مراد شاہ کے ساتھ نیویارک بھیجتے ہوئے چودھری نے بیٹے سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو مشرقی روایات کے خلاف امریکی ماحول میں نہیں ڈھلنے دے گا۔ شاہدہ حویلی کی دوسری خواتین کی طرح نیویارک میں رہنے کے باوجود گھریلو زندگی گزارے گی۔ مراد نے یہ شرط قبول کر لی تھی۔ خود شاہدہ کو بھی باہر کی دنیا سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اس لیے وہ آرام سے ایک گھریلو بیوی کی ذمے داریاں نبھا رہی تھی۔ کام کاج میں مدد کے لیے دن بھر ایک ملازمہ اس کے ساتھ رہتی تھی اس لیے اس پر بہت زیادہ بوجھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے مراد شاہ نے اسے مکمل آزادی سے قطعی محروم نہیں کیا تھا۔ وہ بہت سے معاملات میں اپنی مرضی کی مالک تھی اور اسے اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے کے لیے آزادی بھی حاصل تھی۔

’’ماموں جان! آپ کا کمرا تیار ہے۔ آپ لمبے سفر سے آئے ہیں، کچھ دیر آرام کر لیں پھر پوتی کے لاڈ اٹھائیے گا۔‘‘ شاہدہ نے چودھری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پوتی کے ساتھ مصروف تھا۔

’’ہاں پتر! میں واقعی بڑا تھک گیا ہوں۔ اب کچھ دیر آرام کروں گا۔‘‘ چودھری نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کی توجہ سے یک دم محروم ہو جانے پر علینہ نے احتجاج شروع کر دیا لیکن اس بار چودھری نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ تو علینہ کو پوتی ہونے اور اتنی دور رہنے کی وجہ سے کافی رعایت حاصل تھی ورنہ بیٹیوں سے محبت کا برتاؤ کرنا حویلی والوں کی روایات میں ہی شامل نہیں تھا۔ مراد شاہ جو باپ کے اس انداز کو سمجھتا تھا، خود ہی علینہ کو گود میں لے کر اسے بہلانے لگا جبکہ چودھری نے اپنے لیے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ آرام دہ بستر پر لیٹا تو اسے ایک بار پھر ڈیوڈ اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔ اس گفتگو میں ایک کارآمد بات یہ تھی کہ ڈیوڈ نے اسے ماہ بانو سے متعلق یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اسے مل جائے گی۔ ڈیوڈ سے معاملات جس طرح بھی طے پاتے لیکن ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ اسے ماہ بانو کے حصول کے لیے اب شہریار پر دباؤ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ اسے اغوا کروانا بھی بے کار ہی تھا۔ اس خیال کے آنے کے بعد اس نے فوراً ہی بالے کا موبائل نمبر ملایا۔ موبائل کی سہولت آ جانے کے بعد اس نے بالے سمیت اپنے کچھ خاص ملازمین کو موبائل سیٹ فراہم کر دیے تھے تاکہ وقت ضرورت فوری رابطہ ہو سکے لیکن اس وقت اسے بالے سے رابطہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ [illegible] بالے کا موبائل نمبر لگ ہی نہیں رہا تھا۔ [illegible] چودھری نے منشی اللہ رکھا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

’’سلام سرکار! خیر نال پہنچ گئے۔ میں یہی انتظار کر رہا تھا کہ آپ کی طرف سے خیریت کا فون آ جائے۔‘‘ چودھری کی آواز سنتے ہی منشی نے خوشامدانہ انداز میں بولنا شروع کر دیا۔

’’بالا کدھر ہے منشی؟ میں اتنی دیر سے اسے فون کر رہا ہوں، پر اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔‘‘ منشی کی خوشامدانہ باتوں پر کان دھرے بغیر چودھری نے اپنے مطلب کی بات کی۔

’’بالا تو رات سے ہی غائب ہے سرکار! مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ آپ نے اس کے ذمے کوئی کام لگایا ہے اسی کے سلسلے میں انتظامات کرنے جا رہا ہے۔ دو تین دن میں واپسی ہو گی۔‘‘ منشی نے اسے اطلاع دی تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یقیناً بالا شہریار کے اغوا کے انتظامات کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ موجود تھا جہاں موبائل سگنلز نہیں پہنچتے ہوں گے۔

’’ٹھیک ہے، پر تو کوشش کر کے دیکھ کہ کسی طرح بالے سے تیرا رابطہ ہو جائے۔ اس سے گل ہو تو بولنا کہ ابھی رک جائے۔ میں نے اسے جو کام کہا تھا، اس میں فوری ہتھ نہ ڈالے۔‘‘ چودھری نے ہدایات جاری کیں اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب اگر منشی کا بالے سے رابطہ ہو جاتا تو شہریار کا اغوا رک جاتا ورنہ دوسری صورت میں اس نے سوچ لیا تھا کہ بالے سے کہے گا کہ شہریار سے ماہ بانو کا پتا معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے اور یونہی اس کی تھوڑی بہت پھینٹی لگا کر اسے آزاد کر دے۔ شہریار کو اتنی تکلیف بھی پہنچ جاتی تو وہ اپنے دل میں بڑی ٹھنڈک محسوس کرتا۔

☆☆☆

قدرے ناہموار سڑک پر چلتے مشابرم خان کے قدم اس ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی طرف اٹھ رہے تھے جس کی جیپ ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق نامعلوم افراد نے جیپ چلانے والے ڈرائیور کو اچانک ہی روک کر اس سے جیپ چھین لی تھی اور ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا تھا۔ پولیس کے مطابق جیپ ڈرائیور حملہ آوروں کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں بتا سکا تھا لیکن مشابرم خان ایک بار خود جیپ ڈرائیور سے مل کر معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی ماں، اکرم خان اور ماہ بانو کے صدمے سے کافی حد تک واپس [illegible] جیپ ڈرائیور [illegible] چکا تھا لیکن اس نے محض یہی بتایا تھا کہ اغوا کاروں کی تعداد چار تھی اور انہوں نے اپنے چہروں کو نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ اغوا کاروں کی قومیت کے بارے میں بھی کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا تھا، البتہ اس نے ان کے قد و قامت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

مشابرم خان چاہتا تھا کہ اغوا کے لیے استعمال کی جانے والی جیپ کے ڈرائیور سے مل کر بھی دیکھ لے تاکہ اگر وہ کوئی خاص بات نوٹ کر سکا ہو تو اس کے ذریعے حملہ آوروں کا سراغ لگایا جا سکے۔ اسے تھانے سے جیپ ڈرائیور کے بارے میں معلومات مل گئی تھیں۔ اس شخص کا نام نیاز علی تھا اور وہ کئی سالوں سے ایک ٹورسٹ کمپنی میں بہ حیثیت ڈرائیور ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا بلتستان کے مختلف حصوں میں مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن وہ پہلی بار ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ واقعے میں وہ بے چارہ زخمی بھی ہوا تھا۔ حملہ آوروں نے اسے بے ہوش کرنے کے لیے سر پر ضرب لگائی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر پر زخم آ گیا تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے ٹورسٹ کمپنی آج کل اسے کسی جگہ نہیں بھیج رہی تھی اور مشابرم خان کی معلومات کے مطابق ان دنوں وہ اپنے گھر پر آرام کر رہا تھا۔ تھانے سے اسے نیاز علی کے گھر کا پتا معلوم نہیں ہو سکا تھا چنانچہ وہ ٹورسٹ کمپنی کے دفتر جا کر وہاں سے اس کے گھر کا پتا معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے خیالوں میں گم دفتر کی طرف جانے والے راستے پر سر جھکائے چلتے ہوئے وہ اردگرد سے تقریباً بے خبر تھا اس لیے جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ چونک پڑا اور سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ پکارنے والا اس کا ایک واقف کار آذر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے آذر پورٹر تھا اور عموماً سیزن میں پہاڑوں کے سفر پر ہی رہتا تھا۔

’’اور یار مشابرم خان! کیا حال چال ہے؟ ابھی اس طرح سر جھکائے بے خبری میں کدھر جاتا ہے؟‘‘ مشابرم خان متوجہ ہوا تو آذر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

’’بس یار! ایک کام سے جا رہا تھا۔ ماں اسپتال میں داخل ہے اس کے لیے دوائیں خریدنی تھیں اور ایک دوسرا کام بھی تھا۔‘‘ اس نے آذر کے سوال کا سرسری انداز میں جواب دیا۔

’’ہاں یار! ہمیں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تھا۔ بڑا برا ہوا تمہارے خاندان کے ساتھ۔ بے چارہ اکرم خان تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہم دونوں کا اکثر ہی ایک ساتھ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اکرم خان ماں جی کی خاطر ہی اوپر پہاڑوں پر نہیں جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ ماں ڈرتی ہے کہ کہیں میرے باپ اور بڑے بھائی کی طرح میں بھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں، پر قسمت کی خرابی دیکھو کہ اتنی احتیاط کے باوجود بھی بے چاری ماں کو اس عمر میں اتنا بڑا صدمہ سہنا پڑا۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ کے ٹو کے بیس کیمپ تک گیا ہوا تھا۔ رات ہی واپس آیا ہوں۔ اگر یہاں ہوتا تو اکرم خان کی تدفین میں ضرور شریک ہوتا۔ اب تو ساری زندگی یہی افسوس رہے گا کہ اپنے اتنے اچھے ساتھی کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔‘‘ آذر اس سے اکرم خان کی موت پر اظہار افسوس کرنے لگا۔ جواباً مشابرم خان خاموش رہا۔ اکرم خان کے ذکر پر اسے اپنے سینے میں دھواں سا بھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انتقام کی ایک آگ سی تھی جو تن بدن کو جھلسانے لگتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو لوگوں سے چھپانے کے لیے وہ ایسے مواقع پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

’’اچھا ہوا کہ تم مجھے راستے میں ہی مل گئے ورنہ میں خود تم سے ملنے کے لیے اسپتال کی طرف ہی جا رہا تھا۔ مجھے کسی سے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنا زیادہ وقت اسپتال میں اپنی ماں کے

www.pkdigest.com

پاس ہی گزارتے ہو۔ چلو چل کر ماں کی دوا لے لیتے ہیں پھر میں تمہارے ساتھ ہی اسپتال تک چلوں گا تاکہ ماں جی کی مزاج پرسی کرسکوں۔'' آذر نے اس کی خاموشی کو محسوس کیے بغیر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسا دینے کے انداز میں ہلکی سی تھپکی دی اور اسی راستے پر قدم آگے بڑھائے جس راستے پر مشابرم خان پہلے جا رہا تھا۔

''اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو میرے ساتھ چلو ورنہ چاہو تو سیدھے ماں سے ملنے اسپتال بھی جاسکتے ہو۔ اصل میں مجھے دوائیں خریدنے کے بعد نیاز علی ڈرائیور سے ملنے اس کی ٹورسٹ کمپنی کے دفتر تک بھی جانا ہے۔ تمہیں شاید کسی سے معلوم ہوا ہو کہ اکرم خان کے قتل میں جو لوگ ملوث ہیں، انہوں نے نیاز علی کی جیپ ہی استعمال کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ نیاز علی سے مل کر ان لوگوں کے حلیے وغیرہ معلوم کر سکوں۔'' آذر کو اپنے ساتھ چلنے پر مصر دیکھتے ہوئے مشابرم خان کو اس پر اپنا پروگرام ظاہر کرنا پڑا۔

''ہاں، میں نے سنا تھا کہ قاتلوں نے نیاز علی سے جیپ چھین کر اسے واردات کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں اس کے گھر تک لے جاسکتا ہوں۔ سنا ہے اپنی کمپنی کے دفتر تو وہ آج کل نہیں جا رہا ہے۔ دفتر والوں نے اسے آرام کے لیے چھٹی دی ہوئی ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن مجھے نیاز علی کے گھر کا پتا نہیں معلوم تھا اس لیے میں دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں سے اس کا پتا معلوم کرلوں گا۔ تمہیں اس کا گھر معلوم ہے تو اچھی بات ہے۔ ایسا کرو کہ مجھے اس کا گھر دکھا دو، پہلے میں اس سے ہی ملاقات کرلیتا ہوں۔'' آذر کی پیشکش سن کر مشابرم خان فوراً ہی اس کے ساتھ نیاز علی کے گھر جانے پر آمادہ ہوگیا۔

''چلو، تم کہتے ہو تو پہلے وہیں چلتے ہیں لیکن تم نیاز علی سے زیادہ اچھی امید نہ رکھنا۔ کچھ خود دماغ سا آدمی ہے۔ زیادہ کسی سے ملنا جلنا اور بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ کچھ سال پہلے اس کا مزاج ایسا نہیں تھا، سب سے مل جل کر رہتا تھا، پر اب بہت بدل گیا ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کے بیوی بچوں کا پہننا اوڑھنا دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے پاس کہیں سے پیسا آنے لگا ہے۔ حالانکہ پہلے بھی وہ ڈرائیوری ہی کرتا تھا اور اب بھی یہی کام کرتا ہے۔'' نیاز علی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے آذر نے اسے بتایا تو وہ ٹھٹک گیا۔ آذر کا نیاز علی کے بارے میں سرسری طور پر کیا جانے والا تبصرہ قابل غور تھا۔ اگر کسی طرح نیاز علی کے پاس معمول سے زیادہ پیسا آنے لگا

تھا تو اس کا مطلب تھا کہ نیاز علی کچھ مشکوک شخصیت کا مالک ہے اور ایسے شخص کی ہر بات پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

''تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ نیاز علی کے پاس پیسا کہاں سے آرہا ہے؟ اگر وہ کوئی نیا کام دھندا کرتا تو پیسا آنے والی بات سمجھ بھی آتی لیکن پہلے والی نوکری کے ساتھ زیادہ پیسا آنا تو ذرا عجیب سی بات ہے۔'' مشابرم خان نے آذر کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''کہاں یار! ہمارے پاس نہ تو فرصت ہے اور نہ ہی ہمیں عادت ہے کہ دوسرے کے معاملوں میں ٹانگ اڑائیں اس لیے کبھی جان کر اس معاملے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' آذر نے بے نیازانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''پھر بھی... کبھی تو تم نے نیاز علی کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہوگی جو تمہیں معمول سے ہٹ کر اور ذرا مشکوک لگی ہو؟'' مشابرم خان آسانی سے ہمت ہارنے والا نہیں تھا، چنانچہ آذر کو دماغ پر زور دینے کے لیے اکسایا۔

''ایسی کوئی خاص مشکوک حرکت تو نہیں دیکھی، پر ایک بار اس کی ایک حرکت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ یہ پچھلے سال کا ذکر ہے۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہنزہ گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا کا رابرٹ صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ اسکردو آیا ہوا ہے۔ رابرٹ صاحب مجھے بڑا پسند کرتا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں اسکردو میں نہیں ہوں لیکن جلد واپس آنے والا ہوں تو وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گیا کہ میں کسی طرح اسے جوائن کرلوں۔ اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ نیاز علی ایک ٹیم کو واپس لانے کے لیے آگے جانے والا ہے۔ میں نے اس سے لفٹ مانگ لی۔ اس وقت میں نے اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی جیپ میں کھانے پینے کا سامان اور دوائیں وغیرہ بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اگر وہ کسی ٹیم کے ساتھ سفر پر جا رہا ہوتا تو سامان کی موجودگی سمجھ آتی لیکن وہ تو ٹیم کو واپس لانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے سامان کے بارے میں پوچھا تو بولا آگے کسی گاؤں میں اس کے ایک دوست نے یہ سامان منگوایا ہے۔ میں اس کا جواب سن کر خاموش ہوگیا لیکن اس کے بعد بھی کئی بار میں نے نوٹ کیا کہ نیاز علی جب بھی کسی ٹیم کو واپس لانے جاتا ہے تو اس کی جیپ خالی نہیں ہوتی، اس میں کافی سامان لدا ہوا ہوتا ہے۔'' آذر کی فراہم کردہ معلومات بڑی قیمتی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں نیاز علی کا کردار جس طرح سامنے آیا تھا، اس کے

مطابق وہ قابل بھروسا آدمی نہیں تھا، چنانچہ اس کے اس بیان پر بھی یقین کرنا مناسب نہیں تھا کہ اغواکاروں نے اس سے جیپ چھینی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پیسے کے حصول کے لیے نیاز علی نے خود ان لوگوں سے سودا طے کیا ہو اور انہیں واردات کے لیے جیپ فراہم کرکے خود کو زخمی کیے جانے کا ڈراما رچایا ہو۔ یہ امکان ایسا تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے مشابرم خان سمجھتا تھا کہ نیاز علی سے سیدھے طریقے سے بات کرنا اتنا سودمند ثابت نہیں ہوگا اور اس شخص سے درست معلومات اگلوانے کے لیے اس پر ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

''وہ دیکھو... وہ جو لال چھت والا مکان ہے اس میں نیاز علی رہتا ہے۔'' مشابرم خان کی سوچوں سے بے خبر آذر نے ہاتھ کے اشارے سے ایک مکان کی نشان دہی کی تو وہ مکان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن عمارت اچھی حالت میں اور مضبوط تھی اور اس پر موجود رنگ و روغن بھی ایسا لگتا تھا کہ حال ہی میں کیا گیا ہو۔

''ایسا کرو کہ تم نیاز علی سے ملاقات کرلو۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔ نیاز علی کا معلوم نہیں کہ کس روکھے انداز میں ملے اور میں رات ہی سفر سے تھکا ماندہ آیا ہوں۔ تھکن میں برداشت ذرا کم ہو جاتی ہے اس لیے میرے خیال میں، میں اس سے نہ ہی ملوں تو اچھا ہے۔'' گھر کے قریب پہنچ کر آذر نے اچانک ہی اندر جانے کا ارادہ بدل دیا اور مشابرم خان سے بولا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ مگر میری تو مجبوری ہے۔ مجھے نیاز علی سے بڑی اہم باتیں معلوم کرنی ہیں اس لیے چاہے وہ جس انداز میں بھی ملے، مجھے تو اس سے ملنا ہی پڑے گا۔'' مشابرم خان خود آذر کے اس ملاقات میں ساتھ ہونے کے خیال سے الجھن کا شکار تھا اس لیے اب جو آذر نے ارادہ بدلا تو خوش ہوگیا اور اسے خوش دلی سے رخصت دے دی۔ آذر اس سے مصافحہ کرکے واپسی کے راستے کی طرف چل پڑا، تب مشابرم خان نے نیاز علی کے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بلند آواز میں لیکن مہذبانہ انداز میں دی گئی تھی۔ دستک کے جواب میں تقریباً سات آٹھ سال کا ایک بچہ دروازے سے باہر نکلا۔

''میرا نام مشابرم خان ہے۔ مجھے نیاز علی سے ملنا ہے۔'' اس نے بچے کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا واپس اندر چلا گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر ایک دراز قد، گوری رنگت اور بھوری آنکھوں والا تقریباً چالیس بیالیس سالہ مرد نمودار ہوا۔

''السلام علیکم بھائی مشابرم! آؤ اندر آجاؤ۔'' آذر کی فراہم کردہ معلومات کے برخلاف نیاز علی نے اس سے کافی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ مشابرم خان نے یہ دعوت قبول کرلی۔

''مجھے معلوم ہوا تھا کہ اکرم خان کا بھائی مشابرم خان اسکردو آیا ہوا ہے۔ میں اکرم خان کے افسوس کے لیے تم سے ملنا بھی چاہتا تھا لیکن طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ تمہیں معلوم تو ہوا ہوگا کہ جن لوگوں نے اکرم خان کو ہلاک کیا، وہ جیپ چھیننے کے چکر میں مجھے بھی زخمی کر گئے تھے۔'' گھر کی بیٹھک میں پہنچ کر نیاز علی نے ایک وضاحتی سا بیان دیا لیکن اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ صرف مشابرم خان کو سامنے پاکر باتیں بنا رہا ہے ورنہ حقیقتاً وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''مجھے تمہارے زخمی ہونے کا معلوم ہوا تھا۔ میں نے سوچا چل کر مزاج پرسی کرلوں۔ ساتھ ہی اگر تم اکرم خان کے قاتلوں کے بارے میں کچھ بتا سکو تو بڑی مہربانی ہوگی۔'' نیاز علی کی بھوری آنکھوں سے جھلکتی عیاری کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے نرمی سے درخواست کی۔

''پولیس والوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن میں کیا بتا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے مجھ سے جیپ چھینی، وہ اپنے چہروں کو نقاب میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی اس لیے ان کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔'' اس بار نیاز علی کا لہجہ قدرے روکھا ہوگیا تھا۔

''لیکن تم نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی تو اندازہ لگایا ہوگا۔ کم از کم اتنا اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ وہ لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے؟'' اندرونی طور پر غصہ محسوس کرنے کے باوجود مشابرم خان نے نیاز علی کے سامنے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ نیاز علی جواب میں کچھ بولتا، اس سے قبل ہی مشابرم خان کی آمد پر دروازہ کھولنے والا سات آٹھ سال کا بچہ چھوٹی سی گول تھالی میں قہوے کی پیالیاں رکھے اندر چلا آیا۔ بچے کی آمد پر نیاز علی اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور اس کے ہاتھ سے تھالی لے کر مشابرم خان کے آگے رکھی۔ مشابرم خان نے دیکھا کہ تھالی میں قہوے کی پیالیوں کے ساتھ ایک طشتری میں خشک خوبانیاں بھی رکھی ہیں۔

''لو بھائی! قہوہ پیو۔'' بچہ تھالی تھمانے کے بعد فوراً ہی واپس پلٹ گیا جبکہ نیاز علی میزبانی کے فرائض انجام دینے لگا۔

''تمہارا بیٹا ہے؟'' مشابرم خان نے نیاز علی کی بڑھائی ہوئی طشتری میں سے ایک خشک خوبانی اٹھاتے ہوئے

www.pkdigest.com

اس سے پوچھا۔

”ہاں... یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس سے بڑی دو بہنیں ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے، پر ہے بڑا نیک۔ زیادہ ستاتا نہیں ہے۔ ہر حکم مانتا ہے اور پڑھنے لکھنے کا بھی بڑا شوقین ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ یہ پرائمری اسکول پاس کر لے تو اسے کسی بڑے شہر کے اچھے سے اسکول میں داخل کروا دوں گا۔ اچھی جگہ سے پڑھے گا تو ان شاء اللہ بڑا ہو کر کہیں اونچا افسر لگ جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر سے نیچے کے تو خواب ہی نہیں دیکھتا میں اپنے بیٹے کے لیے۔ یہ ہے بھی اتنا ذہین کہ مجھے یقین ہے کہ میرے سارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔“ نیاز علی کے لہجے میں گہری پدرانہ شفقت و محبت تھی۔

”اللہ تعالیٰ تمہاری خواہش پوری کرے لیکن ہے یہ بہت مہنگی خواہش۔ خاص طور پر کسی بڑے شہر کے اچھے سے اسکول میں بچے کو داخل کروا کر پڑھانے میں تو بہت خرچہ آئے گا۔ ایک تو بڑے اسکولوں کی فیسیں زیادہ ہوتی ہیں دوسرے تمہیں ہاسٹل وغیرہ کا خرچ بھی اٹھانا پڑے گا۔“ مشابرم خان کو یاد تھا آذر نے اسے بتایا تھا کہ نیاز علی کے پاس کہیں سے روپیا آنے لگا ہے۔ اب جو اس نے بیٹے کے بارے میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا تو اسے احساس ہوا کہ آذر واقعی سچ کہہ رہا تھا، ورنہ کسی عام آدمی کے لیے تو اتنے مہنگے خواب دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

”خرچہ تو واقعی آئے گا لیکن اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر تو مارنے ہی پڑتے ہیں۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم کا انتظام کرلوں گا۔“ نیاز علی نے بہ ظاہر بے نیازی سے جواب دیا لیکن مشابرم خان محسوس کر رہا تھا کہ اس کی اس بے نیازی میں ایک خاص قسم کا یقین ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے وسائل کی تنگی کا ذرا بھی خدشہ نہ ہو۔

”چلو، اللہ تمہارا ساتھ دے۔ میں نے تو ویسے ہی ایک بات کی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ تم خود زیادہ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ اپنے بچے کے لیے کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں؟ میں تو یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ وہ لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے لگتے تھے؟“ بچے کی آمد کی وجہ سے جو سوال ٹل گیا تھا وہ مشابرم خان نے پھر دہرایا۔

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں وہ کہیں باہر کے ہی لوگ ہوں گے۔ مقامی افراد میں سے تو کوئی بھی ایسی کارروائی کی جرأت نہیں کرسکتا۔“ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے نیاز علی نے خیال آرائی کی۔

”تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو نیاز علی جہاں سے حملہ آوروں نے تمہاری جیپ چھینی تھی؟“

”دکھا تو سکتا ہوں لیکن تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے؟ وہ تو بالکل ویران اور چٹیل سی جگہ ہے۔ اس جگہ کا پولیس والے پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں اور انہیں وہاں سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کے ذریعے مجرموں کی نشان دہی ہو سکے۔“ نیاز علی نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”بس میں ایک بار اپنی تسلی کے لیے وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار مجھے وہاں لے چلو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے تم ضد کر رہے ہو تو میں چلوں گا لیکن وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے اور بغیر جیپ کے پہنچنا ممکن نہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے جیپ کا انتظام تمہیں خود کرنا ہوگا۔ میں جس ٹورسٹ کمپنی کے لیے کام کرتا ہوں، وہ صرف اپنے کام کے لیے ہی مجھے جیپ فراہم کرتی ہے۔“ نیاز علی نے نیم دلانہ سے انداز میں ہامی بھری۔

”جیپ کا مسئلہ نہیں اس کا میں خود انتظام کرلوں گا۔ تم دو گھنٹے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔“ نیاز علی کو کسی اور کا بہانہ بنانے کا موقع دیے بغیر اس نے کہا اور [illegible] خالی پیالی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

www.pkdigest.com

”دو گھنٹے بعد... لیکن میری طبیعت ابھی اتنی اچھی نہیں ہے کہ میں گاڑی چلا سکوں۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔ اگر اچانک چکر وغیرہ آگیا تو کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔“ مشابرم خان کو بالکل تیار دیکھ کر نیاز علی نے ایک اور بہانہ تراشا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے ڈرائیوری کا بڑا تجربہ ہے۔ میں آرام سے جیپ چلا لوں گا۔ تمہیں صرف میری راہنمائی کرنی ہوگی۔“ مشابرم خان نے اس کا یہ بہانہ بھی مسترد کر کے مسئلے کا حل پیش کر دیا۔ جواباً نیاز علی کے چہرے کے عضلات کچھ تن سے گئے لیکن اب ہامی بھرنے کے بعد انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا چنانچہ بے دلی سے ہی سہی، اسے آمادگی ظاہر کرنی پڑی۔ اس کے آمادگی ظاہر کرتے ہی مشابرم خان اس سے رخصت لے کر سیدھا ایک ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پہنچا تاکہ وہاں سے جیپ حاصل کر سکے۔ ٹورسٹ کمپنی والے عموماً بغیر ڈرائیور کے کسی کو جیپ فراہم نہیں کرتے لیکن اس دفتر میں مشابرم خان کا ایک دیرینہ دوست ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ضمانت پر اسے جیپ فراہم کر دی گئی۔

دو گھنٹے بعد وہ ایک بار پھر نیاز علی کے گھر کے دروازے پر تھا۔

”میری تو سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے جہاں سے ان غنڈوں نے مجھ سے جیپ چھینی تھی..... بے کار میں تمہارا اور میرا دونوں کا وقت ہی ضائع جائے گا۔“ اسے سامنے دیکھ کر نیاز علی نے منہ بناتے ہوئے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”بس تم میری تسلی کے لیے چلے چلو۔ اب تو میں کرائے پر جیپ بھی لے آیا ہوں۔“ مشابرم خان نے اصرار کیا تو نیاز علی کو چار و ناچار اس کے ساتھ جیپ میں سوار ہونا ہی پڑا۔ ڈرائیونگ مشابرم خان کر رہا تھا اور نہایت مہارت سے نیاز علی کی راہنمائی میں گاڑی آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔ ڈھائی تین گھنٹے کی خاصی مشقت طلب ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں زمین کی رنگت سلیٹی مائل اور ساخت پتھریلی سی تھی۔ یہ علاقہ بالکل ویران اور بنجر تھا اور دور تک پھیلی پتھریلی زمین کے سرے پر اسی کی طرح ویران اور خشک پہاڑ کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”اس جگہ ان غنڈوں نے مجھے گھیرا تھا۔ اس جگہ سڑک کتنی خراب ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ڈرائیور کو بہت احتیاط سے اور ہلکی اسپیڈ میں گاڑی چلانی پڑتی ہے ورنہ [illegible] سڑک کی دوسری طرف کھائی میں گر جاتی ہے۔“ جیپ اغوا کیے جانے کی جگہ کی نشان دہی کرتے ہوئے نیاز علی نے مشابرم خان کی توجہ راستے کی کٹھنائی کی طرف مبذول کروائی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ سڑک کی حالت واقعی کافی مخدوش تھی اور اس کی ایک جانب موجود وسیع لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں۔ سڑک کو یہاں کھائی کے قریب سے گزارنا بھی مجبوری تھی کیونکہ آگے جا کر جہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو رہا تھا وہاں راستہ تنگ ہو گیا تھا اور کسی اور زاویے سے سڑک گزارنا ممکن نہیں تھا۔

”میری جیپ چھیننے والے غنڈے شاید اس پہاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ میں راستے پر توجہ ہونے کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکا کہ وہ کس طرف سے آئے تھے۔ بس مجھے تو ایسا لگا کہ وہ بالکل اچانک میرے راستے میں آ کھڑے ہوئے ہوں۔“ نیاز علی تفصیلات بتا رہا تھا جبکہ مشابرم خان نے جیپ کو سڑک سے اتار کر بنجر زمین پر ایک طرف روک لیا تھا اور اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ علاقے کا معائنہ کرتے ہوئے اسے نیاز علی کی بات کافی درست محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے جیپ چھیننے والے غنڈوں کو اصولاً پہاڑی کے پیچھے ہی چھپا ہونا چاہیے تھا۔ کھلی جگہ موجود ہونے کی صورت میں تو وہ فوراً ہی نظروں میں آجاتے۔ وہ ٹہلتا ہوا بنجر پہاڑی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نیاز علی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ قریب پہنچ کر پہاڑی کا جائزہ لینے پر چونک سا گیا۔ وہ بلند پہاڑی یقیناً چھپنے والوں کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ اس کے پیچھے کچھ جگہ موجود ہوتی لیکن اس پہاڑی کے پیچھے تو بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ گھوم کر پہاڑی کی دوسری طرف جانے کی کوشش کرنے والے مشابرم خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد معنی خیز انداز میں سر گھما کر نیاز علی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کی معنی خیزی نے نیاز علی کو بوکھلا دیا۔ وہ خود بھی وہ بات محسوس کر چکا تھا جسے مشابرم خان نے نوٹ کیا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف کسی شخص کے کھڑے ہونے کے لیے بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ دوسری طرف بالکل ویسی ہی گہری کھائی تھی جیسی سڑک کے دائیں جانب موجود تھی۔

”تم کہتے ہو کہ وہ غنڈے اس پہاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے تھے لیکن یہاں تو چھپنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔“ مشابرم خان واپس پلٹا اور نہایت سنجیدگی سے نیاز علی سے بولا۔

”میں نے شاید کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں اور چھپے ہوں۔“ نیاز علی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں صفائی پیش کی۔

”کہیں اور کہاں چھپ سکتے تھے وہ لوگ؟ سڑک کے دائیں جانب گہری کھائی ہے جہاں کوئی چھپ ہی نہیں سکتا، اب بائیں جانب کا علاقہ ہی رہ جاتا ہے اور یہ اتنا کھلا ہے کہ تم دور ہی سے ان لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔“ اب مشابرم خان کے لہجے میں ذرا تندی آگئی تھی۔

”لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے وہ زمین سے چپک کر لیٹے ہوئے ہوں اس لیے میری ان پر نظر نہیں پڑ سکی ہو۔“ نیاز علی نے ایک اور دلیل دی جو قدرے معقول تھی۔ اس جگہ کی زمین واقعی ایسی رنگت کی تھی کہ اگر کوئی ملتے جلتے رنگ کے کپڑے پہن کر اس سے چپک کر لیٹ جائے تو بے دھیانی میں گزرنے والے کو کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا لیکن مشابرم خان، نیاز علی کی طرف سے کھٹک چکا تھا۔ پہلے آذر کی فراہم کردہ معلومات اور اب نیاز علی کا بوکھلایا ہوا رویہ اس کے ذہن میں شک پیدا کر رہا تھا۔ ذہن میں موجود شک نے ہی اسے راہ سجھائی اور اسے ایک اہم نکتے کا خیال آیا۔

”تمہاری جیپ چھیننے والے غنڈے خود یہاں تک کیسے پہنچے تھے؟ یہ جگہ ایسی تو نہیں کہ یہاں تک کوئی پیدل آسکے۔ وہ

لوگ یقیناً کسی جیپ میں ہی یہاں تک آسکتے تھے۔ اگر وہ جیپ میں آئے تھے تو انہوں نے اپنی جیپ کہاں چھپائی تھی؟"

نیاز علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یہ سوال کیا تو وہ واضح طور پر بوکھلا گیا اور اپنی اس بوکھلاہٹ کو چھپانے کے لیے غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں پتا کہ وہ لوگ یہاں کیسے آئے تھے اور کہاں چھپے تھے؟ میں نے تمہاری درخواست پر تمہیں جائے وقوعہ دکھا دی ہے۔ اب تمہیں جو دیکھنا ہے اور معلوم کرنا ہے، خود ہی معلوم کرلو۔ میں تمہارے سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مجھے جو دیکھنا تھا وہ تو دیکھ چکا ہوں لیکن جو معلوم کرنا ہے، وہ تم سے معلوم کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا پڑے گا۔" اس کا جواب سن کر مشابرم خان جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"خبردار! مجھ سے دور رہو ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔" نیاز علی نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے پسٹل نکال کر اس پر تان دیا۔

"تمہاری اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ اکرم خان کے ساتھ جو کچھ ہوا تم خود بھی اس میں شامل تھے اور جیپ چھینے جانے کا ڈراما کر کے تم نے پولیس والوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔" اپنی طرف تنے پسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے مشابرم خان نے پُریقین لہجے میں کہا۔ نیاز علی کے پسٹل نکال لینے کے بعد وہ بے شک اپنی جگہ پر رک گیا تھا لیکن اس کے لہجے اور انداز میں خوف زدگی کا ذرا سا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ پوری طرح پُرسکون اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

"تم جو چاہے سمجھو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نیاز علی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور مشابرم خان پر نظر جمائے جمائے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "تم اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھ لو اور اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا جب تک میں یہاں سے چلا نہ جاؤں۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھنا کہ میں بلاتکلف تمہیں گولی ماردوں گا۔"

نیاز علی کا انداز کسی ایسی بلی کا سا تھا جو بند کمرے میں پھنس گئی ہو اور باہر نکلنے کی خواہش میں سامنے آنے والے انسان کا زخرا ادھیڑ ڈالنے میں بھی عار نہ سمجھے۔ اس کے لہجے کی خوں خواری دیکھتے ہوئے مشابرم خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن اب بھی وہ گھبرایا ہوا یا پریشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیاز علی پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ اس پر پسٹل تانے تانے الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مشابرم خان کو اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اسے اس ویرانے میں چھوڑ کر خود جیپ میں فرار ہونے کا سوچ رہا تھا۔ اگر اسے آسانی سے جیپ تک پہنچنے کی مہلت دے دی جاتی تو اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔

مشابرم خان کو جیپ سے اترتے وقت چابی نکالنے کا خیال نہیں آیا تھا اور چابی ہنوز اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ نیاز علی ایک بار جیپ تک پہنچ جاتا تو اسے وہاں چھوڑ کر لمحہ بھر میں ہوا ہوسکتا تھا۔ اسے اپنے اس ویران مقام پر رہ جانے کی تو فکر نہیں تھی کہ کبھی نہ کبھی کوئی ٹورسٹ یہاں سے گزرتا تو وہ اس سے لفٹ لے سکتا تھا ورنہ دوسری صورت میں پیدل چل کر آگے ایسے کسی مقام تک جایا جاسکتا تھا جہاں سے سواری کا کوئی بندوبست ہوجاتا لیکن اصل مسئلہ نیاز علی کا تھا۔ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر دوبارہ اسے گھیرنا اور اس سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا۔ مشابرم خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پل بھر میں یہ سارا حساب کتاب کیا اور اپنے اردگرد ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کی دائیں ٹانگ کے قریب چند انچ کا ایک نکیلا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس پتھر کے نظروں کی گرفت میں آتے ہی وہ فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوگیا اور بے حد تیزی سے اس نے ٹانگ کو بہت نپے تلے انداز میں حرکت دی۔ اس کی ٹھوکر کھا کے پیر کے قریب پڑا پتھر زمین سے اوپر اچھلا اور قوس کی صورت میں حرکت کرتا ہوا نیاز علی کی طرف بڑھا۔

نیاز علی جو اس پر نظریں جمائے ہوا تھا، اس کی حرکت پر بدک گیا اور بنا توقف فائر داغ دیا لیکن مشابرم خان اس ردعمل کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس لیے اس کے فائر کرنے سے قبل ہی نیچے بیٹھ چکا تھا۔ اس کا یہ پھرتی سے بیٹھنا اس کے کام آیا اور گولی چند انچ کے فاصلے سے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ اس وقت میں اس کا نیاز علی کی طرف اچھالا گیا پتھر بھی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ بہت حساب کتاب سے پھینکے گئے پتھر نے فائر کے اگلے لمحے ہی پسٹل کو ضرب لگائی اور پسٹل اچھل کر نیاز علی کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد لڑھکتا ہوا نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ پسٹل کے غائب ہوتے ہی نیاز علی کی خوداعتمادی بالکل جواب دے گئی اور وہ پلٹ کر جیپ کی طرف بھاگا لیکن مشابرم خان کب چوکنے والا تھا۔ اس نے ایک لمبی جست لگائی اور چند سیکنڈوں میں ہی اسے چھاپ لیا۔ نیاز علی نے جب فرار کی راہ مسدود دیکھی تو دوبدو مقابلے کے لیے غراتا ہوا اس کی طرف پلٹا۔ پلٹنے کے اس عمل میں اسے اچھی خاصی طاقت صرف کرنی پڑی تھی کیونکہ اس کی

گردن اور ایک بازو مشابرم خان کی گرفت میں تھے۔ پلٹنے کے ساتھ ہی اس نے بلاتوقف اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر مشابرم خان کے منہ پر مارنے کی کوشش کی۔ مشابرم خان نے بچاؤ کے لیے اپنا چہرہ پیچھے کرلیا لیکن پھر بھی نیاز علی کے مکے سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکا اور پھسلتا ہوا سا وار اس کے رخسار پر لگا۔ اس معمولی چوٹ نے ہی ہمالیہ کی ایک عظیم چوٹی کے ہم نام مشابرم خان کو غضب ناک کردیا۔ وہ پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ اس نے پہاڑوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ ساری زندگی پہاڑوں کو سر کرتا ہوا آخر کار انہی کی آغوش میں جا سویا تھا۔ اس پہاڑ آشنا شخص نے اپنے بیٹے کا نام ایک پہاڑی چوٹی کے نام پر رکھا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پہاڑ جیسا ہی مضبوط دیکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال وجہ جو بھی رہی ہو، یہ طے ہے کہ جب پہاڑ نامہربان ہوجائیں تو ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ پہاڑوں کا غضب سہنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ مشابرم خان بھی غصے میں آیا تو نیاز علی کی ذرا پیش نہ چلی۔ مشابرم خان نے اسے بے در بے مکوں کی زد پر رکھ لیا۔ ساتھ ہی اس کی ٹانگیں بھی مسلسل چل رہی تھیں۔ آخر کار نیاز علی نڈھال ہوکر نیچے گر پڑا۔

"بتا کون تھے وہ لوگ جنہوں نے میرے بھائی کو قتل کیا اور ہماری مہمان لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے؟" مشابرم خان نے اس پر جھکتے ہوئے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی سخت گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"مم... مجھے نہیں معلوم۔" نیاز علی نے خوف زدہ لہجے میں انکار کیا۔ اس کے اس انکار نے مشابرم خان کو مزید غضب ناک کردیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس کی دو انگلیوں کو نیاز علی کے نتھنوں میں ڈال کر اس زور سے دباؤ ڈالا کہ اس کے نتھنے چر سے گئے۔ تکلیف کی شدت سے نیاز علی کسی ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔

"مجھ پر اس وقت خون سوار ہے نیاز علی! میرا سینہ اپنے جوان بھائی کی موت کے غم سے جل رہا ہے۔ یہ آگ صرف اسی صورت ہی بجھ سکتی ہے کہ میں بھائی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا دوں اور اپنی مہمان لڑکی کو ان کی گرفت سے نکال لاؤں۔ اگر تو نے میرے اس ارادے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور مجھے سچ نہیں بتایا تو پھر سینے میں جلتی آگ سب سے پہلے تجھے بھسم کردے گی۔" مشابرم خان کے چہرے پر ویسی ہی دہکتی سرخی چھائی ہوئی تھی جیسی آگ کے قریب میں موجود کسی کے چہرے پر دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا کہ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کے شعلوں کا رقص اس کے چہرے پر دیکھا جاسکتا تھا۔

"وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں نے تمہیں کچھ بتایا تو وہ مجھے اور میرے بیوی بچوں سب کو مار ڈالیں گے۔" نیاز علی تقریباً رو پڑا تھا۔

"اس وقت میں بھی تمہارے لیے کسی جلاد سے کم نہیں ہوں۔ تم نے اگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا تو میں بھی تمہیں مار ڈالوں گا اور وہ بھی آسانی سے نہیں، تڑپا تڑپا کر بے حد اذیت کے ساتھ۔" نہایت سفاکی سے جواب دیتے ہوئے مشابرم خان نے اس کے نتھنوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ایک بار پھر جنبش دی۔ نیاز علی کے حلق سے ایک بار پھر چیخ برآمد ہوئی۔

"بولو! کون ہیں وہ لوگ... تمہارا ان غنڈوں سے کیا تعلق ہے؟" اس کے چیخنے کی پروا کیے بغیر مشابرم خان نے پوچھا۔

"وہ کون ہیں، میں نہیں جانتا۔ بس یہ معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" نیاز علی نے سسکاری لیتے ہوئے بتایا۔

"تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں وہ کیسے اور کہاں ملے؟" مشابرم خان نے اپنا سوال ذرا سے اضافے کے ساتھ دہرایا۔

"وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں... ان کا ایک معمولی سا کام کردیا کروں تو بدلے میں مجھے کافی بڑی رقم ملا کرے گی۔ میں اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے رقم کے لالچ میں آگیا پھر کام بھی کوئی خطرے والا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں جب کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم کو واپس لینے جاؤں تو انہیں راشن اور ادویات وغیرہ سپلائی کردیا کروں۔ بس میں ان کے لیے یہ کام کرتا تھا اور بدلے میں مجھے اچھی رقم مل جاتی تھی۔ اس بار میں انہیں راشن پہنچانے گیا تو انہوں نے مجھ سے میری جیپ مانگ لی۔ ظاہر ہے، میں اس طرح انہیں جیپ نہیں دے سکتا تھا۔ دے دیتا تو اپنی کمپنی کے مالک کو کیا جواب دیتا کہ میں وقت پر ٹیم کو لینے کیوں نہیں پہنچا۔ مالک کے سوال جواب سے بچنے کے لیے ہم نے جیپ چھینے جانے اور مجھے بے ہوش کرنے کا ڈراما کیا۔ پولیس والوں سمیت سب نے اس ڈرامے پر یقین کرلیا لیکن تم کو پتا نہیں کیسے شک پڑ گیا... مگر یقین کرو خان! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مجھ سے جیپ لے کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا، بس یہی کہا تھا کہ انہیں اپنے

www.pkdigest.com

ایک کام کے لیے چند گھنٹوں کے لیے جیپ چاہیے۔ اس خدمت کے لیے انہوں نے مجھے رقم بھی دی تھی۔ نہیں دیتے، تب بھی میں انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میرے انکار پر غصے میں آکر مجھے قتل بھی کر سکتے تھے۔'' نیاز علی کے لہجے میں واضح خوف تھا۔

''تم انہیں راشن کس جگہ پہنچاتے ہو؟'' اس کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر مشابرم خان نے پُرسوچ انداز میں سوال کیا۔

''کسی ایک جگہ نہیں۔ راشن بھیجنے والے جب مال میرے حوالے کرتے ہیں تو اس وقت جگہ کے بارے میں بتاتے ہیں۔''

''کون ہیں وہ لوگ؟ کیا یہیں اسکردو میں رہتے ہیں؟'' مشابرم خان اس کا جواب سن کر چونکا۔

''میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' نیاز علی نے جواب دیا لیکن یہ جواب دیتے ہوئے اس نے جس طرح نظریں چرائی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

''جھوٹ مت بولو نیاز علی! یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ اتنے عرصے سے مسلسل تم سے یہ کام لے رہے ہیں، تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہی نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان لوگوں کے بارے میں جانتے ہو گے۔ آخر راشن کی وصولی اور اپنی خدمت کا معاوضہ لینے کے لیے تمہیں کسی سے تو ملنا پڑتا ہوگا۔ تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔'' پہاڑوں میں ٹھکانا بنا کر رہنے والوں کے بارے میں تو مشابرم خان یقین کر سکتا تھا کہ وہ نیاز علی کے لیے اجنبی ہوں گے۔ جو لوگ سب سے چھپ کر پہاڑوں میں اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے، ان کے بارے میں یہ بات یقینی تھی کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپائے رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہوگی لیکن اسکردو شہر میں رہ کر نیاز علی سے کام لینے والے کا پردے میں رہنا ممکن نہیں تھا۔

''میں نے کہہ دیا نا کہ میں کسی کو نہیں جانتا تو پھر تم کیوں زبردستی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟'' نیاز علی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا اور یک دم ہی اسے دھکا دے دیا۔ مشابرم خان جو نیاز علی کو تعاون پر آمادہ دیکھ کر اسے قدرے ڈھیلا چھوڑ چکا تھا، اس اچانک دھکے کو سہار نہیں سکا اور پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے گرتے ہی اب تک بے بس پڑے نیاز علی نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے کھڑا ہو کر جیپ کی طرف دوڑا۔ مشابرم خان کے سنبھل کر کھڑے ہونے تک وہ جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نیاز علی کو نہیں پکڑ سکے گا پھر بھی وہ اس کی طرف دوڑا لیکن اس دوڑ بھاگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے کچھ بھی کرنے سے قبل نیاز علی جیپ میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مشابرم خان نے چھلانگ لگائی کہ کسی طرح جیپ میں سوار ہو سکے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کی انگلیاں صرف جیپ کی باڈی کو مس ہی کر سکی تھیں کہ جیپ جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ بے بس سا زمین پر گرا مشابرم خان ابھی کفِ افسوس ہی مل رہا تھا کہ اگلے پل دم بخود رہ گیا۔ اس کی دسترس سے نکل جانے والی جیپ توازن برقرار نہیں رکھ سکی اور بے قابو ہو کر سڑک کی دوسری طرف موجود کھائی میں لڑھک گئی۔ شاید عجلت اور گھبراہٹ کے باعث نیاز علی جیسا تجربے کار ڈرائیور غلطی کر بیٹھا تھا۔

مشابرم خان لمحہ بھر کے لیے شاک کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور کھائی کی طرف دوڑا۔ سڑک پر کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے جھک کر نیچے کی طرف جھانکا۔ بے قابو ہو کر سڑک سے گرنے والی جیپ لڑھکتی ہوئی کافی نیچے تک پہنچ چکی تھی اور ابھی لڑھکنے کا عمل جاری تھا۔ موجودہ صورتِ حال دیکھ کر بغیر کسی شک و شبہے کے یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ نیاز علی کی زندگی کا چراغ جلے رہنا اب ممکن [illegible] اوجھل ہوئی۔ جیپ کے غائب ہو جانے کے بعد مشابرم خان ایک گہرا سانس لیتا ہوا پیچھے ہٹا اور سڑک پر پیدل چلنے لگا۔

اب اس کے واپس شہر پہنچنے کا انحصار اسی بات پر تھا کہ کوئی سواری اتفاق سے اس طرف آ نکلے اور اسے لفٹ مل جائے۔ کچھ دیر قبل نیاز علی نے اسے اس ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں وہ بہرحال کامیاب ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے ارادے کے مطابق یہاں سے نکل کر واپس شہر کی طرف سفر کرنے کے بجائے ہمیشہ کی واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ سفر تھا جس پر جانے کا ارادہ کبھی کوئی نہیں باندھتا لیکن بالآخر اسے اس راستے پر سفر کے لیے قدم اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ نیاز علی کی واپسی کا سفر بھی قدرت کے طے کردہ وقت پر شروع ہو گیا تھا اور اس سفر کے دوران ہی اس کو یہ جاننا تھا کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے آرام کے لیے وہ جو مال و زر جمع کر رہا تھا، اس نے اس کا سفرِ آخرت کتنا مشکل بنا ڈالا تھا۔

☆☆☆

''کیا حال ہیں چوہدری صاحب! سفر کی تھکن اتر گئی یا نہیں؟'' گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے چوہدری نے

روحانی معالج صدر کراچی
ایس - آر - رائے
ہر کام بذریعہ کلام الٰہی کیا جاتا ہے ہر مقصد میں کامیابی چند یوم میں حاصل کریں مثلاً
من پسند جگہ شادی
گھریلو پریشانی
کاروبار میں بندش
رشتوں میں بندش
انعامی چانس
سوتن سے نجات
شوہر کو راہِ راست پر لانا
بیرونِ ملک سفر
ہر کام بذریعہ نقش و کلام کیا جاتا ہے
ہم دعویٰ نہیں کام کرتے ہیں
خود بیٹھ کر کام حل کروائیں اور پرسکون زندگی بسر کریں
اپنا لکی نمبر، برج، ستارہ، پتھر، مبارک دن اور اصلی پتھر
مناسب ہدیہ پر وی پی پارسل حاصل کریں صرف ایک فون کال پر
رابطہ 24 گھنٹے
0332-2502301 , 021-32783885
0322-3231669 , 0333-3136430
Email : aamilsr_roy@yahoo.com

اپنا سیل فون بجنے پر کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نہایت بے تکلفانہ انداز میں پوچھا گیا۔ چودھری جو فون کی اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھ کر الجھ گیا تھا، اس بے تکلفانہ لب و لہجے کو فوراً شناخت کر گیا۔

”آپ سنائیں مسٹر ڈیوڈ! آپ نے کیسے کال کی زحمت کی؟“ دورانِ سفر اس کی ڈیوڈ سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی لیکن آخر میں جس طرح ڈیوڈ نے پینترا بدل کر دھمکی آمیز لہجہ اختیار کر لیا تھا، وہ چودھری کو بھولا نہیں تھا۔ چنانچہ اس وقت اس کے لہجے میں کافی سرد مہری تھی۔

”زحمت کیسی؟ آپ کو کال کر کے تو مجھے دلی خوشی ہوئی ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کال کے ذریعے میں آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سفر کے دوران ہمارے درمیان ایک ڈیل کے سلسلے میں گفتگو چل رہی تھی اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس موضوع پر بعد میں اطمینان سے بات چیت کریں گے۔ شاید اپنے ساتھ لنچ کی آفر بھی میں نے آپ کو اسی وقت دے دی تھی۔ اس وقت میں نے اسی سلسلے میں یاد دہانی کے لیے فون کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ آج لنچ میرے ساتھ ہی کریں۔“ ڈیوڈ کا لہجہ بے حد شائستہ ہونے کے باوجود چودھری اس میں موجود تحکمانہ پن کو محسوس کر رہا تھا اور یہ شے اس کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ اس جیسے حکم چلانے کے عادی شخص کے لیے کسی دوسرے کے احکامات کو برداشت کرنا قطعی ناقابلِ قبول تھا۔

”فی الحال میرا ایسا کوئی موڈ نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“ اس نے قدرے روکھے پن سے ڈیوڈ کو جواب دیا۔

”موڈ کا کیا ہے چودھری صاحب! آپ چاہیں گے تو موڈ بھی بن جائے گا۔ اور یاد رکھیں کہ موڈ بننے میں سراسر آپ کا ہی فائدہ ہے۔ ہماری یہ ملاقات آپ کے لیے ہر لحاظ سے سود مند ثابت ہوگی۔“

”میرے فائدے کو چھوڑیں، یہ بتائیں کہ آپ کا کیا فائدہ ہے جو آپ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ صرف میرے فائدے کے لیے تو آپ اتنے بے چین نہیں ہو سکتے؟“ ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری نے چڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آپ بڑے ذہین آدمی ہیں چودھری صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا کہ میں بھی آپ سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن یاد رکھیں کہ آپ کا منافع مجھ سے زیادہ ہی ہوگا۔ میں آپ کو آپ کی منظورِ نظر ماہ پارہ تو بھی دے دوں گا اور ساتھ ہی ہمارے درمیان ایک کاروباری معاہدہ بھی طے پا جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ نئے اے سی شہریار عادل کی آمد کے بعد آپ کا لکڑی کا کاروبار بالکل ٹھپ ہو گیا ہے۔ آپ مجھ سے ملاقات کریں تو میں آپ کو اس کے متبادل دوسرے کاروبار کے سلسلے میں مشورہ دوں گا اور یقین جانیے کہ وہ نیا کاروبار آپ کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہوگا۔“ ڈیوڈ نے چودھری کے سامنے وہ دانہ ڈالا کہ اس کے لیے ملاقات سے انکار ممکن ہی نہیں رہا۔ وہ زن، زر اور زمین کا دیوانہ تھا۔ ڈیوڈ اسے ان تینوں میں سے دو کے ملنے کی نوید دے رہا تھا اس لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے انکار کر دیتا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہاری آفر قبول کر لیتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کب اور کہاں پہنچنا ہے؟“ اس نے ہامی بھرتے ہوئے ڈیوڈ سے پوچھا۔

”آپ ایک بجے تک ٹائمز اسکوائر پہنچ جائیں۔ وہاں سے میں خود آپ کو پک کر لوں گا۔“ ڈیوڈ نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔“ چودھری نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا اور پُرسوچ انداز میں اپنے سامنے چلتے ٹیلی ویژن کی اسکرین [illegible] لیکن [illegible] تصور کرتے [illegible] کا دھیان ڈیوڈ کی باتوں میں ہی الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے کسی منفعت بخش کاروبار میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کاروبار کیا ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے، یہ کوئی عام اور قانونی قسم کا کاروبار نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ڈیوڈ کو اس سے پُراسرار طریقے سے ملنے اور گھیرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہی سوچوں میں گھرے کافی وقت گزر گیا۔ چودھری اپنے خیالات کی دنیا سے اس وقت نکلا جب دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور اس کی بہو شاہدہ نے احتیاط سے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”آپ مصروف تو نہیں ہیں ماموں جان؟“ چودھری اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”فی الحال تو نہیں۔ تم کہو، کوئی کام تھا کیا مجھ سے؟“ چودھری نے اپنے مخصوص روکھے انداز میں پوچھا۔

”جی میں کھانا تیار کروا رہی تھی اس لیے آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ آپ دوپہر کے کھانے میں کیا کھانا پسند کریں گے؟“ نیویارک میں کئی برس رہنے کے باعث شاہدہ میں کافی خود اعتمادی تو پیدا ہو گئی تھی لیکن بہر حال، ابھی وہ اتنی بہادر نہیں ہوئی تھی کہ چودھری افتخار عالم شاہ سے جس کی ہیبت پورے خاندان پر طاری تھی، ایک عام سی بات بھی پورے اعتماد سے کر سکتی۔

”دوپہر کے کھانے پر مجھے ایک دوست نے بلایا ہے۔ میں کھانا اس کے ساتھ کھاؤں گا اس لیے میری فکر چھوڑ کر تم اپنے لیے جو چاہے پکوا لو۔“

”جی اچھا۔“ شاہدہ اس کا جواب سن کر واپس پلٹنے لگی۔

”گل سن شاہدہ۔“ چودھری نے اسے روکا۔

”جی ماموں جان!“ وہ رک کر مؤدبانہ انداز میں ہمہ تن گوش ہو گئی۔

”میں نے تجھے شاید پچھلی واری بھی بتایا تھا کہ ہر روز ”کیا کھائیں گے؟“ پوچھنے مت کھڑی ہو جایا کر۔ ملازمہ سے کہہ کر کچھ آٹھ کھانے بنوا لیا کر... وقت پر میرا جو دل کرے گا وہ کھا لوں گا۔ اگر تجھے میری پسند ناپسند یاد نہیں تو حویلی فون کر کے ادھر اپنی ساس سے پوچھ لے۔ وہ تجھے میرے پسند کے کھانوں کی لسٹ لکھوا دے گی۔“

”اصل میں ماموں جان! مراد شاہ کو ایک وقت میں دو سے زیادہ کھانے دیکھ کر غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کھانا آدمی زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے، کوئی کھانے کے لیے زندہ [illegible] کھانے [illegible] وہاں تک بھر دیا جائے۔ پھر یہاں حویلی والی گل بھی تو نہیں کہ ہر وقت کے کھانے پر ڈھیر سارے لوگ موجود ہوں۔ زیادہ کھانا بناؤ تو باسی ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ ملازمہ بھی صرف ایک ہے۔ اس سے اتنا سارا کام لوں گی تو نوکری چھوڑ کر چلی جائے گی۔ خیر، کام کا تو مسئلہ نہیں۔ آپ کی خاطر میں اپنے ہاتھ سے بھی کھانا تیار کر سکتی ہوں۔ بس آپ یہ وعدہ کریں کہ مجھے مراد شاہ کی ڈانٹ سے بچا لیں گے۔“ شاہدہ نے بڑے سبھاؤ سے پوری بات اس کے گوش گزار کر دی تھی لیکن سامنے چودھری جیسا بندہ تھا جسے اپنی بات کے آگے کسی کا ایک حرف بھی گوارا نہیں تھا۔

”مراد شاہ کا دماغ تو مجھے ٹھیک کرنا پڑے گا۔ دن بہ دن انقلابی بنتا جا رہا ہے۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ ہوتا کون ہے وہ یہ سب بتانے والا؟ میں اس کا باپ ہوں وہ میرا نہیں کہ میں اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلوں۔ بڑکوں سے ہماری کچھ روایتیں رہی ہیں۔ اس کل کے چھوکرے کے کہنے پر میں اپنی ان روایتوں کو چھوڑ کر ٹٹ پونجیوں اور منگتوں جیسی زندگی تو نہیں گزار سکتا۔ ہاں، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری حکمرانی صرف حویلی تک محدود ہے اور اس گھر کا وہ مالک و مختار ہے تو گل الگ ہے۔ فیر تو میرے یہاں رکنے کا بھی کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ میں آج اور ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اتنے بڑے شہر میں ہوٹلوں کی کمی ہے، نہ ہی میری جیب خالی کہ میں اپنے ہی پتر کے در پر بے عزت ہونے کے لیے پڑا رہوں۔“ نہایت غصے سے کہتا ہوا وہ اس الماری کی طرف بڑھا جہاں اس کا سفری بیگ اور بریف کیس وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

”سوری ماموں جان! پلیز کسی برا نہ مانو۔ میں تو صرف آپ کو مراد شاہ کے خیالات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ہوگا تو وہی جو آپ چاہیں گے۔“ چودھری کو الماری سے سامان نکالتا دیکھ کر شاہدہ سٹپٹا گئی اور معذرت کرتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تو جو بھی کہہ لے، اب میں یہاں رکنے والا نہیں۔ مراد شاہ کو بتا دینا کہ اس کے گھر سے نکل کر میں کوئی کھلے آسمان تلے نہیں آ جاؤں گا۔ میں اسے امریکا میں سیٹل کر سکتا ہوں تو کیا خود اپنے چند دن رہنے کا ٹھکانا نہیں کر سکتا۔“ شاہدہ کی منت سماجت کے باوجود وہ کسی صورت رکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شاہدہ نے تین سالہ علینہ کو اس کے سامنے لاکھڑا کیا کہ شاید اکلوتی پوتی کو دیکھ کر اس کا دل پسیج جائے لیکن وہ چودھری افتخار عالم شاہ تھا جس کی ضد اور خود سری کے سامنے کسی شے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے ایک بار فیصلہ کر لیا تھا کہ مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں نہیں رکنا تو اب دنیا کی کوئی طاقت اسے وہاں رکنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ شاہدہ کی معذرتوں اور علینہ کی معصوم پکار کو یکسر نظر انداز کرتا ہوا وہ وہاں سے باہر نکل گیا اور ایک کیب لے کر اس کے ڈرائیور کو شہر کے بہترین ہوٹل چلنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی اور اسے ایک بہترین ہوٹل تک پہنچا دیا۔ شان دار طرزِ تعمیر رکھنے والا وہ ہوٹل اپنی آؤٹ لک سے ہی بتا رہا تھا کہ وہاں قیام کرنا کسی معمولی حیثیت کے بندے کے بس کی بات نہیں۔ چودھری عام حیثیت کا مالک نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں قدم رکھتے ہوئے جھجکتا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس اس دولت سے بھرے ہوئے تھے جو اس نے اور اس کے آبا و اجداد نے دوسروں کا خون چوس چوس کر بھرے تھے۔ اس دولت کو وہ ہوٹل بازی میں لٹاتا، نائٹ کلبس میں یا پیشہ ور عورتوں پر... دکھ تو کسی صورت نہیں ہوتا تھا۔ پیسے کا بے جا زیاں تو اس محنت کش کو گراں گزرتا ہے جس نے ایک ایک پیسے کے حصول کے لیے اپنے خون کو پسینا بنایا ہو اور رزقِ حلال کے حصول کے لیے کی جانے والی محنت نے اس کی ہڈیاں تک گلا دی ہوں۔ چودھری جیسے لٹیرے اور غاصب کو اس دولت کو لٹانے میں کیا عار تھی۔ اس نے ہوٹل کے ہوش ربا کرائے کی پروا نہ

www.pkdigest.com

کرتے ہوئے اس میں اپنے لیے ایک سوئٹ بک کروایا اور ویٹر کی راہنمائی میں اس شان دار سوئٹ میں جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوا بارہ ہو چکے ہیں۔ ڈیوڈ نے اسے ایک بجے ٹائمز اسکوائر بلایا تھا۔ یعنی اپنی تیاری اور وہاں تک کا سفر طے کرنے کے لیے اس کے پاس محض پون گھنٹا تھا۔ اس پون گھنٹے کو اس نے ذرا بھی ضائع نہیں کیا۔ نتیجتاً ایک بجنے میں ابھی دو تین منٹ باقی تھے کہ وہ ٹائمز اسکوائر پہنچ چکا تھا۔ نیویارک کے اس پُررونق علاقے میں وہ پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا اور اس کے تاریخی پس منظر سے واقف تھا۔ آج کا معروف ترین ٹائمز اسکوائر انیسویں صدی تک ''لونگ ایکڑ'' کہلاتا تھا۔ 1904ء میں جب مشہور زمانہ اخبار ''نیویارک ٹائمز'' کی عمارت اس علاقے میں کھڑی کی گئی تو اس بلند عمارت کی مناسبت سے اس جگہ کو ''ٹائمز اسکوائر'' پکارا جانے لگا۔ ماضی میں یہ جگہ کچھ اچھی تصور نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں غنڈوں کا راج تھا۔ بعد میں جولیانو نام کے ایک میئر نے اس علاقے کی اصلاح کی اور یہاں سے غنڈا عناصر کو باہر نکالا۔ اب یہ جگہ کافی پُرامن تھی جہاں لوگ آنا اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا پسند کرتے تھے۔ ماضی کے ٹائمز اسکوائر کے مقابلے میں اب یہاں شوقیہ فنکاروں، کاروباری افراد، ضرورت مندوں اور سیاحوں وغیرہ کا راج تھا۔ چودھری کئی بار کے دیکھے منظر پر سرسری سی نظر ڈال کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر اس کی نظریں پُرشکوہ بگھیوں کو دو ڈاتی کو جوان لڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ایسی لڑکی پر جا ٹھہریں جو شکلاً تو بے شک اپنی دوسری ساتھیوں سے بڑھ کر خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کا جسم غضب کا پُرکشش تھا۔ وہ یقینی طور پر اپنی اس جسمانی کشش سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس نے خود کو ایکسپوز کرنے کا خصوصی اہتمام کر رکھا تھا۔ چودھری کو یقین تھا کہ بگھی میں بیٹھنے کے شوقین افراد میں سے بیشتر افراد کا انتخاب اسی لڑکی کی بگھی ہوتی ہوگی۔ خود اس کا دل لڑکی کی بگھی میں بیٹھ کر سیر کرنے کو مچل گیا۔ سیر کے بہانے وہ اس کے حسنِ بے حجاب کا اور بھی زیادہ قریب سے نظارہ کر سکتا تھا۔ ابھی وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے قدم اٹھانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کسی کے شانے پر ہاتھ رکھنے پر چونک کر پلٹا۔ وہ ڈیوڈ تھا جو اس کے بالکل قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''ہیلو چودھری صاحب! یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ وقت کے کافی پابند ہیں۔'' چودھری کو اپنی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر وہ شستہ اردو میں بولا۔ چودھری اس کی اردو دانی کو جہاز کے سفر کے دوران بھی ملاحظہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی اسے اس خالص امریکی نقش و نگار اور لباس کے مالک شخص کی زبان سے یہ جملے سننا عجیب لگا۔

''کیا خیال ہے؟ پھر چلتے ہیں۔ لنچ بالکل ریڈی ہے اس لیے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔'' بہ ظاہر اس کی رائے پوچھتا ہوا وہ دراصل اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' چودھری خود اصل بات جاننے کے لیے بے چین تھا چنانچہ اس کی تائید کی اور کوچوان لڑکی پر ایک نظر ڈالتا ہوا ڈیوڈ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی ڈیوڈ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

''افسوس مت کریں چودھری صاحب! میرے اپارٹمنٹ پر اس کوچوان لڑکی سے بھی زیادہ حسین لڑکی آپ کی میزبانی کے لیے موجود ہوگی۔'' گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے ڈیوڈ نے بہ ظاہر سرسری لہجے میں یہ بات کہی لیکن اس کے اس جملے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خاصی تیز نظر رکھتا ہے اور چودھری کا زاویۂ نظر بھانپ چکا ہے۔ چودھری نے اس کی بات کے جواب میں خاموشی مناسب سمجھی اور کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ ڈیوڈ کا اپارٹمنٹ ٹائمز اسکوائر کے پہلو میں موجود براڈوے کے علاقے میں تھا۔ چودھری اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں موجود اشیا خود اپنے منہ سے اپنی قیمت کا اعلان کر رہی تھیں۔ پھر ان کی نہایت نپی تلی ترتیب سے بھی واضح تھا کہ کسی ماہر انٹیریئر ڈیکوریٹر کی زیرِ ہدایت یہ کام کیا گیا ہے۔ لاؤنج میں رکھے صوفوں سے لے کر دیواروں پر موجود پینٹنگز تک کسی شے کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس جگہ مس فٹ ہے۔ ہر شے اپنی جگہ اتنی موزوں لگ رہی تھی کہ دیکھنے والے کے لیے کہیں کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر ان سب اشیا سے بڑھ کر وہ حسینہ تھی جس نے ڈور بیل کے جواب میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ سریلی آواز والی وہ حسینہ جس کے بالوں اور جلد کی رنگت میں سنہری پن اتنا نمایاں تھا کہ اس پر سونے سے بنی ہوئی کسی مورتی کا گمان ہوتا تھا، بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے اپارٹمنٹ میں موجود دیگر اشیا کی طرح اسے بھی بالخصوص آرڈر پر تیار کروا کے یہاں سجا دیا گیا ہو۔ چودھری کی نظر اس حسینہ پر پڑی تو پھر اس کے سارے جسم پر پھسلتی ہی چلی گئی۔ ایک طرف اس کے عریاں بازو دعوتِ نظارہ دیتے تھے تو دوسری طرف جسمانی نشیب و فراز آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ عریاں کمر کے خم میں دیکھنے والے کو گرفتار کر لینے کی صلاحیت تھی تو لمبی سڈول ٹانگیں قدموں سے لپٹ جانے پر مجبور کرتی تھیں۔

''یہ میری دوست لنڈا ہے۔ اسے میں نے خاص طور پر آپ کی میزبانی کے لیے یہاں بلوایا ہے۔'' ڈیوڈ نے اس نازنین حسینہ سے اس کا تعارف کروایا تو اس نے جواباً مسکراتے ہوئے چودھری سے مصافحہ کیا۔ یہ ایک نہایت پُرجوش مصافحہ تھا جس کے دوران لنڈا نے چودھری کے ہاتھ کو مخصوص انداز میں دبا کر یوں آہستگی سے آزاد کیا کہ وہ اس دباؤ کی سنسناہٹ اپنے پورے جسم میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میرے خیال میں پہلے لنچ کر لیتے ہیں پھر بعد میں اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کریں گے۔'' چودھری کے سرخ پڑتے ہوئے چہرے کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے خیال ظاہر کیا۔ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی لنڈا کی موجودگی کے باعث ان کے درمیان گفتگو کے لیے انگلش کا استعمال ہونے لگا تھا۔ چودھری اگرچہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں گفتگو کو زیادہ پسند کرتا تھا لیکن انگریزی سے نابلد نہیں تھا۔ جس طرح اس نے اپنے بیٹے کے لیے بہترین تعلیم کا بندوبست کیا تھا، اسی طرح اس کے باپ نے بھی اس کی شخصیت کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کے باپ کے دور میں بھاری رقم خرچ کر کے بھی تعلیم اور تربیت کا معیار ویسا نہیں تھا۔ وہ دوسروں پر حکمرانی کرنے والے لوگ تھے چنانچہ ان کی تربیت کتابوں میں درج اخلاقیات کے اصولوں پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چودھری اور اس سے قبل اس کے آبا و اجداد کی تربیت حکمرانی کرنے والوں کے اپنے طے کردہ اصولوں پر ہوتی رہی تھی۔ جانے کیسے چودھری کی مراد شاہ پر گرفت ذرا کمزور پڑ گئی اور وہ اپنے خاندان کے مردوں سے مختلف نکل آیا۔ شاید یہ کئی سال اپنے ماحول سے دور ایک آزاد معاشرے میں رہنے کا اثر تھا۔ اس آزاد ماحول میں رہ کر اسے جو کچھ مناسب محسوس ہوا، اسے اپناتا گیا اور اب نتیجتاً وہ اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھا۔

''ڈیوڈ سچ کہہ رہا ہے چودھری صاحب! لنچ تیار ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے، اگر ٹھنڈا ہو گیا تو لطف نہیں دے گا۔'' لنڈا نے ڈیوڈ کی تائید کرتے ہوئے چودھری کا بازو تھاما اور اس حصے کی طرف بڑھ گئی جسے ایک مخملیں سے پردے کے ذریعے لاؤنج سے الگ کر کے وہاں آٹھ کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل رکھی گئی تھی۔ لاؤنج میں رکھے سامان کی طرح یہ ڈائننگ ٹیبل اور اس پر سجی کراکری بھی بے حد شان دار تھی۔ چودھری کے لیے اس شان و شوکت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں تھا کہ خود اس کی دسترس میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی لیکن اس کا ذہن یہ حساب کتاب ضرور لگا رہا تھا کہ ایک انجینئر کی کتنی آمدنی ہو سکتی ہے جو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اتنی بیش قیمت اشیا جمع کر سکے۔ لنڈا کی خوب صورت میزبانی میں لنچ سے لطف اندوز ہوا گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر انگریزی کھانوں کے علاوہ چند ایک مشرقی کھانے بھی موجود تھے۔ لنڈا خود بڑھ چڑھ کر ہر شے چودھری کو پیش کر رہی تھی۔ پہلو میں بیٹھ کر مسلسل آنچ دیتے شباب اور سامنے رنگین شراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ کتنا کھا گیا، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا ساتھ دینے والے لنڈا اور ڈیوڈ البتہ بہت محتاط انداز میں کھا پی رہے تھے۔ چودھری کو ناک تک ٹھنسا دینے کے بعد جب وہاں خدمت کے لیے مامور ادھیڑ عمر میڈ ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہی تھی تو ڈیوڈ کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے چودھری اور لنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے ایکسکیوز کہا اور کال ریسیو کر لی۔ موبائل پر کی جانے والی اس کی یک طرفہ گفتگو سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کہیں آنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ پھر یوں لگا کہ جیسے اس نے بالآخر مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہوں۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' اس کے موبائل آف کرتے ہی لنڈا نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، اصل میں باس کی کال تھی۔ اس نے کسی پراجیکٹ پر ڈسکشن کے لیے میٹنگ رکھ لی ہے اور اس میٹنگ میں میری شرکت کو ضروری قرار دے رہا ہے.... لیکن مجھے چودھری صاحب کو چھوڑ کر کہیں جانا اچھا نہیں لگ رہا۔''

''یہ کوئی اتنا بڑا پرابلم تو نہیں ہے۔ تم جاؤ اپنی میٹنگ اٹینڈ کرو، اتنی دیر میں چودھری صاحب کو کمپنی دیتی ہوں۔'' لنڈا نے گویا چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کیا اور چودھری کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے چودھری صاحب؟ آپ تو سنا ہے نیویارک آئے ہی گھومنے پھرنے اور تفریح کے ارادے سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیوڈ کے آنے تک آپ اگر کچھ وقت میری کمپنی میں گزار لیں تو ہرگز بھی بور نہیں ہوں گے۔'' یہ بات کہتے ہوئے لنڈا کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایسی بلا کی مسکراہٹ تھی کہ چودھری جیسا پاپی تو دور کی بات، کوئی زاہدِ خشک بھی ہوتا تو ایک لمحے کے لیے ضرور ڈگمگا جاتا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں مسٹر ڈیوڈ! میں آج پورا دن فارغ ہی ہوں۔ آپ جا کر اپنی میٹنگ اٹینڈ کریں، میں اتنی

www.pkdigest.com

ویر مس لنڈا کی کمپنی کو انجوائے کرتا ہوں۔'' نہایت لہک کر شراب و شباب کے نشے میں غرق یہ جواب دیتے ہوئے چودھری کو یاد بھی نہیں تھا کہ ڈیوڈ سے آج کی یہ ملاقات کسی خاص مقصد کے تحت کی جارہی ہے اور یہاں آنے سے قبل وہ اس مقصد کو جاننے کے لیے بے حد بے چین تھا۔

''تھینک یو چودھری صاحب! آپ نے میری مشکل آسان کردی۔'' ڈیوڈ خوش دلی اور ممنونیت سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ڈیوڈ کے رخصت ہوتے ہی لنڈا چودھری کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آئیں چودھری صاحب! تھوڑی دیر آرام کرلیں۔'' اس نے چودھری کو صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کی بغل میں بازو ڈال کر سہارا بھی دیا۔ لنڈا کے حسین بازوؤں کے سہارے چودھری جھومتا ہوا اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔ لنڈا کے آنچ دیتے جسم سے چپکا وہ بیڈ روم کی طرز پر سجے کمرے میں داخل ہوا تو خود پر قابو رکھنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ اس نے یک دم ہی خود کو سہارا دے کر بیڈ پر لٹاتی لنڈا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے جواباً کوئی تعرض نہیں کیا اور خود سپردگی کے عالم میں چودھری کی من مانیوں کا سواگت کرنے لگی۔ شراب کے نشے میں شباب کی آمادگی نے بات بہت آگے تک پہنچادی۔ ہوس و نفسانی لذت میں ڈوبے لمحات کتنی تیزی سے گزرتے رہے، چودھری کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے زندگی میں بے شمار عورتوں کی قربت سے لطف اٹھایا تھا۔ ان عورتوں میں اس کی بیویوں سے لے کر...... بے باک طوائفیں اور وہ مظلوم لڑکیاں جنہیں وہ طاقت و اختیار کے زور پر اپنے بستر تک آنے پر مجبور کردیتا تھا، سب ہی شامل تھیں... لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی لنڈا جیسی نہیں تھی... بے پناہ جنسی کشش کی حامل لنڈا کسی منہ زور ندی کی طرح تھی جس میں اترنے کے بعد چودھری تیرنے کی کوشش میں ہانپ سا گیا لیکن اسے اعتراف تھا کہ اس منہ زور ندی کی قربت میں جو لطف ہے، وہ اسے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی کہیں بھی نہیں ملا... اسی لیے وہ ہانپنے اور تھکنے کے باوجود اس ندی سے باہر آنے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔

''دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ ڈیوڈ آنے والا ہوگا۔'' آخرکار لنڈا نے خود ہی احساس دلایا تو چودھری طوعاً و کرہاً اس سے الگ ہوا۔ وہ دونوں بیڈ روم سے نکل کر باہر لاؤنج میں آکر بیٹھے تو چند منٹ بعد ہی ڈیوڈ وہاں پہنچ گیا۔

''سوری چودھری صاحب! مسئلہ ہی ایسا سامنے آگیا تھا کہ مجھے جانا پڑا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا میزبان ہے جو دعوت پر بلا کر خود غائب ہوگیا۔'' چودھری کے مقابل ایک سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے ڈیوڈ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں مسٹر ڈیوڈ! آپ اپنے بدلے میں مجھے اتنی شان دار میزبان کی نگرانی میں چھوڑ کر گئے تھے کہ کسی قسم کی بوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' چودھری نے اپنے پہلو میں بیٹھی لنڈا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ڈیوڈ کو جواب دیا۔ اگر وہ جواب نہ بھی دیتا تو اس کی ساری کیفیت اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ بھاری بھرکم چہرے کی سرخی اور آنکھوں کا خمار ان لمحات کی کہانی سنا رہے تھے جو اس نے لنڈا کے ساتھ گزارے تھے۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میرے نہ ہونے سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ورنہ میں تو سارا وقت اسی الجھن میں رہا کہ کہیں آپ بور نہ ہو رہے ہوں۔''

''میرے ہوتے ہوئے کسی کو بوریت ہو، یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا ڈیوڈ؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر لنڈا نے بڑی ادا سے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو ڈیئر! تمہارا ساتھ تو بندے کو پرانی شراب [illegible] طرح مدہوش کر [illegible] ہے کہ اس مدہوشی کو کم کرنے کے لیے تم [illegible] گرم گرم [illegible] کافی پلوا دو تا کہ میں چودھری صاحب سے ذرا کام کی باتیں بھی کرسکوں۔'' بظاہر خوش گواری سے کہتے ہوئے ڈیوڈ کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔ اس معنی خیزی کو محسوس کرکے چودھری سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ مرحلہ آگیا تھا جب اس پر اس ملاقات کا مقصد واضح ہو جاتا۔

''وہیں سے بات شروع کرتے ہیں چودھری صاحب جہاں تک پلین میں ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ماہ بانو نام کی اس لڑکی میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی کہاں ہے، یہ صرف میں جانتا ہوں اور میں ہی اسے آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔ آپ لڑکی کے حصول کے لیے اسی شہریار کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اس بات کا بھی مجھے اچھی طرح علم ہے۔ اس چکر میں آپ ایک بار اسے ہی کو دھوکا دے کر اس کی قابل اعتراض حالت میں تصویریں بھی اتار چکے ہیں، اس کا بھی مجھے علم ہے اور اب بھی یقیناً آپ کوئی نئی ترکیب لڑانے کا سوچ رہے ہوں گے، یہ بھی میں جانتا ہوں... لیکن ماہ بانو اب کہاں ہے، یہ شہریار کو بھی معلوم نہیں۔

اس کا پتا دینے والا ساری دنیا میں آپ کو میرے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں ملے گا لیکن ظاہر ہے اتنی قیمتی معلومات میں آپ کو ایسے ہی تو فراہم نہیں کردوں گا۔ اس کے لیے آپ کو GIVE AND TAKE کے اصول کے مطابق میرے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔'' لنڈا کے لاؤنج سے نکلتے ہی ڈیوڈ نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کردیا۔

''تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟'' چودھری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کام بھی بتاؤں گا لیکن پہلے اتنا جان لیں کہ میری بات مان لینے کی صورت میں آپ کو صرف ماہ بانو ہی نہیں ملے گی بلکہ میں آپ کو باقاعدہ معاوضہ بھی ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ لنڈا اور دوسری من پسند لڑکیوں کی قربت بونس سمجھ کر انجوائے کیجیے گا آپ۔'' وہ چودھری کی لالچی فطرت کو للچانے کی ہر ممکن ترکیب لڑا رہا تھا۔

''کام بتاؤ۔ کام معلوم ہوگا تب ہی میں کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔'' چودھری نے بھی کوئی بچی گولیاں نہیں کھیل رکھی تھیں جو اتنی آسانی سے ڈیوڈ کو خود پر حاوی ہونے دیتا۔ لنڈا کی ہوش رُبا قربت میں دو گھنٹے گزار لینے کے بعد بھی بہرحال وہ اتنا تو ہوش میں تھا کہ کام کی نوعیت جانے بغیر ڈیوڈ کی کسی پیشکش سے متاثر نہ ہوپاتا [illegible] سے متاثر ہونے کا تاثر نہ دے۔

[illegible] کے ساتھ یہ جنگل [illegible] آپ کی آمدنی میں کتنا اضافہ کرتا ہے، یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نئے اے سی شہریار کی پوسٹنگ کے بعد آپ اس سلسلے میں بڑے پریشان ہیں۔ وہ نہ لکڑی اسمگل کرنے دیتا ہے اور نہ ہی جانوروں کی کھالیں۔ اس کی طرف سے ہونے والی سختی کی وجہ سے آپ کا اچھا خاصا بزنس تباہ ہوگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا یہ نقصان پورا ہو جائے۔''

''تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی اور منصوبہ ہے کیا؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں ہے لیکن لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے بجائے نئے بزنس کا منصوبہ ہے۔''

''نیا بزنس... وہ کیا؟'' چودھری حیران ہوا۔

''اس کی تفصیلات میں ابھی بتاتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا اور کافی کے مگ لے کر آنے والی لنڈا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لنڈا نے اسے اور چودھری کو کافی پکڑائی اور خود ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''زبردست! تم نے بالکل اپنی طرح شان دار کافی بنائی ہے۔'' ڈیوڈ نے گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر لنڈا کو سراہا اور پھر چودھری کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہاں تو میں آپ کو بزنس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ پیر آباد آپ کے ضلع کا سب سے بڑا گاؤں ہے اور آپ کا ہی پورے علاقے میں سب سے زیادہ ہولڈ بھی ہے اس لیے ہم آپ سے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہمیں دیگر زمینداروں میں سے کسی سے رابطہ کرنا ہوگا اور یہ بات یقیناً آپ کو اچھی نہیں لگے گی۔'' اتنی بات کہہ کر اس نے لمحے بھر کا توقف کیا اور چودھری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بات مزید آگے بڑھائی۔

''آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کے علاقے میں جو جنگل ہے وہ حیرت انگیز ماحول رکھتا ہے۔ آپ کی گورنمنٹ نے توجہ نہیں دی ورنہ اس جنگل میں دنیا کے نایاب ترین پودوں اور جانوروں کی نشوونما ہوسکتی تھی۔ بہرحال میں نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جنگل کا حیرت انگیز ماحول اور موسم پوست کی کاشت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم مستقبل میں بہت بڑے پیمانے پر اس سلسلے میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن فی الحال تو اس سے پہلے کاشت کا مرحلہ ہے اور اس سلسلے میں ہمیں جو مین پاور چاہیے وہ آپ ہمیں پرووائڈ کریں گے۔ آپ کے پاس ایسے محنتی اور قابل اعتماد بندوں کی کمی نہیں ہوگی جو یہ کام کریں بھی اور معاملے کو راز میں بھی رکھیں۔'' ڈیوڈ نے آخرکار تھیلے سے بلی نکال ہی دی۔

''لیکن فاریسٹ آفیسر کو ساتھ ملائے بغیر یہ کام کیسے ہوگا؟ میں نے سنا ہے کہ نیا فاریسٹ آفیسر عابد انصاری بہت اچھی شہرت رکھتا ہے اور ابھی کسی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سامنے نہیں آیا۔'' چودھری نے ڈیوڈ کی توجہ اہم نکتے کی طرف مبذول کروائی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم کرلیں گے۔ عابد انصاری کتنی ہی اچھی شہرت رکھتا ہو، ہے تو آخرکار انسان ہی... اور انسانوں کو ان کے اصولوں سمیت خریدنے کا پرانا تجربہ ہے ہمیں۔'' ڈیوڈ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے کیا مسئلہ ہوسکتا ہے؟ اصل میں تو عابد انصاری آپ کا اپنا مسئلہ ہے، میں تو اپنے بارے میں بات کروں گا۔ آپ جو کام مجھ سے لینا چاہتے ہیں وہ بہت رسکی ہے۔ بندے بے شک میں آپ کو فراہم کرسکتا ہوں لیکن کام کی نوعیت ایسی ہے کہ بہت چھان پھٹک کر بندوں کا انتخاب کرنا پڑے گا اور یہ تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ایسے منتخب

بندوں کا ریٹ بھی اونچا ہوتا ہے۔ میرے بندے میرے وفادار ہیں تو صرف اس لیے کہ میں انہیں ان کی وفاداری کی مناسب قیمت ادا کرتا ہوں۔ آپ جو کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے میں جو بندہ لگاؤں گا، ان کی قیمت اچھی خاصی ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ مجھے مناسب ادائیگی کریں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ کام پارٹنر شپ کی بنیاد پر ہو۔ لکڑی اور کھالوں والے بزنس میں بھی ہم اسی بنیاد پر کام کرتے تھے۔ اس بزنس کے لیے بھی میری یہی شرط ہو گی۔'' چودھری نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے تعاون سے کاشت کی جانے والی پوست آنے والے وقت میں کتنوں کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنے گی۔ وہ بے ضمیر انسان انسانیت کا ہر فریضہ واحساس بھول کر مال و دولت کے حساب کتاب میں الجھ گیا تھا۔

''پارٹنر شپ کی ضد نہ کریں چودھری صاحب! آپ نے ضد کی تو ہم آپ کے کسی حریف سے بھی معاملات طے کر سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اس کا مطالبہ سن کر دھمکی دی۔

''میرا کوئی حریف اتنا طاقتور نہیں کہ میرے مقابلے پر آکر کسی کام میں ہاتھ ڈال سکے... بلکہ سچ پوچھیں تو آپ اس علاقے میں میرا کوئی حریف ڈھونڈ ہی نہیں سکیں گے۔ ہیرآباد کو چھوڑ کر جتنے بھی گاؤں ہیں، ان میں سے کسی کا بھی زمیندار میری ٹکر کا نہیں ہے اس لیے اگر کسی کے دل میں دشمنی ہو بھی تو زبان سے اظہار کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' معاملے کی نوعیت سامنے آنے کے بعد چودھری مکمل طور پر فارم میں آ گیا تھا اور بہت عیاری سے ڈیوڈ سے معاملات طے کر رہا تھا۔

''او کے! اگر آپ کی یہی شرط ہے تو ہم پرسنٹیج پر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ آپ اس بزنس میں تھری پرسنٹ کے حصے دار ہوں گے۔ اب تو آپ خوش ہیں نا؟'' ڈیوڈ بھی چودھری کے بیان کردہ حقائق اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

''تھری پرسنٹ بہت کم ہے۔ تھرٹی فائیو پرسنٹ سے ایک پوائنٹ نیچے بھی معاملہ طے نہیں ہوگا۔'' ڈیوڈ کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے چودھری نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''تھرٹی فائیو پرسنٹ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ ہم جو بزنس کرنے جارہے ہیں، اس میں قدم قدم پر کتنی دشواریاں سامنے آتی ہیں اور کتنے لوگوں کو ساتھ ملانا پڑتا ہے۔ اگر میں اپنے ایک پارٹنر کو ہی تھرٹی فائیو پرسنٹ دے دوں گا تو باقی لوگوں کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟'' ڈیوڈ نے اعتراض کیا۔

''یہ سب میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ سب سے زیادہ خطرہ میرے لیے ہوگا۔ میرے بندے کام کریں گے تو کسی اونچ نیچ کی صورت میں، میں ہی پکڑا جاؤں گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطالبہ بالکل درست ہے۔'' چودھری بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈیمانڈ پر اڑا رہا۔

''اس طرح رویے میں لچک لائے بغیر تو بات نہیں بنے گی چودھری صاحب! میری نرم گفتاری کو شاید آپ میری کوئی مجبوری سمجھ رہے ہیں لیکن یاد رکھیے کہ ہم جیسے کام کرنے والے لوگ کسی کے سامنے مجبور نہیں ہوتے۔ اگر کوئی ہم سے تعاون کرے تو ٹھیک ورنہ اپنی راہ کی رکاوٹیں ہٹانا ہمیں اچھی طرح آتا ہے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری بھڑک اٹھا۔

''یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ردعمل میں چودھری اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آرام سے ڈارلنگ! یہ تم چودھری صاحب جیسے شخص سے کس انداز میں بات کر رہے ہو؟'' اب تک خاموش کردار کی طرح کمرے کے منظر میں موجود لنڈا فوراً ہی حرکت میں آئی اور ڈیوڈ کو ٹوکا۔ جواباً ڈیوڈ بُری بُری شکلیں بنانے لگا۔

''ڈیوڈ کی بات کا بُرا مت مانیں چودھری صاحب! [illegible] اصل میں اپنی جگہ یہ بھی بالکل صحیح ہے لیکن آپ چونکہ پہلی بار اس بزنس میں ہاتھ ڈالنے جارہے ہیں، اس لیے آپ کو صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہے۔ آپ کو تھرٹی فائیو پرسنٹ دے کر واقعی ڈیوڈ کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں ڈیوڈ سے آپ کے لیے ٹوئنٹی فائیو پرسنٹ شیئرز کی سفارش کر سکتی ہوں۔ یقین کریں، ٹوئنٹی فائیو پرسنٹ لے کر بھی آپ بہت فائدے میں رہیں گے۔'' چودھری کا بازو پکڑ کر اسے واپس صوفے پر بٹھاتے ہوئے لنڈا نے کچھ ایسی ادا سے یہ بات کی کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب لنڈا اس کے پہلو سے بالکل جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم نے تو مجھے پھنسا دیا لنڈا! ٹوئنٹی فائیو پرسنٹ شیئرز بھی بہت زیادہ ہے۔'' ڈیوڈ نے احتجاج کیا۔

''کتنا ہی زیادہ ہو، اب تو میں چودھری صاحب سے وعدہ کر چکی ہوں۔ تمہیں میرا یہ وعدہ ہر صورت پورا کرنا ہو گا۔'' لنڈا نے محبوبانہ ناز کے ساتھ حکم صادر کیا۔

''تمہاری سفارش ہے تو میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔''

ڈیوڈ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

''اب تو آپ خوش ہیں نا چودھری صاحب؟'' لنڈا نے فاخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے چودھری سے پوچھا۔

''تم ساتھ ہو تو خوش نہ ہونے کا کیا سوال بنتا ہے! تم نے جو کہہ دیا ہم نے مان لیا۔'' لنڈا کے آنچ دیتے ہوئے بدن کی حدت اپنے اندر اتارتے ہوئے چودھری نے جواب دیا۔ جواباً لنڈا نے سامنے بیٹھے ہوئے ڈیوڈ کی پروا کیے بغیر اس کے رخسار کو چوم لیا۔ چودھری کے نزدیک یہ اس کی فتح تھی کہ ڈیوڈ کی گرل فرینڈ اس کے سامنے اس کے بجائے چودھری کے ناز اٹھا رہی تھی۔ حسن کی شاطرانہ چالوں کے آگے ہار جانے والا چودھری بھلا کیسے جان سکتا تھا کہ فتح تو انہی کے ہاتھ آئی ہے جنہوں نے اس کھیل کا آغاز کیا تھا۔

☆☆☆

''بات سنو! ذرا دو منٹ یہاں رک جاؤ۔'' کھانے کے برتن لے کر آنے والا اس کے سامنے کھانا رکھ کر پلٹ رہا تھا، تب ماہ بانو نے اسے پکارا۔ یہ تقریباً بیس اکیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان تھا جس کی سبز آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھتے ہی دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ اس نوجوان نے اپنی زندگی میں کوئی بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ [illegible] نقصان جس کے بعد اس کے لیے زندگی بے معنی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ماہ بانو نے آج دوسری بار اس نوجوان کو دیکھا تھا اور جانے کیوں اس کے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ وہ وہاں موجود دیگر لوگوں کے مقابلے میں قدرے مختلف ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت و بربریت کے وہ آثار نظر نہیں آتے تھے جو دوسروں کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ شاید یہ اس کی شکل و صورت کا بھی کمال تھا کہ دیکھنے والے کو خود بہ خود ہی اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم سا گوشا پیدا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ ماہ بانو کو بھی وہ اچھا لگا تھا اور ایک بے نام سی امید کے سہارے وہ اسے پکار بیٹھی تھی۔ اس کی پکار کے جواب میں وہ نوجوان رکا ضرور لیکن بغیر کچھ کہے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ماہ بانو نے اس سے دریافت کیا۔ ردعمل میں وہ جواب دینے کے بجائے یوں منہ پھیر گیا جیسے اسے جتانا چاہتا ہو کہ اگر کوئی کام کی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ میں چلتا ہوں۔

''دیکھو، میں جانتی ہوں کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور اس کا جواب بھی دے سکتے ہو۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں تو اس لیے کہ مجھے تم اپنے دوسرے ساتھیوں سے مختلف لگتے ہو۔ وہ سب وحشی اور جنگلی ہیں لیکن تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کسی اچھے خاندان کے پڑھے لکھے لڑکے ہو۔ تمہیں میرا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ میری طرح تمہاری بھی تو کوئی بہن ہو گی۔ ذرا سوچو اگر اسے اس طرح کسی جگہ قید کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی؟ ساری دنیا سے کٹ کر اس ویرانے میں وحشی مردوں کے درمیان رہنا کتنا خوفناک ہے، تم مجھے ایک بہن کی نظر سے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا۔'' اسے وہاں سے ہٹنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر ماہ بانو نے پُردرد لہجے میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔

''تم یہاں کیوں قید ہو، مجھے نہیں معلوم لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں ہم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی۔ ہم تمہارے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ رہی مردوں کے درمیان تمہارے رہنے کی بات تو اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ یہاں کوئی تمہیں میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔'' یہ پہلی بار تھا کہ اس برف زار کی قید کے دوران کسی نے ماہ بانو سے براہ راست بات کی تھی ورنہ تو وہ لوگ اس کے سامنے گونگے بن کر رہتے تھے۔

''یہ تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے یہاں کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا... لیکن سچ یہ ہے کہ میں یہاں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہی۔ پچھلی رات میں نے یہاں کسی کی آنکھوں میں ہوس دیکھی ہے اور اس کو دیکھنے کے بعد مجھے ایک پل کے لیے بھی سکون کی نیند نہیں آسکی۔ تم جو کوئی بھی ہو اور تمہارا جو بھی نام ہے، میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اپنے کسی بڑے تک میرا پیغام پہنچا دو۔ ان سے کہو کہ مجھے میرا جرم بتایا جائے۔ میں اس طرح کب تک اس قید خانے میں بند رہوں گی؟ اگر میں کسی کی مجرم ہوں تو وہ سامنے آکر مجھے میرے جرم کی سزا سنائے لیکن اس ذہنی اذیت سے تو کسی طرح نجات ملے۔'' نوجوان کا جواب سن کر ماہ بانو غصے میں بولتی چلی گئی۔ جذبات کی شدت کے باعث بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی چھلک پڑے تھے۔ حقیقت تھی کہ کل جس طرح وہ شخص ہوس ناک انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اس صورت حال سے بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ ایک تو بے جرم کی زبردستی مسلط کردہ قید تنہائی اور اس پر سے عزت جانے کا خوف۔ اس کے اعصاب جواب نہ دے جاتے تو اور کیا ہوتا؟

''پچھلی رات کون تمہیں کھانا پہنچانے آیا تھا؟'' اس کی بات سن کر نوجوان چونکا۔

''کوئی گل شیر نام کا آدمی تھا۔'' ماہ بانو نے رخساروں پر پھیلے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آئندہ نظر رکھوں گا کہ کوئی تمہاری طرف غلط ارادے سے نہ بڑھ سکے۔ باقی رہی کسی بڑے کو تمہارا پیغام پہنچانے کی بات تو میں کمانڈر سے کہہ دوں گا۔ وہ اوپر والوں سے بات کرلے گا۔" وہ بے حد روکھے لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی ظاہر تھا کہ کچھ نہ کچھ اس کی باتوں کا اثر لیا ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح وہ بھی حسبِ معمول گونگا بہرہ بنا رہتا اور اسے کوئی رسپانس نہ دیتا۔

"بہت بہت شکریہ بھائی! میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گی۔" ماہ بانو نے جھٹ اس کا شکریہ ادا کیا جس کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماہ بانو بھی اس پر سے توجہ ہٹا کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ چنے کی دال کے ساتھ گندم کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کردیا۔ یہاں آنے کے بعد کھانے سے منہ موڑنے کی حماقت اس نے ایک بار بھی نہیں کی تھی۔ شروع سے یہ بات اس کے ذہن میں تھی کہ اس قید کے دوران اگر کوئی ایسا مرحلہ آئے جب جسمانی طاقت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہو تو وہ ناتواں ثابت نہ ہو... اور توانائی کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ غذا باقاعدگی سے لیتی رہے۔ اس وقت بھی طبیعت پر بہت بوجھ ہونے کے باوجود اس نے کھانے سے منہ نہیں موڑا اور پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔ کھانے کے بعد وہ برتن ایک طرف سرکا کر خود دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس قید خانے کے میزبانوں میں سے کوئی خود ہی آکر برتن واپس لے جاتا۔ اس کے پاس تو یہاں کھانے، سونے اور لایعنی سوچوں میں گھرے رہنے کے سوا کوئی چوتھا کام نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی سوچوں میں گھری بیٹھی تھی کہ یک دم ...نظر دروازے پر گئی۔ اسے کھانا پہنچانے والا نوجوان دروازے کو مقفل کرنا بھول گیا تھا۔ اس کے دل میں جانے کیا خیال آیا کہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دبے قدموں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ قید خانے کے آگے موجود تنگ راہداری کو اس نے بے حد احتیاط سے دبے قدموں طے کیا۔ یہاں لائے جانے کے وقت اس نے راستہ دیکھا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کئی شاخوں میں منقسم اس غار کا دہانہ بائیں جانب موجود ہے۔ دہانے تک پہنچنے کے لیے البتہ اسے اس مقام سے گزرنا پڑتا جہاں اس نے کئی لوگوں کو دیکھا تھا اور جہاں دیواروں پر دنیا بھر کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ راہداری عبور کرکے بائیں جانب مڑ گئی۔ احتیاط کے پیشِ نظر وہ بلی کی طرح پنجوں کے بل چل رہی تھی تاکہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ پر چونک نہ پڑے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہی اسے مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کے اندر مایوسی کی گہری لہر دوڑ گئی۔ ان آوازوں کا مطلب تھا کہ آگے راستہ صاف نہیں ہے اور وہ لوگ اس مقام پر موجود ہیں جہاں سے گزر کر اسے دہانے تک پہنچنا تھا۔ غار کا وہ کشادہ حصہ کسی ہال کی طرح تھا جہاں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھ سکتے تھے جبکہ اس کی باقی جتنی بھی راہداریوں میں نظر پڑی تھی، انھیں اس نے اپنے قید خانے والی راہداری کی طرح تنگ پایا تھا۔

مایوس ہونے کے باوجود اس نے اپنے قدموں کو نہیں روکا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اسے قیدی بنا کر رکھنے والے کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مشکوک حلیوں والے وہ نیم وحشی سے انسان اس کے لیے ابھی تک معما ہی تھے۔ ابھی تک وہ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکی تھی۔ اب موقع ملا تو سوچا کہ کیوں نہ چھپ کر ان کی ٹوہ لی جائے... کہ ہوسکتا ہے اسی طرح ان کی شخصیت پر پڑے اسرار کے پردے کچھ سرک سکیں۔ تجسس و کھوج میں مبتلا وہ آہستگی سے ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں ایک آڑ میں کھڑی ہوکر وہ نہ صرف ان [illegible] واضح طور پر [illegible] ان کی سرگرمیوں کا بھرپور جائزہ بھی لے سکتی تھی۔

"چھیتی کرو اوئے! ساروں کو اِدھر جمع کرکے بیٹھ گئے ہو اور ابھی تک پروجیکٹر ڈھنگ سے نہیں لگایا۔ آگے اور بھی تو کام کرنے ہیں یا نہیں؟" اس نے آڑ سے ذرا سا سر نکال کر جھانکا تو وہ سب اسے سینما ہال میں موجود تماش بینوں کی طرح پروجیکٹر کی طرف منہ کرکے بیٹھے دکھائی دیے۔ آبادی سے بہت دور اس برف سے ڈھکے پہاڑی علاقے میں پروجیکٹر کو چلانے کے لیے طاقتور بیٹریوں کا استعمال کیا جارہا تھا۔ ایک لمبی داڑھی والا شخص جو پروجیکٹر کو چلانے کی کوشش کررہا تھا، خود کو دیے جانے والے اس حکم کے بعد اور بھی مستعد نظر آنے لگا۔ ماہ بانو تجسس و تحیر کے عالم میں یہ ساری کارروائی دیکھنے لگی۔ آخرکار پروجیکٹر کو آپریٹ کرنے والا آدمی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور سادی پڑی اسکرین پر متحرک سائے نظر آنے لگے۔ یہ متحرک سائے دراصل چار عدد مرد تھے۔ ان مردوں میں سے ایک کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا جبکہ باقی تینوں کے چہروں پر نقاب منڈھے ہوئے تھے۔ ان کی نقاب سے جھانکتی آنکھوں سے وحشت جھلک رہی تھی۔ ان میں سے دو نے آنکھوں پر

پٹی بندھے نوجوان کے بازوؤں کو سختی سے جکڑا ہوا تھا۔ نوجوان جس انداز میں چل رہا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ان دونوں نے اسے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔ اس منظر کو دیکھ کر ماہ بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی فلم یا ڈرامے کا کوئی منظر دیکھ رہی ہو لیکن پروجیکٹر پر چلتی فلم کی کوالٹی بتا رہی تھی کہ اسے کسی عام مووی کیمرے سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے، فلم یا ڈرامے کے لیے ایسے کیمرے کا استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنے اندر عجیب سی بے چینی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے کچھ اور غور سے اس منظر کا جائزہ لیا۔ اسے لگا کہ دو بندوں کی گرفت میں موجود نوجوان کا جسم زخمی ہے اور اس کے لباس پر دکھائی دینے والے دھبے دراصل خون کے ہیں۔ کیمرے نے باقی افراد کو چھوڑ کر اس نوجوان کو فوکس کرنا شروع کیا تو اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ نوجوان واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کی باچھیں چری ہوئی تھیں جن پر خون جما ہوا تھا۔ ہاف آستین والی ٹی شرٹ میں سے جھانکتے اس کے بازو بھی بری طرح زخمی تھے جبکہ پیروں کی انگلیوں کے ناخن کھنچے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور جس انداز میں اسے لانے والے لے کر چل رہے تھے، اس سے ظاہر تھا کہ وہ اس پر رحم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ [illegible] منظر نے ماہ بانو کے اندازے کی تصدیق کردی۔ نوجوان کو پکڑ کر لانے والے نقاب پوشوں نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ نوجوان جس کی ٹانگیں پہلے ہی لڑکھڑا رہی تھیں، اس دھکے کو سہہ نہ سکا اور نیچے فرش پر گر گیا۔ نقاب پوشوں کا تیسرا ساتھی جو اپنی حرکات و سکنات سے ان کا لیڈر لگ رہا تھا، کمرے میں پڑی واحد لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی دونوں کو احکامات دینے لگا۔ وہ کسی قسم کے احکامات جاری کررہا ہے، اس بات کا اندازہ ماہ بانو نے اس کا روئے سخن اور باقی دو کے تابع داری سے ہلتے ہوئے سروں کو دیکھ کر لگایا تھا ورنہ پروجیکٹر پر چلنے والی فلم مکمل طور پر خاموش تھی۔ کسی قسم کی آواز سنائی نہ دینے کے باوجود اس فلم میں کچھ ایسا تھا جو جسم کے اندر تھرتھری سی پیدا کررہا تھا اور دل کسی انہونی کے اندیشے سے بری طرح دھڑکے جارہا تھا۔ آخرکار ماہ بانو کے اس خوف نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کو دھکا دے کر فرش پر گرانے والے نقاب پوشوں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ پیروں کو دبوچا اور اپنی کمر کے ساتھ بندھی رسی کا گچھا کھول کر اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھنے لگے۔ نوجوان نے اس موقع پر شدید مزاحمت کی اور تڑپ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دونوں تو کسی تجربہ کار قصاب کی سی مہارت رکھتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے نوجوان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اس کے ہاتھ پیروں کو رسی سے اچھی طرح جکڑنے کے بعد ان میں سے ایک اس کے پیروں پر جبکہ دوسرا سینے پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھ گیا۔ نوجوان جو بندھنے کے نتیجے میں پہلے ہی بے بس ہوگیا تھا، اب ہلنے جلنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ اس کے مکمل طور پر بے بس ہوتے ہی اب تک کرسی پر بیٹھ کر خاموشی سے نظارہ کرنے والا تیسرا نقاب پوش اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی جیکٹ کی زپ کھول کر گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ گریبان سے برآمد ہوا تو اس میں لمبے پھل والی ایک تیز دھار چھری چمکتی ہوئی نظر آئی۔ چھری نکالنے کے بعد پہلے اس نے اسے اپنی آنکھوں کے عین سامنے لاتے ہوئے اس کا جائزہ لیا پھر مزید اطمینان کے لیے دھار پر انگلی پھیر کر چیک کیا۔ فرش پر بندھے پڑے نوجوان اور اس چھری بردار کی حرکات و سکنات نے ماہ بانو کو باور کروادیا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔ آنے والے لمحات کا سوچ کر ماہ بانو کپکپا اٹھی اور ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس کرکے نیچے بیٹھ گئی۔ اسی طرح کا لرزہ خیز منظر وہ پہلے بھی ایک بار دیکھ چکی تھی۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ منظر اس نے لائیو دیکھا تھا جبکہ موجودہ منظر ریکارڈڈ تھا۔ سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی شہلا کے بہیمانہ قتل کو وہ ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتی تھی۔ سامنے پروجیکٹر پر جو فلم چل رہی تھی اس کے پس منظر میں بھی شاید ایسا ہی کچھ تھا۔ چھری بردار نقاب پوش چھری لہراتا ہوا نوجوان کے قریب بیٹھا تو ماہ بانو نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اپنے اندر ایسا ظالمانہ اور وحشت انگیز منظر دیکھنے کی قطعی جرأت محسوس نہیں کررہی تھی۔

"مبارک ہو عمران! مجھے یقین ہے کہ اپنے دشمن کا یہ انجام دیکھ کر تمہیں خوشی ہوئی ہوگی اور تمہارے سینے میں لگی انتقام کی آگ بھی بجھ گئی ہوگی۔" اسے آنکھیں بند کیے ایک منٹ کا وقفہ گزرا تھا کہ ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ اس جملے کو سن کر اسے اندازہ ہوگیا کہ کسی جانور کی طرح باندھ کر ڈالا گیا نوجوان اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔

"سینے میں لگی آگ کا نہ پوچھیں بھائی صاحب! یہ آگ تو ایسی زوردار ہے کہ دل کرتا ہے اس کمینے کو سو بار ماروں اور زندہ کروں۔ اگر آپ لوگ مجھے یہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی اجازت دے دیتے تو شاید میرے سینے میں کچھ ٹھنڈ پڑ جاتی۔ ابھی تو لگتا ہے کہ میرا اس ذلیل سے انتقام

www.pkdigest.com

ادھورا رہ گیا ہے۔"

نہایت نفرت میں ڈوبی یہ آواز ماہ بانو کو شناسا لگی۔ یقینی طور پر یہ اسی نوجوان کی آواز تھی جس سے کچھ دیر قبل اس نے اپنے قید خانے میں گفتگو کی تھی۔ نوجوان کی اس انتہا کو پہنچی ہوئی نفرت پر دل میں شدید رنج محسوس کرتے ہوئے اور اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے ماہ بانو نے آنکھیں کھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ فرطِ جوش سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ وہ یقیناً وہی نوجوان تھا جس کے بارے میں کچھ دیر قبل اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں بہت معصوم اور شریف ہے۔ وہ معصوم دکھائی دینے والا چہرہ اس وقت غصے اور انتقام کی آگ میں جل کر بری طرح مسخ ہو کر اپنی دلکشی کھو بیٹھا تھا۔

"ہم نے جان بوجھ کر تمہیں تمہارے ہاتھوں سے یہ کام نہیں کرنے دیا۔ تم ہمارے دوست ہو اور دوستوں کے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رہی تمہارے انتقام کی آگ بجھنے کی بات تو میرے خیال میں یہ آگ جلتی رہے تو اچھا ہے۔ یہ آگ جلتی رہے گی تو ہی تم اس جیسے کرتوت رکھنے والے دوسرے شیطانوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکو گے۔ ذاتی انتقام لے کر سکون سے بیٹھ جانا تو کوئی کارنامہ نہیں، بات تو جب ہے کہ آدمی ہر بُرے آدمی کے خلاف لڑے اور اس کا وہ حشر کرے کہ باقیوں کو عبرت حاصل ہو۔ ہم سب یہاں اسی مشن پر کام کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم اس مشن میں ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟" بہت رواں لہجے میں بولتا وہ شخص عمران نامی اس نوجوان سے پوچھ رہا تھا۔

"بالکل دوں گا۔ میری زندگی میں اب رہ ہی کیا گیا ہے؟ اگر یہ بچ جانے والی سانسیں کسی اچھے مقصد کے ساتھ گزر گئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے زندہ رہنے کا حق ادا کر دیا۔" عمران نے وہی کہا تھا جو اس سے مصروفِ گفتگو شخص کہلانا چاہتا تھا۔ نہ جانے وہ کتنے دنوں سے اس معصوم نوجوان کی برین واشنگ کر رہا تھا جو اس کے دل میں زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر شعور اور حساسیت کی مالک ماہ بانو نے اس صورتِ حال پر گہری سانس لیتے ہوئے وہاں موجود دیگر افراد کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ وحشت زدہ چہرے اس وقت کچھ اور بھی بھیانک لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بے خیالی میں اس کی نظر پروجیکٹر کی اسکرین پر جا پڑی۔ اسکرین ابھی تک روشن تھی اور اس پر ذبح کیے ہوئے نوجوان کی خون آلود لاش دکھائی دے رہی تھی۔ جوان، صحت مند جسم سے نکلنے والے ڈھیروں خون نے لاش کے گرد ایک چھوٹا سا سرخ تالاب بنا ڈالا تھا۔ اپنے ہی خون میں پڑی نوجوان کی وہ لاش کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی لاش سے مشابہ لگ رہی تھی۔ ماہ بانو صرف ایک پل کے لیے یہ منظر دیکھ سکی۔ اگلے ہی پل اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دوہری ہو گئی۔ وہ لوگ جو کسی تفریحی فلم کی طرح اس دردناک منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ابکائی کی آواز سن کر چونک پڑے۔

"لگتا ہے قیدی لڑکی اپنی کوٹھری سے نکل کر یہاں آ گئی ہے۔" سب سے پہلے عمران متحرک ہوا اور آواز کی سمت دوڑا۔ اس دوران ماہ بانو خود پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام ہو کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس لڑکی کو یہ سب نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔" وہ آدمی جو اب تک عمران سے گفتگو کرتا رہا تھا اور وہاں موجود افراد کا کمانڈر تھا، ماہ بانو کو دیکھ کر بولا۔

"یہ باہر کیسے نکلی؟ کون اسے کھانا دینے گیا تھا؟" صورتِ حال پر تبصرے کے ساتھ ہی کمانڈر کو فوراً ہی سب سے اہم خیال آیا۔

"میں نے اسے کھانا پہنچایا تھا۔" عمران نے کسی مجرم کی طرح اعتراف کیا جسے سن کر کمانڈر کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"ہمارے کام میں ایسی غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس بار تو میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ کسی کوتاہی کا انجام بہت بُرا ہوگا۔" وہ جو اب تک بڑی نرمی اور محبت سے عمران سے بات کرتا رہا تھا، نہایت سخت لہجے میں بولا۔

"سوری کمانڈر!" عمران نے فوراً ہی اس سے معافی مانگی۔

"اسے اس کی کوٹھری تک پہنچا کر کوٹھری کو تالا لگا دو۔" اس کی معذرت کو خاطر میں لائے بغیر کمانڈر نے سرد لہجے میں حکم دیا اور پلٹ گیا۔ ماہ بانو کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اس کی کوٹھری کی طرف لے جاتے ہوئے عمران کا ذہن لہجے کے ان تضادات میں بُری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"گاڑی تیار ہے سر!" عبدالمنان کی اس اطلاع پر اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لاہور سے واپس آ کر جو نیا شیڈول ترتیب دیا تھا، اس کے مطابق آج اسے پیر آباد کے دورے پر جانا تھا۔ اس کے زیرِ نگیں علاقے میں پیر آباد سب سے بڑا گاؤں تھا اس لیے وہ اسے بالکل بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دیگر

دیہاتوں کے مقابلے میں پیر آباد کی ترقی کی رفتار قدرے تیز ہونے کے باوجود وہ اس کی طرف خصوصی توجہ دینا چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ مزاحمت بھی اسی جگہ ہے اور اگر وہ ذرا بھی ڈھیلا پڑا تو سب کیا کرایا ضائع ہو جائے گا۔

"نور پور میں جو ٹھیکے دار کام کر رہا ہے آج تم اس سے ملاقات ضرور کر لینا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں ہم کسی دن اچانک وہاں جا کر کام کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ پر کتنا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔" اپنے دفتر سے نکل کر باہر پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو یاد دہانی کروائی۔

"یس سر! آپ بے فکر رہیں، میں یہ کام کر لوں گا۔" عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ مشاہرم خان کی غیر موجودگی میں آج کل یہی ڈرائیور اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔ مشاہرم خان ابھی تک واپس نہیں آیا تھا، البتہ اس کی طرف سے رپورٹیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اس نے نیاز علی سے اپنی ملاقات سے لے کر اس کی حادثاتی موت تک ہر بات تفصیل سے شہریار کو بتا دی تھی۔ نیاز علی کی حادثاتی موت نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ نیاز علی کے جیپ سمیت کھائی میں گر جانے کے بعد وہ پیدل طویل سفر کر کے ایسے مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا جہاں سے اسے پہاڑوں سے واپس لوٹنے والی ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم نے اپنی جیپ میں لفٹ دی اور اسے اس کی درخواست پر تھانے کے قریب ڈراپ کر کے چلے گئے۔

تھانے پہنچ کر اس نے وہاں موجود ڈیوٹی افسر کو حادثے کے بارے میں بتایا۔ افسر نے پولیس کی روایت کے مطابق اسے ڈھیر سارے سوالوں کی زد پر لے لیا لیکن مشاہرم خان ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے پولیس افسر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات اگلوانے میں ناکام رہا جس کے ذریعے مشاہرم خان کو نیاز علی کی موت کا ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا۔ نیاز علی کے ساتھ اپنے اس علاقے میں جانے کی وجہ اس نے بالکل سچ سچ بتا دی تھی جس پر پولیس افسر تھوڑا جزبز بھی ہوا تھا کہ اسے پولیس کی کارکردگی پر یقین نہیں تھا جو خود معاملے کی تحقیق کرنے نکل کھڑا ہوا۔ جواب میں مشاہرم خان نے اس کا دھیان ان نکات کی طرف دلوایا جنہیں پولیس والوں نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے انہیں باور کروایا کہ وہ لوگ صرف نیاز علی کے بیان پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے تھے اور معاملے کے ان پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا تھا جس سے نیاز علی کے سچ جھوٹ کا اندازہ ہو سکتا۔ اس نے پولیس افسر کو تفصیل سے اس علاقے کے محلِ وقوع اور مٹی کی ساخت وغیرہ سے آگاہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ نیاز علی کا بیان سراسر جھوٹ پر مبنی تھا اور کسی نے اس سے جیپ چھینی نہیں تھی بلکہ وہ خود مجرموں کا ساتھی تھا۔ اس نے پولیس افسر کو صاف لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ نیاز علی اپنا جھوٹ کھل جانے کے بعد گھبراہٹ میں جیپ لے کر فرار ہونے کے چکر میں حادثے کا شکار ہوا تھا، البتہ وہ نیاز علی پر تشدد اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کا ذکر گول کر گیا تھا۔ اس کے بیان کی روشنی میں پولیس افسر نے نیاز علی کی لاش اور جیپ کھائی سے نکلوانے کے انتظامات شروع کر دیے لیکن تا حال جیپ یا لاش نہیں نکالی جا سکی تھی۔ مشاہرم خان کے ذاتی خیال کے مطابق یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ بہر حال، لاش نکلتی یا نہیں وہ خود براہِ راست نیاز علی کی موت کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

کچھ کمال شہریار کی فون کال نے بھی دکھایا۔ اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب کو فون کر کے یہ باور کروا دیا کہ مشاہرم خان ایک دیانت دار اور بے ضرر آدمی ہے جو اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے اسکردو میں رکا ہوا ہے۔ اپنے بھائی کے قتل کی تحقیق کے لیے اگر اس نے کچھ ہاتھ پیر مارے ہیں تو یہ صرف برادرانہ محبت کا نتیجہ ہے ورنہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے والا یا انسانی جان سے کھیلنے والا بندہ نہیں ہے۔ اس کی ضمانت پر مشاہرم خان کے ساتھ خصوصی نرمی برتی گئی اور اسے قتل کے شک میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کرنے کے بجائے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ اتنی پابندی ضرور عائد کی گئی تھی کہ وہ مقامی مختار سے اجازت لیے بغیر اسکردو چھوڑ کر واپس اپنی ڈیوٹی پر نہیں جا سکتا۔ مشاہرم خان کا فی الحال واپس لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ وہیں رہ کر اس معاملے کی مزید تحقیق کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اس حکم پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

شہریار خود بھی اس کے اس پروگرام سے متفق تھا۔ مشاہرم خان کے وہاں رہنے اور ہاتھ پیر مارنے کی صورت میں ہی یہ ممکن تھا کہ ماہ بانو کا کوئی اتا پتا مل سکتا اور ساتھ ہی اس راز سے بھی پردہ اٹھتا کہ وہ کون لوگ تھے جنہیں نیاز علی خفیہ طور پر راشن اور ادویات وغیرہ سپلائی کر رہا تھا۔ اتنے خفیہ طور پر چھپ کر رہنے والے لوگوں کا کسی کارِ خیر میں مصروف ہونے کا گمان تو کیا نہیں جا سکتا تھا پھر ان کا ماہ بانو کو اغوا کرنا

www.pkdigest.com

بھی ان کے خلاف اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ لوگ منفی سرگرمیوں میں مصروف ہیں... لیکن یہ بات شہریار کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ ان لوگوں نے اس قدر پلاننگ کے ساتھ ماہ بانو کو اغوا کیوں کیا؟ ماہ بانو کی کھوج تو صرف ایک ہی بندے کو تھی اور اس شخص کا بلتستان سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ اپنے علاقے میں بے حد بااختیار اور طاقتور چودھری کی بے شک حکومتی ایوانوں تک بھی پہنچ تھی لیکن وہ اتنا بااختیار بہرحال نہیں تھا کہ بلتستان میں اس کے بندے اس قدر سرگرم ہوتے۔ شہریار کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ لیکن سوال وہی تھا کہ اس معاملے سے ماہ بانو کا کیا تعلق تھا؟ فیصل آباد میں پرورش پانے والی وہ کم عمر لڑکی جو اپنے آبائی گاؤں چھٹیاں گزارنے آئی تھی، چودھری کی ہوس بھری نظروں میں آنے کے بعد اتنی مصیبت میں پڑی کہ پھر اس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ وہ مشابرم خان کے مشورے اور شہریار کے تعاون کے نتیجے میں پناہ کی تلاش میں بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جاکر ٹھہری تو وہاں بھی اسے سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس دور افتادہ گاؤں میں بھی حالات کے گرداب نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

آثار بتاتے تھے کہ اس بار وہ جن لوگوں کے نرغے میں پھنسی ہے، ان کا چودھری سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ ایک عام سی بے ضرر لڑکی میں آخر ایسی کیا بات تھی کہ وہ بالکل انجان جگہ پر بھی محفوظ نہیں رہ سکی اور اسے باقاعدہ ایک سازش کے ذریعے اغوا کرلیا گیا؟

یہ سارے وہ سوالات تھے جن کے جواب کے حصول کے لیے تحقیق و تفتیش کی ضرورت تھی۔ مشابرم خان کی صلاحیتیں شہریار دیکھ چکا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام کرسکتا ہے چنانچہ اس نے اسے بلتستان میں ہی رکے رہنے کی منظوری دیتے ہوئے اس کی چھٹیاں بڑھا دیں۔ خود وہ تو اپنی پوسٹ اور ذمے داریوں کی وجہ سے بُری طرح جکڑا ہوا تھا چنانچہ خواہش رکھتے ہوئے بھی اس کام کے لیے نہیں جاسکتا تھا، کم از کم فوری طور پر تو بالکل نہیں۔ ان حالات میں مشابرم خان کے تعاون کو غنیمت جانتے ہوئے اس نے اپنی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا اور ماہ بانو کی تلاش کی ذمے داری اسے سونپ دی لیکن یہ تو وہی جانتا تھا کہ اس کا دل کتنی بار اس بات پر مچل جاتا ہے کہ وہ خود جاکر ماہ بانو کو تلاش کرے۔ اسے آج بھی وہ لمحات یاد تھے جب ماسٹر آفتاب کے اسکول میں چہرے کو نقاب میں چھپائے ماہ بانو اس سے مدد کی درخواست کرنے وہاں پہنچی تھی۔ فرض اور انسانی ہمدردی اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود اس کے اپنے دل نے بھی یہ خواہش کی تھی کہ وہ اس ہراساں ہرنی جیسی لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لے۔ دل کی اس خواہش کو اس نے اپنی سرکاری حیثیت کے اندر رہتے ہوئے پورا بھی کیا تھا لیکن اس کی ہر کوشش ناکام چلی گئی اور آج پھر ماہ بانو اس سے بہت دور کسی کی قید میں پھنسی اس کی مدد کی طلب گار تھی اور وہ مجبوریوں اور اصولوں کی قید میں جکڑا خود اس کی تلاش میں نکلنے سے قاصر تھا۔

گاڑی کی پچھلی نشست پر بہ ظاہر سکون سے بیٹھا وہ مسلسل حالات و واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کے باہر تیزی سے گزرتے مناظر کی طرح اس کے ذہن کے جھروکے سے بھی واقعات ایک ایک کرکے گزرتے جارہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والا ہر نیا دن نئی خبر لے کر آتا تھا۔ ان خبروں میں اچھی خبروں کا تناسب کافی کم تھا بلکہ دیکھا جائے تو چند چھوٹے موٹے ترقیاتی منصوبوں کے آغاز کے سوا کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ خوش ہو پاتا۔ سازشیں، حادثات، دشمنیاں یہی سب تھا جنھیں وہ اس عرصے میں بھگتتا رہا تھا... لیکن بہرحال، خود اس کی طرح ابھی اس کا حوصلہ بھی جوان تھا اور وہ اتنی آسانی سے حالات کے سامنے ہار نہیں ماننے والا تھا۔ اسے حالات کے اس گرداب سے نکلنا تھا اور وہ تبدیلیاں لانی تھیں جن کو لائے بغیر حقِ انسانیت ادا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی حق کو ادا کرنے کے لیے وہ ہر ذاتی خواہش اور تکلیف کو نظرانداز کرکے سرگرمِ عمل ہوگیا تھا اور کسی عام افسر کی طرح اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھ کر محض رپورٹوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے خود تکلیف اٹھاتے ہوئے پیر آباد کی طرف رواں دواں تھا۔ خیالات کے ہجوم میں گھرے پیر آباد تک کا سفر کیسے طے ہوا، وہ خود بھی اندازہ نہیں کرسکا لیکن جب گاڑی پیر آباد کے داخلی راستے پر چلنے لگی تو کچے راستے پر لگنے والے جھٹکوں نے اسے یاد دہانی کروائی کہ اس راستے پر پختہ سڑک کی تعمیر ازحد ضروری ہے۔ اصل میں اسکول اور مرکزِ صحت کی تعمیر کے کام تو فوری طور پر اس لیے انجام پاگئے تھے کہ ان کے لیے سیٹھ سوتی والا کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے قائم کردہ ٹرسٹ سے سرمایہ فراہم کردیا گیا تھا لیکن سڑک کی تعمیر کے لیے خالصتاً حکومتی فنڈ سے رقم حاصل کی جانی تھی اور اس کے لیے منظوری ملتی، تب ہی کچھ ہو پاتا۔

پیر آباد میں اس کا شیڈول طے شدہ تھا۔ اسے سب سے پہلے مرکزِ صحت پھر اسکول و انڈسٹریل ہوم اور آخر میں فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کے لیے جانا تھا۔

www.pkdigest.com

اس طے شدہ شیڈول پر عمل کرتے ہوئے ڈرائیور نے گاڑی مرکزِ صحت کے سامنے لے جاکر روک دی۔ مرکزِ صحت کے دروازے پر تیس پینتیس سال کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ آدمی یہاں بہ یک وقت کمپاؤنڈری اور چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ شہریار کو دیکھ کر وہ جھٹ دوڑا آیا اور اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ سب ٹھیک ہے؟ اندر ڈاکٹرز موجود ہیں یا نہیں؟" اس نے نرمی سے اس شخص کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"ڈاکٹرنی صاحبہ ہیں جی! ایک دو مریض عورتیں رہ گئی ہیں، انہیں دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب البتہ اپنے کوارٹر میں چلے گئے ہیں۔" اس شخص نے مستعدی سے اطلاع دی جس پر سر کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے شہریار اندر داخل ہوگیا۔

"یہ دوا رکھو اور اسے پابندی سے کھاتی رہنا۔ ابھی تمہاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ابھی سے بچوں وغیرہ کے جھنجٹ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چار پانچ سال آرام سے گزارو پھر اس بارے میں سوچنا۔ سسرال والے طعنے دیتے ہیں تو دینے دو۔ ابھی تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، انہیں بچوں کے چکر میں پڑ کر ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ ڈاکٹر ماریا کے کمرے کے قریب پہنچا تو اسے اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ مریضہ کی موجودگی کی وجہ سے وہ اندر جانے کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کمپاؤنڈر نے خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر ماریا کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ فوراً ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اب اس کے باہر رکے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔

"واؤ ونڈرفل سرپرائز! آپ کو یوں اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔" اس کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے خوشی کا اظہار کیا۔

"میں اپنے روٹین وزٹ پر آیا تھا۔ آپ بتائیں ایوری تھنگ از او کے اور ناٹ؟" اس نے مریضہ عورت کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ماریا سے پوچھا۔ بیس بائیس سال کی وہ عورت اچھی شکل و صورت کی مالک تھی اور چہرے سے کسی طور بیمار نہیں لگ رہی تھی۔

"آل از او کے سر... بلکہ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی نیوز بھی ہے۔" ڈاکٹر ماریا نے خوش گوار لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر مریضہ کی طرف متوجہ ہوکر اس سے بولی۔ "اب تم جاؤ بی بی اور میری ہدایت کے مطابق پابندی سے دوا استعمال کرتی رہنا۔"

"بہت بہتر ڈاکٹرنی صاحبہ۔" عورت فوراً ہی باہر نکل گئی۔ اس عورت کی صحت اور عمر دیکھتے ہوئے شہریار کو خیال آیا کہ ڈاکٹر ماریا تھوڑی دیر قبل اسے جو مشورہ دے رہی تھی، وہ کچھ مناسب نہیں تھا خصوصاً گاؤں کے ماحول میں جہاں کم عمری کی شادی اور پھر جلد بچوں کی پیدائش کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں طویل عرصے تک اس عورت کا ماں نہ بننا اس کے لیے مشکلات بھی کھڑی کرسکتا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا ڈاکٹر ماریا کے سامنے اظہار نہیں کیا اور یہ سوچ کر ذہن سے جھٹک دیا کہ ممکن ہے کہ عورت کو کوئی ایسی پرابلم ہو جس کے پیشِ نظر ڈاکٹر ماریا فی الحال اس کے لیے بچے کی پیدائش کو خطرناک سمجھتی ہو۔ بہرحال، وہ ڈاکٹر تھی اور ان معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتی تھی۔

"اور کوئی مریضہ رہ گئی ہے تو اسے اندر بھیج دو۔" عورت کے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے کمپاؤنڈر کو حکم دیا۔

"صرف ایک عورت اور ہے جی! میں اسے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے دیکھیں، تب تک میں اے سی صاحب کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔" کمپاؤنڈر نے مستعدی دکھانے کی کوشش کی۔

"چائے پانی رہنے دو۔ وہ میں انہیں اپنے کوارٹر میں لے جاکر کروادوں گی۔ تم بس پیشنٹ کو بھیج دو۔" شہریار انکار کرتا، اس سے قبل ڈاکٹر ماریا نے خود ہی منع کردیا۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا اس لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے یہاں کی ضروریات اور مسائل وغیرہ سے آگاہ کردیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ ڈاکٹر صاحب کی رائے بھی لے لیں تو مناسب ہوگا۔" ماریا کو ٹوکتے ہوئے شہریار نے اس سے کہا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر اندر آنے والی ادھیڑ عمر عورت کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ عورت نزلہ زکام اور بخار میں مبتلا تھی۔ اس کا چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے پرچے پر دوائیں لکھ کردیں کہ جاکر کمپاؤنڈر سے لے لو پھر شہریار کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہاں کی ضروریات کی لسٹ میں اور ڈاکٹر داوڑ کر پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ میں وہ لسٹ آپ کو دے دیتی ہوں البتہ آپ چاہیں تو اپنی تسلی کے لیے ڈاکٹر داوڑ سے بھی مل سکتے ہیں۔ میں کمپاؤنڈر کو بھیج کر انہیں بلوا لیتی ہوں۔ ایکچولی پیشنٹس کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ ذرا جلدی فارغ ہوجاتے ہیں اور اپنے کوارٹر میں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت شاید وہ ریسٹ کررہے ہوں گے۔"

''اوکے! پھر آپ انہیں رہنے دیں اور لسٹ مجھے دے دیں۔'' شہر یار نے اس کی بات سن کر کہا۔ مرکزِ صحت کی صورتِ حال اسے یہاں داخل ہوتے ہی تسلی بخش لگی تھی۔ اس کی تیز نظروں نے لمحے بھر میں ہی جائزہ لے لیا تھا کہ وہاں صفائی کا معیار عمدہ ہے اور ہر شے ترتیب و تنظیم کے ساتھ موجود ہے اس لیے میل ڈاکٹر کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔

''یہ لیجیے لسٹ اور اب میرے ساتھ چلیے۔'' ڈاکٹر ماریا نے دراز کھول کر اس میں سے ایک فل اسکیپ پیپر نکال کر شہر یار کے حوالے کرتے ہوئے اپنی فرمائش دہرائی۔

''پلیز! میں نے کہا نا کہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے یہاں اور بھی کام ہیں۔'' اس سے لسٹ وصول کر کے اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''اچھا، میں تو چاہ رہی تھی کہ آپ کی اپنی ممی سے ملاقات کروادوں۔'' ڈاکٹر ماریا کے چہرے پر مایوسی چھائی۔

''ممی سے...؟ یعنی آپ کی مدر چودھری کی قید سے آزاد ہو کر آپ تک پہنچ چکی ہیں؟'' شہر یار حیران ہوا جس کے جواب میں ڈاکٹر ماریا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''لیکن کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہوا؟'' شہر یار اب بھی حیران تھا۔

''میرے اور چودھری کے درمیان ڈیل ہوگئی ہے۔ میں یہاں رہ کر چودھری کی مرضی کے مطابق کام کرتی رہوں گی۔ اس شرط پر اس نے میری ممی کو رہا کیا ہے اور ساتھ یہ بھی تنبیہ کر دی ہے کہ میں خود کو آزاد نہ سمجھوں۔ اس کے بندے ہر وقت میری اور میری ممی کی نگرانی کرتے رہیں گے۔'' ڈاکٹر ماریا نے اداسی سے بتایا۔

''یہ تو کھلی غنڈا گردی ہے۔ آپ کو اس واقعے کی رپورٹ لکھوانی چاہیے۔ میں خود اس ناانصافی کے خلاف آپ کا ساتھ دوں گا۔'' غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ شہر یار نے ماریا کو اکسایا۔

''تھینکس فار یور کائینڈنیس سر! بٹ آئی کانٹ ڈو اٹ۔ میں اچھی طرح اس فیوڈل سسٹم کو جانتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر ماریا نے صاف انکار کیا۔

''اگر آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی باتیں کریں گے اور اس طرح ڈرتے رہیں گے تو کون اس ظلم کے خلاف جہاد کرے گا۔ آپ تھوڑی سی ہمت تو کریں، میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ میں چودھری کو سبق سکھاؤں گا کہ کسی کے ساتھ اس طرح زبردستی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' شہر یار نے اس پر زور ڈالا۔

''سوری سر! میں آپ کا ساتھ ہرگز بھی نہیں دے سکتی۔ آپ چودھری کے خلاف ہیں، مجھے معلوم ہے لیکن میں دو مگرمچھوں کی لڑائی میں خود کو فریق بنانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ دونوں بڑے لوگ ہیں۔ اس لڑائی میں آپ کا کچھ نہیں جائے گا لیکن میں اور میری ممی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔'' ماریا نے پھر صاف انکار کر دیا۔

''اوکے! پھر میں چلتا ہوں لیکن مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ایک پڑھی لکھی، باشعور خاتون نے ظالم کے سامنے اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے اور وہ رول ادا نہیں کیا جو اس کا فرض بنتا تھا۔'' وہ کافی آف موڈ کے ساتھ ڈاکٹر ماریا کے پاس سے رخصت ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسکول و انڈسٹریل ہوم تھا۔ اسکول کا ٹائم چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لیے کمروں میں تالا پڑا تھا البتہ انڈسٹریل ہوم کھلا ہوا تھا۔ وہاں نگرانی پر تعینات چوکیدار شام کے بعد ڈیوٹی پر آتا تھا اس لیے شہر یار کے آنے کی اطلاع اندر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی رکوائی بھی ذرا فاصلے پر تھی ورنہ گاڑی کی آواز سن کر ہی کوئی متوجہ ہو جاتا۔ گاڑی سے اتر کر وہ پیدل ہی اطمینان سے چلتا ہوا انڈسٹریل ہوم تک پہنچا۔ ایک کمرے پر مشتمل انڈسٹریل ہوم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے اندر کام کرتی خواتین صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بہت منظم انداز میں خاموشی سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ کام کرنے والی ان خواتین کے علاوہ وہاں آفتاب بھی موجود تھا جو کرسی پر بیٹھا اپنے سامنے کھلے رجسٹر میں بری طرح غرق تھا۔ شہر یار کی اچانک آمد نے اسے حیران کر دیا۔

''تشریف لائیں سر! میں اس وقت آپ کی آمد کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔'' شہر یار سے مصافحہ کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے اس نے خوشی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''ایکسپیکٹ تو میں بھی نہیں کر رہا تھا کہ اس ٹائم تمہیں یہاں دیکھ سکوں گا۔'' شہر یار نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے تو میں کبھی کبھار ہی یہاں کا چکر لگاتا ہوں لیکن آج کل یہاں نگرانی پر مامور لڑکی چودھری افتخار کی لاہور والی کوٹھی میں ہے اس لیے مجھے روزانہ ہی آنا پڑتا ہے۔ وہ لڑکی ان کی ملازمہ ہے۔ اس لیے حکم کی تعمیل پر مجبور تھی۔'' شہر یار کو لگا کہ بہ ظاہر مسکرا کر یہ جواب دیتے ہوئے آفتاب حقیقتاً کافی اپ سیٹ ہے۔

''اوہ آئی سی... لیکن اس طرح تمہیں تو بڑی پریشانی ہوتی ہوگی۔ بہتر ہے کہ تم اس لڑکی کی جگہ کسی دوسری ایسی لڑکی کو لے آؤ جو کسی اور کی ملازمت میں نہ ہو۔'' شہر یار نے اسے مشورہ دیا۔

''یہی تو مشکل ہے کہ یہاں ایسی لڑکیاں ملتی نہیں ہیں۔ وہ کافی سمجھ دار اور تھوڑی سی پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لیے مجھے ذرا سہولت رہتی ہے۔ خیر، وہ کسی دن واپس آ ہی جائے گی۔ فی الحال آپ یہ دیکھیں۔ میں نے لاہور اور اسلام آباد میں ملبوسات کے بزنس سے جڑے کچھ افراد سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی طرف سے اچھا رسپانس ملا ہے۔ وہ یہاں کی خواتین سے کام کروانے کے لیے تیار ہیں اور معاوضہ بھی مناسب آفر کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان سے آرڈرز لے لیے جائیں۔ اس طرح ان خواتین کے لیے آمدنی کا معقول ذریعہ بن جائے گا۔'' آفتاب نے شہر یار کے سامنے دو لفافے رکھے جن پر مشہور ڈریس ڈیزائنرز کے مونوگرام پرنٹ تھے۔

''ویل ڈن آفتاب! تم تو ہر فیلڈ میں بڑی پرفیکشن کے ساتھ کام کرتے ہو۔ میں نے آج صبح تمہارا وہ کالم پڑھا ہے جو تم نے [illegible] کے بارے میں لکھا تھا۔ بہت شاندار کالم [illegible] ہیں جو [illegible] شامل کیا جو میں بتا چاہتا تھا۔ اتنی محنت سے اور اتنا اچھا کالم لکھنے پر مجھے تمہیں اسپیشل تھینکس کہنا چاہیے۔'' شہر یار نے کھلے دل سے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''تھینکس کی ضرورت ہی نہیں سر! آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق جس نے جو کر لیا، سمجھیں وہ اس کا فرض تھا جس کی ادائیگی کے لیے اللہ نے ذریعے بنا دیے ورنہ انسان کی کیا اوقات کہ کبھی بھی، کچھ بھی کر سکے۔'' آفتاب نے انکساری سے جواب دیا اور یہی انکساری تو تھی جو اسے بہت سے لوگوں میں ممتاز کرتی تھی۔ دل میں بہت خوش گوار سا احساس لیے شہر یار نے وہاں سے رخصت چاہی۔ ماسٹر آفتاب کی کام کے ساتھ لگن ہمیشہ ہی اسے بہت متاثر کرتی تھی لیکن آج اس نے محسوس کیا تھا کہ پوری تن دہی سے اپنے کام میں مصروف آفتاب کچھ بجھا بجھا ہوا ہے۔

''تمہاری ترقی کی رفتار دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی آفتاب! اسی اسپرٹ کے ساتھ کام جاری رکھو۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ اگر اسکول اور انڈسٹریل ہوم کی بہتری کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا چاہتے ہو تو اپنی مرضی سے اٹھا سکتے ہو۔ بس تمہارا فون پر مجھے یا عبدالمنان کو انفارم کر دینا کافی ہوگا۔'' آفتاب سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''تھینک یو سر! آپ کا یہ اعتماد میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔'' آفتاب مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ کچھ بجھی ہوئی تھی۔

''اوکے! تو پھر میں چلتا ہوں۔ اگر کسی نوعیت کا کوئی بھی مسئلہ ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔'' اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے بالآخر شہر یار کو کہنا ہی پڑا۔

''نو سر! کوئی پرابلم نہیں۔'' اس نے اپنی مسکراہٹ کو کچھ اور بھی گہرا کرتے ہوئے شہر یار کو یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ چپ ہو گیا۔ اتنا اندازہ تو بہرحال اسے ہو گیا تھا کہ مسئلے کی نوعیت کچھ نجی قسم کی ہے اس لیے آفتاب بتانے سے گریزاں ہے۔ مزید اصرار کو بے کار جان کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کی اگلی منزل فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کا بنگلا تھا۔ یہ وہی بنگلا تھا جس میں کچھ عرصہ قبل تک اقبال باجوہ رہائش پذیر تھا اور بہ طور فاریسٹ آفیسر ہر طرح کی بدعنوانی میں ملوث رہنے کے بعد بالآخر ایک دن بالکل اچانک ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ موت اسے اچانک دبوچتے ہوئے نہ اس کی کمائی دولت سے مرعوب ہوئی تھی، نہ ہی مراسم سے۔ وہ اپنا کمایا ہوا سارا مال اسی خالی دنیا میں چھوڑ کر سیاہ کاریوں سے بھرا نامۂ اعمال لے کر خالقِ حقیقی کے سامنے شرمندہ ہونے پہنچ گیا تھا۔ وہ جنگل کی ابتدائی حدود میں واقع فاریسٹ آفیسر کے بنگلے تک پہنچا تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ بنگلے پر عابد انصاری نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ وہ پچاس پچپن سال کا ایک گریس فل آدمی تھا جس کے نفاست سے کنگھی کیے گئے بالوں میں سے کہیں کہیں جھلکتی سفیدی اس کی شخصیت کو اور بھی خوب صورت و پُرکشش بنا رہی تھی۔ شخصیت کی اس کشش کو بڑھانے میں اس کی آنکھوں پر لگے سنہری فریم کے نفیس سے چشمے کے ساتھ وہ آف وائٹ سفاری سوٹ بھی اہم کردار ادا کر رہا تھا جو اس نے یقیناً کسی ماہر درزی سے سلوا کر زیب تن کیا تھا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں پوسٹنگ سے قبل آپ کے بارے میں کافی کچھ سننے کو ملا تھا۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ آپ کی سفارش پر مجھے یہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یقین رکھیں کہ میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔'' اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد جب ابتدائی تعارف کا مرحلہ گزر گیا

www.pkdigest.com

اظہار کیا۔

''میں بھی یہی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ میری امیدوں پر پورے اتر سکیں اور میں اچھے ٹیم ورک کے لیے جو ٹیم تشکیل دے رہا ہوں، آپ اس کے ایک اچھے ممبر ثابت ہوں۔ ڈاکٹر ماریا نے مجھ سے بہ طور خاص آپ کی تعریف کی تھی۔ وہ خود ایک محنتی اور فرض شناس خاتون ہیں اس لیے میں نے ان کی تعریف پر یقین کرتے ہوئے آپ کی یہاں پوسٹنگ کے لیے سفارش کروا دی۔ اب آگے آپ کا کام بتائے گا کہ میں اپنے اس عمل میں درست تھا یا نہیں۔'' شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔ البتہ میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اتنے محتاط کیوں ہیں۔ دنیا سے اٹھ جانے والوں کی برائی مناسب تو نہیں لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ باجوہ صاحب نے اپنے فرائض سے غفلت کی حد تک بے پروائی برتی تھی اور یقیناً ان کا یہی رویّہ آپ کو محتاط ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ بہر حال میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ پر میرے اور باجوہ صاحب کے درمیان موجود فرق ظاہر ہو جائے گا۔ آپ کی تسلی کے لیے میں اتنا بتا دوں کہ میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ خصوصاً میں ریکارڈ مین ٹین کرنے پر زور دے رہا ہوں۔ ہمارے پاس جنگل میں موجود جانوروں اور درختوں کے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے اسمگلنگ کی روک تھام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی ہے جس میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے ایسے افراد فراہم کیے جائیں جو اس کام کے ماہر ہوں۔ میں ٹیگنگ کی تکنیک استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جنگل میں موجود فانا اور فلورا کی کاؤنٹنگ بھی ہو جائے گی اور نشان زدہ جانوروں اور درختوں کو اسمگل کرنا بھی آسان نہیں رہے گا۔'' عابد انصاری نے مختصر الفاظ میں اسے اپنا سارا منصوبہ بتایا۔

''یہ تو آپ بہت زبردست کام کریں گے انصاری صاحب! میری ذاتی خواہش بھی یہی تھی کہ جنگل کے سلسلے میں کچھ اس طرح سے کام کیا جائے جو مستقل بنیادوں پر ہو۔ آپ بے فکر ہو کر اپنی درخواست بھجوائیں۔ میں خود بھی آپ کی سفارش کروں گا۔'' وہ جو کام کرنے والے افراد کا دل سے قدر دان تھا، عابد انصاری کی بات سن کر خوش ہو گیا اور انہیں اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروانے لگا۔

اعتماد اور تعاون اسی طرح میرے ساتھ رہا تو میں اپنی کارکردگی سے آپ کو حیران کر دوں گا۔'' عابد انصاری اس کے جوش کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد بھی ان دونوں میں کافی دیر تک اس موضوع پر گفت و شنید ہوتی رہی۔ اس گفتگو کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ شہریار تو اس وقت چونکا جب ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

''مجھے اجازت دیں انصاری صاحب! آپ کی کمپنی میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا، ورنہ طے شدہ شیڈول کے مطابق تو مجھے اب تک واپس نور کوٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔'' وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر عابد انصاری سے اجازت طلب کرنے لگا۔

''اب آپ اس طرح بغیر کھانا کھائے تو یہاں سے نہیں جا سکتے۔ جہاں اتنا وقت گزر گیا ہے پندرہ منٹ اور عنایت کر دیں۔'' عابد انصاری نے اصرار کیا اور پھر ان کا یہ وضع دارانہ اصرار اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ شہریار کو کھانے کے لیے رکتے ہی بنی۔ کھانا عمدہ اور قدرے پُرتکلف تھا لیکن اتنی بہتات میں نہیں تھا جیسا چودھری کی ڈائننگ ٹیبل پر ہوتا تھا۔ شہریار اور عابد انصاری نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا۔ ڈرائیور کے بارے میں بھی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اسے بھی کھانا کھلا دیا گیا ہے۔ کھانے کے بعد [illegible] وہاں سے رخصت چاہی۔ عابد انصاری کے بنگلے سے نکل کر وہ اپنی گاڑی میں واپسی کے لیے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت خوش گوار سا احساس تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جس مشن کے تحت کام کر رہا ہے، اس کے لیے اس کا ساتھ دینے والوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا ایک قافلہ تشکیل پا رہا تھا جو اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔ سکون اور اطمینان کے اس گہرے احساس کے ساتھ وہ گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ناہموار سطح پر چلتی گاڑی کو لگنے والے ہچکولے بھی اس کے اطمینان میں فرق نہیں لا رہے تھے لیکن پھر یک دم ہی ایک زوردار جھٹکا لگا اور بریکس کی زوردار چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ شہریار نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی کے باہر نظر آنے والا منظر حیران کن تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار۔ پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

''لیفٹیننٹ ... میرا مطلب ہے زیگ؟''

زیگ نے پڑھتے ہوئے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بانڈ کو رول کر لیا۔ ''بولو جوان! ویسے تم نے میرا عہدہ بڑھا دیا ہے۔ میں ابھی جونیئر لیفٹیننٹ ہوں۔''

یہ درست تھا کہ زیگ جونیئر تھا لیکن وہ ہم سب کے لیے تو سینئر ہی تھا کیونکہ باقی تین افراد صرف سپاہی تھے۔ زیگ کوئی عمر رسیدہ یا تجربے کار شخص نہیں تھا۔ وہ اتنا ہی عمر رسیدہ یا تجربے کار تھا جتنا ایک چوبیس برس کا نوجوان ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے کہا نا کہ وہ ہمارے لیے بہت اونچی چیز تھا کیونکہ ہم میں سے کوئی بیس سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ پال، ندی کی طرف سے بالٹی میں پانی بھر کر لا رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور پال کے مقابلے میں باقی سب آرام سے تھے کیونکہ اسے کھانا بنانا تھا۔ زیگ تو باقاعدہ کمبل اوڑھے اپنے کاغذات دیکھ رہا تھا۔

جب میں فوج میں بھرتی ہوا تو میرا خیال تھا کہ ابتدائی تربیت کے بعد مجھے کسی شان دار سے فوجی اڈے پر تعینات کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے بجائے مجھے شمال مشرقی ریاست وائیومنگ بھیج دیا گیا جہاں مجھے ایک گشتی پلاٹون میں لگا دیا گیا

قانون کے رکھوالوں کے مابین انصاف کے حصول کی جنگ کا احوال

ہر ریاست کا ایک قانون ...... ایک آئین ہوتا ہے ...... ان قوانین سے انحراف سنگین جرم کے ذمرے میں آتا ہے ...... اس کے باوجود لوگ ان سے نظریں چراتے ہیں ...... اور وہ سب کر جاتے ہیں جو گرفت میں آجائے تو پھر کہیں پناہ نہیں ملتی......

سیاہ عقارت

محمد عفان آزاد

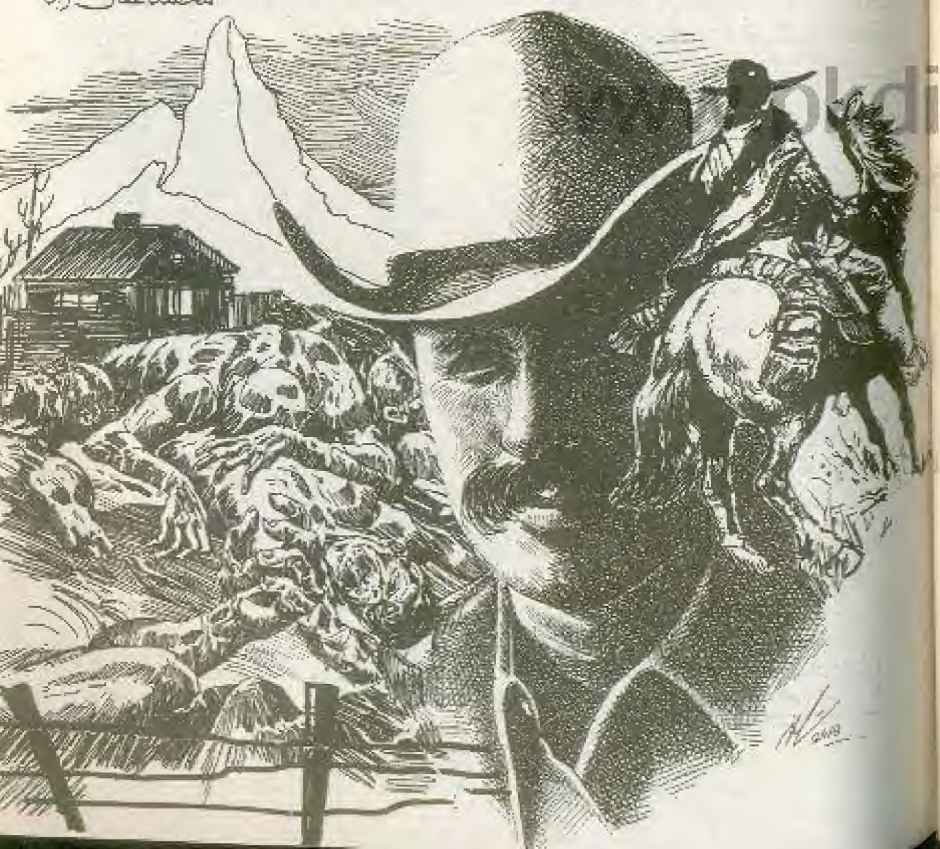

جس کا کام ساری ریاست میں مارے مارے پھرتا تھا۔ اس زمانے میں امن و امان کی ذمے داری پولیس کے ساتھ فوج کے سپرد بھی تھی۔ خاص طور سے جن ریاستوں میں ریڈ انڈین جنگجو جنگ پر آمادہ تھے، وہاں فوج مستقل گشت کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی چھاؤنی میں یہ پلاٹون مقیم تھی اور میں پہلی بار ایک دستے کے ساتھ گشت پر نکلا تھا۔ ہمیں کوئی دو ہزار میل کا سفر دو ہفتوں میں طے کرنا تھا۔ مجھے اس سفر کے مقاصد کے بارے میں خاص معلومات نہیں تھی۔ اس لیے پہلے دن سفر کے اختتام پر رکنے اور سامان اتارنے کے بعد میں زیگ کے پاس آبیٹھا۔ گھوڑوں کی نگرانی اور دیکھ بھال جیک کے سپرد تھی اس لیے وہ بھی مصروف تھا۔

''میں اس سفر کے مقاصد جاننا چاہتا ہوں۔''

میری اس بات پر زیگ نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ ہم کیوں گشت پر نکلے ہیں؟''

''نہیں... معلوم تو ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ ہمارا دائرۂ اختیار کیا ہوگا؟''

''جرائم کی روک تھام سے متعلق ہر چیز ہمارے دائرۂ اختیار میں ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا جس سے میری تسلی نہیں ہوئی۔

''فرض کرو ہم کسی شخص کو کوئی سنگین جرم کرتے ہوئے پکڑتے ہیں تو ہم اس کے ساتھ کیا کریں گے؟''

''ہم اسے پولیس کے حوالے کردیں گے۔''

''اگر پولیس اس جگہ نہ ہو تو؟''

''تب ہم اسے گرفتار کرکے اپنے ساتھ رکھیں گے اور جہاں پولیس ہوگی، وہاں اس کے حوالے کردیں گے۔''

''ٹھیک ہے... اور اگر کوئی جرائم پیشہ گرفتاری دینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر ہم کیا کریں گے؟''

''اس صورت میں اسے آمادہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔'' زیگ نے اپنی رائفل کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن میں اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی تھی اور اتنا تو میں سمجھتا تھا کہ فوج کی تربیت الگ ہوتی ہے اور پولیس کی تربیت الگ۔ پولیس مین کو ہر بات اور ہر چیز پر شک کرنا سکھایا جاتا ہے جبکہ فوج میں سپاہی کو حکم ماننا سکھایا جاتا ہے۔ یعنی بنیادی تربیت میں ہی فرق ہے۔ ایک طرف دماغ استعمال کرنے کا حکم ہے اور دوسری طرف دماغ استعمال نہ کرنے کا حکم۔ دوسرے لفظوں میں میرے نزدیک یہ سفر ایک بے کار سی مشق تھی۔ ہاں، ہمیں کہیں ریڈ انڈین قبائل کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جاتا تو اس سفر کی تک سمجھ میں آتی۔ ہم کیسے جانتے کہ کون سا شخص قانون شکنی کر رہا ہے اور کون نہیں کر رہا؟

لیکن میں نے زیگ سے مزید بحث کرنے سے اس وجہ سے گریز کیا کیونکہ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ میری بات نہیں سمجھ پایا ہے اور جو میری بات ہی نہیں سمجھ پایا، وہ میری تسلی کیسے کرتا؟ پھر وہ میرا کمانڈر تھا اور مجھے اس کے حکم کی تعمیل کرنا تھی۔ رات کا کھانا کھا کر ہم میں سے دو سو جاتے اور دو جاگ کر پہرا دیتے۔ پہلی باری میری اور پال کی تھی۔ ہم نے ایک الاؤ روشن کر رکھا تھا اور اس کے پاس بیٹھے تھے۔ گرم کوٹ، ٹوپی اور دستانوں میں بھی سردی لگ رہی تھی۔ پال نے بچی ہوئی کافی گرم کرکے دو مگوں میں نکالی اور ایک مجھے تھما دیا۔

''کل ہمیں سیکسن ویلی میں سفر کرنا ہے۔ اس پوری ریاست میں اس سے زیادہ ویران جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ یہاں ریڈ انڈین بڑی تعداد میں آباد ہیں۔''

''ان کے حملے کا خطرہ ہوگا؟''

''ممکن ہے ہو لیکن پچھلے چار برسوں میں کسی حملے کا ذکر سننے میں نہیں آیا ہے۔'' پال نے جواب دیا۔ ''اصل میں ریڈ انڈین سمجھ گئے ہیں کہ وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے اب وہ جنگ چھیڑنے سے گریز کرتے ہیں۔''

میرا تعلق ٹینیسی سے تھا جہاں میں نے کوئی ریڈ انڈین نہیں دیکھا تھا، صرف ان کے بارے میں سنا تھا۔ البتہ ہمارے علاقے میں سیاہ فام بہت تھے اور متعصب سفید فام ان پر جبر کرکے اپنی تسلی کر لیا کرتے تھے۔ میرا باپ ایک پادری تھا اور وہ صرف چالیس سال کی عمر میں مر گیا تھا لیکن اس نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا اور اس میں ایک اہم سبق یہ تھا کہ سارے انسان برابر ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے سے اس لیے برتر نہیں ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے۔ میرے خیال میں بھی یہ بات درست تھی لیکن میں اس کا اظہار کم کرتا تھا کیونکہ 1840ء کا امریکا ابھی انسانی حقوق کے معاملے میں بہت پیچھے تھا۔ وہاں سیاہ فاموں اور ریڈ انڈین کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔

''تم پہلے بھی اس علاقے میں جا چکے ہو؟'' میں نے پال سے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''دو بار جا چکا ہوں۔ سیکسن ویلی میں لوگوں نے بڑے بڑے فارم بنا لیے ہیں لیکن یہاں عام قصبے اور شہر نہیں ہیں۔ لوگ فارموں کے مالک ہیں یا ان میں کام کرتے ہیں۔''

''کیا انہیں ریڈ انڈینز کے حملوں کا خطرہ نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہے لیکن ان کے پاس آتشیں اسلحے کی کمی نہیں ہے اور ہر شخص اسلحہ چلانا جانتا ہے۔ میں نے چار پانچ سال کے بچوں کو بھی پستول سے فائرنگ کی مشق کرتے دیکھا ہے۔''

''وہ اتنے چھوٹے بچوں کو اسلحہ دے دیتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' پال نے شانے اچکائے۔ ''لیکن یہ ان کا طرزِ زندگی ہے۔ اپنے مسائل سے یہ خود بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔''

جب ہماری سونے کی باری آئی تو ہم نے زیگ اور جیک کو جگا دیا۔ ہمارے اوقاتِ کار کچھ اس طرح تھے کہ ہم دن میں دس گھنٹے سفر کرتے اور دو گھنٹے کھانے میں لگتے تھے جبکہ باقی بارہ گھنٹے میں سے باری باری چھ چھ گھنٹے کے لیے سوتے تھے۔ اس مشقت کے بعد ایسی نیند آتی کہ لیٹتے ہی سو جاتے اور پھر جب کوئی جگاتا تو تب ہی جاگتے۔ اگلے دن ناشتہ کرکے ہم سیکسن ویلی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ کوئی وادی نہیں تھی بلکہ دور تک پہاڑوں میں گھرے ایک علاقے کا نام تھا۔ یہاں سبزہ کم اور جنگل پہاڑ زیادہ نظر آتے تھے۔ حالانکہ یہاں ندیاں اور دریا وافر مقدار میں تھے۔

سارا دن سفر کے دوران ہمیں کئی فارم نظر آئے جن میں لوگ کام کر رہے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہر فارم کے گرد مضبوط خاردار تار کی دہری باڑھ لگی تھی۔ اگر انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا تو اس کی کیا ضرورت تھی؟ ہم کہیں رکے نہیں۔ البتہ جب شام کو ایک فارم کے سامنے پہنچے تو وہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جیسے وہاں جنگ ہو کر ابھی ختم ہوئی ہو۔ وہاں کم سے کم ایک درجن ریڈ انڈینز جنگجوؤں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جنہیں چار افراد اٹھا کر ایک گھوڑا گاڑی پر رکھ رہے تھے۔ فضا میں خون اور بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر لاشیں اٹھانے والے رک گئے۔ زیگ آگے بڑھا اور اس نے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

ایک شخص نے اپنا ہیٹ اتار کر کہا۔ ''یہ تو مسٹر بینگل بتا سکتے ہیں سر!''

''بینگل کون ہے؟''

''اس فارم کے مالک... ہم سب ان کے ملازم ہیں۔''

بینگل اور اس کے دوسرے آدمیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے فارم کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں زمین پر بے شمار کارتوسوں کے خول بکھرے ہوئے تھے جبکہ باہر مجھے کوئی کارتوس نظر نہیں آیا تھا۔ بینگل ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت بھی پی رہا تھا اور اس کے آس پاس نصف درجن مسلح افراد تھے۔ اس نے زیگ سے ہاتھ ملایا۔ ''تمہیں کس نے اطلاع دی لیفٹیننٹ؟''

''کس بات کی اطلاع؟''

''یہی کہ میرے فارم پر ان لوگوں نے حملہ کر دیا ہے۔'' اس نے گھوڑا گاڑی پر بار کی جانے والی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان ایک درجن ریڈ انڈینز نے؟'' زیگ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں... نہیں۔'' بینگل نے ہاتھ لہرایا۔ ''ان کی تعداد سو کے قریب تھی۔''

''سو افراد نے حملہ کیا تھا؟'' زیگ نے مڑ کر فارم کے سامنے کھلے میدان کی طرف دیکھا۔ ''اس طرف سے آئے تھے؟''

بینگل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ سامنے والی

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ہیئر ڈریسنگ	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ہوسٹنگ	بیسک فیشن	آٹو سروسنگ
ریڈیو ٹی وی ریکارڈنگ	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ملٹی لنگول ٹیچنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹو گرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
ہومیوپیتھی	شمسی توانائی	مہر سازی	حکمت
ماڈرن میڈیکل	لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ
ایگریکلچر	میڈیکل لیب	آرکیٹیکچرل	ٹیلرنگ
پولٹری ڈیری فارمنگ	ٹیوب ویل	ویلڈنگ	پبلک ہیلتھ

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237 جی پی او اسلام آباد

پہاڑی کے پیچھے سے نکلے تھے۔''
''وہ مسلح تھے؟''
''ہاں، ان کے پاس پرانی طرز کی بندوقیں تھیں۔'' بینگل نے جواب دیا۔
زنیگ نے بینگل کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگوں کے پاس جدید ہتھیار ہیں؟''
بینگل نے فخر سے سر ہلایا۔ ''ہاں، اسی سے اندازہ لگالو کہ ہم ایک درجن افراد نے ان سو کا مقابلہ کیا اور انہیں مار بھگایا۔''
''سوائے ان کے!'' میں نے لاشوں کی طرف دیکھا۔
''ہاں، یہ میرے آدمیوں نے ایک ہی ہلے میں مار گرائے تھے۔ اس کے بعد ان کے قدم رک گئے، وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی بھاگ نکلے۔''
''تم ان لاشوں کا کیا کررہے ہو؟'' زنیگ نے اگلا سوال کیا۔
''ان کو دریا کے کنارے ڈلوادوں گا جہاں سے ریڈ انڈینز خود انہیں لے جائیں گے۔'' بینگل بے پروائی سے بولا۔
''کیا تم نے حکام کو اس واقعے کی اطلاع دی ہے؟''
بینگل تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''حکام؟... یہاں اس نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ہمیں تمام مسائل سے خود نمٹنا ہوتا ہے اور اپنے سارے فیصلے بھی خود کرنے ہوتے ہیں۔''
''گویا تم اس حملے کی اطلاع کسی مقامی دفتر میں نہیں دو گے؟''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' بینگل نے ایک بار پھر... بے پروائی سے کہا۔ ''ہم نے اپنے مجرموں کو خود سزا دے دی ہے۔''
''لیکن اس... تعے کی رپورٹ کرنا لازمی ہے۔'' زنیگ نے اصرار کیا۔ ''کیونکہ میں اس کی رپورٹ کروں گا اور اگر تم نے نہیں کی تو تم مصیبت میں پڑ سکتے ہو۔''
بینگل کچھ دیر زنیگ کو دیکھتا رہا جیسے اس کی بات کو تول رہا ہو پھر اس نے سر ہلایا۔ ''اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم کہتے ہو تو میں رپورٹ کردوں گا۔''
زنیگ، بینگل سے بات کرنے میں مصروف تھا، میں نے سوچا ذرا گھوم پھر کر دیکھ لوں۔ میں مکان کی سیڑھیوں سے اتر کر پہلے سامنے احاطے میں آیا اور پھر دروازے سے باہر نکلا۔ دروازہ انگل آئرن کا تھا، اس پر بھی خاردار تاریں لگائی گئی تھیں۔ لاشیں جمع کرنے والے تمام لاشوں کو گاڑی میں ڈال چکے تھے۔ میں نے ذرا قریب سے لاشوں کا معائنہ کیا۔ ریڈ انڈین جنگجوؤں نے موسم کی مناسبت سے موٹا لباس پہن

رکھا تھا اور ان کے لباس خون سے رنگین ہورہے تھے۔ مجھے ان کے پاس ہتھیار نظر نہیں آئے لیکن میں نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر میں نے میدان کا معائنہ کیا۔ یہ ریتلا میدان تھا اس لیے تمام نقش بہت واضح تھے۔ جب میں میدان کا معائنہ کررہا تھا تو بینگل کے ملازمین گاڑی لے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ چار افراد یہ تھے اور چھ بینگل کے ساتھ تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس ایک درجن ملازمین تھے تو باقی دو کہاں تھے؟
میں واپس احاطے میں آیا۔ سرما کا سورج تیزی سے غروب ہورہا تھا۔ اس دن سورج پوری طرح چمک رہا تھا اور میرے حساب سے آج کا دن حملے کے لیے بالکل بھی موزوں نہیں تھا۔ بینگل کا مکان قلعہ نما تھا اور اس کی تعمیر میں زیادہ تر پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ اس دو منزلہ مکان کی چھت لکڑی کی تھی۔ اس میں کھڑکیاں اور دروازے کم تھے۔ اسی وجہ سے اس کی ساخت قلعہ نما لگ رہی تھی لیکن اس کے باوجود یہ خوب صورت مکان تھا۔ اس کے چاروں طرف یوکلپٹس کے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ تین اطراف میں یہ کسی دیوار کی طرح اونچے اور گھنے تھے لیکن سامنے کی طرف ان کی تعداد کم تھی۔
بینگل کا فارم، مکان کے عقب میں تھا اور اس وقت زمین پر شاید چقندر اور آلو کاشت کیے گئے تھے۔ ان کی فصل بس نکالی جانے والی تھی۔ اس کے بعد برف باری شروع ہو جاتی اور کاشت کاری بند کردی جاتی۔ میں مکان کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ جب میں درختوں سے دوسری طرف آیا تو فارم کی وسعت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ کم سے کم بھی تین سو ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اسے کاشت کرنے اور اس کی پوری طرح دیکھ بھال کرنے کے لیے کم سے کم تیس سے پینتیس افراد کی ضرورت تھی۔ فارم مکمل طور پر استعمال میں تھا اور اس کے ہر حصے پر آلو اور چقندر کے پودے موجود تھے۔
بہت دور فارم کے آخری حصے میں مجھے سیاہ رنگ کا ایک دو منزلہ مکان نظر آیا۔ وہ شاید بینگل کے ملازمین کے لیے مخصوص تھا۔ مکان اتنا بڑا تھا کہ اس میں تیس پینتیس افراد آرام سے رہائش اختیار کرسکتے تھے۔ مکان تک جانے کے لیے ایک چوڑا کچا راستہ تھا جس پر دو گھوڑے آرام سے پہلو بہ پہلو دوڑ سکتے تھے۔ میں ابھی فارم دیکھ رہا تھا کہ عقب سے آہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہ بینگل کے مسلح افراد میں سے ایک تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی لیکن اس نے اسے چھپانے کے لیے کپڑا وغیرہ باندھنے کا تکلف نہیں کیا تھا اور اس کی نمائش کررہا تھا۔ اس کے خیال میں

شاید اس طرح وہ زیادہ خوفناک نظر آرہا تھا۔
''کیا ہورہا ہے لڑکے؟'' اس نے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کی۔
''میرا نام چارلس ہے۔'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔
''کوئی بات نہیں... چارلس ہی سہی۔'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''
''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔
''تمہیں واپس جانا چاہیے اور اپنی پارٹی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ یہ جگہ اکیلے آدمیوں کے لیے بہت خطرناک ہے۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔
''میں اکیلا نہیں ہوں۔'' میں نے کہا اور دور سیاہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا وہ مکان بھی اس فارم کا ایک حصہ ہے؟''
''وہاں فارم پر کام کرنے والے رہتے ہیں۔'' وہ بولا۔
''لیکن مجھے فارم پر کوئی کام کرتا نظر نہیں آرہا۔'' میں نے شک سے کہا۔ ''جبکہ فصل تیار ہے۔ یہ کب اتاری جائے گی؟''
''جلد اتار لی جائے گی۔'' اس نے کہا اور اپنے ہولسٹر پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں مکان کی طرف چلنا چاہیے۔''
میں کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر میں نے شانے اچکائے اور مکان کی طرف چل پڑا۔ زنیگ برآمدے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''چلو، ہم رات یہیں رکیں گے۔''
میں سمجھا کہ وہ فارم پر رکنے کی بات کررہا ہے لیکن جب وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا تو پال اور جیک نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس لیے میں بھی اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ بینگل اپنے آدمیوں سمیت برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''اس علاقے میں رکنے کے بجائے اگر تم آگے نکل جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔''
زنیگ نے اپنے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد سرد لہجے میں کہا۔ ''مشورے کا شکریہ... ہم یہیں قیام کریں گے۔''
''یہاں ریڈ انڈینز کے حملے کا خطرہ ہوتا ہے۔''
''ہم ہر خطرے سے نمٹنا جانتے ہیں۔'' زنیگ نے کہا اور گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے آہستہ سے کہا۔
''یہ لوگ شاید جھوٹ بول رہے ہیں، یہاں سب ویسا نہیں ہوا ہے جیسا کہ یہ لوگ بیان کررہے ہیں۔''
میرا خیال تھا کہ زنیگ اس بارے میں کوئی بات کرے

گا لیکن اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ جھوٹ بول رہے ہیں تو اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''
''ممکن ہے یہ جرم کررہے ہوں؟''
''جب تک اس کا واضح ثبوت نہیں ہوگا ہم کچھ نہیں کرسکتے۔'' اس نے کہا۔ ہم نے پڑاؤ کے لیے فارم کے سامنے پہاڑیوں کا رخ کیا اور یہ وہی جگہ تھی جہاں سے بقول بینگل کے ریڈ انڈینز نے نکل کر حملہ کیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ جگہ بہت خطرناک تھی لیکن زنیگ نے اسی جگہ کو رات گزارنے کے لیے منتخب کیا۔ پال اور میں سامان اتارنے میں لگ گئے۔ آج کھانا بنانے کی باری جیک کی تھی۔ ہم لوگوں نے کام بانٹ رکھے تھے۔ ہر روز ذمے داریاں بدل جاتی تھیں۔ سامان اتار کر رکھنے کے بعد ہم الاؤ جلانے کی تیاری کرنے لگے کیونکہ سورج غروب ہوتے ہی سردی میں بہت تیزی سے اضافہ ہو جاتا تھا۔ خشک لکڑیاں جمع کرنے کے دوران میں نے پہاڑیوں کو دوسری طرف سے دیکھا۔ اس طرف ایک خشک نالا تھا اور اس کے پار دور تک تہ در تہ پہاڑیوں کا طویل... سلسلہ تھا۔ ریڈ انڈینز اسی طرف سے آتے تھے۔ میں نے واپس آکر زنیگ سے کہا۔
''ہمیں کسی اونچی جگہ پڑاؤ ڈالنا چاہیے۔ ممکن ہے آج رات ریڈ انڈینز پھر حملہ کریں۔''
زنیگ بیٹھا رہا۔ ''نہیں، وہ حملہ نہیں کریں گے۔ یہ لوگ کبھی فوراً پلٹ کر حملہ نہیں کرتے بلکہ دوبارہ تیاری کے ساتھ اور پہلے سے مختلف انداز میں حملہ کرتے ہیں۔''
میں نے زنیگ کو فارم کے عقبی حصے میں ملازموں کے لیے مخصوص مکان کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اس میں کیا خاص بات ہے؟ ہر فارم پر ملازموں کی رہائش کے لیے مخصوص مکان ہوتا ہے۔''
''مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے کہا اور الاؤ جلانے کی تیاری کرنے لگا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ زنیگ نے اگرچہ ریڈ انڈینز کے حملے کا خدشہ مسترد کردیا تھا لیکن اس نے میری تجویز کے مطابق پڑاؤ کو ایک ٹیلے پر منتقل کردیا۔ یہاں ہم براہِ راست سرد ہواؤں کی زد میں تھے لیکن یہاں سے دور تک صاف نظر آرہا تھا۔ کھانے کے بعد میں اور زنیگ سو گئے۔ چھ گھنٹے بعد ہمیں اٹھا دیا گیا۔ پال اور جیک سو گئے۔ میں اور زنیگ الاؤ کے پاس آبیٹھے۔ زنیگ نے کافی بنائی۔
اس جگہ سے بینگل کا مکان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے زنیگ سے پوچھا۔ ''بینگل کا کیا کہنا ہے، ریڈ انڈینز

www.pkdigest.com

نے حملہ کیوں کیا تھا؟"

زیگ نے کافی کا گھونٹ لیا۔ "ریڈ انڈینز اس زمین کے دعوے دار ہیں اور وہ بینگل سے زمین خالی کرانے کے لیے حملے کرتے رہتے ہیں۔"

"یعنی یہ پہلا موقع نہیں تھا جب انہوں نے حملہ کیا؟"

"ہاں، اس سے پہلے بھی وہ دو بار حملہ کر چکے ہیں۔"

"ان حملوں میں ریڈ انڈینز کا کتنا جانی نقصان ہوا تھا؟"

"بینگل اس سوال کا جواب ٹال گیا تھا لیکن ان تین حملوں میں اس کا کوئی آدمی نہیں مرا۔"

"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اس کے آدمی بہترین نشانے باز ہیں۔"

"آدمی کتنا ہی ماہر نشانے باز کیوں نہ ہو، اگر اتنی بڑی تعداد میں لوگ حملہ کریں تو کچھ نہ کچھ نقصان تو ہوتا ہے۔"

"اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس کا مکان کسی قلعے کی طرح محفوظ ہے۔"

مکان واقعی قلعے کی طرح محفوظ تھا۔ زیگ نے مگ خالی کر کے نیچے رکھ دیا اور اپنے بیگ سے کاغذات نکال کر ان کا معائنہ کرنے لگا۔ پتا نہیں یہ کیسے کاغذات تھے، اسے جہاں موقع ملتا وہ انہیں دیکھنے لگ جاتا۔ میں اسے کاغذات دیکھتے چھوڑ کر اٹھا اور ٹیلے سے نیچے جانے لگا۔ عقب سے زیگ نے پکارا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"فارم کا قریب سے معائنہ کرنے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوشیار رہنا، کہیں وہ تمہیں... ریڈ انڈین سمجھ کر گولی نہ مار دیں۔"

میں سر ہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔ آسمان پر تیسری یا چوتھی کا چاند تھا اور ستاروں کے ساتھ اس کی بہت ہلکی سی روشنی تھی۔ مجھے سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ نیچے آ کر میں نے فارم کی طرف دیکھا۔ بینگل کے مکان میں تیز روشنیاں تھیں اور خاص طور سے سامنے والے حصے میں بہت تیز روشنی والے لیمپ جل رہے تھے اس لیے میں نے مکان کے سامنے جانے سے گریز کیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، میں نے ایک طرف کا رخ کیا۔ اس طرف تاریکی تھی۔ میری رائفل میرے پاس تھی۔ میں دبے قدموں چل رہا تھا۔ اس طرف راستہ بہت دشوار تھا۔ کئی بار میں گرتے گرتے بچا اور مجھے خیال آیا کہ مجھے واپس چلے جانا چاہیے لیکن کوئی جذبہ تھا جو مجھے آگے لیے جا رہا تھا۔

کوئی تیس منٹ بعد میں سیاہ عمارت کے پاس تھا لیکن اس تک جانے کے لیے مجھے دہرے خاردار تاروں کی باڑھ عبور کرنا تھی۔ خاردار باڑھ بہت گھنی تھی اور اس میں راستہ بنانا بہت دشوار تھا اس لیے میں نے آسان راستہ اختیار کیا۔ میں نے رائفل کی سنگین اتار کر اس کی مدد سے زمین کھودنا شروع کی۔ سردی کی وجہ سے زمین کسی قدر سخت ہو رہی تھی لیکن میرے لیے خاص مسئلہ نہیں ہوا اور میں نے دس منٹ میں باڑھ کے نیچے گڑھا کر کے راستہ بنا لیا اور اس کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف آ گیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہاں کتے نہیں ہیں۔ ورنہ جب میں زمین کھود رہا تھا، وہ آ موجود ہوتے۔

اندر آنے کے بعد میں نے رائفل تیار کر لی تھی کیونکہ اب کسی وقت بھی میرا کسی سے سامنا ہو سکتا تھا۔ میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا سیاہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ ایک لمبی اور چوکور ساخت کی دومنزلہ عمارت تھی جس میں اوپر نیچے ایک ہی انداز میں کھڑکیاں لگی تھیں اور ان کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ پہلے میں عقبی حصے میں آیا۔ اس طرف ایک دروازہ تھا اور وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کے بعد میں سامنے کی طرف آیا۔ اس طرف بھی ایک ہی دروازہ تھا اور وہ بھی بند تھا لیکن اسے باہر سے تالا ڈال کر بند کیا گیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ دروازے میں باہر سے تالا کیوں ڈالا گیا تھا؟ کیا عمارت کے اندر کوئی نہیں تھا؟ لیکن عمارت کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا یعنی اندر کوئی تھا، تب ہی تو آتش دان کام کر رہے تھے۔ میں عمارت میں داخل ہونے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ چند گھڑسوار آتے دکھائی دیے۔ میں جلدی سے وہاں رکھے کچھ ڈرموں کی آڑ میں ہو گیا۔

آنے والے تین تھے۔ وہ آ کر عمارت کے سامنے رکے اور گھوڑوں سے اتر کر وہ عمارت کے سامنے والے دروازے کی طرف آئے۔ انہوں نے بھاری کوٹوں کے ساتھ فلیٹ ہیٹ لگا رکھے تھے اس لیے ان کی شکلیں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن جب ان میں سے ایک بولا تو میں پہچان گیا۔ وہ بینگل تھا۔ اس نے مخصوص بھاری آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

"ابھی کھولتا ہوں باس۔" دوسرے نے جیب سے چابی نکالتے ہوئے کہا۔ وہ وہی یک چشم تھا۔ تیسرا بھی ان کا ساتھی ہی تھا۔ دروازہ کھلنے پر وہ تینوں اندر چلے گئے اور دروازہ کھلا رہ گیا۔ انہوں نے اسے اندر سے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں بھی ان

کے پیچھے اندر آ گیا۔ سامنے ایک گیلری تھی لیکن اس میں کوئی نہیں تھا اور نہ اس میں کوئی فرنیچر تھا۔ فرش اور دیواریں پتھر کی تھیں۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ میرے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے۔ اچانک مجھے کسی کی سسکی سنائی دی تو میں رک گیا۔ آواز دائیں طرف کے ایک کمرے سے آئی تھی۔ اس کا دروازہ باہر سے بند تھا اور اس پر بھی تالا تھا۔ ظاہر ہے، میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے سسکی نظرانداز کر کے میں آگے بڑھا۔ میں بینگل اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کر رہا تھا کہ وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟

راہداری آگے جا کر بائیں طرف مڑ رہی تھی۔ میں نے جھانکا تو مجھے نیچے سیڑھیاں جاتی نظر آئیں۔ سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور نیچے سے ان تینوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے یک چشم کو کہتے سنا۔ "یہ کیسی رہے گی باس؟"

"نہیں۔" بینگل بولا۔ "یہ میرے پاس آ چکی ہے۔ کوئی اور دیکھو۔"

میں سیڑھیوں تک آیا۔ یہاں سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا، بس سامنے کا ایک حصہ نمایاں تھا جس میں ایک فولادی پنجرے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں دبے قدموں ذرا نیچے تک آیا، تب مجھے پنجرے کا بقیہ حصہ بھی نظر آنے لگا۔ پنجرے میں کم سے کم دس لڑکیاں بند تھیں اور دوسری طرف مجھے بینگل اور اس کے ساتھی نظر آ رہے تھے۔ ان کی توجہ پنجرے کی طرف نہیں تھی۔ یہ لڑکیاں ریڈ انڈین تھیں اور انہوں نے اپنے مخصوص طرز کے لباس پہن رکھے تھے۔ وہ سہم کر ایک دوسرے میں گھسی جا رہی تھیں۔

ان کی حالت اور پنجرہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ ان کو غیر قانونی طور پر حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاید وہ ان سے زیادتی بھی کرتے تھے جیسا کہ ابھی بینگل نے کسی لڑکی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اس کے پاس پہلے بھی آ چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ کسی ایک یا اس سے زیادہ لڑکیوں کو لے جانے کے لیے آئے تھے۔ امریکی قانون کسی شہری کو اس طرح قید میں رکھنے اور اس پر کسی قسم کا تشدد کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ لوگ میری نظروں کے سامنے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے اور انہیں روکنا میرا فرض تھا۔

جیسے ہی یک چشم نے پنجرے کا دروازہ کھولا، میں نے ان لوگوں پر رائفل تان لی اور بلند آواز سے بولا۔ "کوئی حرکت نہ کرے، میں قانون کے نام پر حکم دیتا ہوں۔"

یک چشم اور باقی سب ساکت ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ کوئی حرکت نہیں کریں گے لیکن یک چشم نے پھرتی سے پستول نکال کر فائر کیا اور میں بال بال بچا۔ گولی میرے بالکل پاس سیڑھی پر لگی تھی۔ میں نے ایک فائر کیا تو وہ بھی تیزی سے تتر بتر ہو گئے۔ میں ذرا اوپر آ گیا کیونکہ سیڑھیوں پر خطرہ تھا اور وہ مجھے نشانہ بنا سکتے تھے۔ میرے پسپا ہونے سے انہیں حوصلہ ہوا اور وہ بیک وقت سیڑھیوں پر چڑھ آئے۔ ساتھ ہی وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی یلغار سے بچنے کے لیے مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ بینگل بلند آواز سے گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے مزید چند فائر کیے اور پھر اپنی رائفل لوڈ کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"تم لوگ قانون سے ٹکرا کر اچھا نہیں کر رہے۔"

اس پر بینگل نے قانون کو ایک موٹی سی گالی دی اور دہاڑ کر بولا۔ "میں تم سب کو یہیں دفن کر دوں گا۔"

"تم قانون کے رکھوالوں پر حملہ کر کے سنگین جرم کر رہے ہو۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "اگر تم نے ہتھیار ڈال کر اپنے اقدام کی وضاحت نہ کی تو تمہیں عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

اس پر بینگل کے تیسرے ساتھی نے طیش میں آ کر عدالت کو بھی گالی دی اور اوپر آنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی اس کا سر سیڑھیوں سے نمودار ہوا، میں نے اسے گولی مار دی۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی اور وہ واپس نیچے لڑھک گیا۔ اس پر بینگل اور یک چشم نے پاگلوں کی طرح فائرنگ شروع کر دی اور مجھے گولیوں سے بچنے کے لیے ایک ستون کی آڑ میں ہونا پڑا۔ اسی لمحے بینگل کو نکلنے کا موقع مل گیا کیونکہ میں پسپا ہوتے ہوئے سیڑھیوں والی راہداری میں دائیں والے حصے میں آ گیا تھا۔ میں نے وہاں سے بھاگتے ہوئے بینگل پر فائر کیا لیکن وہ بچ کر باہر والی راہداری میں نکل گیا۔ سیڑھیوں پر یک چشم موجود تھا۔ اس کی وجہ سے میں بینگل کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ یک چشم نے قہقہہ لگایا۔

"اب کچھ دیر میں ہمارے ساتھی آ جائیں گے اور تم نہیں بچو گے۔"

"تم اپنی فکر کرو۔" میں نے رائفل کو لوڈ کرتے ہوئے کہا۔

یک چشم وقفے وقفے سے ہاتھ نکال کر میری طرف فائر کر رہا تھا۔ میں ستون کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا لیکن ساتھ ہی میں اس پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ اگر بینگل اپنے لڑکوں کو لے کر آ جاتا تو میرا نکلنا ناممکن ہو جاتا اور وہ مجھے نہیں بخشتے۔ مگر یک چشم میرے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔ میں نے رائفل کا رخ سیڑھیوں کی طرف کر دیا اور انتظار کرنے لگا کہ

www.pkdigest.com

کب یک چشم ہاتھ نکال کر فائر کرتا ہے۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ نمودار ہوا، میں نے فائر کیا اور اس کا پستول اڑ گیا۔ ساتھ ہی اس نے چیخ کر گالی بھی دی۔ وہ شاید زخمی ہوا تھا۔ میں سیڑھیوں کی طرف دوڑا اور بروقت وہاں پہنچا... کیونکہ یک چشم زمین پر پڑا اپنا پستول اٹھا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر پستول کا رخ میری طرف کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ جھٹکے سے فرش پر جا گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا ساتھی بھی اس کے برابر میں پڑا تھا۔ میں نے نیچے آ کر یک چشم کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکا تھا۔ پنجرے میں بند لڑکیاں یہ قتل و غارت گری دیکھ رہی تھیں۔ میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے ان کی طرف توجہ دیے بغیر میں نے یہاں سے نکلنے کا سوچا اور اوپر آیا لیکن جیسے ہی میں نے باہر جانے والا دروازہ کھولا، سامنے ہی چھ سات گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ اب فرار کا موقع نہیں تھا۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا اور واپس تہ خانے کی طرف آیا۔ مجھے مزید اسلحہ درکار تھا۔ میں نے یک چشم اور اس کے ساتھی کے پستول اور گولیوں کی بیلٹ نکال لی تھی۔ اوپر وہ لوگ کسی چیز کی مدد سے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اوپر آیا اور دروازے پر دو تین فائر کیے۔ باہر سے کسی کی چیخ سنائی دی پھر وہ واپس بھاگے اور اس کے بعد جوابی فائر کرنے لگے۔ گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی راہداری میں آ رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی میرے جسم میں بھی اتر سکتی تھی اس لیے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اندر آ جاؤں۔ میں سیڑھیوں کی... طرف والی راہداری میں آ گیا۔

باہر سے ہونے والی فائرنگ نے بالآخر دروازے کی کنڈی والا حصہ توڑ دیا اور اس کے پٹ کھل گئے۔ اب بینگل کے آدمی دروازے کے دائیں بائیں آ کر اندر فائر کر رہے تھے اور ان کو مزید اندر آنے سے روکنے کے لیے میں بھی وقفے وقفے سے فائر کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے فکر تھی کہ میں ان کو کتنی دیر روک سکوں گا کیونکہ میرے پاس ایمونیشن محدود تھا۔ جب میرا ایمونیشن ختم ہو جاتا تو وہ اندر آ جاتے اور اس کے بعد میں ان کے رحم و کرم پر ہوتا۔ اس لیے میں بہت کم فائر کر رہا تھا۔ اس سے بھی ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ میرا ایمونیشن کم رہ گیا ہے۔

میں نے کچھ دیر بعد فائر کرنا بالکل روک دیا۔ وہ کچھ دیر تو انتظار کرتے رہے لیکن جب میں نے فائر نہیں کیا تو انہوں نے ہمت کی اور دروازے سے اندر آ گئے۔ جب وہ اتنا آگے آ گئے کہ پلٹ کر نہ جا سکیں تو میں نے اچانک ہی آڑ سے نکل کر دو لگاتار فائر کیے اور ان کے جوابی فائر سے پہلے دوبارہ آڑ میں ہو گیا۔ ایک آدمی کو گولی لگی تھی، وہ نیچے گرا اور چیخنے لگا۔ اس کا ساتھی اسے اٹھا کر باہر لے جانے لگا کہ میں نے اس بار نیچے سے ہاتھ باہر نکالا اور سہارا دینے والے کی ٹانگ میں گولی اتار دی۔ میں چاہتا تو دونوں کو مار سکتا تھا کیونکہ ان کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے باہر والے مجھ پر فائر کرنے سے قاصر تھے۔ جیسے ہی دونوں زخمی کسی نہ کسی طرح باہر گئے، انہوں نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔

مجھے امید تھی کہ اس دھچکے کے بعد وہ اتنی جلدی اندر آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایک رائفل اور دو پستولوں کے بل پر میں ان کو صبح تک روک سکتا تھا یا کم سے کم اتنی دیر تو روک سکتا تھا کہ زیگ کو میری گم شدگی کا احساس ہو جاتا۔ مجھے یہ امید بھی تھی کہ فائرنگ کی آواز میرے ساتھیوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔ خاص طور سے مکان سے باہر ہونے والی فائرنگ کی آواز ٹیلوں تک لازمی سنی گئی ہو گی۔ اگر ایسا تھا تو وہ بھی کچھ دیر میں میری مدد کو آ سکتے تھے۔

باہر موجود لوگ ایک دوسرے پر چیخ چلا رہے تھے۔ پانچ افراد کے ہلاک یا زخمی ہونے کے بعد ان کا صبر جواب دے گیا تھا۔ کبھی کبھی بینگل کی آواز آتی تھی۔ وہ بھی مجھے اور کبھی اپنے ساتھیوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک کم عمر جوان سپاہی اس کے تجربے کار لوگوں پر حاوی آ جائے گا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اگر میں بچ گیا تو وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر مجھے مار ڈالنے پر تل گیا تھا۔ پھر اس نے بہت ہی خطرناک حربہ استعمال کیا۔ اچانک ہی ایک لکڑی کا پائپ اندر پھینکا جس میں بارود بھرا ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی میں سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ وہ اسے فائر کر کے اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں سیڑھیوں پر آیا، ایک گولی اسے لگی اور خوفناک دھماکا ہوا۔ میں جیسے اڑ کر فرش پر جا گرا۔ ہاتھ سامنے کرنے سے میرا منہ فرش سے ٹکرانے سے محفوظ رہا تھا۔ اس کے بعد مجھ پر ملبے کی بارش ہو گئی۔ ریڈ انڈین لڑکیاں خوف زدہ ہو کر چلا رہی تھیں۔ میں بہ مشکل اٹھا اور ایک طرف ہو گیا۔ اب وہ مجھے مارنے کے لیے اندر آنے والے تھے۔ ایک آڑ میں مورچا سنبھال کر میں آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ بارود کے دھماکے نے ساری فضا کو دھواں دھواں کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ آنے والوں کو میں فوراً نظر نہیں آؤں گا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں مزید ایک دو کو مار

گراؤں گا۔

بینگل کے آدمی مجھ سے خوف زدہ تھے کیونکہ دو افراد تو یقینی طور پر مارے جا چکے تھے اور تین زخمی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کتنے مارے گئے تھے۔ اس لیے وہ بم کے حملے کے بعد بھی فوراً اندر آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ خاصی دیر بعد جب دھواں کم ہوا تو اوپر سیڑھیوں کی طرف سے کچھ سائے نمودار ہوئے۔ تہ خانے میں ایک لیمپ روشن تھا لیکن اوپر والا لیمپ اس دھماکے میں تباہ ہو گیا تھا۔ پہلے ایک آدمی کے پاؤں نمودار ہوئے، اس کے پیچھے دوسرا تھا۔ میں نے پہلے پیچھے والے کے پیر پر پستول سے لگاتار فائر کیے تو وہ چیخ مار کر اپنے ساتھی پر گرا اور اسے لیتا ہوا نیچے تک آیا۔ اس کا ساتھی سنبھلتے ہوئے اپنی رائفل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے مجھے اس کو شوٹ کرنا پڑا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور وہ فوراً مر گیا۔ جس کے پاؤں میں گولی لگی تھی، اس نے دہشت زدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور ہاتھ اوپر کر لیے۔

"مجھے مت مارو۔"

"نیچے منہ کر کے لیٹ جاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔ "ہاتھ سامنے پھیلا لو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ مجھے انتظار تھا کہ اب کون نیچے آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اوپر کتنے لوگ ہیں؟"

"بینگل سمیت پانچ لوگ ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

اس لمحے اوپر سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ پہلے میں سمجھا کہ بینگل اور اس کے ساتھی فائرنگ کرتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں لیکن جب کان لگا کر سنا تو یہ فائرنگ مکان سے باہر ہو رہی تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ شاید میرے ساتھی آ گئے تھے۔ کچھ دیر تک دھواں دھار فائرنگ ہوتی رہی پھر اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے جیک کی آواز سنی۔

"چارلس! تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں۔" میں نے چلا کر کہا۔ "جیک! نیچے آ جاؤ۔"

جیک سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور اس نے مجھے آگاہ کیا۔ "اوپر ہم نے قابو پا لیا ہے۔"

"یہ زندہ ہے۔" میں نے اوندھے منہ لیٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "اوپر کیا صورتِ حال ہے؟"

"بینگل کے سوا سب مارے جا چکے ہیں۔ وہ بھی زخمی ہے لیکن مرے گا نہیں۔"

ہم زخمی قیدی کو سہارا دے کر اوپر لائے۔ زیگ اور پال مرنے والوں کو چیک کر رہے تھے۔ بینگل ایک طرف بندھا پڑا تھا۔ میں نے زیگ سے کہا۔ "تم لوگ فائرنگ کی آواز سن کر آئے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں... یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"بینگل نے نیچے ریڈ انڈینز لڑکیوں کو قید کر رکھا ہے۔ شاید یہ ان سے زمین پر کام لیتے ہیں اور ان سے زیادتی بھی کرتے ہیں۔"

زیگ نے سر ہلایا۔ "تو اس وجہ سے ریڈ انڈینز نے ان پر حملہ کیا تھا۔"

"یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ دوسرے مجھے شبہ ہے کہ یہاں کمروں میں کچھ اور لوگ بھی قید ہیں۔"

ہم نے کچھ دیر میں کمروں میں بند کوئی پچاس ریڈ انڈینز بچوں کو نکال لیا۔ ان کی عمریں دس سے پندرہ سال کے درمیان تھیں اور ان میں لڑکیاں اور لڑکے دونوں شامل تھے۔ جوان لڑکیوں کو انہوں نے پنجروں میں بند کر دیا تھا۔ بینگل اصل میں ان سے اپنی زمین پر بیگار لیتا تھا۔ اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا اور صرف گالیاں دے رہا تھا لیکن اس کے زخمی ساتھی نے بتا دیا کہ ان سب ریڈ انڈینز کو ان کے قبیلوں سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔ ان سے زمینوں پر کام لیا جاتا تھا اور کام کے بعد ان کو اس عمارت میں قید کر دیا جاتا..... ان کو اسی کمرے میں رکھا جاتا... اور وہ رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکالے جاتے تھے۔ اس وجہ سے کمرے متعفن ہو رہے تھے۔ ان کو دو وقت کھانے کو معمولی سا کھانا دیا جاتا اور جو کام میں سستی کرتا یا انکار کرتا، اس کی ہنٹر سے مار لگائی جاتی۔ ان میں سے کئی بچے کئی سال سے قید تھے۔

جوان لڑکیوں کو یہ عیاشی کے لیے الگ رکھتے تھے اور ان سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ ان کو کھانا پینا بھی بہتر ملتا تھا لیکن ان کو بھی سخت قید میں ہی رکھا جاتا تھا۔ ان کا پنجرہ تو میں خود بھی دیکھ چکا تھا۔ زیگ تمام صورتِ حال دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"ان بچوں کا کیا کرنا ہے؟"

"یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیونکہ ہم اتنے سارے لوگوں کو لے کر سفر نہیں کر سکتے۔" زیگ نے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔

"اور ان کا کیا کرنا ہے؟" میں نے بینگل اور اس کے بچ جانے والے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کو ہم ساتھ لے جائیں گے اور ان کے جرائم بتا کر مقامی پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

ہم بچوں، لڑکیوں اور ان دونوں کو لے کر بینگل کے مکان کی طرف آنے لگے تو میں نے مڑ کر سیاہ مکان کی طرف

دیکھا اور اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے کیوں عام عمارت سے مختلف لگی تھی۔ اس کی ساخت کسی قید خانے جیسی تھی۔ جینگل کے آدمیوں کی لاشیں ہم نے وہیں چھوڑ دیں۔ ان کا بھی مقامی پولیس ہی کچھ کرتی۔ ہم جینگل کے مکان کے سامنے پہنچے اور ساکت ہو گئے کیونکہ مکان کے سامنے والے حصے میں کوئی سو مسلح ریڈ انڈینز موجود تھے لیکن ان میں سے چند ایک کے پاس ہی آتشیں اسلحہ تھا اور باقی تیر کمان سے مسلح تھے...... ہم تیر کمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے زیگ کی طرف دیکھا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا تو مجھے شدید حیرت ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے ریڈ انڈینز کی زبان آتی ہے۔ اس پر ایک آدمی آگے آیا اور اس نے بچوں اور لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ پھر زیگ اور اس آدمی میں گفتگو ہوتی رہی۔ زیگ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ایک لڑکی کو آگے بلایا اور اس سے کچھ پوچھا، لڑکی سر ہلا کر جواب دیتی رہی۔ آخر میں زیگ نے ان سب کو اجازت دے دی۔ مجھے اس کا پتا یوں چلا کہ لڑکیاں اور بچے بھاگتے ہوئے ان مسلح ریڈ انڈینز کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ اپنے اپنے رشتے داروں سے لپٹ رہے تھے اور مارے خوشی کے رو رہے تھے۔

بات کرنے والے نے اب جینگل کی طرف اشارہ کر کے زیگ سے کچھ کہا۔ شاید وہ جینگل کو حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا کیونکہ میں نے زیگ کو نفی میں سر ہلاتے دیکھا۔ ریڈ انڈین نے اصرار کیا لیکن زیگ کا انکار اقرار میں نہیں بدلا۔ میں نے محسوس کیا کہ زیگ کے انکار کی وجہ سے صورتِ حال کسی قدر کشیدہ ہو گئی تھی اور مسلح افراد کے چہروں سے کدورت جھلکنے لگی تھی۔ لیکن کچھ دیر زیگ ان کو سمجھاتا رہا اور رفتہ رفتہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ ان کے تنے ہوئے چہرے نرم پڑ گئے اور پھر وہ لڑکیوں اور بچوں کو لے کر وہاں سے جانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سامنے پہاڑیوں میں غائب ہو گئے۔

''اس نے مجھ سے بچوں اور لڑکیوں کا مطالبہ کیا تھا۔'' زیگ نے ان کے جانے کے بعد بتایا۔ ''میں تو خود بھی یہی چاہ رہا تھا لیکن میں نے خاصی بحث کے بعد اس کی بات مانی۔ پھر اس نے جینگل کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس بار میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ جینگل پر عدالت میں مقدمہ چلے گا اور اسے وہاں سے سزا ملے گی۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ چلے گئے۔''

ہم جینگل کے مکان میں آئے جہاں جیک نے جینگل اور اس کے زخمی ساتھی کی مرہم پٹی کی۔ زیگ نے مجھے بتایا کہ وہ فائرنگ کی آوازیں سن کے فارم کی طرف آئے تھے۔ یہاں مکان میں کوئی نہیں تھا پھر وہ سیاہ عمارت کی طرف آئے.... جہاں جینگل اور اس کے آدمی اندر حملے کر رہے تھے۔ زیگ نے گھیرا ڈال کر ان کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا لیکن انہوں نے حکم ماننے کے بجائے فائرنگ شروع کر دی۔ زیگ، پال اور جیک کی جوابی فائرنگ سے جینگل کے تمام ساتھی مارے گئے اور وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا۔

جینگل جو ہماری گفتگو سن رہا تھا، اس نے حقارت سے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا مجھے سزا ہو جائے گی؟''

''یہ ہم نہیں جانتے لیکن ہمارا جو کام ہے وہ ہم ضرور کریں گے۔'' زیگ نے نرمی سے کہا۔

''ان وحشیوں کو قتل کرنے پر اس ریاست میں کوئی سزا نہیں ہے۔''

''ممکن ہے ان کو قتل کرنے پر تمہیں سزا نہ ملے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس ریاست میں کسی کو قید کر کے رکھنا، اس سے بیگار لینا اور قیدیوں سے جنسی زیادتی سنگین جرم ہیں۔''

زیگ کی اس بات پر جینگل کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''[illegible]'' زیگ [illegible] ''ایک سنگین جرم تم بھول رہے ہو۔ سرکاری آدمیوں پر حملہ اور ان کو قتل کرنے کی کوشش... اس جرم میں تمہیں لازمی سزا ملے گی۔''

اس بار جینگل کو چپ لگ گئی۔ صبح کے آثار نمودار ہونے پر ہم نے روانگی کی تیاری کی۔ راستے میں زیگ نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ جینگل اور اس کے ساتھی جھوٹ بول رہے ہیں اور یہاں کوئی گڑبڑ ہے؟''

''مجھے اس کا اندازہ دو باتوں سے ہوا۔ ایک تو ان کا کہنا تھا کہ سو ریڈ انڈینز نے حملہ کیا تھا جبکہ سامنے ریت کے میدان میں ایسے کوئی نشانات نہیں تھے کہ سو افراد نے اس سے گزر کر حملہ کیا ہو... اور دوسرے مجھے ملازمین والی عمارت عام عمارت نہیں لگی تھی۔ اس کی ساخت کسی جیل خانے جیسی تھی۔ ملازمین کے لیے کوئی اتنی بڑی اور مضبوط عمارت نہیں بنواتا۔''

''تم ذہین ہو۔'' زیگ نے تعریفی انداز میں کہا اور گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

دنیا کے کچھ خطے ایسے ہیں جن کے نام کے ساتھ ہی پُراسراریت کا تصور ذہن میں ابھرنے لگتا ہے...... ان خطوں سے وابستہ مافوق الفطرت عناصر رگ و پے میں سنسنی پھیلا دیتے ہیں۔ حیرت کدۂ افریقہ کے قرب و جوار میں سانس لیتی ایک پُرتجسس و سسپنس سے بھرپور کہانی......

حسیب

احمد صغیر صدیقی

اسرار و تحیر اور سراغ رسانی کی دبیز تہوں میں پوشیدہ منفرد پارہ

''تفتیش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔'' سواکومند کے پولیس آفیسر کی چاکلیٹی بھووں پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ چھت سے لٹکا پنکھا گھوں گھوں کرتا حبس زدہ ماحول میں گھومے جا رہا تھا اور لگتا تھا کہ بس کسی بھی لمحے یہ رک جائے گا۔ بغلی دروازے سے قدرے بلند ہیجان انگیز آواز آتی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی ناقابلِ فہم سی زبان میں کچھ کہہ رہا

تھا۔ ہوگر کے ذہن میں بس ایک ہی خیال آسکا کہ شاید ساتھ والے کمرے میں کسی ملزم سے کوئی آفیسر پوچھ گچھ کررہا ہے۔ ویسے اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ یہ آواز تفتیشی آفیسر کی تھی یا ملزم کی۔

''میں اتنی دور جرمنی سے یہاں آیا ہوں۔'' ہوگر نے کہا۔ ''دس گھنٹے مجھے جہاز میں لگے ہیں اور چار گھنٹے اس کار میں... کیا تم...''

پولیس آفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہمارے خیال میں یہ قتل کی واردات بھی ہوسکتی ہے۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''یہ بات تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔ میں تفصیل سے سب سننا چاہتا ہوں... آخر ہوا کیا تھا؟''

پولیس آفیسر نے اپنے کمپیوٹر کی اسکرین کی سمت دیکھا۔ یہ کوئی نیا ماڈل نہیں تھا۔ ہوگر کا تو خیال تھا کہ یہاں صرف چند بوسیدہ ٹائپ رائٹر ہی ہوں گے۔ نمیبیا کے کسی پولیس اسٹیشن پر اس سے زیادہ کی توقع کی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ آفیسر نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہارے بہنوئی کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ بھی تھا؟''

''کیا...؟ یہ سوال کیوں کیا تم نے؟''

آفیسر نے انگلی سے اپنے سر کو تھپتھپایا۔ وہ سمجھا کہ ہوگر اس کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

''نہیں۔'' ہوگر نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں تھی... کم ازکم جب تک وہ جرمنی میں تھا۔''

''مگر وہ نمیبیا میں کوئی دو سال سے تھا۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''ہوا کیا تھا؟'' ہوگر نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مسئلے کو کل پر ڈالا جائے یا اسے کسی اور ذمے دار آفیسر کی سمت روانہ کردیا جائے۔

پولیس آفیسر نے اسے خالی نظروں سے دیکھا پھر وہ اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ بغلی دروازے سے آتی ہوئی ناقابلِ فہم آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ کمپیوٹر اسکرین پر فیتا غورثی اشکال کی اچھل کود جاری تھی۔ اسی اثنا میں پولیس آفیسر اپنے ہاتھ میں ایک سیاہ نوٹ بک تھامے واپس آیا اور اس نے نوٹ بک ہوگر کے سامنے رکھ دی۔

''تمہارا بہنوئی ڈائری لکھنے کا عادی تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پڑھ لو... یہیں... کیونکہ یہ تفتیشی ریکارڈ کا حصہ ہے۔''

ہوگر نے ڈائری کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ویسے...'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''سب جانتے ہیں کہ نمیبیا بے شک پس ماندہ ملک ضرور ہے مگر یہاں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں... مثال کے طور پر میری طرح... جو ردحوں یا ٹیلی پیتھی وغیرہ کو نہیں مانتے۔''

ہوگر نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ڈائری کھول لی۔

☆☆☆

23 دسمبر... وقت تین بجے سہ پہر۔

ہوا اس قدر گرم ہے کہ جسم جھلس رہا ہے۔ گویا سورج نے سارے آسمان میں آگ لگادی ہو۔ میں ابھی کار سے اترا ہوں اور ایک درخت تلے بیٹھا ہوا ہوں۔ کچھ پرندے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے مگر کار کی آواز سنتے ہی کچھ فضاؤں میں اڑ گئے۔

ہوا صحرائی زمین پر پانی کی طرح چمک رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سامنے کوئی جھیل ہو۔ یہ محض آنکھوں کا دھوکا ہے... سراب! ادھر سو کلومیٹر تک کسی بھی سمت میں کہیں پانی نہیں پایا جاتا۔ بس ریت کے تودے ہیں۔ جھلسی ہوئی گھاس اور کچھ جھاڑیاں! جو چند درخت ہیں ان کا ہونا بھی معجزے سے کم نہیں ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ادھر کبھی بارش کا ایک قطرہ بھی گرا ہو گا البتہ بارشوں کے اچھے موسم میں نمیبیائی لوگوں کے بقول کچھ پانی پہاڑوں سے ادھر ان نالیوں کے ذریعے ضرور آجاتا ہے جسے مقامی لوگ ''ری ور'' کہتے ہیں۔

میں نے کچھ پانی اپنے حلق میں اتارا۔ یہ ہلکا گرم پانی ایک پلاسٹک بیگ میں ہے۔ اگر میں سواکومند ملک میں ہوتا تو اس وقت اس شراب خانے میں بیئر پی رہا ہوتا جس کا نام ''ٹائیگر ریف'' ہے۔ جہاں مستقل آنے والے گاہک وہاں بیٹھ کر سو برس پرانا میوزک سنتے ہیں اور میں نمیبیا میں موجود ان سفید فاموں کی سمت دیکھ دیکھ کر سر ہلاتا رہتا جو اپنی کرسمس کی تعطیلات میں ادھر آتے ہیں۔ مجھے افریقا کے موسمِ گرما میں کرسمس کی روشنیاں سخت ناپسند ہیں۔ اس جگہ مجھے کرسمس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

☆☆☆

23 دسمبر... نو بجے شب۔

میں نے ایک خیمہ ایک چٹان کی دیوار کے نزدیک لگا دیا ہے۔ اس طرح مجھے کم ازکم گھنٹا بھر کے لیے آرام سے بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ چٹان کی درزوں میں سبزہ اگا ہوا ہے۔ اس وادی سے ذرا فاصلے پر مجھے چند درخت بھی نظر آرہے

ہیں۔ بلونڈ کوپی ٹھیک میرے اس پار واقع ہے۔ اس کے معنی ہیں ''خونی پہاڑی'' یہ اسم ہاسکی ہے۔ یہ سیاہ پتھروں کا ایک بلاک ہے۔ آج شام جب سورج غروب ہورہا تھا تو میں نے اس کا منظر دیکھا تھا جو زندگی کی بھوک اور مرگ مفاجات کا آمیزہ تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج کوئی چوپایہ ہو جسے کسی نیزے سے زخمی کردیا گیا ہو اور اس کا خون پہاڑیوں پر قطرہ قطرہ گر رہا ہو۔ یہ منظر صرف میں نے دیکھا تھا کیونکہ یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں۔ اس جگہ اس بات کو شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جرمنی کتنے فاصلے پر ہے۔

میں نے آگ جلائی اور مرغی کی رانیں روسٹ کر کے کھائیں اور پھر ایک ایک کر کے سیاہ آسمان پر ستارے نمودار ہونا شروع ہوگئے۔ اب مجھے جھینگروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ کبھی کبھی الاؤ کی روشنی میں مجھے چمگادڑ اڑتی ہوئی نظر آجاتی۔ مجھے کچھ ایسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جیسے کوئی چیز سرسرا رہی ہو یا گھسٹ رہی ہو... ہوسکتا ہے یہ کوئی گیدڑ وغیرہ ہو جسے گوشت کی بو آگئی ہو۔

☆☆☆

24 دسمبر... صبح آٹھ بجے۔

میرا ارادہ تھا کہ صبح تڑکے ہی میں بلونڈ کوپی پر چڑھنے کا آغاز کروں گا مگر مجھے اس آدمی پر اعتبار نہیں ہے جس کا نام بقول اس کے حبیب ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ اس کا کام ہوگا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک دامارا (DAMARA) ہے لیکن اس کے لمبے قد اور مضبوط جسم کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ وہ یا تو ''ہررورد'' ہوگا یا پھر ''اوامبو''۔ میں پچھلی رات خوائجِ ضروریہ کے لیے جھاڑیوں کی طرف گیا تھا۔ پلٹا تو دیکھا کہ وہ میرے الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس طرح جیسے ہمیشہ سے یہاں رہا ہو۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو اس نے میری طرف بس سرسری انداز میں دیکھا جیسے وہ اچانک ہی ہواؤں سے نمودار ہوا ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کے آنے کی کوئی آہٹ محسوس نہیں کی تو وہ ہنس پڑا۔ پھر اس نے سر کے اشارے سے بلونڈ کوپی کی سمت میری توجہ مبذول کرائی۔ وہ ادھر ہی رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ پہاڑی اس کی تھی۔

یہ ایک بالکل مہمل بات تھی۔ ہم اس وقت نیشنل پارک کے قریب تھے۔ ادھر دور تک کہیں پانی نہیں، کوئی گھر نہیں... کچھ نہیں۔ ادھر کوئی بھولے بھٹکے بھی نہیں آتا۔ میلوں تک صحرا پھیلا ہوا ہے اور ادھر مستقل کسی کے رہنے کا سوال ہی پیدا

''اس مجسمہ ساز نے بس یہیں تک یہ مجسمہ بنایا تھا.... اس کے بعد سے یہ زیادہ تر وہیں لیٹا رہتا ہے.....''

نہیں ہوتا۔ نہ DAMARA نہ OVAMBO نہ کوئی اور۔ میں نے اس سے کچھ اور جاننے کی کوشش کی مگر اس نے اس طرح اداکاری کی جیسے کچھ سمجھ نہ رہا ہو حالانکہ اس کی انگریزی خاصی اچھی ہے۔ مثلاً جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ سواکومند سے واقف ہے تو اس نے جواباً کہا کہ آج صبح اس نے ایک پہاڑی زیبرا دیکھا تھا جو شہر کی سمت دوڑ رہا تھا۔

''اچھا!'' میں نے کہا۔ ''اور کیا وہ خود بھی کبھی ادھر گیا ہے؟''

''پہلے میں سمجھا تھا کہ زیبرا جنوب کی سمت جارہا ہے۔'' حبیب نے کہا۔ ''مگر میں غلطی پر تھا۔ وہ سواکومند کی سمت جارہا تھا۔''

''تو کیا یہ کوئی غیر معمولی بات تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ کیا یہاں کے زیبرے ادھر کا رخ نہیں کرتے؟''

حبیب نے میری سمت الجھی نظروں سے دیکھا۔ ''زیبرے ہر سمت میں دوڑتے ہیں مگر جسے میں نے آج صبح دیکھا تھا، وہ سواکومند کی سمت جارہا تھا۔''

بس اسی طرح کی باتیں تھیں... میں سوالات کرتا تھا اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا تھا۔ بالآخر میں تھک گیا۔ ہم خاموش بیٹھے آگ کو دیکھتے رہے۔ میں تھکا ہوا تھا لیکن خیمے میں جاکر سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس آدمی کی موجودگی جو بالکل اجنبی تھا، مجھے اکھر رہی تھی۔ ویسے میں خوف زدہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس پر ظاہر کردوں کہ میں چوکس ہوں اور اسے چوری کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

شمال کی جانب سے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی مگر رات پھر بھی گرم تھی۔ جھاڑیاں پُراسرار انداز سے ہل رہی تھیں۔ سر

www.pkdigest.com

پر ستاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ مجھے آسمان پر BETELGEUS نامی ستارہ فوراً ہی نظر آ گیا جسے شکاری کا چاقو کہا جاتا ہے۔ میں ابھی اپنے خیالات کو سمیٹ ہی رہا تھا کہ ہوا کے ایک جھونکے نے بجھتے الاؤ کی راکھ کو چھیڑا۔ اچانک مجھے اپنی کھڑکی سے دکھائی دیتا وہ منظر یاد آ گیا جب برف باری ہوتی تھی۔

حبیب نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا، اس نے پوچھا۔ ''سال کے اس حصے میں غالباً جرمنی میں سردیاں ہوتی ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بھی سر ہلایا پھر اٹھا اور چلتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے نادانستگی میں اسے بتا دیا ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ ویسے ہو سکتا ہے اس نے میرے لب و لہجے سے جان لیا ہوگا کہ میں جرمن نژاد ہوں۔ میں نے اپنا چاقو سنبھالا اور خیمے میں چلا گیا۔ مجھے ٹھیک سے نیند نہ آ سکی تاہم رات میں کچھ نہیں ہوا۔ میری کار سے کچھ چرایا نہیں گیا۔ ہر چیز موجود تھی۔ اس وقت بھی خود حبیب بھی موجود ہے۔ وہ تھوڑے فاصلے پر چھاؤں میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے سامنے پڑے پتھروں کو اوپر تلے رکھ رہا تھا۔ کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔

☆☆☆

25 دسمبر... شام سات بجے۔

حبیب الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا ٹراؤٹ مچھلی کا گوشت بھون رہا ہے۔ کرسٹائن ہمیشہ کرسمس کی شام میں مچھلی پکاتی تھی۔ یہ اس کی خاندانی رسم تھی۔ ہم دونوں کی شادی کے بعد بھی وہ یہ رسم جاری رکھے ہوئے تھی۔ پہلے مچھلی... پھر کرسمس گفٹ! لیکن یہاں نمیبیا میں ٹراؤٹ نہیں ہوتی... اور مچھلیاں ہوتی ہیں مگر ٹراؤٹ نہیں۔ میں یہاں دو سال سے ہوں۔ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ سواکومنڈ کی سپر مارکیٹ میں بھی نہیں۔

جب میں نے حبیب سے پوچھا کہ اسے ٹراؤٹ کہاں سے ملی تو وہ صرف مسکرا دیا اور کہا کہ یہ ایک خاص دن ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرنا چاہتا ہے۔

''خوب!'' میں نے کہا۔ ''مگر یہ مچھلی تمہیں کہاں سے ملی؟''

اس نے انگلیاں ہلائیں جیسے اس نے انہیں جادو کے زور سے نکالا ہو۔ اس کی پراسراریت میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ مجھے بے حد حیرت تھی کہ یہ آدمی میرا ذہن پڑھ لیتا ہے... کسی کھلی کتاب کی طرح! اس سے بھی بڑھ کر جیسے وہ میرے دماغ میں گھسا ہوا ہے، میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ اس صبح اس نے مجھ سے پوچھا۔ کیا میں اپنی بیوی کو مس کر رہا ہوں؟ اس کا سوال بالکل اچانک تھا۔

''میں شادی شدہ نہیں ہوں۔'' میں نے جواباً کہا۔

حبیب نے سکون سے شادی کی اس انگوٹھی کی سمت اشارہ کیا جو میری انگلی میں پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ہم دو برسوں سے جدا ہیں۔ بس انگوٹھی اتارنا بھول گیا ہوں۔''

''وہ زندہ نہیں ہے شاید... کیوں؟'' حبیب نے کہا۔ ''کرسمس پر انتقال ہوا تھا؟''

میں نے تعجب سے اسے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ رنگ کی کچھ رگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں کھڑکی سے باہر گرتی برف دکھائی دی اور کرسٹائن بھی جو اپنے بستر پر پڑی تھی اور بستر کی چادر اس کے خون سے شرابور تھی۔

اس واقعے کو عرصہ گزر چکا تھا مگر اچانک ہی سارے واقعات پھر سے میرے ذہن میں ابھر آئے تھے۔

''دفع ہو جاؤ۔'' میں اچانک غصے سے چلایا۔ ''جاؤ۔''

حبیب اٹھا اور خاموشی سے اسی وقت چلا گیا۔ میں خود بھی اٹھا اور دوسری طرف پہاڑی کی جانب... کی چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ پتھر میرے قدموں تلے ڈھلک رہے تھے۔ چھپکلیاں راستے سے دوسری طرف بھاگ رہی تھیں۔ جلد ہی چڑھائی اس قدر سیدھی ہو گئی کہ مجھے جھک کر ہاتھوں کی مدد سے چڑھنا پڑا۔ اس گرمی میں اتنی مشقت بہت تھی۔ بڑی مشکل سے میں ایک قدرے مسطح جگہ پر پہنچا۔ ذرا سا رک کر میں نے چڑھائی کا سفر پھر شروع کیا۔ جس وقت میں چوٹی کے نزدیک تھا، مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ میں اس شدید تپش میں پانی کے بغیر چلا آیا ہوں۔ میری زبان سوکھ رہی تھی اور سورج کی تپش مسلسل بڑھ رہی تھی۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ہوا کا شور بھی مجھے اس میں سنائی نہیں دے رہا تھا... میری آنکھوں کے سامنے دائرے سے ناچ رہے تھے جیسے برف باری میں برف کے گالے اڑتے ہیں۔ میں بے حد سستی سے چل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح چوٹی پر پہنچ جاؤں۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ میں حبیب کی مدد کے بغیر نیچے کا سفر طے کر سکتا ہوں۔ وہ چوٹی پر موجود تھا۔ اس نے کچھ کہا نہیں، بس پانی کی بوتل مجھے تھما دی اور میں نے بے صبری سے پینا شروع کر دیا۔ نیچے اترنے کے لیے میں نے جلدی نہیں کی۔ تھوڑا سا دم لینے کے لیے رک گیا۔ حبیب قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں صحرائے نمیب (NAIMIB) کو گھور رہے تھے۔ یہ دنیا کا آخری کنارہ لگ رہا تھا۔ بے جان اور بے آب و گیاہ!

''حبیب! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری بیوی کرسمس پر مری تھی؟''

''تم اکیلے صحرا میں چلے گئے تھے... اپنے ملک سے بہت دور۔ اس کی روح اپنی برسی کے موقع پر تمہیں نہیں پا سکتی تھی۔'' حبیب نے پراسراریت سے جواب دیا اور بولا۔ ''یہ تمہاری چالاکی تھی۔''

میں نے پہلے بھی بہت سی معقول وضاحتیں سنی تھیں مگر حبیب سے نہیں۔ یہ بات بھی تھی کہ مقامی لوگوں کی سوچیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے خیال میں کسی روح سے فرار ہی میرے وہاں آنے کا سبب رہا ہو۔ تبھی وہ ٹراؤٹ کے ساتھ نمودار ہوا تھا اور یہی سبب ہے کہ اس کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں تھی۔ کوئی چکر تھا جو چل پڑا تھا۔

☆☆☆

25 دسمبر... صبح آٹھ بجے۔

میری جیب میں ایک پاکٹ نائف موجود ہے اور میں اپنے ساتھ ایک شکاری چاقو بھی لایا ہوں۔ کیا معلوم کب ضرورت پڑ جائے۔ اب مجھے ایک فیصلہ کرنا ہے۔ کیا مجھے پیدل ہی بھاگ نکلنا چاہیے یا اس امید پر رکا رہوں کہ شاید کوئی پارک رینجر دن میں ادھر آ جائے۔ اب میں دوسری رات بغیر سوئے نہیں رہ سکتا۔

گرمی کی شدت سے میرا سر دکھ رہا ہے۔ میں چٹان کی دیوار کی چھاؤں میں آ گیا ہوں۔ حبیب میری لینڈ کروزر کے کھلے حصے میں بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ یہ کچھ کریکر وغیرہ ہیں جو میں لایا تھا۔ اسے کھانے میں مزہ آ رہا ہے۔ اس کی کسی حرکت سے اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ مجھے ہلاک کرنے کا کوئی موقع چاہتا ہے۔ پچھلی رات وہ ایک دم سے اٹھا اور رکوع میں جانے لگا۔ وہ کچھ بدبدا بھی رہا تھا... چٹان کے نچلے حصے پر پڑے پتھروں کے ڈھیر کو دیکھ کر!

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ایک قدیم قبرستان ہے۔''

''فضول بات ہے حبیب۔ میں نے دیکھا تھا کہ تم ان پتھروں کو اوپر تلے رکھ رہے تھے۔''

جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ اس کی آواز دبی دبی سی تھی۔ ''تم نے اپنی بیوی کو ہلاک کیوں کیا تھا؟''

مجھے گمان ہوا کہ شاید میں سن نہیں سکا ہوں مگر پھر میں سمجھ گیا۔ لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے اٹھ رہے ہوں اور حبیب کوئی آدمی نہ رہا ہو بلکہ اس نے کسی شیطان یا روح کا روپ دھار لیا ہو جس کا مسکن کوئی اور دنیا تھی۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں اپنی کار کی سمت لپکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی مگر کار اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار کوشش کی... مگر فضول!

''واہ صاحب......! آپ کے جوڑ تو اس عمر میں بھی نہایت عمدگی سے کام کر رہے ہیں۔''

''شاید ٹینک خالی ہے۔'' حبیب نے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ میں نے وہ جیری کین کھولا جو میں بھروا کر سواکومنڈ سے لایا تھا۔ وہ بھی بالکل خالی تھا۔ میں سراسیمہ ہو گیا اور صحرا کی طرف چل پڑا... مگر جلد ہی مجھے خیال آیا کہ حبیب تو چاہتا بھی یہی ہے۔ میں صحرا میں صرف بھٹک سکتا ہوں۔ اس سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ وہ کسی بھی وقت میرے عقب میں نمودار ہو سکتا تھا۔ میں نے شکاری چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دوبارہ اسی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

''تم نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا؟'' اس کا سکون ہنوز برقرار تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

''میں نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر اس کی روح تمہارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہے؟''

اس کی روح... یہ بات درست تھی۔ پچھلی رات سے یادیں مجھ پر آسیب بن کر مسلط ہو رہی تھیں۔ میرا ذہن اس ہولناک دن کی پرچھائیوں سے نجات حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ میز پر رکھا لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی دیواروں پر سائے بنا رہی تھی۔ پردے کھلے ہوئے تھے اور برف کے گالے باہر آہستگی سے اڑ رہے تھے۔

مجھے پسینا آ رہا تھا۔ اس کا سبب یہاں کی گرمی تھی یا پھر چٹان کی دیوار کی تپش۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں حبیب کو بتانا چاہتا تھا کہ کرسٹائن نے خود ہی اپنے آپ کو ہلاک کیا تھا۔ اس نے خواب آور گولیاں کھائی تھیں اور اپنی

www.pkdigest.com

کلائی کی رگ کاٹ دی تھی۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی... ڈپریشن کے شکار افراد عام طور پر کرسمس کے دن خودکشی کرتے رہے ہیں... کیونکہ...

حبیب غائب ہو چکا تھا۔ میں اسے کوئی حرکت کرتے ہوئے دیکھ نہیں سکا۔ اس کی شراب کی بوتل وہیں رکھی تھی مگر وہ جس پتھر پر بیٹھا تھا، وہ خالی تھا۔

"حبیب!" میں نے اسے آواز دی۔ روحیں دبے قدموں آ جا رہی تھیں۔ میں اپنے خیمے میں نہیں گیا بلکہ میں نے چٹان کی دیوار سے پشت لگا دی اور چاقو کو ہاتھ میں دبا لیا۔ حبیب واپس نہیں آیا۔ اس دن ساری رات میں نے آنکھیں بند نہیں کیں۔

☆☆☆

26 دسمبر... صبح سویرے۔

24 گھنٹے ہو چکے ہیں۔ میرے منہ میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں گیا ہے۔ حبیب نے خدا جانے کہاں پانی کا کنستر چھپا دیا تھا۔ وہ مسلسل ظاہر ہوتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی وہ نظر آتا ہے اور ابھی مفقود۔ میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں مگر میں سو نہیں سکتا۔ ہر بار میں چاقو کی نوک ہاتھ میں چبھا لیتا ہوں۔

چٹان کا سایہ اب صحرا میں برف کی طرح پگھل رہا ہے۔ سورج سے میرے پیر جلنے لگے ہیں۔ چھپکلیاں میرے اس قدر قریب آ رہی ہیں کہ میں انہیں چھو سکتا ہوں۔ رات بھر حبیب نے پتھروں کا جو ڈھیر بنایا تھا، اونچا ہو چکا ہے۔ مجھے اپنے چاروں طرف سے سرگوشیوں کی صدائیں محسوس ہو رہی ہیں مگر میں ان کی زبان نہیں سمجھ پا رہا۔ میں نے کچھ نئے لفظ گھڑ لیے ہیں اور انہی کو بار بار دہرا رہا ہوں تاکہ جاگ سکوں۔ "دشت، سرما، خنجر، برف، سورج گالے۔"

مجھے تو اسی وقت چل دینا چاہیے تھا جب اس بات کا علم ہوا تھا کہ حبیب نے کار کو ناکارہ کر دیا ہے۔ خطرہ مول لے کر میں رات میں سفر کر سکتا تھا۔ جونہی کہ اس تک پہنچتے ہی میں مین روڈ پر جا سکتا تھا۔ ادھر سے اکثر کاریں گزرتی رہتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی مجھے لفٹ دے دیتا۔ میں یہاں سے نکل جاتا۔

"تم نے اپنی بیوی کو بچایا کیوں نہیں؟" اس سے پہلے حبیب نے پوچھا تھا۔ وہ میرے گرد کسی گدھ کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ اگر میرے پاس چاقو نہ ہوتا تو وہ کب کا مجھے چیر پھاڑ دیتا۔

"وہ مر چکی تھی۔" میں منمنایا۔ "میری کار خراب ہو گئی تھی اور میں تین گھنٹے بعد گھر پہنچا تھا۔ یہ کرسمس کی رات تھی۔ مجھے کوئی اور گاڑی نہیں مل سکتی تھی۔ میں رات میں، برف کے اندر پیدل چلا تھا۔"

"اور اگر تم وقت پر پہنچ جاتے..." کسی طرف سے حبیب کی آواز ابھری۔ "تو وہ اس وقت تک زندہ ہوتی اور..."

معاً حبیب کی نرم آواز ایک دہاڑ بن گئی۔ جواب میں پہاڑی نے ایک دہکتا ہوا جواب اچھالا۔ یا یہ وہ دھمک تھی جو میرے سر میں ہو رہی تھی۔ میں لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ زیادہ دیر انتظار کرنا اب میرے بس میں نہیں۔ میرے پاس ابھی تک چاقو موجود ہے۔ ابھی یا پھر کبھی نہیں۔ اب حبیب رہے گا یا نہیں۔

☆☆☆

ڈائری کا آخری اندراج انہی الفاظ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ہینڈ رائٹنگ ڈگمگاتی ہوئی تھی۔ ہوگر نے سیاہ ڈائری کو بند کر دیا اور بولا۔

"مجھے تو یہ بالکل قتل کا کیس لگتا ہے۔"

"ہاں، اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

"تمہیں یہ شخص حبیب ملا تھا؟"

آفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر تم نے اس کا اشتہار تو دیا ہوگا کہ تمہیں اس کی تلاش ہے؟"

بغلی دروازے پر خاموشی طاری ہو چکی تھی، اب بس پنکھے کی گھوں گھوں تھی۔ پولیس آفیسر نے کہا۔ "ہمیں ایسی کوئی نشانی نہیں ملی جس سے اندازہ ہوتا کہ ہلونڈ کوپی میں تمہارے بہنوئی کے ساتھ کوئی شخص اور بھی تھا۔"

"مگر اس نے اس شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک لمبا اور مضبوط دامارا ہے..."

"اور یہ بھی کہ وہ ذہن پڑھ لیتا ہے اور ہاتھوں سے ٹراؤٹ مچھلیاں برآمد کر سکتا ہے۔ وہ کسی روح کی طرح غائب ہو جاتا ہے اور نمودار ہو جاتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" ہوگر نے پوچھا۔

"ہمیں وہاں سے مرغی کی ہڈیاں بھی ملی ہیں۔ مگر کوئی مچھلی کا کانٹا نہیں ملا۔ لینڈ کروزر کے ٹینک میں بہت سا پیٹرول موجود تھا اور جیری کین بھی بھرا ہوا تھا۔"

"کار بلاتامل اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ تمہارے بہنوئی کے بالکل پاس واٹر کین رکھا ہوا تھا۔ وہیں لاش کے ساتھ ہی اس کی ڈائری بھی پڑی تھی۔ اس پر ایک پتھر رکھا ہوا تھا تاکہ ہوا

سے اڑ نہ سکے۔"

ہوگر نے ڈائری کے سیاہ کور کی طرف گھورا۔ کور پر لگے اسٹیکر پر لکھا تھا۔

"کاؤنٹر بک۔ 96 صفحات۔"

"اس حبیب نے یقیناً تمہارے بہنوئی کی تحریر دیکھی ہو گی۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ "ظاہر ہے اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمہارے بہنوئی نے ڈائری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ بہت قیمتی شہادت تھی۔ آخر اس نے ڈائری غائب کیوں نہیں کی؟"

ہوگر نے بے بسی سے شانے اچکا دیے۔ پولیس آفیسر بولتا رہا۔ "تمہارے بہنوئی کی موت خون بہہ جانے سے ہوئی تھی۔ اس کی دونوں کلائیوں اور بازوؤں پر کٹ لگا دیے گئے تھے... اور یہ کام خود اسی کے چاقو سے کیے گئے تھے۔"

"گویا یہ خودکشی تھی؟ مگر تم نے تو خود کہا ہے کہ..."

"یہ ٹھیک ہے قتل کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔" آفیسر نے ڈائری کا آخری صفحہ کھولا جس پر تھوڑی سی تحریر تھی۔ اس نے اندراج کے آخری حصے پر موجود ایک جملے پر انگلی رکھی۔

"اگر تمہارا بہنوئی وقت پر گھر پہنچ جاتا تو کیا ہوتا؟ اسے اپنی بیوی زندہ ملتی۔ وہ ٹیلی فون اٹھاتا تاکہ ایمبولینس بلائے مگر نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے ایک خیال آتا ہے کہ اگر وہ تین گھنٹے دیر سے گھر پہنچے تو بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ بیوی مر چکی ہوتی۔ وہ آزاد ہوتا اور بے فکری سے افریقا کے لیے نقل مکانی کر سکتا تھا۔ مثلاً اگر اس کی کار راستے میں خراب ہو جاتی۔ بس اس خیال کے بعد... وہ ریسیور رکھ دیتا ہے اور اپنی کار میں بیٹھ کر..."

"یہ ممکن نہیں۔" ہوگر نے احتجاج کیا۔ "جرمن پولیس اس رخ پر تفتیش کر چکی ہے۔ ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی کہ وہ اس پر چارج لگا سکتے۔"

"آدمی کے لیے خود کو مارنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ "خصوصاً ان حالات میں کہ دو سال تک اس نے اپنے ضمیر کے کچوکے سہے ہوں۔ اس کا ایک حصہ زندگی سے چمٹا رہتا ہے۔ وہ اس کے اقدامات کو درست قرار دیتا ہے، مزاحمت کرتا ہے، یادوں کو کھرچ دیتا ہے، صحرا کی سمت لے جاتا ہے... مگر پھر بھی اس کا دوسرا حصہ جان نہیں چھوڑتا۔ وہ سب کچھ یاد رکھتا ہے اور برابر اسے اس کا گناہ یاد دلاتا رہتا ہے۔"

ہوا جیسے رک گئی تھی حالانکہ پنکھا تیزی سے چل رہا تھا۔ پولیس آفیسر بولتا رہا۔ "پتا نہیں کیوں سفید فام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ کا چہرہ سیاہ ہوتا ہے۔ البتہ میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس سیاہ فام کو حبیب کیوں کہا جاتا تھا۔ حبیب دراصل ناما اور دامارا قبیلے کے ایک دیوتا کا نام ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حبیب امر ہے، مر نہیں سکتا۔ اسے بار بار مارا گیا تھا۔ پتھروں تلے دفنایا گیا تھا مگر وہ ہر بار نکل آتا تھا، گنگناتا ہوا۔ وہ کچھ ایسی چیز تھا جیسے آدمی کا ضمیر ہوتا ہے جس سے نجات نہیں مل سکتی۔ مگر میں کسی دیوتا پر یقین نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ حبیب دراصل صرف تمہارے بہنوئی کے دماغ میں تھا۔ یہ اس کا وہ حصہ تھا جو اس کے گناہ کا گواہ تھا... یعنی بیوی کی لاش کا اور نکل بھاگنے کا۔ بس اسی لیے اسے معلوم تھا کہ کرسمس پر کیا کھایا جاتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تمہارا بہنوئی بھاگ کر افریقا کیوں آیا تھا اور تین سال قبل جرمنی میں کیا ہوا تھا۔"

ہوگر کے ذہن میں وہ کھلی ہوئی قبر ابھری۔ اس روز بہت برف گری تھی۔ قبر زمین پر سفیدی کے درمیان کسی کھلے ہوئے زخم کی طرح لگ رہی تھی۔

"گویا اس نے میری بہن کو مرنے دیا تھا؟" ہوگر نے سوچ بھرے لہجے میں کہا۔

پولیس آفیسر چپ رہا۔ ہوگر اٹھ گیا۔

پولیس آفیسر نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"میں آج ہی WIND HOEK جا رہا ہوں۔" ہوگر نے کہا۔ "وہاں سے میں دوسری پرواز سے جرمنی چلا جاؤں گا۔"

وہ پولیس اسٹیشن سے نکل گیا۔ باہر خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ تازگی بھری ہوا نے گرمی کو قابل برداشت بنا دیا تھا۔ ہوگر نے سڑک پار کی اور پانی کی سمت چلا۔ اس نے اپنے دائیں جانب واقع بیچ کو پیچھے چھوڑا، وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ اوشن باسکٹ ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرا۔ وہ پیدل ہی BREAKWATER پر، نئی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں وہ کوئی آدھ گھنٹے چوکور پتھروں کے بلاکوں پر سیل مچھلیوں کے تماشے دیکھتا رہا۔ تبھی ایک لمبے قد کا مضبوط جسم والا آدمی اس کی سمت بڑھا اور اس کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ کوئی اوامبو تھا یا پھر کوئی ہریرو۔

"میرا نام حبیب ہے۔" آدمی نے کہا۔

"حبیب... اور؟"

"بس... صرف حبیب۔"

ہوگر کو یقین نہیں تھا کہ یہ کوئی اصلی نام ہوگا۔ اس نے ذرا سا سر ہلایا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور وہ لفافہ باہر نکالا جس میں پانچ ہزار یورو رکھے ہوئے تھے اور اسے اس آدمی کو تھما دیا۔

⌘

www.pkdigest.com

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں مصروف رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان، محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے۔
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و
شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے .....
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک للکار ہے۔

پانچویں قسط

www.pkdigest.com

چند سیکنڈ بعد میڈم صفورا سے کال مل گئی۔ ''ہیلو میڈم! آپ اب کہاں ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔ دوسری طرف سے میڈم نے جواب میں کچھ کہا۔ عمران گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میڈم! یہاں بہت زیادتی ہورہی ہے۔ آپ کی اجازت سے گارڈز، سلیم کو تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس لائے تھے۔ میڈم نادیہ اس کے پیچھے ہی پیچھے یہاں آگئی ہیں۔ ان کے ساتھ چھ سات گارڈز بھی تھے۔ وہ سلیم کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ انہوں نے بدزبانی بھی کی ہے۔''

جواب میں کچھ کہا گیا جو عمران نے خاموشی سے سنا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے میڈم! لیکن ایک بات آپ بھی ذہن میں

رکھے گا۔ میں نے آپ سے سلیم کے سوا اور کچھ نہیں مانگا تھا اور اس کی جو حالت ہو چکی ہے، وہ بھی میں نے دیکھ لی ہے۔ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ لگتا ہے کہ میڈم نادیہ اپنے دل کی ساری بھڑاس اس پر نکال چکی ہیں۔ اب وہ اسے معاف کر دیں تو یہی بہتر ہے۔"

عمران کی آنکھیں سرخ تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت کوشش کر کے اپنے لہجے کو نارمل رکھے ہوئے ہے۔

اس نے فون بند کیا تو اقبال نے بے قراری سے پوچھا۔ "کیا کہا میڈم نے؟"

"کہتی ہیں، میں ابھی دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں پھر بات کرتی ہوں نادیہ سے۔"

میڈم صفورا کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیدھی نادیہ والے پورشن میں پہنچی۔ دونوں بہنوں کی یہ ملاقات ہماری توقع سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد میڈم صفورا ہماری انیکسی کی طرف آئی۔ اس کا چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کا ذاتی گارڈ اس کے ہمراہ تھا تاہم اس نے اسے باہر ہی چھوڑ دیا۔ وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا پھر سگریٹ سلگایا اور بولی۔ "مسٹر عمران! ایک بات کی بالکل تسلی رکھو۔ جو پرامس میں نے تم سے کیا ہے، وہ ضرور پورا کروں گی... سلیم کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ یہاں تمہارے پاس بھی پہنچے گا۔ اس میں تھوڑا سا ٹائم ضرور لگ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل تک معاملہ نمٹ جائے۔ میرے آنے سے پہلے نادو کا دماغ بہت گھوما ہوا تھا لیکن اب وہ میرے سمجھانے سے کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ اصل میں یہ بہت الجھی ہوئی لڑکی ہے۔ بچپن سے ضدی ہے اور کسی وقت اس کی یہ عادت خطرناک حدوں کو چھو لیتی ہے..."

"وہ آپ کی بہن ہے۔ آپ اس کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ڈھائی تین گھنٹے پہلے سلیم یہاں آیا تو آپ کی اجازت سے ہی آیا تھا۔" عمران نے کہا۔

"میری بات ہوئی تھی نادو سے... اور اس نے نیم رضامندی بھی ظاہر کی تھی۔ میں بھی کہ وہ مان گئی ہے لیکن کچھ کسر ابھی باقی تھی۔ خیر، پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں ایک آدھ دن میں سنبھال لوں گی اسے۔"

"گستاخی معاف۔" عمران نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ آپ بھی ان کے سامنے بے بسی محسوس کر رہی ہیں۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ بس اس کی طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا رویہ نفسیاتی مریضہ جیسا ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ ڈرنک کر لیتی ہے۔ ساتھ میں نشہ آور گولیاں کھا لیتی ہے۔ ایسے میں شور مچاتی ہے اور توڑ پھوڑ کرتی ہے۔ ایک دو مرتبہ زخمی حالت میں اسے اسپتال لے جانا پڑا ہے۔"

"مگر میڈم! گستاخی معاف... اس ڈر سے کہ وہ شور مچائیں گی اور توڑ پھوڑ کریں گی، ہم کسی جیتے جاگتے انسان کی زندگی تو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے دیکھا ہے... اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ سلیم کو کس بری طرح مارا گیا ہے۔ ربڑ کے پائپ پر تار لپٹا ہوا تھا اور اس نے کئی جگہ سے سلیم کی چمڑی ادھیڑ دی ہے۔ اسے تو اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی مگر وہ اسے پھر اپنے ٹارچر سیل میں لے گئی ہیں۔"

"اس سے اب اور مار پیٹ نہیں ہوگی۔ میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ باقی میں نے ابھی خود اس کی بینڈیج وغیرہ کرائی ہے۔ وہ اس وقت سو رہا ہے۔"

میڈم نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ "دراصل بندہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی ایسی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہوگی... میری اور نادو کی عمر میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے لیکن میں نے اسے ہمیشہ بچوں کی طرح ہی سمجھا ہے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اور لاڈلی بھی۔ والدین ایک حادثے [illegible] سال تھی۔ [illegible] ماں باپ [illegible] ہو، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خودسر ہوتی چلی گئی۔ وہ میرے لیے ایک پرابلم چائلڈ بن گئی اور کسی حد تک اب بھی پرابلم چائلڈ ہی ہے... مگر بچی بھی ہے۔ میرے اوپر بہت سی ذمے داریاں ہیں اور میں ان ذمے داریوں کو "اون" بھی کرتی ہوں۔ جب معاملہ کچھ ایسا ہو جائے کہ ایک طرف بہن کی محبت اور دوسری طرف ذمے داری ہو تو میرا جھکاؤ ذمے داری کی طرف ہی رہتا ہے۔ لہٰذا مائی ڈیئر! تم بے فکر رہو۔ تم نے میرے لیے ایک بڑا اہم کام بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ اس کام کے بدلے تم نے جو کچھ مانگا ہے، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔"

"آپ کی تعریف اور تسلی کا شکریہ۔" عمران نے کہا۔

"صدیقی آج کل بہت پریشان ہے۔" میڈم صفورا زیرِلب مسکرائی۔ "یقیناً اسے زیادہ دکھ اس بات کا ہوگا کہ اس نے جو کچھ کیا اپنے ہاتھوں سے کیا۔ خود ہی مجسمے کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالا اور خود ہی تمہارے حوالے کیا۔ اس نے وہاں قلعہ روہتاس کے اردگرد کافی تہلکہ مچایا ہے۔ جس بستی کا تم نے نام لیا تھا، وہاں سے پولیس نے کئی افراد کو پکڑا ہے اور پوچھ گچھ

کی ہے۔ ایک دو لاکھ روپے پولیس والوں کو کھلایا ہے صدیقی نے۔ وہ ہر اس گاؤں پر چھاپا مار رہے ہیں جس پر صدیقی اور اس کے بندے تھوڑا سا بھی شک ظاہر کر رہے ہیں۔ کئی علاقوں میں تنکا بیچنے والوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔"

"آپ کی طرف تو دھیان نہیں گیا اس کا؟" اقبال نے پوچھا۔

"لگتا تو نہیں ہے... اور اگر گیا بھی تو اس کے لیے ثبوت چاہیے ہوگا۔"

"وہ یہاں تو نہیں آ دھمکے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ اپنی پارسائی جتانے کے لیے آ بھی دھمکے مگر انیکسی کی طرف اس کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ ہاں، اگر وہ میرے پاس آیا تو میں تم لوگوں کو اطلاع کر دوں گی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے ہی رکے گا، اس دوران میں تم لوگ انیکسی کے اندر ہی رہنا۔"

عمران بولا۔ "میں تو چاہتا تھا کہ آج سلیم آ جائے تو کل ہم کسی وقت یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔ یہاں کی نسبت کوئی بھی دوسری جگہ ہمارے لیے زیادہ محفوظ ہوگی۔"

"سوری! میں تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی۔ تمہیں یہاں لال کوٹھی میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں [illegible] ابھی چند روز تم سکون سے یہاں رہو۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا سیٹ اپ بنانا ہے۔ میں تمہارے اس ساتھی اقبال کی ٹانگوں کے بارے میں بھی فکرمند ہوں۔ اس کا علاج جلدی اور اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔"

اقبال بولا۔ "میڈم! ہمیں زیادہ پریشانی سلیم کے حوالے سے ہے۔ آپ یہ پریشانی ختم کر دیں... باقی پریشانیاں خود ہی ختم ہو جائیں گی۔"

"ڈونٹ وری!" میڈم صفورا اٹھتے ہوئے بولی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رات گیارہ بارہ بجے کا وقت تھا۔ اقبال سو چکا تھا، ہم اونگھ رہے تھے۔ اچانک عمران تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی کوشش کی۔ نادیہ والی لال کوٹھی کی طرف سے مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں لرز گیا۔ یہ سلیم کی آوازیں تھیں۔ وہ تین چار بار زور سے چلایا پھر شاید کراہنے والے انداز میں بہ آوازِ بلند کچھ بولنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک اور مردانہ آواز اس کی آواز میں گڈمڈ ہوئی۔ کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز ابھری اور خاموشی چھا گئی۔

عمران بے چینی سے بیڈ روم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر تفکرات کی لکیریں تھیں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا اور میڈم صفورا کو کال کرنے لگا۔ تیسری یا چوتھی کوشش پر رابطہ ہوا۔

دوسری طرف سے میڈم کی بھاری لیکن پُرکشش آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"میڈم! ابھی کوٹھی کی طرف سے سلیم کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پر پھر تشدد کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ چھوٹی میڈم ہمارے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔"

"نہیں... نہیں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں بلکہ خود جاتی ہوں میں... تم فون آن رکھنا۔ میں کال کروں گی۔"

تقریباً دس منٹ انتظار میں گزرے۔ اس دوران میں کوٹھی کی طرف سے کوئی مزید آواز بلند نہیں ہوئی۔ آخر میڈم صفورا کی کال آ گئی۔ "ہیلو! میڈم صفورا اسپیکنگ۔" اس نے اپنے مخصوص بارعب لہجے میں کہا۔

"جی میڈم!"

"میں نے کہا تھا نا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں ابھی خود دیکھ کر آئی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس تیز بخار کی وجہ سے ہذیان بول رہا تھا۔ ایک چھوٹا فریج بھی نیچے گرا دیا ہے۔ اس کے اٹینڈنٹ نے دوا کھلائی ہے۔ اب سو رہا ہے۔ ڈونٹ وری... ہی از کوائٹ اوکے۔" میڈم نے کہا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ بخار والی بات بھی درست تھی۔ کل جب سلیم ہمارے پاس آیا تھا تو اس کا چہرہ بخار سے تمتما رہا تھا۔ یہ بخار شاید ان زخموں کی وجہ سے تھا جو تشدد کا نتیجہ تھے اور کئی دنوں سے اس کے جسم پر موجود تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے سوتے جاگتے ہی گزارا۔ یہ صبح تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ انیکسی کی طویل کھڑکیوں سے باہر

اہم اعلان

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک خارج کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہِ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

www.pkdigest.com

وہ دونوں عمارتیں نظر آ رہی تھیں جنھیں لال کوٹھیاں کہا جاتا تھا۔ عمارتوں کا درمیانی سبزہ زار اور ہماری انیکسی کا چھوٹا سا باغیچہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ گاہے بہ گاہے دیوہیکل السیشین کتے کی آواز فضا میں ابھرتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس کتے کی آواز میں ایک عجیب طرح کی ہولناک کیفیت موجود رہتی تھی۔ یہ آواز اس طرز کے دیگر کتوں سے مختلف تھی۔

یک لخت میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے لگا کہ نادیہ کی رہائش گاہ کی بالائی منزل سے کوئی پرچھائیں سی اڑتی ہوئی زمین پر گری ہے۔ یہ ہرگز وہم نہیں تھا۔ پرچھائیں کے زمین سے ٹکرانے کی تیز زور آواز صبح کے سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ میرے ساتھ عمران نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔

''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے تحیر کے عالم میں نکلا۔

وہ ایک دم پلٹا اور باہر کی طرف دوڑا۔ میں اس کے عقب میں گیا۔ ہم باغیچے میں سے بھاگتے ہوئے گزرے۔ اسی دوران میں پہرے داروں کی بلند آوازیں بھی سنائی دیں۔ ارد گرد ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ سب سے پہلے میں اور عمران ہی موقع پر پہنچے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں اپنے سامنے دیکھتا چلا گیا۔ بالائی منزل کی کھڑکی سے پختہ فرش پر گرنے والا شخص سلیم تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سر کے بل گرا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا اور پورا جسم جان کنی کے عالم میں لرز رہا تھا۔ عمران نے جھپٹ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''سلیم... سلیم!'' اس نے کربناک آواز میں پکارا۔

سلیم غالباً سننے اور جواب دینے کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔

ایک پٹھان گارڈ نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ''او خدایا! یہ کیا قیامت ہو گیا؟''

''گاڑی لاؤ۔'' عمران دہاڑا اور سلیم کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

ہم اسی حالت میں پورچ کی طرف بڑھے۔ ایک ڈرائیور بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف گیا اور اس کے دروازے کھولنے لگا۔ عمران نے سلیم کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نشست کا سفید غلاف خون سے سرخ ہو گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ عمران ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ بے پناہ بے چینی جو اس کے ہاتھ پاؤں میں دوڑ رہی تھی، یک لخت معدوم ہو گئی... اور تب اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ ہمارا دوست و خیر خواہ سلیم آخری ہچکی لے چکا تھا۔ وہ اب ہم میں نہیں تھا۔

''لگتا ہے کہ ختم ہو گیا۔'' ایک گارڈ نے تاسف بھری آواز میں کہا۔

دوسرے نے تائید کی۔ میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ وہ کسی سنگلاخ پتھر کی طرح سپاٹ اور بے حس نظر آ رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب نادیہ، سیٹھ سراج اور شیرا وغیرہ تیز قدموں سے پورچ کی طرف آتے دکھائی دیے۔ سیٹھ سراج کے ہاتھ میں کسی پلازے وغیرہ کا رول کیا ہوا نقشہ تھا۔ میڈم نادیہ نے سلیم کی خونچکاں لاش دیکھی اور کراہ کر بولی۔ ''اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

''خو، ام کو لگتا ہے جی... کہ یہ اوپر والا کھڑکی سے گرا ہے۔ وہ دیکھیں، کھڑکی اب بھی کھلا ہے۔'' پٹھان گارڈ نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ گرا نہیں... اس نے چھلانگ لگائی ہے۔'' سراج نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یہ رات کو بھی ایسی ہی باتیں کر رہا تھا۔''

''بکواس بند کرو۔'' اچانک عمران چنگھاڑا۔ وہ بے انتہا تیزی سے پلٹا اور چوڑے چکلے سراج پر جا پڑا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سیٹھ سراج کا کلف دار گریبان پکڑا، اسے دھکیلا، رگیدتا اور گھسیٹتا چلا گیا۔ دونوں ایک دیوہیکل موٹر سائیکل پر گرے اور پھر پورچ کے فرش پر آ رہے۔ شیرا عقب سے آیا اور عمران سے لپٹ گیا۔ وہ شاید کسی ایسی صورت حال کے لیے پہلے سے چوکس تھا۔ اس نے عمران کو پیچھے سے پوری طاقت کے ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ایک دم بہت سے افراد عمران پر پل پڑے۔ وہ شہد کی مکھیوں کی طرح عمران سے چمٹ گئے۔ اسی دوران میں سراج بھی عمران کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا گریبان ناف تک پھٹ چکا تھا۔ وہ بھی عمران کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں عقب سے سیٹھ سراج پر جھپٹا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس کے سر کے بال کسی جنگلی گھوڑے کے بالوں کی طرح سخت اور موٹے تھے۔ میں نے اسے اتنے زور سے کھینچا کہ وہ نہ صرف عمران سے جدا ہوا بلکہ پشت کے بل فرش پر گر بھی گیا۔

تاہم اسی دوران گارڈز نے مجھے بھی جکڑ لیا اور اوندھے منہ بستہ فرش پر گرا دیا۔ نادیہ کی چلّاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گارڈ مختیار کو ہینڈ کف لانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور عمران کو الٹی ہتھکڑی لگائی جا چکی تھی۔ عمران کو ہتھکڑی لگانے کے لیے ان لوگوں کو بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ پانچ چھ تنومند گارڈ اس وقت تک عمران سے چمٹے رہے تھے جب تک ہینڈ کف لاک نہیں ہو گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے دوران میں گارڈز اور میڈم کے پسینے چھوٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے انڈتا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا... اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اگر عمران اس چار دیواری میں اکیلا ہوتا تو اسے بے بس کرنا ان لوگوں کے لیے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ثابت ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ عمران کسی گارڈ سے رائفل وغیرہ چھین لیتا اور یہاں خون خرابا ہو جاتا۔ یقیناً یہ صرف میرا اور زخمی اقبال کا خیال تھا کہ عمران اس معاملے کو آخری حد تک نہیں لے گیا تھا۔

ہمیں رائفلوں سے دھکیل کر دوبارہ اسی تہ خانے میں لایا گیا جہاں ہم اس سے پہلے بند تھے۔ یعنی ہماری مہمانوں کی حیثیت ایک بار پھر ختم ہو چکی تھی۔ یہ میڈم صفورا کی رہائش گاہ والا وہی تہ خانہ تھا جہاں بیرکوں کی طرز پر دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے سامنے تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی۔ اسی جگہ میڈم صفورا نے عمران اور شیرے کی زور آزمائی بھی کرائی تھی۔

اس ساری مار دھاڑ اور دھینگا مشتی کے دوران میں عمران نے فقط ایک جملہ بولا تھا۔ جب اسے اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرایا گیا تو اس نے آتش فشاں لہجے میں کہا۔ ''تم نے سلیم کو مارا ہے... تمہیں اس کا حساب دینا پڑے گا۔''

اس کے بعد سے وہ خاموش تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس کی خاموشی اس کے بولنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ کسی بھی وقت کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا تھا جو سب کو حیران کر ڈالے۔

سلیم کا مردہ چہرہ مسلسل میری نگاہوں میں بھی گھوم رہا تھا۔ کل تقریباً اسی وقت وہ ہم سے ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ چہرے پر امید کی روشنی لیے اس نے عمران کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ موت کے کتنا قریب پہنچ چکا ہے... اور آج وہ مر چکا تھا۔ ابھی آٹھ دس گھنٹے بعد شاید اسے دفنا بھی دیا جاتا تھا۔ کتنی ناپائیدار ہے زندگی اور کتنے غیر متوقع ہوتے ہیں راہ حیات کے اندھے موڑ۔

کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اس سارے ہنگامے کے دوران میں نظر نہیں آئی تھی۔ یقیناً وہ کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے ملازمین نے اسے یہاں پیش آنے والے خونی واقعے کی اطلاع دی ہو۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ دندناتی ہوئی اس تہ خانے میں گھس آئی۔ اس کے ساتھ اس کے ایک درجن باوردی گارڈز بھی تھے۔ یہ سب لوگ مسلح اور الرٹ نظر آ رہے تھے۔ سیٹھ سراج اور شیرا بھی ساتھ تھے۔ سراج نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص چھپانے کے لیے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔

میڈم نے ہم دونوں کو بیرک نما کمرے میں دیکھا اور ہمارے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی دیکھیں۔ وہ گرج کر شیرے سے بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ ان کے ہاتھ کیوں باندھے ہیں تم نے؟ کس سے اجازت لی ہے تم نے؟''

سیٹھ سراج مؤدب انداز میں بولا۔ ''میڈم! انہوں نے بڑی گڑبڑ مچائی ہے جی۔ یہ دیکھیں جی، میرا گریبان۔ اس نے میرے سارے کپڑے پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔'' اس نے میڈم کو دکھانے کے لیے گرم چادر آگے سے کھول دی۔

شیرا بولا۔ ''ہم مجبور ہو گئے تھے میڈم! اگر ان کو پکڑا نہ جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

سیٹھ سراج نے تائید کی۔ ''اس عمران صیب کا میٹر تو بالکل گھوم گیا تھا جی۔ ذرا ڈھیل ملتی تو اس نے کسی گارڈ سے رائفل کھوس لینی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہو جاتا، گھٹ تھا۔''

میڈم نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ جیسے ایک پُرشور طوفان گزر جانے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے سرزنش کا انداز جاری رکھا۔ وہ جھلّاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے کہ ان کو صدمہ ہوا ہے اور وقتی طور پر انہوں نے ''رِی ایکٹ'' بھی کیا ہو گا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں دوبارہ اس طرح سے باندھ کر یہاں بیسمنٹ میں ڈال دیا جائے... چابی کہاں ہے؟'' اس نے آخر میں تحکم کے ساتھ پوچھا۔

شیرا آگے بڑھا اور اس نے کمرے کی چابی میڈم کی طرف بڑھا دی۔

''دوسری چابیاں بھی دو۔'' وہ پھر غصے سے بولی۔

شیرے نے ہینڈ کف کی دونوں چابیاں بھی میڈم کے سپرد کر دیں۔

وہ اندر آئی اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے ہینڈ کف کھولے۔

''ویری سوری عمران! ویری سوری۔'' وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے میرا دل دکھ سے بھر گیا ہے۔''

عمران اب بھی کچھ نہیں بولا۔ میڈم نے تمام گارڈز کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے۔ سیٹھ سراج تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ ''آپ بھی سراج صاحب!'' میڈم

www.pkdigest.com

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔
سیٹھ باہر چلا گیا۔ عمران نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔ ”میڈم! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ایسا ہونے دیں گی۔ میں نے آپ کے قول پر بھروسا کیا اور آپ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ نادیہ اور اس کے گارڈز، سلیم کو ہمارے پاس سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ہم صرف اس لیے خاموش رہے کہ آپ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گی۔“

”مگر عمران... جو کچھ ہوا ہے بالکل حادثاتی ہے۔ یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ سلیم اس طرح اپنی جان لے لے گا۔ گارڈز نے خود دیکھا ہے کہ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔“

”یہ بالکل غلط ہے میڈم!“ عمران نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ ”گستاخی معاف... سلیم کو آپ کی جنونی بہن نے کھڑکی سے دھکا دے کر مروایا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

میڈم کے چہرے کا رنگ بدلا تاہم وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ”اس وقت تم شاک میں ہو عمران! ویسے بھی اتنی جلدی کسی فائنل نتیجے پر پہنچنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر تمہارے دماغ میں کسی طرح کا کوئی شک ہے تو ہم اس پر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو اس کو سزا ملے گی اور ملنی بھی چاہیے۔“

”کیا آپ اپنی لاڈلی بہن کو وہ سزا دے سکتی ہیں جس کی وہ حق دار ٹھہرے گی؟“ عمران نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

میڈم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ”ہاں، میں دے سکتی ہوں مگر پہلے یہ تو کلیئر ہو جائے کہ ذمے داری کس پر آتی ہے۔ مجھے تھوڑا سا ٹائم دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، کچھ بھی تم سے چھپاؤں گی نہیں۔“

میڈم نے تسلی تشفی کی کچھ اور باتیں کیں۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے کو وقتی طور پر ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہمیں تہ خانے سے واپس انیکسی میں پہنچا دیا گیا۔ تاہم ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب انیکسی کے اردگرد گارڈز موجود ہیں اور وہ پوری طرح چوکس بھی ہیں۔ دو میڈیکل اسٹیشن کتا بھی انیکسی کے سامنے چکر لگا رہا تھا۔

سلیم کی موت نے اقبال کو بھی بہت دکھی کیا تھا۔ اس کی زخموں کی تکلیف اس دکھ میں جیسے دب کر رہ گئی تھی۔

وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں نے سلیم کی میت دیکھی ہے یار! وہ سر کے بل گرا ہے۔ اوپر سے خود چھلانگ لگانے والا کبھی ایسے نہیں گرتا۔ اس حرامزادی نے اسے قتل کیا ہے۔“

عمران نے اشارے سے اسے یاد دلایا کہ یہاں ان کی گفتگو سنی جاتی ہے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”اقبال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف آنے والی پرچھائیں دیکھی تھی۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح نیچے آیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ گرتے وقت وہ ہوش میں ہی نہ ہو۔“

”ان باتوں کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چل سکتا ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کس نے ہونے دینا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میڈم صفورا، سلیم کے وارثوں کی طرف ہی گئی ہے۔ وہ ہمدردی جتا کر اور رقم وغیرہ دے کر ان کے منہ بند کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ اسے جلد سے جلد دفنانے کے لیے بھی دباؤ ڈالا جائے۔“

عمران کا اندازہ درست تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد میڈم صفورا، کالی عینک پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ سفید کپڑوں میں ایک دراز قد شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ شکل و صورت سے کوئی پولیس افسر یا ایجنسی کا آدمی لگتا تھا۔ وہ تو برآمدے کی طرف چلا گیا، میڈم سیدھی ہماری طرف آگئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ”آپ کو سلیم کے جنازے میں شریک ہونا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور باہر پورچ میں موجود ہیں۔ شام سات بجے اس کی آخری رسوم ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ عمران نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم جائیں گے۔“

”لیکن اقبال کو نہ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ اسے چلنے میں دشواری ہوگی۔“ میڈم نے مشورہ دیا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے کافی کوشش کرنا پڑی ہے۔ میں خود سلیم کے گھر گئی تھی۔ اس کی بیوی اور بھائی وغیرہ کو یہی بتایا ہے کہ چند دن پہلے کچھ لوگ سلیم کو زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ ان سے اس کا کوئی لین دین کا تنازع تھا۔ ہم اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے میں لگے رہے، آپ لوگوں کو بھی نہیں بتایا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ کل وہ لوگ اسے خود ہی بس اڈے پر چھوڑ گئے۔ انہوں نے سلیم پر تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر پر ضرب آئی۔ وہ ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگا تھا کہ توازن کھو کر گر گیا۔“

عمران خاموش رہا۔ میڈم بھی ”گائیڈ لائن“ دے کر خاموش رہی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں ہمیں ہدایت دے رہی تھی کہ ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی ہیں اور سلیم کے وارثوں سے وہی کچھ کہنا ہے جو وہ بتا رہی ہے۔

ہم مسلم ٹاؤن میں واقع سلیم کے گھر پہنچے۔ سلیم کی لمبی چوڑی رشتے داری نہیں تھی۔ لاہور میں ایک بھائی کے علاوہ بس اس کے دو چار عزیز ہی تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں عرف عام میں ”معمولی“ کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سلیم کی پراسرار موت کے حوالے سے کسی طرح کا کوئی سوال اٹھاتا۔

اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سلیم سرکس میں ملازمت کرتا رہا تھا۔ لہٰذا سرکس سے تعلق رکھنے والے دو چار افراد بھی یہاں موجود تھے۔ یہ لوگ تعزیتی انداز میں عمران سے گلے ملے۔ ہم اندر گئے تو سلیم کی بیوی دھاڑیں مارتی ہوئی عمران سے لپٹ گئی۔ ”ہیرو بھائی! میں برباد ہو گئی۔ میرا سب کچھ چھن گیا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟“

سلیم کا چھ سات سالہ معصوم صورت بچہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو... میرا ابو کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا مگر جب بھی آتا تھا تو خوش باش ہوتا تھا۔ آج وہ چپ چاپ کیوں لیٹا ہوا ہے؟

عمران نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

بیوہ نے عمران کی قمیص اپنی مٹھیوں میں لی اور اسے ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ہیرو بھائی! وہ آج کل آپ سے ملتے تھے، آپ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو کس کی طرف سے ڈر تھا؟ وہ بہت پریشان تھے۔ اب ان کے مالک کہہ رہے ہیں کہ ان کا کسی سے لین دین کا جھگڑا تھا۔ کیا یہ بات سچ ہے... یا کچھ اور ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے؟“

پھر روتے روتے اس پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ عمران نے اسے سہارا دے کر نیچے چٹائی پر بٹھا دیا۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک فریاد کناں عورت جو شاید سلیم کی بہن تھی، سلیم کا زخمی ماتھا چوم رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ ”تیرے ساتھ کیا ہو گیا بھائی! تجھے کس کی نظر کھا گئی؟ تیری تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔“

میں نے دل میں سوچا... تیرا بھائی دشمنی کی وجہ سے نہیں، دوستی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ ایک سیاہ رات کو اس نے لال کوٹھیوں میں اپنے پرانے دوست کو دیکھا اور اس کی

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جون 2010ء کے شمارے کی ایک جھلک
شہر محبت
جذبات کی آندھیوں میں خوابوں کی کرچیاں بکھر جائیں تو رقابتوں کے طوفان تمام رشتوں اور رستوں کے نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ آخری صفحات پر آپ کے محبوب مصنف **طاہر جاوید مغل** کی دلگداز تحریر
عجیب المعتصم
ابتدائی صفحات پر تاریخ کے تاریک گوشوں کو بے نقاب کرتے عبرت اثر واقعات...... **ہمایوں بلگرامی** کا منفرد انداز
حضرت شموئیلؑ
قدرت کی کرشمہ سازیاں...... ایمان اگر مضبوط ہو تو بنجر زمین بھی ہری بھری کھیتی میں ڈھل جاتی ہے......
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے انبیائے کرام کا سلسلہ
واپسی
تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل طویل داستان...... **محی الدین نواب** کے قلم کا جادو
حصے دار
ملک صاحب کا ایک اور کارنامہ......
زمینداروں کے ظلم و جبر کا ایک نیا روپ
اس کے علاوہ: اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط
مزید: ناہید سلطانہ اختر، کاشف زبیر، نجمہ مودی اور مریم کے خان کی دلچسپ تحریریں

مدد کرنے کی کوشش کی۔ بس اس کی یہی خطا اسے دھیرے دھیرے قبر کی تاریکی کی طرف لے گئی۔

موقع پر موجود سلیم کے رشتے دار چہ میگوئیاں کر رہے تھے مگر ڈرے ہوئے بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سلیم جن لوگوں کے لیے کام کرتا تھا، وہ بہت زور والے ہیں اور ممکن ہے کہ سلیم ان کے لیے کوئی غیر قانونی ڈیوٹی بھی انجام دیتا ہو۔ اس معاملے کو کھنگال کر وہ اپنے لیے اور مرنے والے کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیا تھا؟ یہ وہی ناانصافی تھی جو ہمارے معاشرے میں ہر جگہ روا رکھی جا رہی ہے۔ طاقتور کمزور کو دباتا ہے، اس کے لیے جینے کے راستے بند کرتا ہے۔ وہ ظلم کرتا ہے اور مظلوم کا مضحکہ بھی اڑاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں ''کامن مین'' کے لیے انصاف تک پہنچنے کا رستہ جوئے شیر لانے سے ہزار گنا زیادہ دشوار ہے۔ میری ثروت اور اس کے ہنستے بستے گھرانے کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ نے انصاف کے حصول کی معمولی سی کوشش کی اور انہیں موت وجلاوطنی کی کڑی سزائیں سنادی گئیں۔

ثروت کے اہلِ خانہ کا المیہ کوئی چھوٹا المیہ نہیں تھا۔ یہ المیہ ایک بڑے گھاؤ کی صورت میرے سینے میں مستقل جگہ بنا چکا تھا۔ یہ تو عمران کا سیلابی مزاج تھا اور اس کی طوفانی رفتار تھی کہ میں اس کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا اور مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع کم مل رہا تھا، ورنہ یہ ایسا غم تھا کہ مجھے دنوں میں ہلاک کر دیتا۔ اب بھی میں جس وقت سیٹھ سراج اور اس کے ساتھی عارف خان وغیرہ کو دیکھتا تھا، میرے اندر ایسی سخت ٹوٹ پھوٹ مچتی تھی کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے سلیم کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ دیکھا۔ حالات کا سفر کتنا غیر متوقع ہوتا ہے۔ جس رات سلیم نے لال کوٹھی میں عمران کو بچایا تھا اور اسے میڈم نادیہ کے خطرناک جنسی رویے سے بچا کر باہر نکال دیا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ حرکت دراصل اس کی موت کے سفر کا آغاز بننے والی ہے۔

ہم سلیم کو مسلم ٹاؤن کے ایک نیم تاریک قبرستان میں دفنا کر اور اس کی قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے واپس آگئے لیکن وہ جیسے بدستور ہمارے پیچھے رہا۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا وہ ایک سوالیہ نشان کی طرح ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ ہم سے پوچھتا رہا۔ ''کیا تم میرے خون کا حساب نہیں لو گے؟ کیا تم بھی میری اذیت ناک موت کو بھول جاؤ گے؟ میرے دوستو! مجھے تمہارے ہاتھوں سے چھینا گیا اور بے دردی سے مارا گیا ہے۔ اس جنونی عورت نے بڑی سفاکی سے میری ایک ایک رگ سے جان کشید کی ہے۔ میری بدقسمتی کہ تم مجھے بچا نہیں سکے لیکن کیا اب تم میرے لیے انصاف بھی حاصل نہیں کر سکو گے؟''

تیسرے روز میڈم صفورا نے اس معاملے پر ہم دونوں سے لمبی چوڑی میٹنگ کی۔ وہ اکیلے میں عمران سے بات کرنا چاہتی تھی مگر عمران نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا۔ بہ ظاہر میرے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن وہ جان بوجھ کر مجھے ساتھ رکھتا تھا۔ جیسے ہر معاملے میں میری تربیت کا خواہاں ہو۔ کم از کم میری سمجھ میں تو یہی بات آتی تھی۔

آج میڈم کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی کہ سلیم کی موت کیسے واقع ہوئی۔ وہ اس بات پر بھی اصرار نہیں کر رہی تھی کہ اس نے خود ہی چھلانگ لگائی ہے۔ وہ اس قضیے کو ایک طرف رکھ کر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب اس کی گہرائی میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بین السطور وہ ہمیں یہ بھی بتا رہی تھی کہ اسے نادیہ سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں ہے اور وہ اسے کسی بھی سچے یا جھوٹے الزام سے بچانے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قیمت دے سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ ''عمران! جو کچھ بھی ہوا بہت برا ہوا۔ اگر ہم چاہیں تو بال کی کھال بھی اتار سکتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود ہمیں کچھ بھی نہ ملے۔ میں نے اپنے طور پر پوری انویسٹی گیشن کی ہے۔ یہاں کسی چیز کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ سلیم کی چوٹ ایسی نہیں تھی کہ وہ ٹھیک طور سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی جان نہ لی ہو، وہ کھڑکی کے پاس گیا ہو۔ کسی کو پکارنا چاہتا ہو مگر توازن کھو کر گر گیا ہو۔ میں ''بریفلی'' یہ کہوں گی کہ کیوں نہ ہم ایک ایسا راستہ اختیار کریں جو سب کے لیے بہتر ہو۔ بے شک زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن مادی نقصانات کا مداوا تو کسی نہ کسی حد تک کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی نئی اسکیم میں کنال کنال کے دو پلاٹ سلیم کی بیوہ کے نام کر دیے ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی قیمت اب بھی ڈیڑھ کروڑ سے کم نہیں۔ اسے 25 لاکھ روپیا نقد دیا ہے۔ اور ہاں... کسی طرح کا شک ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ سب کچھ حق حلال کی کمائی سے ہے۔ میں اور میرے مرحوم شوہر نے رئیل اسٹیٹ کے کام میں اپنا بہت سا خون پسینا ایک کیا ہے۔''

عمران اب بھی خاموش تھا۔ اس کے بعد میڈم نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کھولا اور بولی۔ ''دیکھو عمران! تمہارے دوست سلیم کی موت سے تم تینوں کا نقصان بھی تو ہوا ہے۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے مگر COMPENSATION تو ہوتی ہے نا... اور میں یہ کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے چیک بک نکالی۔ اس میں سے ایک چیک سائن کیا اور یہ بلینک چیک عمران کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھی اور خاموشی سے چلی گئی۔

عمران اور میں خالی خالی نظروں سے چیک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت مالدار عورت تھی۔ ہم اس چیک پر کوئی رقم بھی بھر لیتے، امید تھی کہ وہ کیش ہو جائے گی۔ ایک طرح سے یہ چیک اس نہایت مشکل کام کا معاوضہ بھی تھا جو عمران نے میڈم صفورا کے لیے کیا تھا۔ یعنی فاسٹنگ بدھا کو صدیقی کی تحویل سے نکالنا۔

یہ چیک اگلے روز تک یونہی شیشے کی تپائی پر پڑا رہا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ عمران نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی غم و غصے کی کیفیت ماند پڑنے لگی۔ اگلے روز اس نے کھانا بھی کھایا اور ہلکے پھلکے انداز میں دو چار باتیں بھی کیں... لیکن کیا وہ اندر سے واقعی سنبھل رہا تھا؟ یہ سوال خاصا اہم تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے اس کی دلی کیفیت کے بارے میں جاننا اس کے نہایت قریبی ساتھیوں کے لیے بھی دشوار ہوتا تھا اور میرا تو اس کے ساتھ تعلق بھی بہت پرانا نہیں تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا عمران نے واقعی یہ صدمہ سہہ لیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔'' اقبال نے بھی گول مول جواب دیا۔

میں اور اقبال باہر لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اقبال کی ٹانگوں کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر روزانہ اسے دیکھنے کے لیے آرہا تھا۔

''کہیں وہ کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں کرے گا؟'' میں نے اقبال سے پوچھا۔

''میرے خیال میں نہیں... اور اس کی وجہ تم ہو۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''میں؟''

''ہاں... تم اس وقت ہمارے ساتھ ہو۔ عمران ہرگز نہیں چاہے گا کہ وہ اس کشیدہ معاملے کو اور زیادہ کشیدہ کر دے... کیونکہ ایسا ہوگا تو اس کا اثر تم پر اور تمہاری فیملی پر بھی پڑے گا۔ اس لحاظ سے میں تو سمجھتا ہوں کہ نادیہ الو کی بچی کی قسمت اچھی ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔ ورنہ ہم لنڈورے تو کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ہاں... ایک بات کا امکان اب بھی ہے۔'' اقبال مدھم آواز میں بولا۔

''یہ یقیناً'' ایک انوکھا کیس ہے......
یہ پودا اس علاقے میں تو پیدا نہیں ہوتا......''

''وہ کیا؟''

''وہ کسی اور طریقے سے اس کو قرار واقعی سزا دلا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔'' اقبال کا لہجہ معنی خیز تھا۔

اقبال کی بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اس سے پہلے سیٹھ سراج کے ایکسیڈنٹ والی مثال میرے سامنے تھی۔ وہ ایک چھوٹے پیمانے کی کارروائی تھی مگر عمران نے اس طرح کی تھی کہ نہایت خوف زدہ و پریشان ہونے کے باوجود میں نے بھی دلچسپی محسوس کی تھی۔ کیا اب بھی وہ ایسا ہی کچھ کر سکتا ہے؟ کیا واقعی اس کے پاس قابلِ اعتماد دوستوں کا کوئی ایسا سیٹ اپ موجود ہے جن کے ذریعے وہ بہ وقتِ ضرورت کسی بھی شخص کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے؟ کیا وہ یہاں بھی اس سیٹ اپ کو حرکت میں لانے کی ہمت کرے گا؟

اس آخری سوال کا جواب خاصا مشکل تھا۔ سیٹھ سراج کے خلاف ایک معمولی نوعیت کی کارروائی کی گئی تھی مگر یہاں لال کوٹھیوں میں ایک گمبھیر صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ نوّے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ چھوٹی میڈم نادیہ سفاکانہ طریقے سے ایک قتل کی مرتکب ہو چکی ہے۔ اب اگر نادیہ کو سزا دینے کی بات ہوتی تو پھر اس معاملے کو بہت آگے تک چلے جانا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ عمران اس موقع پر اس طرح کا بڑا رسک لے گا۔

وہ آج صبح سے میڈم کی فراہم کردہ ٹویوٹا کار لے کر نکلا

www.pkdigest.com

ہوا تھا۔ اس نے بتایا بھی نہیں تھا کہ کہاں جارہا ہے... بس میرا اندازہ تھا کہ وہ ثروت اور ناصر بھائی کے ایڈریس کے سلسلے میں حاجی صاحب سے ملنے بھی جائے گا۔

شام کو میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ واپس آیا تو اس کے پاس وہ اکاؤنٹ نمبر اور ایڈریس موجود تھا جہاں حاجی صاحب نے تقریباً ایک لاکھ یورو کا پے آرڈر ارسال کرتا تھا۔ یہ فرینکفرٹ جرمنی کا ایڈریس تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس بینک اکاؤنٹ سے ناصر بھائی کی قیام گاہ کا سراغ بھی لگایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ طویل عرصے بعد یہ پہلی حقیقی مسرت تھی جو مجھے حاصل ہوئی۔ حاجی صاحب کے ساتھ عمران کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا تھا کہ ثروت کی منگنی تو ہوچکی ہے مگر شادی کا پروگرام ابھی طے نہیں ہوا۔

عمران کا پاسپورٹ تو موجود تھا مگر مجھے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، تقریباً ہر چھوٹے بڑے محکمے میں عمران کی کوئی نہ کوئی واقفیت نکل ہی آتی تھی۔ وہ پاسپورٹ کے دفتر سے بھی ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس نے بتایا۔

''کل ہم جائیں گے۔ ہمیں لائن میں لگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارے جانے تک فارم تقریباً تیار ہوگا اور پاسپورٹ فیس بھی جمع ہوچکی ہوگی۔ بس تمہارے شناختی کارڈ کی ضرورت ہے۔''

''مگر شناختی کارڈ تو گھر میں ہے۔''

''وہ بھی میں لیتا آیا ہوں یار! والدہ کی خیر خیریت بھی پوچھ آیا ہوں۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں بلکہ پورا گھر بے تاب ہے۔ کل پاسپورٹ آفس سے واپسی پر ان سے تمہاری ملاقات طے ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور بریانی وغیرہ کا لنچ بھی فائنل ہے۔'' اس نے شناختی کارڈ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کا ہر کام طوفانی انداز کا ہوتا تھا۔ برق رفتار اور اندھا دھند... جیسے یہ دنیا ایک بہت بڑا کنواں تھی اور وہ ہر وقت اس میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔

اگلے روز ہم نے ارجنٹ پاسپورٹ اپلائی کیا۔ خرچے کے لیے میرے پاس وافر پیسے موجود تھے... اور یہ وہی ''دو... چھ'' کے کھیل والی انعامی رقم تھی۔ پاسپورٹ آفس سے فارغ ہوکر ہم اس رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے جہاں عمران نے میرے اہلِ خانہ کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ یہ عمارت ڈیفنس میں واقع تھی۔ میری سانس تیز چل رہی تھی اور دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگی تھیں۔ آج کئی ماہ بعد آخر وہ دن آگیا تھا جب میں اپنے گھر والوں کے روبرو ہونے لگا تھا۔ محبت، خوشی، ندامت، دکھ بہت سے جذبات میرے اندر گڈمڈ ہورہے تھے۔ راستے بھر عمران نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں زیادہ ٹینس ہوجاؤں۔

ایک پُرسکون جگہ پر درختوں اور پھولوں میں گھری یہ ایک خوب صورت کوٹھی تھی۔ گیٹ پر باوردی گارڈ نظر آرہا تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ عمران گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ پورچ میں بھی ایک سادہ پوش گارڈ موجود تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نے ذرا دھیان سے دیکھا تو یہ عمران کا وہی آصف نامی ساتھی تھا جس نے عمران کے گھر ہماری غیر موجودگی میں قادر لیے کی حفاظت و نگرانی کی تھی۔

والدہ، فرح اور عاطف بڑی شدت سے میرا انتظار کررہے تھے۔ ان سے میرا ملاپ ناقابلِ فراموش اور نہایت رقت آمیز تھا۔ اس ملاپ کی کیفیت میں شاید لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔ فرح مجھ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ والدہ مسلسل میری پیشانی پر بوسے دیتی جارہی تھیں۔

... اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا جیسے پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ بہت سی باتیں ہوگئیں پھر بھی بہت سی ادھوری رہ گئیں۔ والدہ مجھے اور عمران کو ایک ساتھ دیکھ کر جیسے نہال ہورہی تھیں۔ عمران چند ہی دنوں میں جیسے اس گھر کا ایک فرد نظر آنے لگا تھا۔ والدہ اسے بڑی روانی سے بیٹا اور فرح... بھائی عمران کہہ کر پکار رہی تھی۔ یہ سب لوگ جیسے عمران کے سحر میں گرفتار تھے۔ مجھے ایک طرح کا حسد محسوس ہوا لیکن سچی بات ہے کہ اس حسد کے اندر خوشی بھی پوشیدہ تھی۔ عاطف، عمران کی چوٹوں کے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔ عاطف کے سوال کے جواب میں عمران نے کہا۔ ''یار! میرا تو کام ہی چوٹوں کا ہے۔ تمہیں کہا تو ہے کہ کسی دن سرکس آؤ اور تماشا دیکھو۔ تمہیں پتا چلے گا کہ وہاں ہمارے لیے کیسی کیسی کلاسیکل چوٹوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کوئی بھی فن کار اس سہولت سے محروم نہیں ہے۔ کوئی موت کے کنوئیں میں اوندھے منہ گر کر مزے لے سکتا ہے، کسی کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آنے کی آس ہوتی ہے۔ کسی کو بپھرے ہوئے شیر سے کھجلی ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔''

''مگر بھائی! آپ کو اتنی سخت کھجلی کس نے ڈالی ہے؟'' فرح نے عمران کے چہرے کی خراشوں اور نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساری باتیں تمہیں یہیں بتادوں گا تو پھر تم شو دیکھنے کیسے آؤ گی؟'' عمران نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بزرگانہ انداز میں کہا۔

والدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے۔ ''امی! کیوں گناہ گار کررہی ہیں۔''

''میں ہوں نا گناہ گار۔ مجھے پتا ہے کہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاید انہی غلطیوں کی سزا مجھے اور ہم سب کو ملی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تو ثروت کو بھول سکتا ہے۔ وہ بھی اپنی علیحدہ زندگی شروع کرسکتی ہے۔ یہ میری غلطی تھی۔ کاش میں نے اس وقت تمہاری بات سمجھ لی ہوتی۔ پر اب بھی کوشش ہوسکتی ہے۔ عمران بیٹے نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ناصر جرمنی میں ہے۔ اس کا ایڈریس بھی پتا چل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں ثروت کی بات وغیرہ تو طے ہوگئی ہے لیکن شادی کے بارے میں ابھی کوئی تاریخ طے نہیں ہوسکی۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی تین چار مہینے اور لگ جائیں۔ تم مجھے کسی طرح ایک بار، صرف ایک بار ناصر اور ثروت سے ملادو۔ تیری خوشی کے لیے میں ان کے سامنے اپنی جھولی پھیلا دوں گی۔'' وہ بول رہی تھیں اور روتی چلی جارہی تھیں۔

میں نے انہیں دلاسا دیا۔ ''امی! آپ بس دعا کریں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''مگر اب اس کام میں زیادہ دیر نہ کرو۔ میں نے عمران سے بھی یہی کہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا بنتے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ بس کسی طرح ایک بار فون پر ہی ناصر سے میری بات کروادو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ سب کچھ ٹھیک کرلوں گی۔''

میں نے والدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ بھائی بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیں۔ مجھے یوں لگا کہ دل کا بہت سا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔ عمران مختصر طور پر میرے اہلِ خانہ کو بتا چکا تھا کہ سیٹھ سراج کے ساتھ میری کس طرح کی ٹینشن شروع ہوئی تھی اور اس ٹینشن... کی وجہ سے میرا کچھ عرصہ گھر سے دور رہنا کیوں ضروری ہے۔ اہلِ خانہ عمران کی ہر وضاحت سے مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ واقعی ہر کسی کو قائل کرلیتا تھا۔

رخصت ہونے سے پہلے میری بہن فرح نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور نم ناک آنکھوں سے بولی۔ ''بھائی! پچھلے ماہ باجی ثروت کا ایک خط آیا تھا۔ اس لفافے پر بھیجنے والے کا ادھورا سا ایڈریس لکھا ہوا تھا اور یقیناً وہ بھی فرضی تھا۔ باجی نے اپنی مجبوریاں لکھی تھیں اور وہ حالات لکھے تھے جن کی وجہ سے انہیں اچانک جانا پڑا۔ اس لفافے میں ایک خط آپ کے نام بھی تھا۔'' فرح نے مٹھی میں دبا ہوا ایک تہ شدہ کاغذ مجھے تھما دیا۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ میں نے کھول کر دیکھا، یہ ثروت کی جانی پہچانی تحریر تھی۔ بے ساختہ میری نگاہیں الفاظ پر پھسلنے لگیں۔ ثروت نے لکھا تھا۔

''السلام علیکم، تابش! میں جانتی ہوں کہ تمہیں بہت بڑا دکھ دے کر گئی ہوں۔ بغیر تمہیں بتائے، بغیر الوداع کہے ہمیشہ کے لیے تمہیں چھوڑ گئی ہوں۔ اس دکھ کے لیے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو اس محبت کے صلے میں مجھے معاف کردینا۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا تابش! میں وہی کرسکتی تھی جو میں نے کیا... اور ناصر بھائی بھی وہی کرسکتے تھے جو انہوں نے کیا۔ میری بدنامی کے اشتہاروں نے ہم سب کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔

''یہاں بھائی نے میرے لیے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔ اس کا نام یوسف ہے۔ راولپنڈی کا رہنے والا ہے۔ ہماری انگیجمنٹ ہوگئی ہے۔ وہ بہت سادہ مزاج اور دل کا صاف ہے۔

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاءاللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826 , 021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

میں ڈرتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ جھوٹ کی زندگی نہ گزارنا پڑے۔ لیکن میں جن حالات سے گزری ہوں وہ اتنے سنگین ہیں کہ میں ان کے بارے میں یوسف کو بتا بھی نہیں سکتی۔ بہرحال، کوئی اچھا وقت آیا تو ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت بتا بھی دوں۔ فی الوقت خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے نئے راستے پر چلنے کا حوصلہ اور ہمت بخشے۔

"میں جانتی ہوں تابش! ابھی تمہارے زخم ہرے ہیں۔ بہت تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ جلد ہی دکھ کی یہ شدت برقرار نہیں رہے گی۔ اور پھر دیکھنا زندگی خود ہی جینے کا راستہ ڈھونڈ لے گی۔ مجھے پورا یقین ہے، تمہاری زندگی میں کوئی بہت... بہت اچھی لڑکی آئے گی۔ وہ مجھ سے کہیں بڑھ کر تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہارے سارے دکھ اپنی پلکوں سے چن لے گی۔ میں نے تمہارے لیے اللہ سے رو رو کر مانگا ہے اور سب کہتے ہیں کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعا سنتا ہے۔

"جو کچھ ہوا ہے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تابش! میری واپسی کی آس نہ رکھنا اور نہ مجھ بدقسمت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو بس اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھیں گے۔ خدا حافظ۔"

خط میرے ہاتھ میں لرزتا رہا۔

☆☆☆

ہم لال کوٹھیوں میں تین دن مزید رہے۔ اس دوران میں عمران کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سلیم کی موت کا دکھ وہ پی گیا ہے۔ میڈم صفورا نے نادیہ سے بھی ہم تینوں کی ملاقات کرا دی تھی۔ اس ملاقات میں نادیہ نے یہ تو ہرگز تسلیم نہیں کیا کہ وہ سلیم کے قتل کی ذمے دار ہے تاہم اس نے اس بات پر معذرت ضرور کی تھی کہ اس کی وجہ سے سلیم ناگہانی موت کا شکار ہوا۔ ایک موقع پر اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر عمران اسے سلیم کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہے تو اس کے خلاف کیس درج کرا دے۔ وہ پولیس تفتیش میں پورا پورا تعاون کرے گی اور اس سلسلے میں ذرا سا رنج بھی دل میں نہیں رکھے گی۔

ظاہر تھا کہ یہ سب منہ زبانی باتیں تھیں اور یہ باتیں بھی وہ یقیناً میڈم صفورا کی ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔ آخر میں وہ بولی۔ "جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے، میں اس کو بالکل تسلیم کرتی ہوں اور اس کے لیے آپ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگتی ہوں۔ میرے کہنے پر سلیم کو مارا پیٹا گیا تھا... اور یہ خاصی سخت مار پیٹ تھی۔ دراصل میرا یہ رویہ سلیم کے ساتھ کوئی خاص نہیں تھا۔ میں اپنے ملازموں کو ویسے تو خوش رکھتی ہوں مگر ان کی دھوکا دہی سے مجھے ہمیشہ بہت چڑ رہی ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ نہیں۔ بس جو کچھ ہوا اسی وجہ سے ہوا۔"

اس ملاقات میں عمران کا رویہ خاصا نرم رہا۔ اس نے نارمل انداز میں دونوں بہنوں سے باتیں کیں۔ اگلے تین روز میں حالات کافی حد تک معمول پر آ گئے۔

میڈم صفورا کو اندیشہ تھا کہ اس دوران میں شاید صدیقی بھی لال کوٹھیوں کا چکر لگائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ قدرتی طور پر حالات ایسے ہوئے تھے کہ صدیقی کا دھیان "فا سٹنگ بدھا" کی چوری کے سلسلے میں مکمل طور پر ایک دوسری پارٹی کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو لاہور میں بھی اسے پریشان کرتے رہے تھے۔ یہ کون تھے؟ ان کی تعداد کیا تھی اور ان کا رویہ کیسا تھا؟ اس بارے میں ابھی میڈم اور عمران کو بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔

اقبال کے زخموں کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ میڈم چاہتی تھی کہ اب ہم لال کوٹھیوں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ ہمیں رہائش وغیرہ کی بہترین سہولتیں فراہم کرنے کے لیے تیار تھی مگر عمران کا ارادہ واپس اپنے دس مرلے کے مکان میں جانے کا تھا جو راوی روڈ پر تھا۔ اس کا خیال تھا اسے وہاں زیادہ اطمینان دشمنوں سے نجات میسر ہوں گے۔

www.pkdigest.com

اس روز رات کو ہم لال کوٹھیوں سے واپس راوی روڈ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ جانے سے پہلے میڈم صفورا نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں الوداعی ڈنر دیا۔ اس میں نادیہ اور سیٹھ سراج بھی موجود تھے۔ سیٹھ سراج کی صورت مجھے ہمیشہ اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ ایک عیاش تو وہ لگتا تھا۔ ہر یہ میں زلیخا کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق اب ہمارے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اور یہ تو فقط ایک مثال تھی۔ ایسی نہ جانے کتنی مثالیں اس کے کھاتے میں موجود تھیں۔ ایسے باپ کا بیٹا واہی جیسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس الوداعی ڈنر میں، میں نے پہلی بار نادیہ کو ہوش و حواس میں دیکھا۔ اس نے ڈرنک نہیں کی تھی۔ اس کا لباس بھی بے ہودہ نہیں تھا۔ وہ عمران کے ساتھ لگاوٹ سے باتیں کرتی رہی۔

ہم راوی روڈ واپس آ گئے۔ میں عمران کو ثروت کے خط کے بارے میں تین روز پہلے ہی بتا چکا تھا۔ عمران نے بھی یہ خط پڑھا تھا اور اس کی سطروں میں کروٹ لیتے ہوئے بے پناہ درد کو محسوس کیا تھا۔ درحقیقت اس خط کو پڑھنے کے بعد

میرے اندر ثروت کو ڈھونڈنے اور اس تک پہنچنے کا ارادہ مزید مضبوط ہوا تھا۔ عمران کے احساسات بھی ایسے ہی تھے۔ میں ثروت کے خط کو درجنوں بار پڑھ چکا تھا اور ہر بار یہ خط مجھے ماضی کے دھندلکے میں لے گیا تھا۔ جب لاہور کے گلی کوچے، سبزہ زار اور ریستوران ہماری محبت کے گواہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کی دید کی گھڑیاں گن گن کر گزارتے تھے۔ محبت کا اظہار بہت زیادہ نہیں تھا مگر شدت بہت زیادہ تھی۔ بدلتے موسم، خوش رنگ تہوار اور ملن کے دیگر مواقع محبت کے زینوں جیسے تھے۔ ہم ان زینوں پر پاؤں دھرتے اوپر اٹھتے جارہے تھے۔ ہماری باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی مگر ایک عید کے موقع پر بات پکی ہوگئی تھی۔ نشانی کے طور پر انگوٹھی وغیرہ بھی پہنائی گئی تھی۔ اندازاً ڈھائی سال بعد شادی طے ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے ثروت کو گن کر بتایا تھا کہ ڈھائی سال میں تقریباً 128 ہفتے ہوتے ہیں۔ یعنی ہماری شادی تقریباً 128 ہفتے بعد ہوگی۔ اب یہ ''ہفتوں کی بات'' ہے۔ یہ بات ثروت کو دلچسپ لگی تھی۔ پھر ایک موقع پر میں نے اس کی ایک فائل دیکھی تو اس میں ایک صفحے پر بہت سی سرخ لکیریں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ سرخ لکیروں کو سبز بال پوائنٹ سے کاٹا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ یہ 128 ہفتوں کی لکیریں ہیں۔ ہر ہفتہ گزرنے کے بعد میں ایک لکیر کاٹ دیتی ہوں۔ اب صرف 55 لکیریں باقی رہ گئی ہیں۔

ہاں، وہ ایسی ہی محبت بھری دیوانگی کے دن تھے۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہماری شادی کا درمیانی وقت ایک دم بھاپ بن کر اڑ جائے اور ہم اچانک ملن کی گھڑی کو اپنے روبرو دیکھیں... وقت بھاپ بن کر تو نہیں اڑا تھا مگر پل پل سرک رہا تھا اور ہم اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ چند اوباشوں نے اپنے شر کی چنگاریوں سے ایک ہنستی بستی خوشبودار بستی کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ سرخ لکیریں جو کوئی بڑے شوق کے ساتھ سبز روشنائی سے کاٹتا تھا، کینسر کے جرثوموں کی طرح ایک دم بڑھتی چلی گئیں اور اب انتظار کے کاغذ پر جدائی کی سرخی کے سوا کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔

اب تک کا وقت میں نے پتا نہیں کیسے گزار لیا تھا مگر اب جبکہ میں نے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کردیا تھا اور عمران ویزے کے حصول کی تیاری کررہا تھا، ایک دم ہی میری اندرونی... بے قراری بڑھنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ درمیانی مراحل جلد سے جلد طے ہوں اور میں ثروت کی تلاش میں فرینکفرٹ پہنچ جاؤں۔

عمران کے ہاتھ کی چوٹ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود وہ شام کو سرکس چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمران نے موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا اور سیکڑوں افراد سے داد وصول کی۔ شاہین کے ساتھ عمران کی ملاقات بھی دلچسپ تھی۔ دونوں میں زبردست نوک جھوک ہوئی۔ شاہین کو شکوہ تھا کہ عمران اتنے روز اسے بتائے بغیر غائب رہا ہے اور اس کا سیل فون بھی بند رہا ہے۔ عمران نے ایک بار پھر بے پرکی اڑائی۔ ''تمہیں بتایا تو تھا ڈارلنگ کہ ریماجی کی پیشکش کو ٹھکرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اتنی محبت سے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی کہ اگر میری عمر اسی نوے سال بھی ہوتی تو بھی ایک بار تو میں ضرور سرگرم بلکہ سراسر گرم ہوجاتا۔''

''اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''بھئی، وہی فلم کا کام۔ فلم اندھی لڑکی میں میرا رول کافی اہم ہے۔ ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی کام کررہا ہوں۔ ایبٹ آباد میں سات آٹھ روز شوٹنگ ہوئی ہے۔ اب لاہور میں ریماجی کے گھر پر آٹھ دس روز کا ایک اسپیل ہے۔ ریماجی تو کہتی ہیں کہ میں شوٹنگ کے دوران میں ان کے گھر ہی رہوں۔ آنے جانے میں جو وقت خرچ ہوتا ہے وہ بچے گا لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔'' عمران نے مشورہ طلب نظروں سے شاہین کو دیکھا۔

''کیوں اچھا نہیں لگ رہا؟'' شاہین نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''فلم کے ہیرو صاحب جو کافی بزرگ ہیں، پہلے ہی مجھ سے کچھ خار کھا رہے ہیں۔ اگر میں مستقل طور پر ریماجی کا فائیو اسٹار مہمان بن گیا تو وہ غصے میں فلم ہی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد مجھے پتا ہے کہ کیا ہوگا... ریماجی کہیں گی کہ میں ہی ہیرو کی جگہ لے لوں۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق آدھی فلم میں تو ریماجی کو موٹر سائیکل پر ہیرو کے پیچھے بیٹھے رہنا ہے اور وہ جس طرح سے چپک کر بیٹھتی ہیں... اللہ معافی۔ اوپر سے بریکیں لگانے کی مصیبت۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ بریکیں لگانے سے... میری بات سمجھ رہی ہونا تم... میں تو پرسوں ایبٹ آباد میں اسی وجہ سے ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' اسسٹنٹ عباس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ شاہین شرم سے سرخ ہورہی تھی۔

''میں ہیرو صاحب کے ڈپلی کیٹ کے طور پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ریماجی میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم سڑک پر جارہے تھے کہ اچانک آگے ایک گدھی آگئی۔ میں نے اس ڈر سے بریک نہیں لگائے کہ ریماجی عقب سے میرے ساتھ چپٹ جائیں گی مگر جو کچھ ہوا وہ زیادہ برا تھا۔ موٹر سائیکل گدھی کی پچھلی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ ہم دونوں پکی زمین پر گرے۔ ریماجی نیچے، میں اوپر۔ بالکل فلمی پوز تھا۔ میرے سر پر تھوڑی سی چوٹ بھی لگی۔ ریماجی تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہورہی تھیں۔ ویسے بھی بڑی بے باک ہیں۔ کہنے لگیں... عمرانی! اس سے تو اچھا تھا کہ تم بریک ہی لگا لیتے...''

''زبردست... بہت نئی۔'' شاہین نے زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور شاہین ڈیئر! یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں کہ سر پر چوٹ لگنے سے بھی بھی بندے کا حافظہ وقتی طور پر ختم شدہ ہو جاتا ہے۔ ایک دو منٹ کے لیے تو مجھے بھی یاد نہیں رہا کہ ریماجی کے اوپر سے اٹھنا ہے۔ ریماجی کو بھی شاید یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تو ڈائریکٹر صاحب بھاگے ہوئے آئے اور انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہم موٹر سائیکل پر سے گر چکے ہیں۔''

شاہین تنک کر بولی۔ ''مجھے تو لگ رہا ہے کہ تمہارا حافظہ ابھی تک متاثر ہے... ریما وغیرہ تمہارے ساتھ تھی ہی نہیں۔ تم اکیلے ہی گدھی سے ٹکرائے اور گدھی کے اوپر ہی گرے اور اس گدھی کی بو ابھی تک تمہارے کپڑوں سے اور تمہاری بے ہودہ باتوں سے آرہی ہے۔''

پھر وہ اسسٹنٹ منیجر عباس سے مخاطب ہوئی۔ ''عباس صاحب! کل سے میں ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر انٹری نہیں دوں گی۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

اس کے بعد وہ گھومی اور پاؤں پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔ ''او بات تو سنو یار... ہیلو... ہیلو۔'' عمران اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

عباس بولا۔ ''اب منانے اور ماننے میں آدھ پون گھنٹا تو لگے گا ہی۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ روٹھنے کا جرمانہ بھی شاہین ہی دے گی۔ اسے کسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھلائے گی یا کافی شافی پلائے گی۔''

''یہ تو واقعی زیادتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''روٹھو تو جیب بھی اپنی ہلکی کرو۔''

''بس یہ ان دونوں کا اسٹائل ہے لیکن ویسے فراخ دل ہے ہیرو بھائی۔ شاہین کے گھر والوں کا پورا خیال رکھتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس کے چھوٹے بھائی کی موٹر سائیکل ''جنم'' سے چوری ہوگئی۔ عمران نے گھر میں خبر ہونے سے پہلے پہلے اسے نئی موٹر سائیکل لے دی۔''

شاہین اور عمران کی واپسی تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ شاہین کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غالباً وہ روئی دھوئی تھی اور اب پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ عباس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عمران نے آتے ساتھ ہی اعلان کیا۔ ''اٹھو بھائی تابی! آج ڈنر گھر میں ہی کرنا ہے۔ شاہین تمہیں کھانا خود بنا کر کھلانے والی ہے۔ یہ دیکھو چکن بھی لے آئی ہے۔'' اس نے شاہین کے پھولے ہوئے شولڈر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

گھر پہنچتے ہی شاہین نے کچن یوں سنبھالا جیسے وہ اس کا اپنا کچن ہو۔ اندازہ ہوا کہ وہ دو چار بار پہلے بھی یہ کچن استعمال کرچکی ہے۔ اس نے اپنے بال سمیٹ کر ایپرن باندھ لیا اور آستینیں اڑس لیں۔ عمران اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ تیزی سے کام کرتی ہوئی وہ دلکش نظر آتی تھی۔ یہ بات تو عیاں تھی کہ وہ عمران کو چاہتی ہے مگر عمران کی اندرونی پوزیشن کیا ہے، یہ وہ خود ہی بتا سکتا تھا۔

کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کو بھی سنبھال رہی تھی۔ بستروں کی چادریں درست کررہی تھی۔ بکھرے ہوئے برتن کچن میں پہنچا رہی تھی اور باقی اکھاڑ پچھاڑ کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ عمران کی گھریلو ملازمہ کو بھی سخت سست کہتی جارہی تھی۔

کھانا شان دار تھا۔ اس نے بلیک پیپر اور شاشلک بنایا تھا۔ ساتھ میں کنگ سائز کوک تھی۔ ریستوران کا سا مزہ آگیا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے، دروازے پر دستک ہوئی۔ ''یہ کون بلا آٹپکی؟'' عمران بڑبڑایا۔

آنے والی بلا ہی تھی۔ عمران نے دروازہ کھولا تو سامنے چھوٹی میڈم نادیہ کھڑی تھی۔ ایک سادہ پوش گارڈ اس کے ہمراہ تھا جو اسے دروازے تک چھوڑ کر اور سلیوٹ کر کے گاڑی میں واپس چلا گیا۔ ہم نادیہ کو یہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ بہرحال، وہ معقول حالت میں تھی۔ یعنی نشہ نہیں کیا ہوا تھا اور لباس بھی سلجھا ہوا تھا۔ اس نے ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے جھمکے تھے۔

''دیکھو عمران! کیسے شان دار وقت میں تمہیں پکڑا ہے۔'' وہ چہکی اور ناک سکیڑ کر کھانے کی خوشبو لی۔ پھر بولی۔ ''لگتا ہے کہ ہنرمند ہاتھوں نے کھانا بنایا ہے۔''

''ہاں... اس سے ملو، یہ ہے شاہین۔ میرے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔''

''اوہ وہ... تو یہ ہے شاہین۔'' نادیہ نے ہونٹوں کو سکوڑ

www.pkdigest.com

کر ''اوہو'' کی طویل آواز نکالی۔ ''بھئی، بڑی تعریف سنی ہے تمہاری۔'' اس نے مصافحے کے لیے شاہین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''آیئے، آپ بھی کھانا کھایئے۔'' شاہین نے مصافحہ کر کے دعوت دی۔

''دعوت تم کس حیثیت سے دے رہی ہو؟ گھر والی کی حیثیت سے یا پھر... گھر آئی ہوئی کی حیثیت سے؟''

عمران چہکا۔ ''ابھی تو گھر آئی ہوئی ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ دراصل کرکٹ کے میچ کی طرح، رومانس کے میچ میں بھی آخری بال تک... یعنی شادی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''جوڑی تو اچھی ہے۔'' نادیہ مسکرائی۔ تاہم اس مسکراہٹ کے پیچھے میں نے زہر کی لہر محسوس کی۔

''چائنیز پسند کرتی ہیں آپ؟'' شاہین نے جلدی سے پوچھا۔

''بھئی تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو مجھے کچھ بھی کھانا اچھا لگے گا۔ ویسے جو آپ کھا رہے ہو، یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''یہ چائنیز ہی تو ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اچھا، یہ چائنیز ہے؟'' نادیہ کے لہجے کی تہ میں گہرا طنز تھا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا... اس جیسی عام لڑکی ایسا ہی چائنیز بنا سکتی ہے۔

شاہین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پلیٹ لینے کے بہانے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

نادیہ کی آمد سب کو ہی ناگوار گزری تھی۔ ایک بے تکلف محفل کھچے کھچے ماحول میں بدل گئی۔ نادیہ جتنی دیر موجود رہی، اس کی زہر میں بجھی ہوئی نگاہیں شاہین کا طواف کرتی رہیں۔ وہ بہ ظاہر تو مسکراتے لہجے میں باتیں کر رہی تھی لیکن لب و لہجے کے نیچے گہرائی میں تیز نشتر کی سی چبھن تھی۔

شاہین کو جلدی جانا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ نادیہ بھی قریباً ایک گھنٹا وہاں موجود رہی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ راستے میں مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر آئی ہے۔ وہ شہر کے اس حصے کی طرف کبھی نہیں آئی۔ وہ ان جگہوں کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔

عمران نے کہا۔ ''اب تو بہت دیر ہو چکی ہے... پھر کسی دن سہی۔''

''پھر کسی دن کیوں؟ کل کیوں نہیں؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' عمران نے ٹالنے کے لیے کہا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ آنے سے پہلے فون کرے گی اور وہ کوئی بہانہ بنا دے گا۔

مگر ہوا یہ کہ اگلے روز وہ بغیر اطلاع کے ہی آ دھمکی۔ عمران ابھی شو سے واپس آیا ہی تھا اور نہا رہا تھا۔ آج بھی نادیہ نے نہایت قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہاف سلیوز میں سے اس کی باہیں جگمگا رہی تھیں۔ عمران نے پس و پیش کیا لیکن وہ اڑی رہی۔ عمران کو جانا پڑا۔ اس کی واپسی رات قریباً ڈھائی بجے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ کھانا وغیرہ بھی کھا کر آئے تھے۔ کچھ کھانا وہ پیک کروا کر بھی لائی۔ وہ کسی اونچے چائنیز ہوٹل کا کھانا تھا۔ شاید وہ ہمیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ ہوتا ہے چائنیز۔ وہ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی اور عمران سے کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اس گھٹن زدہ گرد آلود ماحول میں کیسے رہتے ہیں۔

تیسرے روز جب میں اور عمران پاسپورٹ لینے کے لیے مہران گاڑی پر نکلے تو بازار میں پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ عمران نے ایک تھڑے کے قریب جا کر کار آہستہ کی۔ یہاں چاچا نذیر، تایا رحمت، ماسٹر تاج دین اور اس عمر کے دیگر حضرات بیٹھے تھے۔

عمران نے ماسٹر تاج دین سے پوچھا۔ ''ماسٹر جی! مبارک ہو... سڑک شروع ہو گئی۔''

''چاچی نے کہا۔ ''تمہاری ہی مہربانی ہے بیٹا!... تمہاری سیکریٹری نے بتا دیا تھا جب... وہ تمہاری ہی سیکریٹری ہے نا؟''

''کون سیکریٹری؟'' عمران نے کار سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی، وہی لال کار والی... مس نادیہ۔''

عمران ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''وہی جو تم نے کہا تھا۔ بول رہی تھی کہ عمران صاحب کی طرف سے خوش خبری ہے۔ پرسوں سے سڑک کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس وقت تو پورا یقین نہیں آیا تھا مگر اب آ گیا ہے۔ تمہارے بڑے احسان ہیں بیٹا ہم سب پر۔ اب کس کس کا شکریہ ادا کریں... ویسے تم نے کوئی دفتر وغیرہ کھولا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ سیکریٹری...؟''

''ہاں جی، کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے گول مول جواب دیا۔

''ہماری کالونی میں سیوریج کا کام کب شروع کراؤ گے پتر جی؟'' چاچے نذیر نے کہا۔

''بس... بس جلد ہی۔'' عمران گڑبڑایا۔

''دو ہفتے کا وعدہ کیا ہے تیری سیکریٹری صاحبہ نے۔ پوری کالونی کا گندا پانی گلیوں میں چلتا ہے۔ تیرا یہ احسان تو ہم مرتے دم تک نہیں بھولیں گے۔ اللہ لمبی عمر کرے تیری اور تیری سیکریٹری شادیہ کی۔''

''نذیرے! شادیہ نہیں نادیہ۔ ایک تو تُو ہر لفظ کا حلیہ تباہ کر دیتا ہے۔'' رحمت نے کہا۔

''کون بیاہ کر لیتا ہے؟'' بہرے نذیرے نے کان پر ہاتھ دھرا۔

''بیاہ نہیں تباہ۔'' رحمت سٹپٹایا۔

ایک نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''پاؤں قبر میں چلے گئے مگر چاچے کو آواز ''بیاہ'' اور ''شادیہ'' وغیرہ ہی کی آئے گی۔''

سب ہنس پڑے۔ عمران بھی اس ہنسی میں شریک ہوا اور پھر الجھا الجھا سا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چند اور افراد بھی موقع پر آ گئے اور عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا چکر چلا رہی ہے یہ الو کی پٹھی؟'' عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لگتا ہے کہ تمہیں متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ کل کلاں وہ علاقے کے لوگوں میں نقد پیسے بانٹنا بھی شروع کر دے۔''

عمران نے گہری سانس لی اور ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ ''چلو خیر، خدا کا بھلا ہو جائے... جائے کسی طرح بھی ہو۔'' وہ ... کرتے ہوئے بولا۔

''مگر اس کے بدلے جب وہ تم سے بلا کی طرح چمٹ جائے گی تو پھر...''

''چلو، یہ بھی ایک نیا تجربہ ہوگا کہ بلا کو بلا کیسے چمٹتی ہے۔''

''اتنی خوش فہمی میں بھی نہ رہو۔ ایسی عورتیں جب کسی مرد کو جیتنے کے چکر میں پڑ جاتی ہیں تو بہت آگے نکل جاتی ہیں۔''

''کتنا آگے نکلے گی... بارڈر پار کر جائے گی؟''

''ایسی عورتوں کے نزدیک کوئی بارڈر شارڈر نہیں ہوتا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''خوشی بس اس بات کی ہے کہ میرے گوٹھے یار نے اب تھوڑا تھوڑا چہکنا شروع کر دیا ہے۔ باقی... نادیہ کے بارے میں پریشان ہونے کی کوشش نہ کر جگر! ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔''

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہوئی اور نادیہ کا فون آ گیا۔ عمران نے مجھے سنانے کے لیے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا۔ ''ہیلو ڈیئر! کیسے ہو؟'' نادیہ نے شیریں آواز میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

اسرائیل کے علاوہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

''بس ذرا مارکیٹ تک۔''
''اور کون ہے ساتھ؟''
''کوئی نہیں۔''
''جائنیز فوڈ والی ہے تو بتا دو پھر فون کرلوں گی۔''
''اس سے صرف سرکس میں ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے چمٹی نہیں رہتی۔''
''تمہارے دماغ سے تو چمٹی رہتی ہے۔'' عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ''ارے... ناراض نہ ہو جانا سویٹ ہارٹ! میں تمہاری ناراضگی مول نہیں لے سکتی۔''
''تو پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟''
''ویری سوری! کان پکڑتی ہوں بھئی... اور ہاں، آج اپنے گھر کے باہر کوئی تبدیلی محسوس کی تم نے؟''
''سڑک بن رہی ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام میں نے شروع کروایا ہے۔''
''تم نے ہی تو کروایا ہے ڈارلنگ... اور ابھی اور بہت کچھ کراؤ گے... تم میں... تم میں سچ مچ میجک ہے۔ میرا بس چلے نا تو پتا ہے کیا کروں؟''
''کیا کرو؟''
''تمہاری ہر مسکراہٹ کا صدقہ اتارنا شروع کر دوں۔ مسکراہٹ کا صدقہ ایک لاکھ روپیا، لافٹر کا نذرانہ دو لاکھ۔ یوں دو چار ہفتوں میں ہی اپنی ساری پونجی تم پر لگا دوں۔ تم جو بات بات پر مجھے امیر کبیر ہونے کا طعنہ دیتے ہو تو یہ طعنے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد میں عام سے کپڑے پہن کر تمہارے پیچھے تمہاری پھٹیچر موٹر سائیکل پر بیٹھوں۔ گول گپے، آلو چنے اور سموسے کھاؤں۔ پورے شہر میں تمہارے ساتھ لور لور پھروں۔''
''ایسے شوق بڑی جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی بے وقوفی کا احساس ہوتا ہے۔''
''جب تم ایسی باتیں کرتے ہو.... تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔ سلیم کی موت ابھی تک تمہارے ذہن پر سوار ہے۔ میں اس کے لیے تمہارا دل کیسے صاف کر سکتی ہوں؟ مجھے بتاؤ، پلیز! مجھے بتاؤ۔ میں ہر کام کے لیے تیار ہوں۔''
''تمہاری ان باتوں سے جانے والا لوٹ تو نہیں آئے گا۔ بہر حال، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کا ذکر نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔''
''اچھا نہیں چھیڑتی۔ بتاؤ، آج شام کیا کر رہے ہو؟''
''کچھ خاص نہیں۔''
''ٹھیک ہے، میں دس بجے تمہیں فون کروں گی۔''
''اوکے!'' عمران نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
''دو چہروں والی عورت۔'' میں نے نفرت سے کہا۔
اسی دوران میں ایک اور کال آ گئی۔ اس مرتبہ دوسری طرف بڑی میڈم عفورا تھی۔ ''ہیلو عمران! کیسے ہو؟'' وہ باوقار انداز میں بولی۔
''بالکل ٹھیک میڈم! کوئی خدمت؟''
''نہیں، ابھی کوئی خدمت نہیں۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''ابھی چند دن آرام کرو۔ کھاؤ پیو اور توانائی بحال کرو۔ خاص طور سے اقبال کی صحت بہتر ہونی چاہیے۔''
''آپ کیسی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔
''بالکل خیریت سے... اور آج کل خوش بھی ہوں۔ میں نادیہ میں کافی چینج محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ میل جول، اس کے مزاج پر اچھا اثر ڈال رہا ہے۔ الکحل بھی کم لے رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم تھوڑا تھوڑا وقت اس کے لیے نکالتے رہو۔''
''جیسے آپ کا حکم میڈم!''
''نہیں بھئی، یہ حکم نہیں۔ یہ تو ایک دوستانہ درخواست ہے۔ مجھے مارچ میں ایک نمائش دیکھنے جاپان جانا ہے۔ ایک ہفتے کا ٹور ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اور نادیہ بھی پروگرام بناؤ اور میرے ساتھ چلو۔'' عمران نے خاموشی اختیار کی تو وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بھی حکم نہیں ہے، درخواست ہے بھئی۔ آرام سے سوچ لینا۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔''
رسمی گفتگو کے بعد میڈم نے عمران کو خدا حافظ کہا۔ عمران گم صم تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔
اس سے اگلی رات میں نے اور اقبال نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ میڈم نادیہ شام سات بجے ہی آ گئی تھی۔ اس روز عمران کی سرکس سے چھٹی تھی... نادیہ کا پروگرام تھا کہ وہ عمران کو کہیں باہر لے کر جائے گی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ بارش شروع ہو گئی۔ نادیہ وہیں گھر میں ہی ہمارے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس کا ڈرائیور اور گارڈ ایک سرخ ہنڈا اکارڈ میں تھے۔ یہ گاڑی بازار سے باہر بڑی سڑک پر کھڑی تھی۔ ان دونوں ''حکم کے غلاموں'' کو ساری رات بھی گاڑی میں گزارنا پڑتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔
نادیہ بے تکلفی سے ہمارے ساتھ گپ شپ کرتی رہی۔ وہ اپنا خاص تکبرانہ انداز چھوڑ کر ہم سے گھل مل جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے درمیان شاہین کی جگہ لے سکے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ نادیہ لاکھ کوشش کرتی مگر اس کی باتوں سے تصنع کی بو آتی تھی۔
اپنے اور عمران کے رومانس کے حوالے سے اب وہ ہم سے کھل کر بات کر رہی تھی۔ اس نے بولڈ انداز میں بتایا کہ اس نے عمران کو اس پہلی رات میں ہی پسند کر لیا تھا جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا اور شیر کے ساتھ اس کی طوفانی جھڑپ ہوئی۔ وہ اس سارے واقعے کی تفصیل مزے لے کر بیان کرتی رہی اور بتاتی رہی کہ وہ کس طرح کلوز سرکٹ ٹی وی پر وہ سارے منظر دیکھتی رہی تھی۔
بارش زور پکڑ گئی تو نادیہ نے آئیڈیا دیا کہ کارڈ کھیلے جائیں۔ ہم عمران کے کمرے میں کارڈ کھیلنے لگے۔ کارڈ کھیلنے کے دوران میں ہی انکشاف ہوا کہ آج اقبال کی سالگرہ ہے۔ نادیہ نے فوراً ڈرائیور کو اس کے سیل فون پر کال کی اور اسے کیک وغیرہ لانے کو کہا۔ آدھ پون گھنٹے بعد بارش میں بھیگا ہوا ڈرائیور بہت بڑا کیک اور بہت سارا باربی کیو لے کر پہنچ گیا۔ ہم نے اقبال کی 26 ویں سالگرہ کا کیک کاٹا اور ہلا گلا کیا۔ اس دوران میں نادیہ نے ایک چابی نکالی اور اقبال کو دیتے ہوئے کہا۔
''یہ میری طرف سے تمہارے لیے سالگرہ کا تحفہ۔''
''کس چیز کی ہے یہ؟''
''ٹویوٹا کرولا کی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''دراصل عمران کے لیے تھی۔ تمہاری اور تابش کی باری بعد میں آتی مگر اپنی برتھ ڈے کی وجہ سے تم نمبر لے گئے۔ اب عمران کے لیے اور آ جائے گی۔''
اس پانچ لاکھ کے تحفے پر ہم واقعی حیران ہوئے۔ اقبال نے رسمی احتجاج کیا مگر وہ تو ہم سب پر بالکل ریشہ خطمی ہو رہی تھی اور اس کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر عمران کو متاثر کرنا چاہ رہی تھی۔ عمران کا حصول جیسے اس کے طوفانی مزاج کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔
دس بجے کے قریب بارش ایک دم شدت اختیار کر گئی۔ کھڑکیوں پر پانی کی تابڑ توڑ بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ اس صورت حال میں نادیہ کا پیدل چل کر دو فرلانگ دور کھڑی گاڑی تک جانا ممکن نہیں تھا اور وہ تو شاید خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت عمران کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے۔
اقبال نے دو تین لمبی جماہیاں لیں پھر مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں اور اقبال اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ عمران اور نادیہ وہیں بیٹھے کارڈ کھیلتے رہے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں بستر پر اونگھنے لگا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اقبال نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میری نظر وال کلاک پر پڑی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بارش کا سلسلہ بدستور جاری تھا... میں نے سوالیہ نظروں سے اقبال کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''
میں نے چپل پہنی اور اٹھ کر دبے پاؤں اقبال کے پیچھے چل دیا۔ ہم بغلی دروازے سے نکلے اور گیراج میں آ گئے۔ وہاں سے گھوم کر گھر کی سائڈ والی راہداری میں پہنچے اور بارش کی بوچھاڑوں سے بچتے ''بیک یارڈ'' میں پہنچ گئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور اقبال کی آنکھوں میں شرارت کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک کھڑکی کی باریک جھری سے آنکھ لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹ گیا اور مجھے جھری میں سے دیکھنے کا موقع دیا۔ اندر کا منظر توجہ طلب تھا۔
لمبے صوفے پر نادیہ، عمران کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ عمران کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زبردست رومانی موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صوفے سے پھسلی اور بڑی ادا سے قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے نیم دراز ہونے کے انداز میں صوفے کے نچلے حصے سے ٹیک لگا لی تھی۔
''یہ کیا کر رہی ہو؟ اوپر بیٹھو۔'' عمران کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔
''نہیں، مجھے ایسے ہی اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ بڑے ناز سے عمران کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر بولی۔
''یہ کیا ڈراما ہے بھئی؟''
''ڈراما نہیں، بس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔''
''تو میں بھی نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔''

سمندری مخلوق پر تحقیق کرنے والے ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''وہیل مچھلی تین سو میل دور سے بھی سمندر میں دوسری وہیل سے رابطہ کر لیتی ہے۔''
''بھلا تین سو میل دور سے وہ دوسری وہیل مچھلی سے کیا کہتی ہوگی؟'' دوست نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
''میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا..... لیکن میرا خیال ہے، یہی کہتی ہوگی..... 'اب تو تمہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے نا؟'''

www.pkdigest.com

''اب تم ڈراما کر رہے ہو۔'' وہ اسے روکتے ہوئے بولی۔
وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بڑے ہیجان خیز انداز میں اس کے گھٹنے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے تعلق میں سب سے نمایاں چیز ''ہیجان'' ہی نظر آتی تھی۔ وہ جدید تراش کی شلوار قمیص میں تھی۔ قمیص کا گریبان واہیات حد تک کشادہ تھا۔ وہ اپنے بیٹھنے کے انداز سے اس کشادگی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمران نے نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جما رکھی تھیں۔ تب میں نے ایک اور دلچسپ منظر دیکھا۔ نادیہ نے بڑی آہستگی سے عمران کی سفید چپل اس کے پاؤں سے علیحدہ کر دی اور بڑے محبت بھرے انداز میں ہولے ہولے اس کے پاؤں پر انگلیاں چلانے لگی، اس کے تلووں کو سہلانے لگی۔ عمران نے ایک بار پھر منع کرنے کی کوشش کی مگر اس نے مصنوعی غصے سے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا۔
اس کا یہ رویہ تعجب خیز تھا۔ یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ لال کوٹھی کی چھوٹی میڈم تھی۔ درجنوں ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ کروڑوں کی مالک تھی اور بڑی بہن کی وجہ سے ہی سہی مگر اسے سوسائٹی میں ایک مقام حاصل تھا۔ آج اس بادوباراں کی شب میں وہ اس چھوٹے سے مکان میں بازی گر عمران دانش کے قدموں میں بیٹھی تھی اور فدویانہ انداز میں اس کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ وہ کیا شے تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
میں نے کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر اقبال کے کان میں مدھم سرگوشی کی۔ ''دیکھو تم بھی... دیکھنے والا سین ہے۔''
اب اقبال نے اپنی آنکھ کھڑکی کی جھری سے لگا دی... کچھ دیر دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''بہت بڑی فتنہ لگتی ہے یہ... باری تعالیٰ ہمیں اور ہمارے یار کو اس کے شر سے بچائے۔''
تب اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ اب دیکھنے کی باری میری ہے۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر کا منظر بدلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اب پھر صوفے پر عمران کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا... اس نے قمیص کے اوپر سے ہی عمران کا کندھا چوما پھر اس کے گریبان کے بٹن کھول کر اپنی ناک اس کے سینے پر رگڑنے لگی۔ لیکن یہ بات عیاں تھی کہ اسے عمران کی طرف سے مناسب رسپانس نہیں مل رہا۔ جب وہ مزید آگے بڑھی تو عمران اپنا سگریٹ کیس لینے کے بہانے اٹھ گیا۔
وہ گہری سانس لے کر صوفے پر پھیل گئی اور ناقدانہ نظروں سے عمران کا جائزہ لینے لگی۔ وہ دوسری کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ''کیا بات ہے ڈیئر! کچھ اکھڑے ہوئے لگ رہے ہو؟''
''نہیں، ایسی بات تو نہیں۔''
''پھر کیسی بات ہے؟'' اس نے ہوش رُبا انگڑائی لی۔
عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا۔ ''لگتا ہے شرم آ رہی ہے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ایک دم کمرا تاریک ہو گیا۔ اس نے ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا تھا۔
میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اقبال نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ قینچی چل گئی؟''
''میں سمجھا نہیں۔ کیا قینچی؟''
''یار! سین سنسر ہو گیا ہے نا۔'' اس نے کہا اور مجھے کھینچ کر واپس اپنے کمرے میں لے آیا۔ ہم وہاں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ عمران نادیہ سے گریز کر رہا ہے مگر وہ مکمل گریز نہیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کچھ حوصلہ افزائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نادیہ کو اپنے آپ میں الجھا رہا ہے۔
صرف دس منٹ بعد عمران کے کمرے کی لائٹ دوبارہ آن ہو گئی۔ اقبال مسکرایا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم کی دال گلی نہیں۔'' میں نے تائید کی۔
پانچ دس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ نادیہ واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ عمران نے ایک پرانی برساتی اس کے لیے مہیا کر دی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی بلکہ ناراض لگتی تھی۔ اس نے ہم سے بھی مختصر سی بات کی۔ فون کر کے اس نے اپنے مسلح گارڈ کو بلا لیا۔ اس کے ساتھ وہ واپس چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد اقبال بولا۔ ''یار عمران! بڑے پرلے درجے کے کٹھور ہو تم۔ اس نے مجھے گاڑی کی چابی دی ہے۔ کم از کم آج تو اسے خوش کر کے بھیجتا تھا۔''
''کیسے خوش کرتا؟''
''کمرے کی بتی دو چار منٹ مزید بجھی رہنے دیتی تھی۔''
''زیادہ دیر اندھیرے میں رہیں تو شیطان کھڑکی میں سے جھانکنے کے بجائے اندر کمرے میں آ جاتا ہے۔''
''بڑے پہنچے ہوئے ہو تم۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ شیطان کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا؟'' اقبال نے پوچھا۔
''دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے۔'' وہ مسکرایا۔
''مجھے تو یہ جگا کر زبردستی لے گیا تھا یار۔'' میں نے

دفاع کیا۔
''چلو کوئی بات نہیں۔ اتنی سی شیطانی تو تم دونوں کا حق ہے۔''
''اب کیا کرنے کا ارادہ ہے چھوٹی میڈم کے ساتھ؟ کوئی فلمی قسم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتے؟'' میں نے پوچھا۔
عمران کا موڈ اب قدرے بحال تھا۔ خوش گوار لہجے میں بولا۔ ''ارادہ تو ایسا ہی ہے۔ اس کے ساتھ شادی کروں گا۔ جب یہ لال جوڑا پہن کر، ہاتھوں میں مہندی لگا کر گہنوں سے لدی پھندی، گٹھڑی سی بن کر پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوگی تو اندر آؤں گا اور کہوں گا... نادیہ بیگم! یہ سہاگ رات نہیں ہے۔ یہ انتقام کی رات ہے... آج تمہارا گھونگھٹ کوئی نہیں اٹھائے گا۔ تم اس کانٹوں کی سیج پر اکیلی ہی رات گزارو گی... آج کے بعد اس گھر میں تم صرف نام کی دلہن بن کر رہو گی۔ پل پل جیو گی، پل پل مرو گی۔''
اقبال بولا۔ ''یار! ویسے اس مشہور فلمی سین میں... جو بار بار فلمایا گیا ہے... کوئی لاجک نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو یہ مجبوری کا سین ہے۔ سنسر کا ڈر ہوتا ہے اس لیے دولہا صاحب اپنے انتقام کا رخ موڑ کر تکیہ اٹھاتے ہیں اور باہر صوفے پر جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ تماشائی بے چارے اس [illegible] انتقام [illegible] رہ جاتے ہیں۔''
''تمہارے خیال میں یہ سین کیسے ہونا چاہیے؟''
عمران نے سگریٹ سلگایا۔
''میں ہوتا تو اس طرح بولتا۔'' وہ ہو بہو فلم اسٹار وحید مراد کے لب و لہجے میں بولنے لگا۔ ''شبانہ! یہ سہاگ کی رات نہیں ہے، انتقام کی رات ہے۔ ہم انتقام کا دور شروع کرنے والے ہیں لیکن جس طرح لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پہلے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، اسی طرح میں بھی پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ آج کی رات ہم محبت کے ساتھ گزاریں گے۔ صبح ساڑھے سات بجے سے انتقام شروع کریں گے وغیرہ وغیرہ۔''
میرا پاسپورٹ مل گیا تھا۔ ویزے کے انٹرویو کے لیے ہمیں ایمبیسی سے دس دن بعد کی اپائنٹمنٹ ملی تھی۔ یہ بھی عمران کی کوشش سے ہوا تھا ورنہ تین دن بعد باری آ رہی تھی۔ اب یہ دس دن ہمیں جیسے تیسے گزارنے تھے۔ انٹرویو کے بعد ویزا لگنے میں بھی دس پندرہ روز لگنے تھے۔
دو روز بعد رات کو ہم نے پھر ایک سین دیکھا۔ یہ سین پہلے والے سین سے زیادہ تہلکہ خیز تھا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ جس وقت نادیہ نے گھر کے دروازے پر دستک دی، صرف پانچ

''وہ دیکھو نیچا اور... بہت دور، تین چار انسان بیٹھے ہوئے ہیں۔''

منٹ پہلے ہی شاہین ہمارے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ نادیہ کی آمد کو محسوس کر کے ہم نے فوراً شاہین کی موجودگی کے اہم آثار کمرے سے ختم کر دیے۔ نادیہ آج بھی شان دار ساڑی میں تھی۔ اس کا موڈ قدرے بہتر نظر آتا تھا مگر آج اس کے چہرے پر خاص قسم کی تمتماہٹ بھی موجود تھی۔ یہ تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے ایک دو پیگ لگا رکھے ہیں۔ اس نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ علاقے میں سڑک کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔
آج جو شولڈر بیگ نادیہ کے کندھے سے جھول رہا تھا، وہ سیتا بڑا تھا۔ کچھ پھولا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ نادیہ نے اقبال سے پوچھا کہ اس نے اپنی نئی گاڑی ڈرائیو کر کے دیکھی ہے؟
''گاڑی میں بیٹھ کر تو دیکھا ہے مگر ابھی ڈرائیو نہیں کی۔'' اقبال نے کہا۔
''تو پھر جاؤ۔ ایک چکر لگا کر آؤ تم اور تابش۔''
غالباً وہ عمران کے ساتھ تنہائی چاہتی تھی۔
''جیسے آپ کا حکم۔'' اقبال نے کہا۔
میں اور اقبال باہر آ گئے۔ بلیو کلر کی نئی مہران باہر موجود تھی۔ ہم بازار سے نکل کر مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔ میں نے کہا۔ ''یار! مجھے تو اس گاڑی میں بیٹھ کر کراہیت سی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ گاڑی نہیں ہے، کسی کی ہوس کاری کا حق معاوضہ ہے اور اس کے علاوہ... شاید سلیم کے خون کی قیمت بھی ہے۔''
''لگ تو مجھے بھی ایسے ہی رہا ہے مگر فی الحال مجبوری ہے۔'' اقبال نے کہا۔
ہم نادیہ کے عجیب و غریب کردار، اس کی شعلہ صفتی اور آتش پائی پر بات کرتے رہے۔ وہ ایک بگڑی تگڑی امیر

www.pkdigest.com

زاوی سے بھی آگے کی چیز تھی۔
ہم نے آئس کریم وغیرہ کھائی پھر آدھ پون گھنٹے میں واپس آگئے۔ اقبال نے گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر پرسوں والی شریر چمک موجود تھی۔ اس کی جیب میں ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ اس چابی سے اس نے آواز پیدا کیے بغیر گھر کا چھوٹا گیٹ کھولا اور میرے ساتھ اندر چلا گیا۔
ابھی ہم برآمدے میں ہی پہنچے تھے کہ اندر سے بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں نادیہ کی آواز نمایاں تھی۔ وہ کسی بات پر عمران سے جھگڑ رہی تھی۔
''آج معاملہ گرم ہے بھئی۔'' اقبال نے میرے کان میں سرگوشی کی۔
وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری سے گزرا اور پھر اسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے پرسوں رات بھی ہم نے اندرونی منظر دیکھا تھا۔ اس کھڑکی میں یہ جھری اقبال جان بوجھ کر رکھتا تھا، اس بات کا پتا مجھے دو روز بعد چلا۔
کمرے سے ابھرنے والی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔ نادیہ کہہ رہی تھی۔ ''تم مجھے ٹارچر کر رہے ہو۔ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان ریلیشن نہیں ہوسکتا۔''
''تمہارے لیے ریلیشن کا بس ایک ہی مطلب کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ ریلیشن کے لیے ہم اکٹھے ایک بستر پر سوئیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح بھی رہ سکتے ہیں۔''
''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں عمران۔'' وہ بھڑکے لہجے میں بولی۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے سلیم کے لیے معاف نہیں کیا ہے۔ تمہارے دل میں وہی گرہ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا دکھ سینے میں لے کر بیٹھے ہوئے ہو تم۔ میری طرف دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں نفرت چمک اٹھتی ہے۔''
نادیہ کی آواز بہکی ہوئی تھی۔ بنارسی ساڑی کا چمکیلا پلو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا تھا۔ مختصر بلاؤز اس کے جسم کو نمایاں کر رہا تھا۔
''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''
''میں غلط نہیں سمجھ رہی۔ تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور مجھے بھی۔ میں نے تمہاری منت کی ہے عمران۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگی ہے لیکن تم نے اپنا دل پتھر کیا ہوا ہے۔ شاید تم مجھے سزا ہی دینا چاہتے ہو۔ تو ٹھیک ہے، دے لو مجھے سزا۔ تمہاری محبت کے لیے میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ ٹھیک ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے سلیم کو مارا پیٹا۔ تو تم اس کا بدلہ لے لو مجھ سے... میں دل سے کہتی ہوں۔ مجھ سے بدلہ لے لو۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔
وہ بڑے جذباتی انداز میں اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھی۔ اس کی زپ کھول کر اس نے اندر سے ایک چیز نکالی۔ پہلے تو مجھے سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ پھر پتا چلا کہ یہ موٹے ربڑ کے پائپ کا قریباً تین فٹ لمبا ٹکڑا ہے۔ اس پائپ کے گرد آہنی تار لپٹا ہوا تھا۔ اس نے یہ پائپ عمران کی گود میں پھینک دیا۔ اس نے اپنے بالائی جسم سے ساڑی ہٹا دی۔ اب وہ مختصر بلاؤز میں تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل عمران کے سامنے گر گئی۔ ''لو، مارلو مجھے۔ جس طرح میں نے اسے مارا تھا، تم مجھے مارلو۔ میں تمہیں دل سے اجازت دیتی ہوں۔ میں ہر تکلیف سہہ سکتی ہوں، پر تمہاری بے رخی نہیں۔ پلیز... پلیز...'' اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے بالوں نے آگے کو پھسل کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔
عمران نے پائپ گود سے اٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''اس پائپ کی دو چوٹیں تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گی نادیہ! کئی ہفتوں تک بستر سے اٹھ نہ سکو گی... تم نے کتنی چوٹیں لگائی تھیں اس کو... کس طرح اسے [illegible] کہیں [illegible] آیا؟''
''مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں مانتی ہوں اور اب اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ اور کیا چاہتے ہو؟''
عمران نے پائپ ایک طرف پھینک دیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے اندر اتنی بے رحمی نہیں لا سکتا۔''
''کیوں نہیں لا سکتے؟ میں قسم کھاتی ہوں، تمہاری بے رخی مجھے اس پائپ کی مار سے کہیں زیادہ تکلیف دے رہی ہے۔''
''تم مجھے جذباتی بلیک میل کر رہی ہو نادیہ! اس طرح دل نہیں جیتے جاتے۔''
''تو تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟''
''میں معاف کرنے والا یا نہ کرنے والا کون ہوتا ہوں؟''
وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اچانک اس کے چہرے کی تمتماہٹ میں اضافہ ہوگیا ہے۔ آنکھوں میں شراب کی سرخی بھی نمایاں تر ہوگئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں پھنکاری۔ ''عمران! تم... تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے مجھے ٹھکرا رہے ہو، مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ وہ... وہ حرامزادی... خناس بن کر گھسی ہوئی ہے تمہارے دماغ میں۔''

''نادیہ... اس کو بیچ میں مت لاؤ۔''
''کیوں نہ لاؤں؟ وہی چڑیل ہے جس نے تمہیں اپنے پنجرے کا طوطا بنایا ہوا ہے۔ تمہاری اس بے رخی کی ایک وجہ وہ بھی ہے۔''
''نادیہ!'' عمران گرجا۔ ''میں اس کے بارے میں بکواس نہیں سنوں گا۔''
''کیوں نہیں سنو گے تم! میں سناؤں گی... حرامزادی، کمینی، کتیا۔'' نادیہ جنونی انداز میں دہاڑی۔ ''میں تمہیں... میں تمہیں اس کے قابل ہی نہیں رہنے دوں گی۔ میں برباد کر دوں گی تمہیں... برباد کر دوں گی۔'' ایک دم ہی اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔
وہ لپک کر ٹیبل کی طرف گئی۔ وہاں بیئر کی بڑی بوتل پڑی تھی۔ نادیہ نے ٹیبل پر مار کر ایک چھناکے سے بوتل توڑ دی۔ وہ ٹوٹ کر ایک تیز دھار ہتھیار کی طرح ہوگئی۔ اب یہ ہتھیار نادیہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں چلاتی ہوئی عمران پر جھپٹی۔ اس نے بے دریغ عمران کے چہرے کو نشانہ بنایا۔ عمران نے بروقت پیچھے ہٹ کر چہرہ بچایا اور اس کی بوتل والی کلائی پکڑ لی۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا۔ اب ہم بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔ نادیہ بالکل دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ عمران پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اپنے نکیلے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی، اس پر ٹانگیں چلا رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑوں کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا بالائی جسم تو نیم عریاں ہو ہی چکا تھا، اب لگتا تھا کہ اس کی ساڑی، زیریں جسم سے بھی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔
ہم نے مل کر اسے بہ مشکل سنبھالا۔ عمران نے اس کے منہ پر دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ وہ چکرا کر دیوار سے ٹکرائی اور گر گئی۔ اس کے باوجود وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہی تھی۔ ہذیانی انداز میں پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھی۔ اس کے نقوش بگڑ گئے تھے اور رنگت سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ پھر یکایک اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ کراہنے لگی اور بڑبڑانے لگی۔ عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے انجکشن لے آیا۔ یہ بے ہوشی کا وہی انجکشن تھا جو اس سے پہلے عمران اور اقبال نے گلشن آباد میں کنول کے بھائی قادرے کو دیا تھا۔ میں نے اور اقبال نے نادیہ کو دبوچا۔ اس کا جسم نرم تھا اور منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ وہ کسمسائی مگر عمران نے اس کے بازو میں دوا انجیکٹ کر دی۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی!''

بے شک یہ گھر کا اندرونی کمرا تھا مگر کچھ دیر پہلے نادیہ کے چلانے چنگھاڑنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ قریبی گھروں تک بھی پہنچی تھی۔ پڑوسی زاہد دیوار پر سے آوازیں دے رہا تھا اور گھر کا بیرونی دروازہ بھی کھٹکھٹایا جانے لگا تھا۔ عمران کے اشارے پر اقبال باہر گیا اور پڑوسیوں کو مطمئن کر کے آیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس نے پڑوسیوں کو بتایا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہیں جن میں ایک لڑکی نفسیاتی مریضہ ہے۔
اقبال کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹی بہن کو اس حالت میں دیکھ کر میڈم صفورا کا پارا بھی چڑھ جائے گا اور وہ طوفان کھڑا کر دے گی۔ تاہم عمران مطمئن تھا۔ اس نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں یار! میں خود ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ جاؤں گا اور اسے چھوڑ کر آؤں گا۔''
''جب تک تم واپس نہیں آؤ گے، ہماری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیے۔'' اقبال نے تجویز پیش کی۔
''پڑوسیوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں بلکہ آٹھ دس محلے دار بھی چلے جائیں تو بہتر ہے۔ میڈم صفورا کو بڑی مسرت ہوگی کہ اس کی بہن کو اتنے اہتمام کے ساتھ یہاں لایا گیا ہے۔'' عمران کے لہجے میں طنز تھا۔
اقبال منہ بنا کر رہ گیا۔
عمران نے نادیہ ہی کے سیل فون سے اس کے ڈرائیور اور گارڈ کو کال کیا۔ وہ دونوں پہنچ گئے۔ بے ہوش نادیہ کو پہلے عمران گاڑی میں ڈال کر بڑی سڑک تک پہنچایا گیا پھر وہاں سے ہنڈا اکارڈ میں ڈال کر لال کوٹھیوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عمران ساتھ ہی گیا تھا۔
میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عمران، سلیم کی دردناک موت کو بھولا نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں بڑی میڈم صفورا

کی منافقت و بدنیتی اسے ہضم ہوئی ہے۔ سلیم کی موت کے بعد میڈم صفورا نے جس طرح عمران کو وافر پیسے کی چمک دکھا کر مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی ایک نہایت ناخوش گوار تجربہ تھا۔

سلیم کی موت معمولی واقعہ نہیں تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے مگر میں آج بھی محسوس کرتا تھا کہ جیسے اس رات سلیم قبرستان میں دفن ہونے کے باوجود ہمارے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ زخموں سے چور، بے بسی کی تصویر بنا ہوا لڑکھڑاتا ہوا، ہم سے پوچھتا ہوا... تم مجھے بچانہ سکے لیکن کیا تم میرا — بے رحم قتل بھی بھول جاؤ گے؟ وہ اب بھی اکثر مجھے اپنے عقب میں محسوس ہوتا تھا... اپنی نم آنکھوں میں یہی سوال لیے۔

...میرا اور اقبال کا خیال تھا کہ شاید اب نادیہ، عمران کے منہ نہیں لگے گی لیکن وہ عجیب فطرت کی لڑکی تھی۔ عمران کو تسخیر کرنا جیسے اس نے زندگی و موت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔ تیسرے چوتھے دن ہم نے پھر عمران اور نادیہ کو اکٹھے دیکھا۔ نادیہ شام سے پہلے ہی آگئی تھی۔ وہ عمران کے ساتھ جا کر سرکس میں اس کا شو دیکھنا چاہتی تھی۔ دونوں نارمل ہی نظر آتے تھے۔ عمران نے ہم سے اصرار کیا کہ ہم بھی ساتھ چلیں۔ عمران، نادیہ والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اور دو گارڈز بھی اس گاڑی میں موجود تھے۔ میں اور اقبال، عمران کی مہران میں روانہ ہوئے۔

آج میں کئی روز بعد پھر سرکس کا رخ کر رہا تھا۔ سرکس تین دن پہلے لاہور کے نزدیکی قصبے شیخوپورہ میں ٹرانسفر ہوا تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں قریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ سرکس کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔ انسان، جنگلی جانور اور مختلف مشینیں... سب مل جل کر کام کرتے ہیں اور لوگوں کو تفریح مہیا کرتے ہیں۔ سرکس کے کام میں سنسنی خیزی، تھرل اور رسک کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک پُرجوش کام ہے۔ سیکڑوں لوگوں کے سامنے ایسا کام کرنے والے لوگ... بلند حوصلہ، ہنرمند اور جسمانی طور پر بھی نہایت فٹ ہوتے ہیں۔ ان کا رہن سہن اور رویہ انہیں عام لوگوں سے مختلف بناتا ہے۔ جس سرکس کا یہاں ذکر ہے وہ ویسے بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔

عمران کا موت کے کنوئیں والا آئٹم شروع ہونے والا تھا۔ کنوئیں کے اوپر موجود تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ عمران کی پرفارمنس کے سلسلے میں اسپیشل اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ شاہین بھی آج بہت نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چست لباس میں اس کا متناسب جسم دیکھنے والوں کو کشش کرتا تھا۔ وہ بڑی ادا سے عمران کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھی

اور اسی لمحے میں نے نادیہ کی آنکھوں میں حسد کی لہر سی ابھرتے دیکھی۔ بہرحال، اس کے چہرے کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ عمران کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے نادیہ اور اس کے باوردی گارڈز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے گئے۔ لوگ مڑ مڑ کر نادیہ کو دیکھ رہے تھے۔ نادیہ کا لباس اور اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی موجودگی لوگوں پر ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی خاص شخصیت ہے۔

موت کے کنوئیں میں اپنی بے خوف پرفارمنس سے عمران نے ایک بار پھر تماشائیوں کے دل موہ لیے۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ شاہین بھی آج بڑی فارم میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لمبے بال موٹر سائیکل پر عمران کے پیچھے کسی پرچم کی طرح لہراتے تھے۔

موت کے کنوئیں کے بعد عمران کو پنڈال میں قریباً پچاس فٹ کی بلندی پر جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس مظاہرے کے لیے عمران اور شاہین نے اپنے لباس تبدیل کر لیے۔ یہاں بھی عمران، شاہین اور سلمان عرف شہزادے وغیرہ نے حاضرین سے خوب خوب داد وصول کی۔ خاص طور سے عمران اور شاہین کی جوڑی کو سراہا گیا۔

یہی وقت تھا جب عمران پنڈال کے وسط سے نکل کر میرے قریب آیا اور میرے کان میں ایک سرگوشی کر کے سنسنی پھیلا دی۔ اس نے کہا "…آج …" پہلا ہفتہ ہے۔"

www.pkdigest.com

میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آج کافی عرصے بعد میں پھر سرکس کے اسپیشل شو کا نظارہ کرنے والا تھا۔ غالباً آج عمران اسی لیے اصرار کر کے ہمیں ساتھ لایا تھا۔

اور پھر رات بارہ بجے کے بعد اسپیشل شو کا آغاز ہوا۔ ایک بار پھر وہی اسرار انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔ سرکس کا عام شو ختم ہو جانے کے قریباً آدھ گھنٹے بعد نئے ماڈل کی بڑی بڑی گاڑیوں کی آمد شروع ہوئی۔ کچھ منچلے نوجوان ہیوی موٹر سائیکل پر بھی آئے۔ یہ سب لوگ ہائی جینٹری سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں اکثریت جواں سال افراد کی تھی۔ ان میں چند ایک فیشن ایبل لڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ گاڑیوں میں گارڈز وغیرہ بھی موجود تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر ان لوگوں کی تعداد ستر اسی تک پہنچ گئی۔ سرکس کی ساری بیرونی لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ بس پنڈال کے اندر گہما گہمی موجود رہی۔ یہاں وی آئی پی انکلوژر میں انگلش میوزک کی گونج تھی اور ڈیزی کی پوشاکیں گردش کر رہی تھیں۔ نادیہ سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی۔ اس سے پچھلی

قطار میں اس کے دونوں مسلح گارڈز اور ڈرائیور موجود تھے۔ نئے آنے والے تماشائیوں میں نادیہ کو ایک واقف کار فیملی بھی مل گئی تھی۔ یہ تین کزن تھے جن میں نہایت باریک و چست چلون والی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ لوگ یہاں نادیہ کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے اور اب اس کے ساتھ بیٹھے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

مقررہ وقت پر حفاظتی جال، جھولوں کے نیچے سے ہٹا دیا گیا اور نہایت سنسنی خیز شو کا آغاز ہو گیا۔ پہلے ایک جاں باز فن کار نے تنے ہوئے رسّے پر چند کرتب دکھائے اور سائیکل وغیرہ چلانے کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد جھولوں پر جمناسٹک شروع ہوئی۔ یہ دل کی دھڑکن روک دینے والا تماشا تھا۔ فن کاروں کے چہروں پر بھی تناؤ کی کیفیت صاف محسوس ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ اپنی ہنرمندی کا ایک جان لیوا دعویٰ تھا۔ ان حالات میں بھی اگر کسی فن کار کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ باقی تھی تو وہ عمران کا چہرہ تھا۔ ایک دوسری لڑکی کے علاوہ شاہین بھی اس مظاہرے میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ غیر معمولی دلیری، مہارت اور اعتماد کے بغیر یہ سب کچھ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پچاس فٹ کی بلندی سے نیچے زمین پر گر جانے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا... اور یہ لڑکیاں... موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھیں۔

شاہین نے کئی بار بڑی مہارت سے... لہراتے ہوئے جھولے کو چھوڑ کر ہوا میں قلابازی کھائی اور عمران کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو پکڑا۔ ہر بار واؤ... زبردست... ونڈرفل کے نعرے بلند ہوئے اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونجا۔ عمران اور شہزادے نے بھی شان دار کوآرڈی نیشن کے ساتھ سانس روک دینے والی فارمیشنز بنائیں۔

ایک چودھری نما شخص نے جذبات میں آ کر نعرہ لگایا۔ ''اوئے قربان جانواں تہاڈیاں پھرتیاں تے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی کھول کر ہوا میں اچھال دی۔

ہر بار جب کسی خطرناک حرکت کا مظاہرہ ہوتا تھا، ہمارے آگے بیٹھی ہوئی ایک ماڈرن خاتون اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپتی اور چلاتی۔ ''اوہ گاڈ... اوہ مائی گاڈ۔''

ہر بار اس کا گنجا شوہر زور سے ہنستا اور اس ہنسی کے پیچھے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کرتا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد یہ شدید سنسنی خیزی اختتام کو پہنچی اور اس اسپیشل شو کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ وہ تین جوکرز اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ان میں ایک بونا بھی تھا۔ انہوں نے مضحکہ خیز حرکات کے ذریعے لوگوں کا اعصابی تناؤ کم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے بعد ایک بڑی میز اور کرسی اسٹیج پر رکھ دی گئی۔ میز پر وہی منقش چوکور ڈبا موجود تھا جس میں ریوالور اور گولیاں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ جب یہ انتظامات ہو رہے تھے، عمران اور شاہین ہمارے پاس آگئے۔ وہ پسینے سے شرابور اور ہانپے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں تھپکیاں دینے لگے۔ چند ایک نے عمران سے آٹوگراف لیے۔ میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر کی شدید ہلچل کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

چودھری نما شخص عمران اور شاہین کے قریب آیا۔ اس نے ایک بار پھر پُرخلوص انداز میں شاہین کی تعریف کی۔ ''چنگی صورت تے دلیری بھی کسی ای اکٹھی ہوندی ہیں جی۔ واہ واہ! چنگی صورت تے دلیری... شاباش بھئی ہیر شیری، واہ واہ بھئی ہیر شیری۔'' اس نے کچھ اور نوٹ شاہین پر وار کر ہوا میں اچھال دیے۔

نادیہ کھسیانے انداز میں بولی۔ ''بھئی واہ... ویل ڈن شاہین! تمہاری اتنی عزت افزائی دیکھ کر تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں بازی گری سیکھنا شروع کر دوں۔''

شاہین مسکرائی۔ ''لیکن میم! اس کے لیے ایک خاص عمر درکار ہوتی ہے۔'' نادیہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شاہین جلدی سے بولی۔ ''ویسے اگر آپ اپنے اعصاب ٹیسٹ کرنا چاہیں تو یہاں اس کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ ابھی کچھ لوگ وہاں اس کرسی پر بیٹھ کر بھی داد وصول کریں گے۔'' شاہین کا اشارہ اسٹیج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں تین چار لڑکیاں آگئیں۔ وہ عمران اور شاہین کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر اتروانا چاہ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ جیسے نادیہ کے سینے پر سانپ لوٹا رہا تھا۔ اندرونی تپش کی وجہ سے اس کے نقوش بگڑتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

ایک مختصر وقفے کے بعد ریوالور والا خطرناک ترین کھیل شروع ہوا۔ منچلوں کی ٹولیاں گولی چلنے یا نہ چلنے کے حوالے سے بولی لگانے لگیں۔ دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئیں اور پیشانیوں پر پسینا چمکنے لگا۔ آج یہ کھیل اس طرح مزید سنسنی خیز ہو گیا کہ لطیف نامی سابقہ رنگ ماسٹر نے کھیل کے آغاز میں ہی ''دو... چھ'' کی بازی لگائی اور خود پر گولی چلائی۔ یہ گولی چل گئی اور وہ لہولہان ہو کر اسٹیج پر گر پڑا۔ اس کے تڑپتے ہوئے قریب جسم کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر بیک اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔

اگلی تین چار بازیوں میں خیریت گزری۔ ان میں عمران نے بھی دو چھ کی ایک بازی کامیابی سے کھیلی اور تقریباً ایک لاکھ روپیا جیتا۔ توقع تھی کہ پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی وہ اس میں سے بہت سارا روپیا... مارکیٹوں کے برآمدوں میں سوئے ہوئے لوگوں میں بانٹ دے گا۔

ایک باوردی ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے اگلی قطار کے سامنے گھوم رہا تھا۔ نادیہ ویٹر کی ٹرے میں سے دو تین بار وہسکی کا پیگ اٹھا چکی تھی اور اب نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ اسی دوران میں دستور کے مطابق اسسٹنٹ منیجر عباس نے اناؤنسمنٹ کی۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیشہ کی طرح ہم آج بھی حاضرین میں سے باہمت افراد کو اسٹیج پر آنے اور قسمت آزمانے کی دعوت دیتے ہیں۔ کھیل کے اصول اور ضابطے آپ کو معلوم ہی ہیں...''

تین چار منٹ کی اناؤنسمنٹ ختم ہوئی تو ایک ہٹا کٹا کلین شیو نوجوان اپنے دونوں ہاتھ لہراتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ حاضرین نے پُرجوش تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ریفری اسے قاعدے کے مطابق شرائط سے آگاہ کرنے لگا۔ عمران بھی قریب ہی موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کا چہرہ دیکھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ آج نادیہ بھی ضرور اس کھیل میں شرکت کرے گی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میرے دل کی گواہی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ جب حاضرین میں سے ایک نے ''ایک... چھ'' اور دوسرے نے ''دو... چھ'' کا کھیل کھیل لیا تو عباس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے حاضرین کو دیکھا۔ اس مرتبہ نادیہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ تالیوں کا بے پناہ شور اٹھا اور اس شور میں وہ اسٹیج پر چڑھ آئی۔

عمران نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''وہی جو تم سب کو نظر آ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''نہیں... نہیں۔ تم صرف تماشائی ہو۔'' عمران نے اسے کرسی پر بیٹھنے سے روک دیا۔

''میں اپنی مرضی اور خوشی سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔'' وہ حتمی انداز میں بولی۔

''بڑی میڈم ناراض ہوں گی۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نادیہ کے گارڈز کو اوپر آنے کا اشارہ کر دیا۔

گارڈز بھی اسٹیج پر پہنچ گئے مگر ان میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ وہ نادیہ کی مرضی کے بغیر اسے واپس لے جا سکتے۔

دو تین منٹ یہ تنازع جاری رہا مگر نادیہ نے ایک نہیں مانی۔ وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ اسے ہلاشیری دینے والے تماشائی بھی مسلسل شور مچا رہے تھے۔ آخر گارڈز کو نیچے اترنا پڑا۔ نادیہ نے چھپے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے پھر اعلان کیا کہ وہ بھی ''دو... چھ'' کھیلے گی۔ یعنی دو خانوں میں گولی، چار خانے خالی۔ عمران اور اسسٹنٹ عباس نے اسے ایک بار پھر منع کیا۔ عمران نے کہا کہ اگر وہ کھیلنا ہی چاہتی ہے تو ''ایک... چھ'' کھیل لے۔ اس معاملے پر ایک بار پھر بحث ہوئی۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طور راضی ہوگئی۔ شاید ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اب وہ خود بھی موت کا لمس محسوس کر رہی تھی۔

بولی شروع ہوئی۔ پانچ دس منٹ کے شور شرابے کے بعد بولی ڈیڑھ چھ پر ختم ہوئی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں نادیہ کو ایک لاکھ بیس ہزار ملنے تھے۔ چلنے کی صورت میں مخالف گروپ کو چار لاکھ اسّی ہزار کی ادائیگی کی جانا تھی۔ عام طور پر یہ بولی ایک چھ کے ریشو پر ختم ہوتی تھی... مگر کچھ بھی تھا، نادیہ لڑکی تھی۔ اس لیے تماشائیوں نے اسے رعایتی نمبر دے کر بولی کو ڈیڑھ چھ تک پہنچایا تھا۔

نادیہ نے ریوالور کا چیمبر کھولا اور اس میں اعشاریہ تین آٹھ کی چمکتی ہوئی گولی داخل کی۔ اس کے بعد چیمبر بند کر کے اس نے چرخی کو کئی بار گھمایا اور اپنے پہلو میں مقررہ جگہ پر رکھ لیا۔ ریفری نے حسبِ دستور آگے بڑھ کر ریوالور کی پوزیشن چیک کی اور تین چار قدم پیچھے ہٹ کر عمران کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ پنڈال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ نادیہ نے اپنی انگلی لبلبی پر رکھی۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے، چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ یقیناً الکحل کی حرارت بھی اس کے اندر موجود تھی جو اسے نتائج سے بے پروا کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ پانچ خانے خالی تھے۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا... مگر امکان تو آخر امکان ہی ہوتا ہے... کبھی کبھی مکافاتِ عمل بھی بندے کو انوکھے انداز میں آواز دیتا ہے۔ کبھی کبھی مشکل آسانی میں ڈھل جاتی ہے اور آسانی نہایت سنگین مشکل میں بدل جاتی ہے۔ نادیہ نے ٹریگر دبایا تو دھماکے سے گولی چلی۔ میں نے نادیہ کو اچھل کر کرسی سے گرتے دیکھا۔ سب سے پہلے اس کا سر ہی زمین سے ٹکرایا تھا۔ پنڈال میں لوگ چلّا اٹھے اور اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے۔ وہ اوندھے منہ گری تھی۔ اس کا ریوالور مخالف سمت میں گرا تھا۔ عمران نے ریوالور اٹھایا اور پھر نادیہ کی طرف لپکا۔ ''نادیہ... نادیہ۔'' وہ زور سے چلایا۔

گارڈز بھی بھاگتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ آئے۔ نادیہ کو

www.pkdigest.com

اٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ اس کے پہلو سے... پسلیوں سے ذرا نیچے، خون کا اخراج بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں لوگ اسے لے کے اسٹیج کے عقب میں اوجھل ہو گئے۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ میں بھی اقبال کے ساتھ اٹھا اور پنڈال سے باہر آ گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ نادیہ کا اسٹریچر تیزی سے ایک اسٹیشن ویگن میں رکھا جا رہا تھا۔

☆☆☆

نادیہ مخدوش حالت میں تھی اور ایک بہت مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ نادیہ کو گولی لگنے سے کچھ دیر پہلے جس سابقہ رنگ ماسٹر کو "دو... چھ" کے کھیل میں گولی لگی تھی، وہ رات پچھلے پہر چار بجے کے قریب جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں اگلے روز دوپہر کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر آئی اور یہی خبر متوقع تھی... رنگ ماسٹر لطیف اپنے کام سے گھر واپس جا رہا تھا۔ مدینہ کالونی کی ایک تاریک گلی میں دو نامعلوم افراد نے اس سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کی۔ ناکامی پر اس کے پیٹ میں گولی ماری اور فرار ہو گئے۔ لطیف کو اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

ہم نے فون پر عمران سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ "نادیہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اس کا آپریشن ہو گیا ہے اور آکسیجن لگی ہے۔"

اقبال نے پوچھا۔ "کیا ہمیں اسپتال آنا چاہیے؟"

وہ بولا۔ "ابھی نہیں۔ جب میں کہوں گا پھر آ جانا۔"

"ہر طرح خیریت تو ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"خیریت ہے... میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

بے شک نادیہ نے اپنی مرضی اور بے حد اصرار کے ساتھ ریوالور والے کھیل میں حصہ لیا تھا اور اس کے کئی ایک گواہ بھی تھے... تاہم میں اور اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ نادیہ کی مرضی کے پیچھے کسی اور کی مرضی بھی تھی... ہاں، کوئی اور تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے نادیہ جیسی چوکس و چنچل لڑکی کو اس کرسی تک پہنچایا تھا جہاں سے لڑھک کر وہ سیدھی اسٹریچر پر آ گئی۔

... اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ سلیم کی دردناک موت کا جواب عمران نے کل رات دیا تھا اور ایسے انداز سے دیا تھا کہ کوئی کوشش کے باوجود اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ بندے کی نفسیات میں گھسنا جانتا تھا اور یہاں وہ بڑی کامیابی سے نادیہ جیسی پیچیدہ عورت کی نفسیات میں گھسا تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ "تمہیں عمران نے اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"کیا مطلب؟"

"تمہیں پتا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہو گا؟"

"نہیں، بس تمہاری طرح ایک اندازہ سا تھا کہ اگلے چند دن میں کچھ نہ کچھ ہو گا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وہ سلیم کے قتل کو آسانی سے فراموش نہیں کرے گا۔"

"مگر کل رات جو کچھ ہوا، اس میں حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ اتفاق کو بھی تو دخل ہے۔"

"تم نادیہ کو گولی لگنے کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں، وہ صرف ایک گولی ڈال کر کھیلی تھی اور وہی گولی اس کو لگ گئی۔"

"شاید اسی کو کرموں کا پھل کہتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کے شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نادیہ نے دوسرے کھلاڑیوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ریوالور کھولا تھا۔ اپنے ہاتھ سے گولی ڈالی تھی۔" اقبال نے کہا۔

"ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جب بری گھڑی آئی ہو تو سارے اسباب خود بہ خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کل رات [illegible] ریوالور ہوتا تو بھی [illegible] گولی لگ جاتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلیم کی بیوہ اور بچوں کی آہیں بہت اوپر تک گئی ہیں۔"

شام کو عمران کا فون آیا کہ نادیہ کی حالت بدستور خراب ہے۔ اس نے کہا کہ ہم عیادت کے لیے اسپتال آ جائیں۔

ہم گلبرگ کے ایک شان دار پرائیویٹ اسپتال پہنچے۔ یہاں لابی میں میڈم کے کئی جاننے والے موجود تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر صدیقی موجود ہوا تو وہ مجھے یا عمران کو پہچان سکتا ہے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ اندیشہ عمران کے ذہن میں بھی ہو گا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ہمیں بلاتا ہی نہیں۔

میڈم صفورا کے تعلقات کافی وسیع تھے۔ ایم این اے گورایا کے علاوہ انتظامیہ کے چند افسر بھی اسپتال کی لابی میں نظر آئے۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کچھ میڈیکل رپورٹس تھیں اور وہ سیل فون پر مسلسل کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

اسی دوران ایک سرجن صاحب آپریشن تھیٹر کی طرف سے نمودار ہوئے۔ سرجن کو دیکھ کر میڈم صفورا نے سیل فون پر بات ختم کر دی اور سرجن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینئر سرجن اور میڈم کے درمیان انگلش میں جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ اس

طرح تھی۔

"ہاں پروفیسر صاحب! اب کیا کہتے ہیں آپ؟"

"پیچیدگی بڑھ رہی ہے میڈم! گردے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے لیکن..."

"بات پوری کیجیے پروفیسر!" میڈم کی آواز میں گرج تھی۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسے وقت میں پروفیسر اشفاق شاہ سے بہتر کوئی سرجن مل سکتا ہے۔ میری بے لاگ رائے ہے کہ کم از کم پاکستان میں ایسے آپریشن کا رسک صرف وہی لے سکتے ہیں۔"

"تو کہاں ہیں وہ؟ کتنی دیر میں یہاں پہنچ سکتے ہیں؟"

"وہ... وہ شاید ایک ہفتے میں بھی نہ پہنچ سکیں۔ وہ ہانٹریال میں ہیں۔ ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔"

"کیا تم سمجھتے ہو پروفیسر کہ وہ شخص بہترین ہے؟" میڈم نے آپ سے تم پر اترتے ہوئے کہا۔

"یس میڈم! وہ بہترین ہیں۔"

"تو پھر اسے یہاں بلاؤ پروفیسر! کسی بھی طرح۔ کسی بھی قیمت پر۔ مجھے اپنی بہن کی زندگی چاہیے۔" میڈم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

پروفیسر سرجن نے [illegible] پھر میڈم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہ اس نازک موضوع پر تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز رات نو بجے کے قریب ہمیں یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ سینئر پروفیسر سرجن اشفاق شاہ ہانٹریال میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر پاکستان پہنچ گئے ہیں اور وہ آج رات نادیہ کا ایک بڑا آپریشن کریں گے۔

یہ پیسے کی اور تعلقات کی طاقت تھی۔ ایک مسیحا کو ہزاروں میل دور سے صرف ایک رات میں پاکستان بلا لیا گیا تھا۔ اتنا طویل سفر کر کے وہ یہاں آتے ساتھ ہی مسیحائی میں مصروف ہو گیا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ نہایت مشکل آپریشن رات گیارہ بجے شروع ہوا اور صبح چار بجے تک جاری رہا۔ عمران بھی وہیں اسپتال میں موجود تھا۔ اقبال گاہے بہ گاہے فون کر کے معلومات حاصل کر لیتا تھا۔

آپریشن کامیابی سے ختم ہو گیا۔ سارا دن خیریت سے گزرا۔ تاہم اگلے روز شام کو پتا چلا کہ نادیہ کی حالت بدستور نازک ہے۔ اس کے نچلے دھڑ نے حرکت کرنا بند کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے لیے پریشان تھے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ عمران اور اقبال خبر گیری کے لیے پھر اسپتال چلے گئے۔

میں گھر ہی میں رہا۔

میں نادیہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس جیسی سفاک عورت کے لیے میرے دل میں ہمدردی کا کوئی گوشہ نہیں تھا۔ میں دوسرے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ سرکس کے اسپیشل شو میں اسے جس طرح گولی لگی تھی، وہ واقعہ حیران کن تھا۔ اسے گولی لگنے کا امکان بہت کم تھا لیکن اسے گولی لگ گئی۔ یہ ایک اتفاق تھا جو ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی... بہرحال اس کے نہ ہونے کے امکان زیادہ تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس میں کسی انوکھے پن کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں اقبال سے بھی تبادلۂ خیال کیا تھا۔ اس نے بھی فقط حیرانی ہی ظاہر کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر خوش بھی تھا کہ بہت کم چانس ہونے کے باوجود نادیہ کو قرار واقعی سزا ملی ہے۔

اقبال سے بات کر کے بھی مجھے یہی لگا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا اس رات نظر آیا ہے۔ اس میں کوئی چھوٹا موٹا پھیر ضرور ہے۔ شاید عمران اور اقبال وہ "پھیر" مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ میرا ذہن مختلف انداز میں اور مختلف اطراف میں سوچتا رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کھیل میں استعمال ہونے والے خاص ریوالور میں کوئی ٹیمپرنگ کی گئی ہو یا ریوالور کی لوڈنگ میں کسی طرح کا کوئی چکر چلایا گیا ہو؟ مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کھیل کے دوران میں عمران اور عباس سمیت اس ریوالور کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسی ریوالور سے پہلے بھی چھ سات افراد کھیل چکے تھے۔ پھر نادیہ نے اپنے ہاتھ سے ریوالور میں گولی رکھی تھی۔ اسے خود چیک کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ریوالور کی چرخی کئی مرتبہ گھمائی تھی۔ سراج کے سوا اس معاملے میں کسی شخص نے کسی طرح کے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ صرف اس نے کہا تھا کہ جس ریوالور سے نادیہ کو گولی لگی، اسے چیک کرنا چاہیے۔ کہیں سرکس والوں نے اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ سرکس والوں کی بات کر رہا تھا لیکن ظاہر تھا کہ اس کی مراد عمران سے ہے۔ بہرحال، اس کی بات پر ابھی تک کسی نے کان نہیں دھرے تھے۔

میں سوچتا رہا اور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسی دوران میں لائٹ چلی گئی۔ سائڈ ٹیبل پر ایک بڑے سائز کی موم بتی موجود تھی۔ میں نے اسے روشن کرنا چاہا مگر ماچس نہیں ملی۔ عمران کی جیبوں میں اکثر لائٹر موجود رہتا تھا۔ میں نے وارڈ روب میں ٹٹول کر اس کی جیکٹ تلاش کی... یہ بہت سے کپڑوں کے نیچے پڑی تھی۔ لائٹر کے لیے اس کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے

www.pkdigest.com

اچانک میری انگلی ایک سوراخ کے اندر چلی گئی۔ یہ سوراخ اس کی قیمتی جیکٹ میں سامنے کی طرف موجود تھا۔ میں حیران ہوا۔ اسی دوران میں ایک جیب سے لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ بھی مل گیا۔ میں نے موم بتی روشن کی اور جیکٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جیکٹ جدید فیشن کی تھی۔ سامنے کی طرف چمکیلی اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے RING سے لگے ہوئے تھے۔ یہ سوراخ ایسے ہی ایک RING میں موجود تھا اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے سیاہ جیکٹ کو موم بتی کے بالکل قریب کیا اور دھیان سے دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ گولی کا سوراخ ہے۔ سوراخ کے کناروں پر جلنے کے آثار موجود تھے۔ یکایک میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ عمران آج کل یہی جیکٹ پہن رہا تھا مگر پچھلے دو دن سے یہ جیکٹ اس کے جسم پر نظر نہیں آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے جیکٹ آخری بار اسی رات پہنی تھی جب ہم اس کے ساتھ سرکس گئے تھے اور اسپیشل شو ہوا تھا... ایک دم ایک منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ وہی اسپیشل شو کا منظر تھا۔ اسٹیج پر ریوالور والا گیم ہو رہا تھا۔ نادیہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ریفری اور عمران اس سے بس تین چار فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ عمران نے یہی جیکٹ پہن رکھی تھی... ہاں یہی جیکٹ۔ عمران کے دونوں ہاتھ حسب عادت جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میری پھٹی پھٹی نظریں... بدستور چرمی جیکٹ کی جیب کے سوراخ پر جمی تھیں... تو کیا... اس رات جیکٹ میں ریوالور موجود تھا... اور اس ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی؟ ایک ایسی گولی جس کا رخ... نادیہ کی طرف تھا۔

میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کی نظریں عقابی اور اس کا نشانہ بے خطا ہے۔ جو شخص چاقو سے بالکل ٹھیک ٹھیک نشانہ لگا سکتا تھا، اس کے لیے آتشیں اسلحے سے نشانہ لگانا کون سا مشکل تھا۔ تو کیا اس رات نادیہ کو اپنے ریوالور کی گولی نہیں لگی تھی؟

ایک بار پھر وہ سارے مناظر میرے تصور کے پردے پر نمایاں تر ہو گئے۔ دھماکے سے گولی چلی تھی۔ نادیہ الٹ کر فرش پر گری تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دوسری طرف گرا تھا۔ یہ ریوالور عمران نے ہی اٹھایا تھا پھر وہ نادیہ کو سنبھالنے لپکا تھا۔

ایک دم واقعات کی کئی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ ہاں... اس رات ضرور کچھ انوکھا ہوا تھا۔ شاید ایک شعبدہ جس نے بہت سے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی۔ ٹریگر نادیہ نے دبایا تھا لیکن گولی کہیں اور سے چلی تھی اور اس کام کی ٹائمنگ اتنی درست تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلا تھا... شاید ٹریگر دبانے والی کو بھی نہیں۔

میری ہتھیلیاں پسینے سے نم ہونے لگیں۔ میں نے لائٹر واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور جیکٹ کو کپڑوں کے نیچے رکھ دیا... اسی طرح جس طرح وہ پہلے پڑی تھی۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اگر عمران نے واقعی ایسا کیا تھا تو بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں مختلف زاویوں سے سوچنے لگا۔ ان میں سے ایک زاویہ یہ بھی تھا کہ اگر... فرض محال نادیہ والے ریوالور کی گولی بھی چلتی تو کیا ہوتا؟ کیا دو گولیاں نادیہ کو لگتیں؟ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا لیکن میرا یہ شک بہ تدریج پختہ یقین میں بدل رہا تھا کہ اس رات ''ڈبل گیم'' ہوا تھا اور ایسا ڈبل گیم عمران جیسا شخص ہی کھیل سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے ایک عجیب طرح کا ہراس میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اگر کسی طرح میڈم صفورا بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اسے پتا چل گیا کہ نادیہ کو موت کے منہ میں پہنچانے والے ہم ہیں تو وہ قیامت برپا کر دے گی۔ خود اقبال کا بھی یہ تجزیہ تھا کہ وہ اوپر سے جتنی دھیمی نظر آتی ہے، اندر سے اتنی ہی تلاطم خیز ہے۔ خاص طور سے اپنی چھوٹی بہن کے لیے تو وہ ہر حد تک جا سکتی ہے۔

نادیہ کی حالت بدستور نازک تھی۔ اس کے حوالے سے کسی بھی وقت کوئی اچھی بُری خبر آ سکتی تھی۔

مجھے اکیلے گھر میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں کمرے سے نکلا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر آ گیا۔ ہوا میں ہلکی خنکی موجود تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ یہ رات بارہ بجے کا عمل تھا۔ بستیاں اونگھ رہی تھیں اور سو رہی تھیں۔ دور فاصلے پر مینار پاکستان کی روشنی بھی جیسے کسی گمبھیر سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ عمران کو فون کروں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ ذہن پر صرف اور صرف عمران کی سیاہ جیکٹ چھائی ہوئی تھی۔ ان گنت اندیشے دل و دماغ میں سر ابھارنے لگے۔

اچانک مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ آہٹ گھر کی عقبی گلی سے ابھری تھی۔ تب مجھے دو سائے دکھائی دیے۔ وہ گھر

کی بیرونی دیوار کے ساتھ حرکت کر کے اوجھل ہو گئے۔ یکایک میرے سینے میں دھڑکن کے گولے سے پھٹنے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو آہٹ سنائی دی، وہ گھر کے عقبی صحن سے ابھری تھی اور یہ کسی کے صحن میں کودنے کی آواز تھی۔ کوئی گہری تاریکی کا فائدہ اٹھا کر صحن میں کودا تھا۔ میں نے اس کودنے والے کو بڑی تیزی سے برآمدے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ یہ گرانڈیل شخص کوئی اور نہیں شیرا ہے۔ تو کیا... تو کیا وہی ہوا تھا جس کے بدترین اندیشے موجود تھے؟ میڈم اور اس کے ہرکاروں کو اصل معاملے کی ٹوہ لگ گئی تھی؟ دونوں طرف کی چھتیں کافی نیچی تھیں ورنہ میں ان میں سے کسی چھت پر کود جاتا۔ میں شدید خوف کے عالم میں خود کو بہ مشکل سنبھالتا ہوا زینوں سے اترا اور پہلی منزل پر پہنچا۔ میرا گلا خشک ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ نچلی منزل کے نصف زینے طے کر کے میں اس قابل ہو گیا کہ گراؤنڈ فلور کے دو کمروں میں جھانک سکوں۔ ان میں سے ایک کمرا وہ تھا جہاں میں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ میری روشن کی ہوئی موم بتی ابھی تک سائڈ ٹیبل پر روشن تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے مجھے لگا کہ شاید کمروں میں کوئی نہیں اور میرے اندیشوں نے مجھے کسی وہم کا شکار کیا ہے۔ تاہم مجھے یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی جب میں نے کمرے میں دو سائے دیکھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں یقیناً پسٹل تھا۔ وہ بڑے چوکس انداز میں دروازے کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ دوسرا سایہ الماری کی طرف متوجہ تھا۔ مدھم روشنی میں مجھے اس کی حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ الماری میں سے کپڑے اور دیگر اشیا اٹھا اٹھا کر قالین پر پھینک رہا تھا۔

اسی دوران میں گھر کے پہلو کی طرف سے بھی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ شاید ان کا تیسرا ساتھی گھر کی بغلی راہداری میں موجود تھا۔ مجھے اس کے بھاری قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے دوبارہ کمرے میں جھانکا تو ہر اندیشہ سچ کا روپ دھارنے لگا۔ اندر گھسنے والے ایک شخص کے ہاتھ میں وہی جیکٹ نظر آئی جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ شخص جیکٹ کی جیبیں ٹٹول رہا تھا... تب شاید وہ جیب کے سوراخ تک پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر جیکٹ کو دیکھا اور پھر موم بتی کے بالکل پاس پہنچ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

میرے لیے وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سات آٹھ زینے چڑھ کر واپس پہلی منزل پر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس منزل کی ایک کھڑکی پڑوسی زاہد حسین کی چھت کی طرف کھلتی ہے۔ میں اس کھڑکی کے ذریعے اس چھت پر اتر سکتا تھا۔

مجھے نہیں پتا، میں کب کچن کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ کب میں نے کھڑکی کھولی اور کب میرے پاؤں ساتھ والے گھر کی چھت سے ٹکرائے۔ میں زینے اتر کر زاہد کے گھر کی بغلی راہداری میں پہنچا۔ زاہد انڈین فلموں کا شوقین تھا۔ اندر کسی کمرے میں اس وقت بھی فلم لگی ہوئی تھی۔ ہیروئن کی آواز آ رہی تھی... کتنا حسین موسم ہے۔ کتنا سکون..... کتنی خوب صورتی۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ یہیں پر ٹھہر جائے۔

جواب میں غالباً ہیرو کی آواز ابھری... یہ رات ایک دلہن جیسی ہے۔ مجھے تو تمہارے ساتھ ساتھ اس رات سے بھی پیار ہو رہا ہے۔

کتنا تضاد تھا اس فلمی مکالمے میں اور موجودہ صورت حال میں۔ میرے لیے یہ رات اور اس رات کی یہ گھڑیاں قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھیں۔ ارد گرد کی ہر شے مجھے اپنی نگاہوں میں گھومتی محسوس ہوتی تھی اور سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ چند ساعتوں کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ زاہد کو مدد کے لیے پکاروں مگر پھر میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر میں زاہد، اس کی بیوی اور ایک چھوٹے بچے کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا اور یہ تینوں اس قابل نہیں تھے کہ شیرے اور اس کے گماشتوں کے خلاف میری فوری مدد کر سکتے۔

میں راہداری سے گزرا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جاؤں۔ کچھ فاصلے پر جا کر ہی میں کسی کو مدد کے لیے کہہ سکتا تھا یا پھر عمران اور اقبال وغیرہ کو فون کر سکتا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ گلی میں کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا کہ یہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو گھر میں گھسے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتا اور کسی شک میں پڑتا، میں نے نیچے جھک کر خود کو ایک گاڑی کی اوٹ میں کر لیا۔ یہ سوزوکی کا ''ہائی روف'' ڈبا تھا۔ گلی سنسان تھی، چھپنے کے لیے اردگرد کوئی جگہ موجود نہیں تھی اور وہ شخص کسی بھی لمحے مجھے گھوم کر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ڈبے کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس سوزوکی ڈبے کے اندر گھس گیا۔

تب میری نظر ایک اور شے پر پڑی اور میں حیران

www.pkdigest.com

ہوا۔ سوزوکی ڈبے کی چابی اگنیشن میں ہی موجود تھی۔ یہی وقت تھا، جب گلی میں کھڑے سائے ایک سے دو ہو گئے۔ مجھے لگا کہ انہوں نے مجھے ڈبے میں گھستے دیکھ لیا ہے اور اگر نہیں دیکھا تو بھی شک میں ضرور مبتلا ہو گئے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ میں نے نیچے جھکے جھکے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ میری توقع پوری ہوئی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ مجھے یہ سب کچھ تائیدِ غیبی کی طرف لگ رہا تھا۔ گاڑی کے دروازے کا کھلا ملنا، اگنیشن میں چابی موجود ہونا اور پہلے ہی سیلف میں انجن کا اسٹارٹ ہو جانا... یہ سب کچھ میری ہنگامی ضرورت کے مطابق تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گیئر لگا کر گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

مجھے اپنے پیچھے دونوں سایوں کی تیز حرکت دکھائی دی۔ وہ پہلے گاڑی کی طرف لپکے تھے پھر اسے پہنچ سے دور دیکھ کر رک گئے تھے۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان کا تعلق گھر میں گھسنے والوں میں سے تھا۔ رات کے وقت یہ اندرونی سڑک سنسان تھی۔ میں گاڑی کو تیزی سے بڑی سڑک پر لے آیا اور یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں ایک گاڑی کی تیز رفتار روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ گاڑی بھی اندرونی سڑک سے نکلی تھی اور اب بلا کی طرح میرے پیچھے آ رہی تھی۔

میری زندگی میں اب تک جو سب سے بُرا واقعہ پیش آیا، وہ سینٹھ سراج والا تھا... اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے بھی بُری صورتِ حال کا شکار ہونے والا ہوں۔ وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کے اندیشے اب تک میرے ذہن میں کلبلاتے رہے تھے... اور اس پر مستزاد یہ کہ عمران جو ان سارے حالات کا ذمے دار تھا اور جس کی وجہ سے میں اس مشکل ترین سچوایشن میں پھنسا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں مجھے اس پر بہت طیش آیا۔ اس کی وہ دلیری و جرأت بھی قابلِ نفرت شے محسوس ہوئی جس کا میں اب تک معترف رہا تھا۔

گاڑی پوری رفتار سے میرے پیچھے آ رہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ گاڑی کسی پولیس اسٹیشن میں گھسا دوں؟ یا پھر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں بہت سے لوگ موجود ہوں؟ وہاں جا کر دہائی مچاؤں کہ میری مدد کی جائے یا پھر...

کئی خیالات برق رفتاری سے ذہن میں آ اور جا رہے تھے مگر عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ عمران سے سیل فون پر رابطہ کروں۔ جیب پر ہاتھ مارا تو جیب خالی تھی۔ پتلون کی جیبیں بھی خالی تھیں۔ فون موجود ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو شاید اس صورتِ حال میں، میں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ نمبر ڈائل نہ کر سکتا۔ پیچھے آنے والی گاڑی اب بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آنے والی کار بھی سوزوکی مہران تھی۔ اس میں وہی چادر پوش شخص نظر آیا جو گلی میں ٹہل رہا تھا۔ خوف کے باوجود میرے اندر تھوڑا اشتعال بھی جمع ہو رہا تھا۔ جی چاہا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کو سائڈ مار کر سڑک سے اتارنے کی کوشش کروں۔ یہی وقت تھا جب ایک موڑ پر میری گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا۔ گو کہ موڑ پر اسپیڈ بہت تیز نہیں تھی مگر جھٹکا شدید تھا۔ گاڑی سائڈ کے پختہ کنارے سے ٹکرائی تھی... مجھے جو آخری احساس ہوا، وہ یہ تھا کہ گاڑی الٹ رہی ہے اور میرا دایاں کندھا کھڑکی سے ٹکرایا ہے... اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک گہرا اندھیرا تھا جس نے ہر طرف سے مجھے ڈھانپ لیا۔ اس اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سامنے کمرے کی سفید ڈیزائن دار چھت دکھائی دے رہی تھی۔ میں کسی بستر پر چت لیٹا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے اٹھنے سے روک دیا لیکن اردگرد کوئی نہیں تھا۔ تب مجھ پر خوفناک انکشاف ہوا کہ میں پلنگ کے بیڈ کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ میرے جسم کے گرد نائیلون کی زرد رسی نظر آ رہی تھی۔

میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے ایکسیڈنٹ سے پہلے پہنا ہوا تھا۔ میرا دایاں کندھا اور بازو عریاں تھا، یہاں سے قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ کندھے اور بازو پر سے جلد بہت بُری طرح چھلی ہوئی تھی۔ ان زخموں پر کوئی مرہم لگایا گیا تھا۔ گھڑی پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی اور کھڑکیوں سے باہر دھوپ کے آثار تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں سولہ سترہ گھنٹے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ ایک متوسط درجے کا گھر تھا۔ سائڈ ٹیبل پر چند دوائیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔

"کوئی ہے؟" میں نے پکار کر کہا۔ میرا گلا بالکل خشک تھا۔

ایک جواں سال عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ عام سے لباس میں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو اس کا دودھ پی رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے عورت نے بچے کو خود سے پیچھا چھڑا کر اپنی قمیص برابر کر لی۔ وہ شکل سے شریف نظر نہیں آتی تھی۔ جیسے کہ بعد میں پتا چلا، اس کا نام تابندہ تھا اور وہ بازاری عورت تھی۔

"دسیہ گل ہے؟" اس نے بےخوف لہجے میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے باندھا کیوں گیا ہے؟"

"ان ساری باتوں کے جواب تو میرا بندہ ہی آ کر دے سکتا ہے۔ بس وہ آنے ہی والا ہے۔ باقی تو نے کوئی پانی شانی پینا ہو تو مجھ کو بتا؟"

میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر رسی کی بندشیں بڑی مضبوط تھیں۔ کئی جگہوں پر رسی میرے جسم کے اندر گھس رہی تھی۔

"میرا قصور کیا ہے؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"تیرے قصوروں کا بھی میرے بندے کو ہی پتا ہے۔ مجھے تو بس ایک بات بتائی ہے انہوں نے۔ تو گاڑیاں شاڑیاں چوری کرتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کون چوری کرتا ہے گاڑیاں؟"

"پولیس جب چھتر مارے گی نا تو سب کچھ بتاؤ گے تم۔ ویسے شکل سے تو تم بھلے مانس لگتے ہو۔ پتلون بھی پہنی ہوئی ہے۔ عام بندہ دیکھے تو یقین نہ کرے کہ چور ہو۔"

میرا سر پہلے ہی بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اس عورت کی باتوں سے بالکل ہی گھومنے لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پانی مانگا۔ وہ پانی لینے چلی گئی۔ میں نے اپنے جسم کو رسی کی بندشوں کے اندر ہی ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ہل رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہڈیاں سلامت ہیں۔ بس کندھے، بازو اور گردن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ یہ رگڑ کی چوٹیں تھیں۔ کل رات والے سارے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے ایک موڑ پر سوزوکی ڈبے کو تیزی سے بائیں طرف کاٹا تھا پھر جھٹکا لگا تھا اور مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

وہ پانی لے آئی اور تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے پلایا۔ اس کے جسم سے پسینے کی بو آ رہی تھی۔ اتنے میں کمرے سے باہر اس کا بچہ رونے لگا۔ اس نے محتاط نظروں سے میری رسی کی بندشیں چیک کیں اور باہر چلی گئی۔ "سنو... میری بات سنو..." میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ تکلیف اور شدید پریشانی کے باوجود میرے ذہن پر غنودگی چھا رہی تھی۔ شاید یہ مجھے دی جانے والی دواؤں کا اثر تھا۔

میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں باندھنے والے لوگ کون ہیں؟ عمران اور اقبال کو میرے حالات کا علم ہوا ہے یا نہیں؟ اگر مجھے شیرے وغیرہ نے ہی یہاں تک پہنچایا ہے تو پھر ابھی تک کوئی شناسا صورت کیوں دکھائی نہیں دی؟ میں اردگرد کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ غالباً یہ گھر کسی گنجان آبادی میں نہیں تھا۔ ہاں، اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ یہ شہری علاقہ ہی ہے۔ کچھ فاصلے سے والز آئس کریم والے سائیکل سوار کا میوزک سنائی دیا۔ اس بے جا شور پر کسی کتے نے آئس کریم والے کو ڈانٹ پلائی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے سر کے چکروں میں اضافہ ہوتا گیا، آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھانے لگی... مجھ پر ایک بار پھر شدید غنودگی کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سارا جسم آگ میں پھنک رہا ہے۔

اگلا کافی سارا وقت عجیب بےہوشی یا غشی کی کیفیت میں گزرا۔ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں اسی کمرے میں موجود ہوں، میرے بدن کے کچھ حصوں پر نائیلون کی رسی بری طرح چبھ رہی ہے۔ میرے اردگرد کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ کمرے میں آتے اور جاتے ہیں۔ ان میں ایک بہت بھاری آواز والا شخص بھی ہے۔ میں نے نیم بےہوشی کے عالم میں اس بھاری آواز والے شخص سے کچھ کہا بھی۔ کیا کہا، یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا... پھر شاید میں نے اپنی والدہ کو پکارا۔ فرح کو آواز دی۔ اس کے بعد مجھے بازو پر سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے انجکشن لگایا جا رہا ہے۔ مجھے شاید بہت تیز بخار ہو چکا تھا... کسی نے میرا سر بھگو دیا۔ میں نے زور لگا کر رسیاں توڑنے کی کوشش کی۔ میں نے کسی کو گالی دی۔ تب مجھے لگا کہ میں ایک بار پھر کسی گہرے تاریک کنوئیں میں اترتا جا رہا ہوں۔ اس پُرخوف تاریکی میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔ مجھے اندر سے بُری طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔ میں پتا نہیں کہ کب تک اس کنوئیں کی گہرائی میں زمان و مکاں کی قید سے آزاد پڑا رہا۔ تب ایک بار پھر میرے حواس خمسہ ہوش اور بےہوشی کے درمیانی خلا میں چکرانے لگے۔ یہ شاید دن کا وقت تھا، آنکھوں کی بند پلکوں پر سرخ روشنی پڑ رہی تھی۔ تب اس روشنی میں سے میری بےباک کزن آرسہ کا سراپا نمودار ہوا۔ وہ اپنی جوبن بھری اداؤں سے مجھے رجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی... تم اس دن گیارہ بجے آئے کیوں نہیں تھے؟ تم آ جاتے تو میں تمہیں زندگی کا مفہوم سمجھا دیتی۔ تمہیں سر سے پاؤں تک سیراب کر دیتی۔ میں نے اسے سخت ڈانٹ پلائی... میں نے کہا کہ تم دھوکے باز ہو۔ تم مجھے بےوقوف بنا رہی ہو۔ تم ثروت کے پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو۔ میں نے تمہاری وہ ساری باتیں سنی تھیں جو تم اپنی کسی سہیلی سے کر رہی تھیں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے

www.pkdigest.com

THE LASERDOT

کردار پر۔ وہ ایک دم او جھل ہوگئی۔ میں نے اپنی پیاری بہن فرح کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”یہ کیا ہوا بھائی؟ آپ قاتل تو نہیں ہو سکتے۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔“ اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے اسے سینے سے لگالیا۔ ”نہیں میری بہن! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔“

فرح نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ”میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اپنے بھائی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔“

تب ایک دم میں ہڑپہ کے کھنڈرات پہنچ گیا۔ وہاں گرما کی ایک نہایت گرم و سنسان دوپہر تھی۔ دھول اڑ رہی تھی، بگولے چکرا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ تھا... ہم بھاگ رہے تھے۔ جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ گہرے سانولے چہروں اور سرخ آنکھوں والے کچھ قدیم لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ پیاس سے میرے جسم میں دراڑیں پڑ رہی تھیں... میری زبان خشک چمڑے کا ٹکڑا ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے گلے میں زہریلے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں سے وہی بھاری آواز ٹکرائی جو اس بے ہوشی و نیم بے ہوشی میں گاہے بہ گاہے میری سماعت میں داخل ہوتی تھی۔ یہ بھاری آواز کرخت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”منہ کھول... منہ کھول۔“

میں نے لبوں کو حرکت دی۔ ٹھنڈا پانی... آب حیات کی طرح میرے ہونٹوں، دانتوں اور زبان سے ٹکرایا۔ پھر گلے کے زہریلے کانٹوں کو اپنی ٹھنڈک سے ڈھانپنے لگا۔

”لگتا ہے کہ ہوش میں آرہا ہے۔“ نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید یہ وہی عورت تھی جس کے سینے سے میں نے شیر خوار بچے کو چمٹے دیکھا تھا۔

غنودگی اور بیداری کے ریلے سے آتے رہے۔ پھر میری بے ہوشی شاید نیند میں بدل گئی تھی۔ میں اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوا تو کمرے میں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں نو بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میرے بازو پر گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی... بڑی سست رفتاری سے ایک ایک قطرہ گر رہا تھا۔ میرے گرد رسیوں کی مضبوط بندشیں... بدستور موجود تھیں۔ صرف وہ بازو آزاد تھا جس پر انجکشن وغیرہ دینے کے لیے ”کینولا“ لگایا گیا تھا۔

میں نے کسی کو پکارنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ مجھے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔ یقیناً یہ وہی طوائف نما عورت تھی جس سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ غالباً وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں یا نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف اس کی کوئی بے تکلف سہیلی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”ہائے... ہائے! اب میں تجھ سے بھی چھپاؤں گی۔ اگر چار پیسے ہاتھ آئے ہوتے تو سب سے پہلے تیرا کرجا (قرضہ) اتارتی... نہیں نہیں... تیرے سر کی قسم۔ میں تجھ سے بھلا جھوٹ بول سکتی ہوں۔ نہیں نہیں... یہ تو ٹھیک ہے کہ آبادی میں سب سے کھاتا پیتا گھر وہی تھا، پر اندر سے کچھ ملا نہیں ہے۔ اوپر سے وہ گڈی والا مسلہ ہو گیا... ہاں ہاں۔ رشید، ماجھو اور کالا اندر وڑے ہوئے تھے۔ گلجار اور جیرا باہر پہرا دے رہے تھے... وہ خبیث شاید چھت پر تھا۔ اس نے اوپر سے ہی دیکھ لیا کہ گھر میں لوگ وڑ آئے ہیں۔ اس نے ساتھ والی چھت پر چھال ماری اور وہاں سے باہر سڑک پر آ گیا۔ اب دیکھو اللہ کی مرضی... وہ رشید والی گڈی میں ہی وڑ گیا۔ گڈی کی چابی بھی گڈی کے اندر ہی تھی۔ اس نے اسٹارٹ کی اور گڈی تو ردی (چلا دی)۔ گلجار اور جیرے نے جب دیکھا کہ اپنی ہی گڈی ہتھ سے نکلنے لگی ہے تو دوسری گڈی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ بتی والے چوک سے تھوڑا پہلے وڈی ڈاچی کے پاس اس خبیث نے گڈی الٹا دی۔ اس کے سر اور موڈھے پر چوٹیں آئی ہیں۔ گلجار اور جیرے کے دماغ نے ٹھیک کام کیا۔ انہوں نے اپنی گڈی روک دی اور دو چار راہ گیروں کے ساتھ مل کر اس خبیث کو اپنی گڈی میں ڈال لیا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ دو اسے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ وہ اسے یہاں گھر لے آئے۔“

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”رشیدے اور ماجھو کا کیا بننا تھا۔ جب انہوں نے اندر سے دیکھا کہ اپنی دونوں گڈیوں نے ایک دم آگے پیچھے دوڑ لگا دی ہے تو وہ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ کوئی خطرا ہو گیا ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل کر پچھلی آبادی کی طرف نچ (بھاگ) گئے۔“

تابندہ قریباً دس منٹ مزید باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ان میں سے رشید نام کا بندہ اس عورت کا رکھی یا اصلی خاوند ہے۔ باقی اس کے رکھے ہوئے ہیں۔ اس چرب زبان عورت کی اسی نوے فیصد باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان باتوں سے مجھ پر ایک حیران کن انکشاف ہوا اور وہ انکشاف یہ تھا کہ میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہوا ہوں۔

www.pkdigest.com

اس رات ہمارے گھر میں گھسنے والے بندے صرف اور صرف وارداتیے تھے۔ ان کا میڈم صفورا یا سیٹھ سراج وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا... اور نہ ہی ان میں شیرا یا بختیار وغیرہ شامل تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ میں درد کی ٹیسیں محسوس ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ صرف میرے اندرونی اندیشے تھے جنہوں نے مجھے حالات کی ایک بالکل غلط تصویر دکھائی... اور میں ان وارداتیوں کو میڈم کے ہرکارے سمجھ کر اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ دوسرا غلط اتفاق یہ ہوا کہ میں نے موقع سے بھاگنے کے لیے انہی وارداتیوں کی گاڑی استعمال کرلی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی گاڑی کا پیچھا تو کرنا ہی تھا۔ ان کے پاس COVER کے طور پر دوسری گاڑی بھی موجود تھی۔ وہ اس پر میرے پیچھے آئے اور نتیجے کے طور پر میں یہاں زخمی حالت میں اس چار دیواری میں آپھنسا۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ یہ سب کچھ اس طرح سے کیوں ہوا؟ کیوں میں نے اس سارے معاملے کو میڈم صفورا اور نادیہ وغیرہ سے نتھی کر دیا؟ اگر میں کچھ اور نہ بھی کرتا، بس پڑوسی زاہد حسین کو بتا دیتا اور وہ شور مچا کر محلے والوں کو جگا دیتا تو وارداتیوں نے راہِ فرار اختیار کر لینی تھی اور ممکن تھا کہ ان میں سے ایک دو پکڑے بھی جاتے۔ مگر میری شدید غلط فہمی اور جلد بازی کی وجہ سے صورتِ حال کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ وہ مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کمرے میں ایک شخص کو عمران کی جیکٹ کا معائنہ کرتے دیکھا تھا اور میرے دماغ نے اس کے سوا اور کچھ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ میڈم صفورا کے لوگ ہیں اور انہیں نادیہ کے زخمی ہونے کی اصل وجوہات معلوم ہو چکی ہیں...

...تو عمران ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی اندرونی ناتوانیوں کے سبب حالات کا بدترین پہلو دیکھتے ہیں۔ دنیا جہاں کے اندیشے انتہائی برق رفتاری سے ان کے دماغ میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔

تابندہ سیل فون پر اپنی گفتگو ختم کر کے میرے والے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر تک ایک الماری میں سے کچھ تلاش کرتی رہی۔ میں آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ وہ میری طرف آئی اور میرے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلا کر بولی۔ ”اوئے! اٹھ جا۔ اب کب تک مردے کی طرح بے سدھ پڑا رہے گا۔ جو چن تو نے چڑھانا تھا وہ تو چڑھا دیا ہے۔“

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھے ترس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”پانی پیے گا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شاید گلوکوز کی وجہ سے پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”کچھ نہ کچھ پی لے... پھر تو شاید تیری قربانی ہو ہی جانی ہے۔“ وہ کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہوئے بولی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ میری طرف مڑی تو میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیدے پاڑ پاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی گلت بات تو نہیں کہہ دی ہے۔ تو نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔ لگتا ہے کہ تجھے اور تیرے یاروں کو کسی پیر فقیر کی بددعا لگ گئی ہے۔“

”پپ... پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔“ میں نے نہایت نحیف آواز میں کہا۔ اپنی آواز خود مجھے بھی اجنبی لگ رہی تھی۔

وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تو شکل سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے۔ پھر تو ایسے خطرناک لوگوں کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟“

”کون لوگ؟“ میں کراہا۔

”وہی جن کے تو نام لے رہا تھا... عمران اور پتا نہیں دوجا نام کیا تھا... کمال کہ اقبال۔“

میں چکرا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے کب ان کے نام لیے ہیں۔ ... مجھے لگا کہ شاید میں بخار کی بے ہوشی میں کچھ بڑبڑاتا رہا ہوں۔ تابندہ نامی یہ عورت بڑے غور سے مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں پھانسی کا مجرم ہوں اور مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جانے والا ہے... یا پھر میں ایک جاں بلب مریض ہوں اور کسی ایسے آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر کی طرف روانہ ہونے والا ہوں جس سے میرے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تابندہ کے دیکھنے کے انداز نے مجھے ان جانے خوف میں مبتلا کر دیا۔

اگلے دو چار منٹ میں میرے اور تابندہ کے درمیان جو بات ہوئی، اس نے مجھ پر ایک اور لرزہ خیز انکشاف کیا... اور یہ انکشاف یہ تھا کہ میں شدید بخار کے دوران میں بڑبڑاتا رہا ہوں۔ میں نے بہت سارا ہذیان بولا ہے اور اس میں کچھ ایسی باتیں بھی شامل ہیں جو مجھے ہرگز ہرگز نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ میرے جسم کے ہر مسام میں سے پسینا بہہ نکلا۔ مجھے محسوس ہوا، شاید میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔

تابندہ کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گمبھیر انداز میں کہہ رہی تھی... ”تیرے بکھار (بخار) کی بے ہوشی نے تیرے بہت سے پردے کھول دیے ہیں۔ تو نے لال

کوٹھیوں کی بات کی ہے... اور کسی وڈی میڈم کی بات کی ہے۔ تو نے قسمیں کھائی ہیں کہ تو نے چھوٹی میڈم کو گولی نہیں ماری۔ تو نے اس کا الجام اپنے یار عمران پر لگایا ہے اور کہا ہے کہ تجھے بھی اس گل کا پتا بعد میں چلا تھا۔ بس اسی طرح کی بکواس کی ہے تو نے... لگتا ہے کہ تو نے رشید اور اس کے یاروں کو ”لال کوٹھیوں والے“ سمجھا ہے۔ انہیں دیکھ کر تو جس طرح گھر سے نکلا ہے... اور بھاگا ہے، اس سے بھی یہ شک پکا ہو گیا ہے کہ تو نے اور تیرے یاروں نے ضرور کوئی کارنامہ کیا ہے اور کیا پتا کوئی قتل ہی کر دیا ہو۔“ میرا سر چکرانے لگا۔ یہ عورت کیا کہہ رہی تھی؟ کیا میں واقعی یہ سب کچھ اپنی زبان سے کہہ چکا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں اور پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں... شاید اسی لیے کچھ دیر پہلے اس تابندہ نام کی عورت نے کہا تھا کہ جو چن تو نے چڑھانا تھا، وہ چڑھا دیا ہے۔

تابندہ کی دل ہلا دینے والی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”لگتا ہے کہ تیرے بھیڑے نصیبوں پر ٹھپا لگ گیا ہے۔ جو کچھ تو نے بکھار کی حالت میں کہا ہے، اس پر شاید میرا بندہ اور اس کے یار جیادہ گور (غور) نہ کرتے... پر میرے بندے رشید کے یاروں میں سے گلجار ان چھوٹی وڈی میڈم کو جانتا ہے جن کی تو نے بات کی ہے۔ اسے یہ بھی پتا ہے کہ ان میں سے ایک میڈم کو گولی لگی ہے اور وہ اسپتال میں پڑی ہے۔ اب سمجھ لے کہ تیری کتی بھیڑی کم بختی آنے والی ہے۔“ وہ مجھے ڈرا رہی تھی۔ اس کے انداز میں تھوڑا تھوڑا ترس تھا اور تھوڑا تھوڑا مزہ بھی۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بولی۔ ”ویسے یہ عمران اور کمال کون ہیں اور اب کہاں ہیں؟“ وہ اقبال کو کمال کہہ رہی تھی۔

”مجھے کچھ پتا نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ سر اور گردن کے پچھلے حصے میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں سے جلد بری طرح چھلی ہوئی ہے۔

”دیکھ، ابھی تھوڑی دیر میں سارا پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اگر تو اپنے منہ سے بتا دے گا تو شاید تیری کچھ بچت ہو جائے...“

اسی دوران میں کسی ساتھ والے کمرے سے دھم کی آواز آئی اور پھر ایک بچے نے یکبارگی رونا چلانا شروع کر دیا۔ یقیناً یہ تابندہ کا بچہ ہی تھا۔ وہ نیند میں بیڈ پر سے نیچے پکے فرش پر گر گیا تھا۔

”ہائے میں مری۔“ تابندہ نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے بچے کی طرف چلی گئی۔ اس کی گود سے موبائل اور ایک تڑا مڑا سا کاغذ نیچے دری پر گر پڑا لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ یہ وہی موبائل تھا جس پر وہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنی کسی سہیلی سے بے تکان باتیں کر رہی تھی۔ بچے کو شاید زیادہ چوٹ لگی تھی۔ وہ پورے زور سے چلاتا جا رہا تھا۔ ”ہائے میں مر گئی۔ سارا ہوٹ (ہونٹ) پاٹ گیا ہے۔“ اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

پھر وہ بچے کو لے کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ غالباً وہ اس کا خون بند کرنے کے چکر میں تھی۔ میری نظر نیچے دری پر پڑے سیل فون کی طرف گئی۔ میرا ایک بازو رسی کی بے رحم بندشوں سے آزاد تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنا ہاتھ اس سیل فون تک پہنچا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور زور لگا کر اپنا ہاتھ نیچے دری تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہاتھ موبائل تک تو نہیں پہنچا تاہم مڑا تڑا کاغذ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے سینے پر رکھ کر اسے کھولا۔ یہ شاید کوئی فون بل تھا۔ میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا اور دوبارہ موبائل فون کے لیے کوشش کرنے لگا۔ بندشیں بڑی سخت تھیں۔ جہاں تک میرا ہاتھ پہنچتا تھا، وہاں تک کوئی گرہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے پوری طاقت لگا کر جسم کو دائیں بائیں ہلایا اور رسی کے بل ذرا ڈھیلے کرنے کی کوشش کی۔ اس میں بہت تھوڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک بار پھر بازو لمبا کر کے فون سیٹ تک پہنچانا چاہا۔ اس بار کامیاب ہوا۔ فون سیٹ میری دو انگلیوں کے درمیان آ گیا۔ اس جان توڑ کوشش میں میری گردن اور کندھے کے زخموں پر جیسے قیامت گزر گئی تھی۔

برآمدے کی طرف سے جو آوازیں آ رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ تابندہ بچے کا منہ وغیرہ دھونے میں مصروف ہے۔ وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے موبائل پر عمران کا نمبر پریس کیا۔ موبائل کان سے لگایا۔ دوسری بیل پر ہی کال ریسیو ہو گئی۔ عمران کی آواز آئی۔ ”ہیلو... کون؟“

”عمران! میں تابش بول رہا ہوں۔“ میں نے تیز سرگوشی کی۔

”تابش! کہاں ہو تم... تت... تم نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے... تم خیریت سے تو ہو؟“

”عمران! میں خیریت سے نہیں ہوں اور یہاں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ یار! مجھے کچھ لوگ اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔ مجھے رسیوں سے باندھا گیا ہے۔ میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

www.pkdigest.com

''کون لوگ ہیں؟'' عمران کے لہجے میں یک لخت شدید فکر مندی در آئی۔
''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان کے نام رشید، جیرا اور گلزار وغیرہ ہیں۔ ایک بازاری عورت تابندہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ کوئی عام سی رہائشی آبادی لگتی ہے۔''
''کچھ تھوڑا بہت اندازہ بھی نہیں کہ کون سی جگہ ہے؟''
اچانک میرا دھیان اس فون بل کی طرف چلا گیا جو زمین سے اٹھایا تھا۔ میں نے جلدی جلدی بل کھول کر دیکھا اور عمران کو بتایا کہ مجھے ایک فون بل ملا ہے اس پر مختصر سا ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ یہاں کا ایڈریس ہے یا کسی اور جگہ کا۔
''تم ایڈریس بتاؤ۔'' عمران تیزی سے بولا۔
''مستری بشیر۔ مکان نمبر 18۔ لالہ زار اسکیم۔ نظامی روڈ۔'' ساتھ ہی میں نے فون نمبر بھی لکھوا دیا۔
''وہاں اس وقت تمہارے آس پاس کتنے لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس چار دیواری میں؟''
''ابھی تو صرف ایک عورت اور اس کا بچہ ہیں۔ کچھ دیر بعد کا پتا نہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔
''تم بے فکر رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔''
''کوئی آرہا ہے۔ میں بند کر رہا ہوں۔'' قدموں کی چاپ سن کر میں نے فون بند کیا اور ہاتھ لمبا کر کے دوبارہ دری پر رکھ دیا۔
تابندہ اپنے جسم کو ہلکورے دیتی تیزی سے اندر آئی۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ الماری کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دراز کھول کر جلدی جلدی کچھ ڈھونڈنے لگی۔ قریبی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ تابندہ ایک دوائی اور روئی لے کر پھر باہر نکل گئی۔
میں اپنی جگہ چت لیٹا رہا اور دل کی دھڑکنیں گنتا رہا۔ آنے والے وقت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عمران کو یہاں پہنچنے میں ناکامی ہو سکتی تھی۔ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی تابندہ کا شوہر اور اس کے ساتھی واپس آسکتے تھے... اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جو ایڈریس میں نے عمران کو لکھوایا ہے، وہ کسی اور جگہ کا ہو۔
تابندہ بچے کے چکر میں پڑ کر وقتی طور پر مجھ سے غافل ہو گئی تھی۔ کمرے کے آخری گوشے میں لوہے کے ایک اسٹینڈ پر پی ٹی سی ایل کا فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں دور ہی سے دیکھ سکتا تھا کہ اس سیٹ پر سی ایل آئی نہیں ہے۔ میں نے زور لگا کر اور بازو لمبا کر کے نیچے سے موبائل سیٹ دوبارہ اٹھایا۔ فون بل پر لکھا ہوا فون نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پر وہی نمبر پریس کیا۔ میرا ''تجربہ'' کامیاب ثابت ہوا۔ کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے پی ٹی سی ایل کے فون پر بیل ہوئی۔ ابھی آدھی بیل ہی ہوئی تھی کہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل سیٹ اور فون کا بل پھر سے دری پر پھینک دیے۔ اب مجھے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی... ہاں، کم از کم اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ میں نے عمران کو جو ایڈریس دیا ہے وہ اسی چار دیواری کا ہے۔
اگلے پندرہ بیس منٹ میں نے امید و بیم کی عجیب کیفیت میں گزارے۔ بخار ایک بار پھر بڑھ رہا تھا۔ پورا جسم پھنکنا شروع ہو گیا تھا۔ کیا میں ایک بار پھر بے ہوشی یا نیم بے ہوشی سے دوچار ہو جاؤں گا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا۔ جیسے کسی نے بڑے بھاری پتھر سینے پر رکھ دیے ہوں... اور یہ بوجھ انہی باتوں کا تھا جو ابھی تابندہ نے مجھے بتائی تھیں۔ تابندہ کے منہ سے چھوٹی اور بڑی میڈم کا ذکر سننے کے بعد اس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اپنے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال وغیرہ کے لیے بھی ایک بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔
عمران کی آمد میری توقع سے پہلے ہو گئی۔ گھر کی کال بیل سنائی دی، میرا دل بُری طرح اچھلا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ تابندہ کا شوہر اور گلزار وغیرہ آگئے ہیں مگر پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تابندہ کسی کے لیے گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول رہی ہے۔ یہ دروازہ گلی کی طرف سے کھلتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ عمران تھا اور اس نے خود کو رشید کا دوست ظاہر کیا تھا۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی عمران نے تابندہ کو دبوچ لیا۔ جب وہ دونوں میرے سامنے آئے تو یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ عمران نے تابندہ کو عقب سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کی ایک ہتھیلی تابندہ کے ہونٹوں پر جمی تھی اور تابندہ کی آنکھیں خوف سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہی تھی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ کمرے کے اندر آنے تک تابندہ کی مزاحمت بس دس پندرہ فیصد ہی رہ گئی تھی۔
عمران اسے باتھ روم میں لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر پستول کی نال رکھی اور پھنکارا۔ ''اپنی اور بچے کی خیریت چاہتی ہو تو آواز نہ نکالنا۔''
اس کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا۔ ساری تن فن جاتی رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور گھگیائی۔ ''مجھے اور کاکے کو کچھ نہ کہنا۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔''
''تو چپ چاپ یہاں کھڑی رہو۔'' عمران کا لہجہ

ـناک تھا۔
''مم... میرے بچے کو یہاں لا دو، وہ رو رہا ہے۔''
بچہ واقعی اپنے سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔
باتھ روم کو باہر سے کنڈی لگا کر عمران دوسرے کمرے میں گیا اور روتے چلاتے بچے کو لے آیا۔ اس کا چہرہ زخمی تھا۔ عمران نے باتھ روم کی کنڈی کھول کر بچہ تابندہ کے حوالے کیا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دہشت زدہ تابندہ نے ہمارے سامنے ہی قمیص اوپر کی اور بچے کو اپنے ساتھ لگا کر دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی... پانچ دس سیکنڈ بعد دودھ اور بچے کا ملاپ ہو گیا اور اس کا رونا دھونا تھم گیا...
عمران نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی پھرتی سے میری بندشیں کاٹ دیں۔ میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سے آنے لگے۔ عمران نے گلوکوز کی ڈرپ میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا جوتا ڈھونڈا۔
''جیبیں دیکھ لو۔ تمہارا کوئی سامان تو نہیں ہے یہاں؟''
میں نے پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے باتھ روم میں کھڑی تابندہ سے پوچھا۔
''میری چیزیں کدھر ہیں اور میرا موبائل؟''
''سب تمہاری جیب سے کچھ پیسے... شناختی کارڈ اور ایک پین نکلا تھا، وہ ساری چیزیں وہاں دراز میں پڑی ہیں۔'' اس نے سامنے الماری کی طرف اشارہ کیا۔
''اور موبائل؟''
''موبائل نہیں تھا تمہارے پاس۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
مجھے یاد آیا کہ موبائل واقعی میرے پاس نہیں تھا۔ راستے میں جب گلزار وغیرہ نے مہران کار پر میرا پیچھا شروع کیا تو میں نے عمران سے رابطہ کرنے کا سوچا تھا مگر پھر پتا چلا تھا کہ موبائل تو میں گھر پر ہی کہیں چھوڑ آیا ہوں۔
میں نے دراز میں سے اپنی باقی چیزیں سمیٹیں۔ عمران نے تابندہ کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے کی تلقین کی اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں قریباً 72 گھنٹے بستر پر رہا تھا۔ مثانے میں بہت سا پانی جمع ہو چکا تھا۔ میں ایک قریبی باتھ روم میں گیا۔ دو تین منٹ بعد ہم مکان سے باہر نکلے۔ یہ ایک درمیانے درجے کی زیر تعمیر آبادی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد کئی پلاٹ خالی اور ویران پڑے تھے۔ عمران اپنی مہران کار میں آیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔
''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کراہتی آواز میں عمران سے پوچھا۔
''گھر۔''
''گھر نہیں۔ کہیں اور چلو... کسی ریسٹورنٹ میں۔'' میرا لہجہ اندیشوں سے لبریز تھا۔
عمران نے گاڑی بائیں جانب موڑ دی۔ ہم وحدت روڈ پر سے گزرے اور پھر ایک تکا شاپ پر جا بیٹھے۔ ''کچھ کھاؤ گے؟'' عمران نے پوچھا۔
''نہیں۔ مجھے بس کوئی جوس پلا دو۔'' میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔
''تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ چلو، پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' عمران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
''نہیں... عمران نہیں۔ ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔ معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔'' میری آواز بیٹھ رہی تھی۔
''یار! کتنا بھی خراب ہے، ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔ تم پہلے خود کو ٹھیک کرو۔ مجھے تمہاری حالت اچھی نہیں لگ رہی۔''
میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ... نادیہ کی حالت اب کیسی ہے؟''
عمران کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''وہ اسپتال میں ہی ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ اس کا نچلا دھڑ کام نہیں کر رہا۔ بے ہوشی بھی اسی طرح ہے۔''
''اس کی موت کا ذمے دار کون ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
''کک... کیا مطلب؟''
''دیکھو عمران... اگر میری اور اپنی دوستی کا دم بھرتے ہو تو مجھے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ کیا میں توقع رکھوں کہ تم ایسا کرو گے؟''
اس نے پھر ایک طویل سانس لی اور تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ''پوچھو۔''
''اختتامی شو میں نادیہ کو گولی کیسے لگی تھی؟'' میں نے بہت دھیمی آواز میں دریافت کیا۔
اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ ''تو تم نے میری وہ جیکٹ دیکھی ہے جس کی جیب میں سوراخ ہے؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ ''تابش! اس سوراخ سے کچھ ثابت نہیں ہو سکتا... کچھ بھی نہیں۔ اور اس سوراخ کے علاوہ بھی کچھ ثابت نہیں ہو سکتا... بہرحال... تم نے جو اندازہ لگایا ہے... وہ درست ہے۔''
میرے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ میں نے کہنیاں میز

www.pkdigest.com

پرٹیک کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”عمران! تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔“ میری آواز بھرا رہی تھی۔

اس نے میرا کندھا تھاما۔ ”اگر پھنس گئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے لیکن پہلے تم خود کو سنبھالو اور مجھے آرام سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟ تمہارے جسم پر اتنی زیادہ چوٹیں کیسے آئیں؟ کیا کہیں ایکسیڈنٹ ہوا ہے تمہارا؟“

میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا... اور شروع سے ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں نے الماری میں اس کی جیکٹ دیکھی اور پھر پریشان ہو کر چھت پر چلا گیا۔ کیسے گھر میں وہ وارداتیے گھسے اور کس طرح ان سے بچنے کے لیے میں باہر گلی میں آگیا۔ اس سے آگے کے سارے واقعات بھی میں نے عمران کے سامنے بیان کر دیے۔ میں نے اپنی اس حماقت کا اعتراف کیا کہ میں رشید اور گلزار کو میڈم صفورا کے ساتھی سمجھا اور مجھے یہی لگا کہ وہ لوگ نادیہ کو گولی لگنے کے بارے میں سب کچھ جان گئے ہیں۔ میں نے کہا۔

”جب وہ لوگ میرے پیچھے آئے تو میرا یہ یقین پکا ہو گیا کہ وہ عام وارداتیے نہیں بلکہ میڈم کے لوگ ہیں۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں ان کی گاڑی میں ہی فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ہی چوک کے قریب ایکسیڈنٹ ہوا اور مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں لالہ زار اسکیم کے اس گھر میں تھا۔“

عمران نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تابش! یہ سب کچھ تمہاری غلط فہمی کی وجہ سے ہوا لیکن شکر کا مقام یہ ہے کہ گاڑی الٹنے کے باوجود تم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے اور اس سے بھی زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ تم نے ہمت دکھائی اور اس عورت کے موبائل سے مجھے کال کر دی۔ اب تم محفوظ ہو۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم چاہو گے تو ان لوگوں سے بھی بعد میں نمٹ لیں گے۔ ویسے گھر میں سے اقبال کی گھڑی اور میرے دس پندرہ ہزار روپے کے سوا کچھ گیا نہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ تمہارے زخموں کو توجہ کی ضرورت ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بخار بھی بڑھتا جا رہا ہے۔“

میں نے نہایت پریشانی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں عمران! تم نے ابھی اصل بات سنی نہیں ہے۔ میں... تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔ تمہارے لیے بھی اور شاید اپنے لیے بھی۔ میں بہت بدقسمت ثابت ہوا ہوں تمہارے لیے۔“

عمران کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں ابھریں۔ اس نے پیار سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”تابی یار! پلیز خود کو کمپوز کرو۔ جو کچھ بھی ہوا ہے مجھے بتاؤ۔ میں سنوں گا اور میں سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پلیز، بتاؤ۔“

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ زخمی ہونے کے بعد اپنے شدید بخار کے بارے میں بھی اور غشی کی حالت میں کی جانے والی ان باتوں کے بارے میں بھی جنہوں نے رشید، گلزار اور جیرے وغیرہ کو بے طرح چونکایا تھا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ گلزار، چھوٹی اور بڑی میڈم کو جانتا ہے اور اسے یہ بھی پتا ہے کہ میڈم نادیہ گولی لگنے سے شدید زخمی ہو چکی ہے۔ میری باتیں سننے کے بعد وہ تینوں شدید شک میں پڑ گئے ہیں۔ تابندہ نے مجھے خود بتایا ہے کہ رشید اور گلزار بڑی میڈم سے ملنے ائرپورٹ کی طرف گئے ہیں۔ ائرپورٹ سے ان کا مطلب ”لال کوٹھیاں“ ہی ہے۔ یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔

عمران گم صم میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ہمیشہ مسکراتا چہرہ گہری سنجیدگی سے ڈھک گیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی انگلیوں میں جکڑی اور آنکھوں کی نمی نمایاں تر ہو گئی۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”عمران! تم سے کہا تھا نا، مجھ سے نہ چمٹو۔ مجھے رخصت ہو جانے دو۔ میرا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ [illegible] بعد ہو جاتا۔ تم جس طرح کی زندگی جی رہے ہو اس میں میرے جیسے معمولی اور کم فہم بندے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کہ کسی نہ کسی موقع پر میری وجہ سے تم شدید نقصان اٹھاؤ گے۔ اور تم نے اٹھا لیا ہے۔ تم نے اٹھا لیا ہے عمران! سیٹھ سراج جیسے لوگ تو میڈم صفورا کو پہلے ہی شک میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے، اب میرے اقبالی بیان کے بعد ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میڈم صفورا اب چپکی بیٹھی رہے گی۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ وہ تمہیں معاف نہیں کرے گی عمران۔“

عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”شاید ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہم سے ایک اور غلطی ہو چکی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم مجھے راستے میں بتا دیتے تو ہم اس لنکا شاپ میں نہیں آتے۔ چلو اٹھو، جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ جلدی کرو۔“ وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ اس نے میرا بازو تھاما اور مجھے اٹھایا۔

افراتفری کے عالم میں وہ مجھے لے کر اس ریسٹورنٹ سے

باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”ہوا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ شاپ نادیہ کے سینئر گارڈ... اس حرامزادے بختیار کی ہے۔“ وہ بولا۔

اس نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی کے عقب میں کوئی شخص سوزوکی ایف ایکس پارک کر گیا تھا۔ عمران نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور مسلسل بجاتا چلا گیا۔ ریسٹورنٹ کے اندر سے ایک ہٹا کٹا شخص سرعت سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لفافے تھے۔ اس نے ہماری طرف دیکھ کر معذرت کے انداز میں سر ہلایا... ”سوری“ بولا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے صرف ایک لفظ سوری کہہ کر اپنی جان چھڑائی تھی لیکن اس کی غلطی کی قیمت ہمیں کیا دینا تھی؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس شخص کے اندر بیٹھتے اور گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے وہ ہو گیا جس کا اندیشہ کم از کم میرے ذہن میں تو نہیں تھا۔ نیلی وردی والا ایک گارڈ بھاگتا ہوا ریسٹورنٹ کی بیرونی سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا پھر اس نے ہماری گاڑی کی طرف انگلی سیدھی کی۔ اس کے عقب میں دو افراد اور تھے۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ وہ ہمیں پکارتے ہوئے ہماری طرف دوڑے۔ ”رکو... رکو...“ آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔

[illegible] عمران نے دانت پیس کر کہا اور گاڑی کو ریورس کرتا چلا گیا۔ عقب میں ایف ایکس والے نے ابھی اپنی گاڑی پوری طرح ہٹائی نہیں تھی۔ ہماری گاڑی کا پچھلا حصہ اس کی گاڑی کے عقب سے ٹکرایا اور وہ گھوم کر رہ گئی۔ عمران جیسے ایک دم ہی ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کی مہم جو اور خطر پسند فطرت ایک انگڑائی کے ساتھ بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے مہران کار کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ پہیوں نے رگڑ کھا کر طویل احتجاجی آواز نکالی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ریسٹورنٹ سے برآمد ہونے والے سادہ پوش افراد بڑی سرعت سے ایک جیپ میں بیٹھ رہے تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ بختیار وغیرہ کو اطلاع پہنچ گئی ہے۔“ عمران نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

عمران کے کہنے کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ رشید اور گلزار وغیرہ میڈم صفورا تک جا پہنچے ہیں اور انہوں نے مرچ مسالے کے ساتھ سب کچھ میڈم کے گوش گزار کر دیا ہے۔ اس کے بعد میڈم اپنے ہرکاروں کو حرکت میں لے آئی ہے۔

”اب کہاں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے تو ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔“ عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔

جیپ بڑی تیزی سے پیچھے آرہی تھی۔ ڈرائیور نے ہاتھ مسلسل ہارن پر رکھا ہوا تھا۔ عمران نے برق رفتاری سے گاڑی کو دو تین سڑکوں پر موڑا مگر جیپ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے عقب میں رہی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جیپ سوار اس قسم کی کارروائی کے ماہر ہیں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ جیپ کی سواریوں میں بختیار یا شیرا خود بھی شامل ہوں۔

عمران کچھ دیر تک تناؤ میں رہنے کے بعد ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آگیا۔ یوں لگتا تھا کہ ہر قسم کے تفکرات کے بادل یکایک اس کے ذہن سے چھٹ گئے ہیں۔ اس کی جگہ ایک عجیب سے جوش اور توانا انداز نے لے لی تھی۔

”گھبرانا نہیں جگر۔“ اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ”دیکھنا کیا تگنی کا ناچ نچاتا ہوں ان بندروں کو۔“

اور واقعی اگلے تین چار منٹ میں اس نے کمال کی ڈرائیونگ کی۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا لیکن جہاں کہیں رش تھا، وہاں سے بھی عمران گولی کی رفتار سے گزر گیا۔ وہ موت کے کنوئیں کا کھلاڑی تھا۔ نہایت تیز لیکن محفوظ ڈرائیونگ اس کا خاصہ تھی۔ چار پانچ منٹ بعد گاڑی کا عقب نما آئینہ جیپ کی عدم موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ ہم آندھی کی طرح راوی روڈ کے علاقے سے داتا دربار کے ایریا میں پہنچ چکے تھے۔ اپنے عقب سے مطمئن ہونے کے بعد عمران نے گاڑی ایک چھوٹی سڑک پر کھڑی کی۔

وہ جلد از جلد اقبال سے رابطہ کر کے اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اقبال کو... کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں میری نگاہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھے اخبار پر پڑی۔ یہ شام کا اخبار تھا۔ ایک خبر نے میری توجہ کھینچ لی۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر یہ چھوٹی سی خبر تھی۔ ساتھ میں تصویر بھی تھی۔ دراصل یہ تصویر ہی تھی جس نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی کی تصویر تھی۔ اس نے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ پھیلی ہوئی سیاہ داڑھی کے نیچے سے سرخ ٹائی کی ناٹ بھی نظر آرہی تھی۔ خبر میں لکھا تھا... ایڈووکیٹ صدیقی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس کی تین ٹیمیں مصروف تفتیش ہیں۔ ڈی ایس پی جہانگیر۔

نیچے خبر کے متن میں درج تھا۔ آج پانچ دن گزرنے کے باوجود ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کی پراسرار گمشدگی کا معما حل نہیں ہوا۔ جہلم میں اپنے ایک گارڈ کی ہلاکت کے بعد ابرار صدیقی اپنے فلیٹ سے غائب پائے گئے تھے۔ یاد رہے کہ ابرار صدیقی ایک معروف قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ

www.pkdigest.com

نوادرات میں زبردست دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں "نوادر چوروں" نے ہی نشانہ بنایا ہے۔ پولیس نے اس سلسلے میں معروف اسٹیٹ ڈویلپر میڈم صفورا شیرازی سے پوچھ گچھ کی ہے۔ مزید تفصیلات منظر عام پر آنے کا امکان ہے۔

اس خبر نے مجھے حیران کیا۔ عمران نے مجھے ابھی تک اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ شاید اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ چند دن پہلے عمران نے مجھے، بے فکری سے نادیہ کی عیادت کے لیے کیوں بلا لیا تھا۔ اسے یہ خطرہ محسوس کیوں نہیں ہوا تھا کہ صدیقی مجھے یا اسے وہاں پہچان سکتا ہے۔ دراصل وہاں اسپتال میں صدیقی کے موجود ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔

عمران سیل فون پر اقبال سے رابطہ قائم نہیں کر سکا۔ اس نے جھنجلا کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی نابنجار عورت بول رہی ہے جس نے ایک خلقت کا جینا حرام کر رکھا ہے... آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب نہیں مل رہا۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کریں... مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی ٹی وی چینلز کی طرح یہ موبائل نیٹ ورک والے بھی وقفہ کرنے لگے ہیں۔ ملتے ہیں ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد۔ کہیں جائیے گا نہیں۔ ہمارے ساتھ رہیے گا۔ بس ایک چھوٹا سا بریک... بس ایک چھوٹا سا۔ یار! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہر ٹی وی چینل پر بھک منگے بیٹھے ہیں اور عوام سے ایک چھوٹے سے بریک کے لیے منتیں کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ اپنے تایا جی نیوز چینل چلاتے ہیں۔ وہ بھی اٹھتے بیٹھتے بس چھوٹے سے بریک کے بارے میں سوچتے ہیں۔ بریک کیسے کیا جائے؟ کہاں کیا جائے؟ اور کتنی دیر کا ہو؟ اپنے بیٹوں کو ہر وقت اسی موضوع پر لیکچر دیتے نظر آتے ہیں.... بقر عید پر پتا ہے کیا ہوا؟"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ وقت گزاری کر رہا ہے۔

وہ بولا۔ "تایا جی نے چالیس ہزار کا بکرا لیا۔ قربانی کے وقت بیٹوں نے بکرے کو گرا کر دبوچا۔ تایا جی نے چھری گردن پر رکھی۔ ذرا سی چھری چلائی اور ایک دم رک گئے۔ بولے... تو یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک۔"

"وہ بکرے کو تڑپتا چھوڑ کر پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اطمینان سے چائے پینے لگے۔ بیٹے بولے 'ابا جی! بکرا تڑپ رہا ہے۔' فرمانے لگے۔ 'اسے تڑپنے دو۔ اس منظر کو غور سے دیکھو اور پروگرام میں "بریک" کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔' سکون سے چائے پینے کے بعد انہوں نے دوبارہ چھری چلائی اور بکرے کی مشکل آسان ہوئی۔ بعد میں محلے کے مولوی صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے خوب لعنت ملامت کی اور تایا جی کو خوش خبری سنائی کہ ان کی قربانی ضائع ہو گئی ہے۔ اگر وہ..."

یکایک عمران ٹھٹک کر چپ ہو گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور میرے جسم میں بجلی سنسنی سی دوڑ گئی۔ اچانک ہی ایک گلی میں سے وہی منحوس جیپ برآمد ہوئی... جس نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی جیپ کے ساتھ ہے۔

"لو جگر! تمہارے سسرالی پھر آ گئے۔" عمران نے کہا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔ ایک بغلی سڑک پر مڑتے ہوئے گاڑی کے ٹائروں نے تارکول سے رگڑ کھا کر زبردست شور مچایا۔ اردگرد کے لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک اندھا دھند ریس پھر شروع ہو گئی۔ عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے عمران کی آنکھوں میں عقابی چمک ابھر آئی تھی۔ مینارِ پاکستان سے آگے نکل کر جب ہم راوی کے پل کی طرف بڑھ رہے تھے، یکایک سائڈ سے ایک اٹھانوے ماڈل مرسیڈیز برآمد ہوئی۔ مرسیڈیز والے نے بڑے خطرناک طریقے سے ہمارا راستہ روکنا چاہا۔ دونوں گاڑیاں لہراتی ہوئی کچے میں اتر گئیں۔ ہر طرف دھول پھیل گئی۔ عمران نے مشاقی سے اپنی گاڑی کو نشیب میں لڑھکنے سے بچایا اور مرسیڈیز کو پیچھا دے کر پھر سے سڑک پر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں فائر کی آواز گونجی۔ یہ فائر مرسیڈیز سے کیا گیا تھا اور یقیناً ہمیں نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ گولی گاڑی کی باڈی میں کہیں لگی۔ پھر ایک اور فائر ہوا لیکن یہ بالکل خطا گیا۔ بغیر ٹول ٹیکس ادا کیے ہماری گاڑی طوفانی رفتار سے راوی کے پل سے گزری اور جی ٹی روڈ پر پہنچ گئی۔ تب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ جیپ سمیت کم از کم چار گاڑیاں ہمارے پیچھے آ رہی ہیں۔ شاید تعاقب کرنے والوں نے سیلولر رابطے کے ذریعے شہر میں موجود اپنے مزید ساتھیوں کو تعاقب میں شامل کر لیا تھا۔ صورتِ حال ایک دم ہی نہایت خطرناک ہو گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بدستور بے فکری رقصاں تھی۔

"معاملہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" اس نے کہا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

نغمہ گونجنے لگا۔ جیون چلنے کا نام، چلتے رہو صبح و شام۔

"اگر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم انہیں پھول ماریں گے اور دیکھنا وہ بڑے سخت پھول ہوں گے۔" اس نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور کپڑے میں لپٹا ہوا ماؤزر نکال کر گود میں رکھ لیا۔ ماؤزر کی جھلک نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میرا دل کہنے لگا کہ یہ ابر آلود رات بڑی سنگین ثابت ہونے والی ہے۔

میرا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ گردن اور سر کے پچھلے حصے سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تاہم ان ٹیسوں کی تکلیف، حالات کی سنگینی میں دب سی گئی۔

عقب والی گاڑیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہنڈا اب سب سے آگے تھی۔ یہ سرخ ہنڈا تھی۔ میں نے پہچان لیا، یہ وہی گاڑی تھی جس میں نادیہ ہمارے راوی روڈ والے گھر پر آتی رہی تھی۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہمارے عقب میں میڈم کے لوگ ہی تھے۔ تب اچانک عمران کے موبائل کی بیل ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اقبال نے "کال بیک" کیا ہے مگر دوسری طرف سے جو آواز ابھری وہ سیٹھ سراج کی تھی۔ اس نے آتشیں لہجے میں کہا۔ "عمران! گڈی روک دے بچے۔ نہیں تے نقصان ہووے گا تیرا۔ شاباش روک دے گڈی۔"

"گڈی نہیں رکے گی چودھری چچو۔ اگر تم نے واقعی اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"عمران!... تو یوں سے چھلنی کر دیں گے۔ لاش بھی نہیں پہچانی جائے گی۔ روک دے۔"

سرخ ہنڈا کار تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سراج اسی گاڑی سے بول رہا ہے۔ عمران نے اچانک گاڑی کو بائیں طرف ایک چھوٹی سڑک پر اتار دیا۔ عقب میں آنے والی دو گاڑیاں تو اپنی جھونک میں کچھ آگے نکل گئیں تاہم دو گاڑیوں کے بریک بروقت چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے پیچھے آ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کا ایک فائر ہوا اور گولی چھناکے سے ہماری گاڑی کی پچھلی اسکرین کو توڑ کر ایک دروازے میں گھس گئی۔

"اپنا سر نیچے رکھو تابی۔" عمران نے کہا اور خود بھی جھک گیا۔

اس کے بعد ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ماؤزر کھڑکی سے باہر نکالا اور سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے جیپ پر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے... یہ بے مثال نشانہ تھا اور بڑے اعتماد سے لگایا گیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جیپ کا اگلا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بری طرح ڈگمگائیں پھر میں نے اسے کھیتوں میں اترتے اور ایک سائڈ پر الٹتے ہوئے دیکھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش واقعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ کھیتوں کھلیانوں اور درختوں کے درمیان نیم پختہ راستوں پر ہماری گاڑی برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور اس کے عقب میں چار گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں میں ہمارے اندازے کے مطابق کم و بیش بیس بائیس مسلح افراد بھرے ہوئے تھے۔ راستے میں گاہے بگاہے فائرنگ بھی ہوتی رہی تھی۔ یہ سب کچھ کسی خوفناک ایکشن فلم جیسا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کا غیظ و غضب دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ اسپتال میں نادیہ دم توڑ چکی ہے... راستے میں ہونے والی فائرنگ سے ہماری گاڑی کی دو کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ پچھلی اسکرین بھی ناپید ہو گئی تھی۔ باڈی میں ڈیڑھ دو درجن سوراخ ہو چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ابھی تک کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عمران اپنے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو ایک خاص سمت میں لے کر جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی پلان تھا۔ اس نے راستے میں ایک بار اپنے کسی ساتھی کو مختصر فون بھی کیا تھا۔

ہم اینٹوں سے بنی ہوئی ایک نیم پختہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ گندم اور چارے کے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹے سے موڑ پر عمران کا ایک اور نشانہ کارگر ثابت ہوا۔ آگے آنے والی سفید گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اس کے رکنے سے پیچھے آنے والی گاڑیوں کو بھی رکنا پڑا۔ یوں ہمیں ایک سنہری موقع ملا کہ ہم پیچھے آنے والی گاڑیوں سے اپنا درمیانی فاصلہ بڑھا سکیں۔ عمران نے مہران کی رفتار کو حتی الامکان حد تک پہنچا دیا۔ گاڑی ایک ایک فٹ اچھل رہی تھی۔ میں نے خود کو مضبوطی سے نشست کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی اچھلی تو ڈیش بورڈ کھل گیا اور اس میں سے کچھ کاغذ نیچے گرے۔ ان میں ایک ڈائری نما چیز بھی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یہ کوئی "پنج سورہ" ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ آنے والے دنوں میں یہ ڈائری میرے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی تھی، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہم نے کھیتوں کے درمیان قریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ بڑی سرعت سے طے کیا اور ایک ڈیک نالے کے کنارے پہنچ گئے۔ عمران نے گاڑی کو عین کنارے پر روکا اور میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ اس کی جانی پہچانی ہے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ صورتِ حال تسلی بخش تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والی گاڑیاں اب بھی کم و بیش دو کلو میٹر دور تھیں۔ شیشم اور کیکر کے درختوں کے بیچ سے ان کی ڈگمگاتی روشنیاں دکھائی دے

رہی تھیں۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی، سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈیک نالے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی پہاڑی نالا ہو۔ میں نے بہ غور دیکھا۔ نالے کے قریباً 100 میٹر چوڑے پاٹ کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوڑی پختہ پٹی ایک پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جیسے ایک لکیری اس کنارے سے دوسرے کنارے تک چلی گئی ہو۔ اس کے نیچے قریباً بیس فٹ کی گہرائی میں ڈیک نالے کا پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ پٹی دراصل لوہے کے تین پائپ تھے جو ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ گیس یا پانی کی سپلائی ہے یا کوئی اور چیز۔

عمران نے گاڑی میں سے ماؤزر، گولیاں اور دو چار ضروری اشیا نکالیں پھر کنارے سے اتر کر اس آہنی پٹی پر پاؤں دھرا اور چند قدم چل کر دیکھا۔ اس کے بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ ”چلو شہزادے ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔“

”اس پر چل کر دوسری طرف جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل... لوگ یہاں سے اکثر گزر جاتے ہیں۔ یہ بالکل آسان ہے۔“

”مگر اندھیرا ہے یار... اور ہوا بھی...“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! بس تھوڑی سی ہمت۔ چلو پہلے میں جاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ قدرے دونوں طرف پھیلا لیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریباً پون فاصلہ طے کر گیا۔ تب وہ میری طرف مڑا اور پکار کر بولا۔ ”چلو آ جاؤ... بس سیدھا دیکھتے رہو۔ نیچے پانی کو نہیں دیکھنا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بیٹھ جانا۔ چلو شاباش...“

دوسرے کنارے پر کسی گاڑی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمران ہی کا کوئی ساتھی ہے جو ہمیں ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ عمران نے پھر مجھے پکارا۔ میں نے دل کڑا کر کے پائپوں پر قدم رکھا۔ میرا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ سردی کے باوجود میں نے اپنی پیشانی پر پسینا محسوس کیا۔ ایک دم میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ میں یہ پل صراط عبور نہیں کر سکوں گا اور میرے ایسا نہ کرنے سے آج یہاں کوئی بڑا سانحہ رونما ہو جائے گا۔ عقب میں متعاقب گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔ ”کیا کر رہے ہو تابی! جلدی کرو۔ وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔“ میں نے ایک بار پھر اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو جمع کیا... آگے بڑھنا چاہا مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ جسم جیسے پتھرا کر رہ گیا تھا۔ عمران عجب بے چارگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تب وہ واپس پلٹا۔ یہی وقت تھا جب عقب میں آنے والی ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹ ڈیک نالے کے کنارے کو روشن کرنے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ”کیا کر رہے ہو تابی! وہ آ گئے ہیں۔ ہمت کرو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ مشکل نہیں ہے۔“ میں اپنے آپ کا کیا کرتا؟ گزرے ہوئے ماہ و سال میں، میں نے کہاں کہاں خود سے کہا تھا۔ یہ مشکل نہیں ہے... یہ مشکل نہیں ہے تابش! تم یہ کر سکتے ہو۔ تھوڑی سی ہمت کرو۔ قدرت نے تمہیں بھی دو ہاتھ، دو پاؤں دیے ہیں۔ صحت مند جسم دیا ہے۔ پھر تم وہ کیوں نہیں کر سکتے جو کرنا چاہتے ہو؟ کیوں ہر دشوار گھڑی میں پسپائی تمہارا مقدر ہوتی ہے؟ تم اپنا حق کیوں نہیں مانگ سکتے؟ کسی غاصب کا گریبان کیوں نہیں پکڑ سکتے؟ کسی جابر کا پنجہ کیوں نہیں مروڑ سکتے؟ تم آزمائشوں کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیتے ہو؟ کتنی بار یہ سوال میں نے خود سے پوچھے تھے اور کتنی بار بے چارگی کے پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ آج اس پُرآشوب رات میں، اس شور مچاتے پانی کے کنارے میں ایک بار پھر اسی بے چارگی و ناتوانی کا شکار تھا... اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تھا ہی ایسا... اور میں اکیلا نہیں تھا۔ شاید مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں بلکہ لاتعداد لوگ تھے جو غیر معمولی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ جو عام تھے اور شاید عام سے بھی کچھ کم... ان سب کا کیا قصور تھا؟ شاید وہ سب میری طرح خود کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے مگر بدل نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے اسیر تھے۔

”عمران! میں یہ نہیں کر سکتا۔“ میں کراہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

گاڑیاں بالکل کنارے پر پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس نالے کے ایک طرف کے کنارے کو روشن کر رہی تھیں۔ یہاں تیز ہوا میں لہلہاتے سرکنڈے بھوتوں کے رقص کا منظر پیش کرتے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کی وحشی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

عمران ایک جان لیوا دوراہے پر تھا۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا... اور اب واپس میری طرف آنا بھی اس کے لیے ازحد خطرناک تھا مگر وہ انوکھا تھا۔ اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا تھا اور اس فولادی دل میں محبت کا سمندر ہلکورے لیتا تھا۔ وہ واپس میری طرف آیا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا... اسے نہیں آنا چاہیے تھا...

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

سہیلی

مریم کے خان

خوش اطواری ..... خوش گفتاری، باہمی تعلقات کو استوار کرنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں ..... خصوصاً لڑکپن دور کی دوستی اور دوست بھلائے نہیں بھولتے ..... وہ بچھڑ بھی جائیں تو ان کی یادیں ذہن و دل کو معطر رکھتی ہیں ..... ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی جسے اپنے بچپن کے دوست ہمہ وقت یاد تھے اور ان کی فرقت اس کے اضطراب و بے قراری کو مسلسل بڑھا رہی تھی .....

درد و کرب کی گرفت میں مقید دوستوں کا فسوں خیز ماجرا

وہ اس کمرے میں بیٹھی سادہ کاغذ پر سیاہ پنسل سے نقوش بناتی رہتی..... دن رات چوبیس گھنٹے اس کی یہی مصروفیت تھی۔ اسے کھانے پینے اور دوسری حاجات سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ اس کی تمام ضرورتوں کا خیال دوسرے رکھتے تھے۔ وہ گزشتہ بارہ برس سے اس کمرے میں موجود تھی۔ دن میں صرف ایک بار کچھ دیر کے لیے اسے یہاں سے نکال کر کھلی فضا میں لے جایا جاتا..... لیکن اس کے لیے کھلی فضا اور یہ بند کمرا ایک جیسے تھے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا

تھا۔ کیونکہ وہ ذہنی طور پر مفلوج تھی۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت برسوں پہلے ختم ہو چکی تھی۔

لیکن یہ دوسروں کا خیال تھا، وہ سوچنے سمجھنے سے بالکل عاری نہیں تھی۔ اس کے اندر خیالات کی ایک دنیا آباد تھی۔ یہ خیالات اسے بے قرار رکھتے۔ اسے اپنا ماضی یاد تھا۔ وہ دس برس کی تھی جب یہاں آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ نارمل بچی کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی جو صرف اس کی تھی اور اس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ وہ وقت بہت اچھا تھا۔ وہ اور اس کی سہیلی ایک دوسرے کے لیے مخصوص تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا؟ دوسرے بچے بھی آ گئے اور سہیلی صرف اس کی نہیں رہی۔ دوسروں نے اسے چھین لیا۔ سہیلی اس کے ساتھ بھی کھیلتی تھی لیکن اسے آدھی ادھوری رفاقت نہیں چاہیے تھی۔ وہ اندر سے جلتی کڑھتی۔ اس نے سہیلی کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ اسے بلانے آتی تو... وہ اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔ اسے مکمل سہیلی درکار تھی۔

پھر اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دن سہیلی اسے بلا کر لے گئی اور اس نے دوسروں کے ساتھ مل کر اس کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلا۔ سہیلی نے اس کی تذلیل کی۔ دوسروں کے ساتھ مل کر اسے بے وقوف بنایا اور پھر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ بہت روئی اور پھر اسے دورہ سا پڑ گیا۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا لیکن اس کے بعد وہ یہاں آ گئی اور تب سے یہیں تھی۔ بارہ برس سے وہ یہاں تھی اور اپنے ماضی کے بارے میں سوچتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ سہیلی سے بدلہ لے۔ اس نے جن دوستوں کی خاطر اسے چھوڑا، وہ ان کو سہیلی سے چھین لے۔ جیسے جیسے وہ اس پر سوچتی اس کا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔ یہی انصاف ہوتا۔ جان... کا بدلہ جان اور دوست کا بدلہ دوست۔

لیکن ایسا کرنے کے لیے یہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ وہ یہاں سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اسے اجازت نہیں تھی۔ پھر ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا! اسے یہاں سے نکلنا تھا اور اپنا بدلہ لینا تھا۔ تب ہی اسے سکون مل سکتا تھا۔ اس نے یہاں سے نکلنے کا طریقہ بھی سوچ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کوئی اسے روک نہیں سکے گا اور وہ اپنا انتقام لے سکے گی۔

☆☆☆

وہ تعداد میں چھ تھے۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ ان میں میرین اور جیسن بہن بھائی تھے اور باقی میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی کہ وہ بچپن کے دوست تھے۔ اور ان کی دوستی آج تک برقرار تھی۔ وہ سب کالج میں پڑھتے تھے۔ ان میں جانز کالج میں پڑھنے کے ساتھ اپنی ورکشاپ بھی چلاتا تھا جس میں وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ رائٹ آئی ٹی میں گریجویشن کر رہا تھا۔ مارلین بھی گریجویشن کر رہی تھی۔ میرین نے کامرس کا انتخاب کیا تھا اور جیسن انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ ایلزبام فائن آرٹ کی طالبہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ سب الگ تھے لیکن دوستی کا بندھن سب سے بالاتر تھا۔ اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے ہٹ کر ان کا تقریباً تمام وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا تھا۔

بچپن کی دوستی جوانی کی حدود میں داخل ہوئی تو بعض کے جذبات ایک دوسروں کے لیے بدل گئے۔ میرین، رائٹ کو پسند کرتی تھی اور جانز مارلین کو چاہتا تھا۔ البتہ جیسن اور ایلز کا معاملہ کچھ ڈانواں ڈول تھا ان کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ میرین کو یقین تھا کہ اس کا بھائی ایلز سے محبت کرتا ہے لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کرتا۔ یہی حال ایلز کا تھا وہ منہ پھٹ اور شرارتی لڑکی تھی اور کسی کے سامنے جھک جانا اسے گوارا نہیں تھا۔

شام کو وہ لازمی کہیں جمع ہوتے تھے۔ عام طور سے ان کی بیٹھک ایلز کے گھر ہوتی تھی۔ اس کا باپ رچرڈ اس علاقے کا شیرف تھا۔ وہ سخت گیر آدمی تھا لیکن ان لوگوں سے شفقت [illegible] کے دوست [illegible] ایک حد اور اعتدال میں رہ کر کرتے تھے۔

اس شام وہ میرین اور جیسن کے گھر جمع ہوئے..... ان کا باپ بروک ایک دولت مند شخص تھا.... اور اس نے قبرستان کے پاس ہی یہ عالی شان ولا بنوایا تھا۔ یہ جگہ بہت... پرسکون تھی۔ بروک کو شراب نوشی پسند نہیں تھی اس لیے وہ سب سے چھپ کر بیئر لائے تھے اور جیسن کے کمرے میں جمع ہو کر پارٹی رہے تھے۔ جانز کچھ سوچ رہا تھا اور مارلین اس سے جڑ کر بیٹھی تھی۔ میرین نے جانز کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے تم چپ سے ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

جیسن نے مذاق اڑایا۔ ''بغیر دماغ کے۔''

جانز نے اسے گھورا۔ ''بکو مت... میں سوچ رہا ہوں بہت دنوں سے کوئی ٹوئسٹ نہیں ہوا۔''

ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایلز بولی۔ ''ہاں واقعی... بہت دن سے کوئی ٹوئسٹ نہیں ہوا ہے۔''

''تب کیا کریں؟'' جیسن نے پوچھا۔

''سوچتے ہیں۔'' جانز نے کہا۔ ''تم لوگ بھی سوچو۔''

رائٹ کھڑکی کے پاس بیٹھا بیئر پی رہا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے دور تک قبرستان پھیلا ہوا تھا۔ اسے یاد تھا آج سے کوئی چودہ سال پہلے جب وہ یہاں آئے تھے تو یہ قبرستان اتنا بڑا نہیں تھا لیکن اس تمام عرصے میں یہ خاصا وسیع ہو چکا تھا۔

میرین رائٹ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

رائٹ چونکا پھر اس نے کہا۔ ''بھوت کا پیچھا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ سب رائٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بھوت کا پیچھا نامی کھیل وہ بچپن میں کھیلتے تھے۔ جب قبرستان کے گرد دیوار نہیں تھی اور وہ آرام سے اس کے اندر چلے جاتے تھے۔ پھر ٹاس کے ذریعے ان میں سے کوئی ایک بھوت بنتا اور باقی سب چھپ جاتے۔ بھوت ان کا پیچھا کر کے ان کو بے خبری میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ جسے وہ پکڑ لیتا، اس کی جگہ اسے بھوت بننا پڑتا۔ لیکن یہ کھیل تو ان کے بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ آخری بار شاید انہوں نے دس سال پہلے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے قبرستان جانا چھوڑ دیا تھا۔

جانز ہچکچایا۔ ''یار یہ تو بچپن کا کھیل تھا۔''

[illegible] ہو گئے ہیں... بچپن کے کھیل تو کسی وقت بھی کھیلے جا سکتے ہیں۔''

''ہاں خیال تو اچھا ہے۔'' میرین بولی۔

مارلین طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''ہاں کیونکہ رائٹ نے پیش کیا ہے۔''

''بکو مت۔'' میرین نے منہ بنایا۔

''لڑو مت، ایسا کرتے ہیں ووٹ کر لیتے ہیں۔'' رائٹ بولا۔ ''جو اس کے حق میں ہے، وہ ہاتھ اٹھا دے۔''

میرین، رائٹ، ایلز اور جیسن نے ہاتھ اٹھا دیے۔ مارلین اور جانز نے نہیں اٹھائے۔ اس بار میرین نے طنزیہ نظروں سے مارلین کی طرف دیکھا۔ ''وہ تو تم نے اس لیے ہاتھ نہیں اٹھایا کہ جانز نے بھی نہیں اٹھایا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے یہ سب احمقانہ لگ رہا ہے۔''

''ٹوئسٹ احمقانہ ہی ہوتا ہے۔'' جیسن بولا۔ ''تو طے ہوا کہ ہمیں بھوت کا پیچھا کھیلنا ہے۔''

''ہاں۔'' ایلز چلائی۔ ''اور ابھی کھیلنا ہے۔''

وہ سب پُرجوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں جانز اور

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں [illegible] صفحات پر [illegible] اسلامی طریقے کے مطابق [illegible]

مارلین بھی اپنی مخالفت بھول کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے..... میرین نے ان کو یاد دلایا۔ ''قبرستان جانے کے لیے دور سے گھوم کر جانا ہو گا۔''

''کوئی بات نہیں، ہم گاڑی میں جائیں گے۔''

رائٹ کے پاس ایک اسپورٹس کار تھی۔ جیسن کے پاس طاقت ور بائیک تھی۔ وہ سب رائٹ کی کار اور جیسن کی بائیک پر سوار ہو کر قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیسن کے ساتھ ایلز تھی۔ وہ گھوم کر قبرستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ چرچ سے دور رہیں۔ ورنہ ان کی ہنگامہ آرائی سن کر کوئی آ سکتا تھا۔ انہوں نے پرانے حصے کا انتخاب کیا کیونکہ وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ رائٹ نے ڈکی سے بیئر کا نیا کارٹن نکال لیا..... انہوں نے اس میں سے بوتلیں لیں اور شور مچاتے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ یہاں چاروں طرف قبریں تھیں اور ان میں سے بیشتر کے کتبے بہت اونچے تھے یعنی وہاں چھپنے کی اچھی گنجائش تھی۔ اس کے علاوہ بے شمار درخت اور کئی جگہیں اونچی نیچی تھیں۔ جانز جو شروع میں مخالف تھا اب سب سے زیادہ پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب مزہ آئے گا۔''

''بھوت کون بنے گا؟'' میرین نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، ٹاس کیسے ہو گا؟''

مارلین نے تجویز دی۔ ''جو سب سے آخر میں بوتل ختم کرے گا وہی بھوت بنے گا۔''

رائٹ نے اون تو تھری کہا اور انہوں نے جلدی جلدی بیئر حلق سے اتارنی شروع کر دی۔ سب سے پہلے رائٹ نے ختم کی... پھر مارلین نے اور سب سے آخر میں جیسن نے ختم کی۔ ''یہ رہا آج کا پہلا بھوت۔'' جانز نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''تو کھیل شروع کریں؟'' میرین بولی۔

''ہاں۔'' جانز نے کہا۔ ''سب آ جاؤ۔''

وہ ایک دائرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور گانا شروع کر دیا۔ ''ایک، دو، تین... میرا

بھوت مل گیا، چار، پانچ، چھ، سات... یہ ہمیں ڈھونڈے گا، آٹھ نو، دس... جسے پکڑا وہ بھوت بنے گا۔“

اس سے پہلے وہ سب بھاگتے، ایک آواز آئی۔ ”کیا میں بھی کھیل سکتی ہوں؟“ وہ سب چونک گئے۔ وہ نوجوان لڑکی ایک قبر کے کتبے کے پیچھے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ ڈر ہی گئے کیونکہ قبرستان میں تھے۔

”تم کون ہو؟“ میرین نے پوچھا۔

”میں یہیں رہتی ہوں۔“ اس نے ذرا دور واقع چرچ کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کتبے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئی... اس نے نیلے رنگ کا فراک پہن رکھا تھا جو... بہ مشکل اس کی سڈول رانوں تک آرہا تھا۔ وہ خاصی خوش شکل لڑکی تھی خاص طور سے اس کی بڑی آنکھیں متاثر کرتی تھیں۔ ”ایسے ہی گھومنے کے لیے باہر نکلی تھی تم لوگوں کو دیکھا۔ میں بھی بچپن میں یہ کھیل کھیلتی تھی۔“

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سب کی رضامندی پاکر رائٹ نے سر ہلا دیا۔ ”آجاؤ۔“

لڑکی خوش ہوگئی اور ان کے ساتھ دائرے میں شامل ہوگئی۔ انہوں نے ایک بار پھر جوش و خروش سے گانا شروع کیا۔ وہ جیسے جیسے گا رہے تھے ان کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی۔ پھر آخری جملہ ادا کرتے ہی وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور جیسن نے بلند آواز سے گنتی گننا شروع کردی۔ دس کہتے ہی وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ جیسن نے دس کہا اور چلّایا۔

”ہو ہو ہو میں بھوت ہوں... بچو مجھ سے میں آرہا ہوں۔“

وہ سب شور مچاتے اور چیختے چلّاتے بھاگ رہے تھے اور مختلف جگہوں پر چھپ رہے تھے۔ مقصد چھپنے سے زیادہ اس کھیل سے لطف اندوز ہونا تھا۔ جیسن نے ایک منٹ میں ایک کتبے کے پیچھے چھپی مارلین کو تلاش کرلیا اور اسے اچانک پیچھے سے جاکر ہاتھ مارا تو وہ اچھل پڑی... جیسن چلّایا۔ ”میں نے پکڑلیا اب مارلین بھوت بنے گی۔“

مارلین گنتی گننے لگی اور جیسن بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سب مختلف جگہوں پر چھپتے پھر رہے تھے۔ مارلین انہیں تلاش کرنے لگی کچھ دیر بعد اس نے جانز کو پکڑلیا بلکہ جانز نے اسے پکڑ کر ایک کتبے کی آڑ میں کھینچ لیا تھا۔ اچانک میرین نے جھانک کر شرارت سے کہا۔

”اچھا تو کوئی اور کھیل کھیلا جارہا ہے۔“

مارلین اور جانز جھینپ کر الگ ہوگئے۔ پھر جانز کسی کو تلاش کرنے لگا اور اس نے میرین کو پکڑلیا۔ جب میرین نے دس تک گنتی مکمل کی تو اس نے نئی لڑکی کو ایک طرف جاتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکی اور عقب سے پکارا۔ ”اے میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔“

وہ بھاگتے بھاگتے رکی اور سر گھما کر کہا۔ ”اچھا تو پکڑلو۔“

میرین اس کے پیچھے لپکی۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک بلند پشتے پر چڑھ گئی اور اس کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ میرین رک گئی۔ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔ ”آؤ مجھے پکڑلو... کبھی تم مجھے آسانی سے پکڑ لیا کرتی تھیں۔“

میرین نے اسے الجھی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟“

لڑکی بہت سنجیدہ تھی۔ ”میرین! مجھے پہچانو۔“

میرین اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ قبرستان میں جابجا کھمبوں پر بلب جل رہے تھے اور وہ خندق کے کنارے کھڑی صاف نظر آرہی تھی۔ مگر میرین اسے نہیں پہچان سکی... اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”نہیں میں تمہیں پہچان نہیں سکی۔“

لڑکی افسردہ ہوگئی۔ ”پھر میرے جینے کا فائدہ؟“

لڑکی کی آنکھیں اچانک اوپر ہوگئیں، اس کا ڈیلا سفید ہوگیا اور وہ خندق میں گر گئی۔ میرین نے چیخ ماری اور خندق کے کنارے کی طرف لپکی۔ اس کا خیال تھا کہ خندق بہت گہری ہوگی لیکن جب وہ اس کے کنارے پہنچی اور نیچے جھانکا تو وہ بہ مشکل ... دو گز ... نیچے نظر آئی ... لڑکی کا کہیں پتا نہیں تھا ... دور تک صاف میدان پھیلا ہوا تھا۔ لڑکی کسی صورت اتنی جلدی غائب نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کی چیخ سن کر باقی سب بھی بھاگے آئے۔ رائٹ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”کیا ہوا؟“

مارلین نے پوچھا۔ ”تم نے چیخ کیوں ماری تھی؟“

”وہ لڑکی یہاں سے نیچے کودگئی اور جب میں آئی تو وہ یہاں نہیں تھی۔“ میرین بولی اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کون، وہی نئی لڑکی؟“ جانز نے بے یقینی سے کہا۔

میرین نے سر ہلایا۔ ”ہاں وہ نیچے گر گئی تھی۔“

ایلز نے نیچے جھانکا۔ ”پھر وہ کہاں گئی؟“

”مجھے نہیں معلوم... اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے پہچانوں لیکن میں اسے نہیں پہچان سکی۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور پھر وہ پشت کے بل گر گئی۔“

رائٹ ہنسا۔ ”تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو؟“

”اور کیا اس نے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔“ جیسن نے رائٹ کی حمایت کی۔

”اس نے کوشش نہیں کی بلکہ کامیاب رہی۔“ مارلین

ہنسی۔ ”وہ ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے آئی تھی۔“

لیکن میرین سنجیدہ تھی۔ اس کے کانوں میں لڑکی کی باتیں گونج رہی تھیں پھر آخر میں اس کا جیسا رویہ ہوگیا تھا وہ بھی میرین کو کھٹک رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر رائٹ سے کہا۔ ”یہاں سے چلو۔“

”کم آن میرین۔“ ایلز بولی۔ ”ابھی تو گیم شروع ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم لوگ کھیلو میں جارہی ہوں۔“ میرین نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ باقی سب تو رکے رہے لیکن رائٹ آوازیں دیتا اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے قریب آکر کہا۔

”میرین کیا ہوا، کیا تم ڈر گئی ہو؟“

”تم جو چاہے سمجھو لیکن اب میں یہاں نہیں رک سکتی۔“ میرین نے کہا۔ ”تم لوگ کھیل جاری رکھو، میں باہر تمہارا انتظار کروں گی۔“

رائٹ نے کہا۔ ”اوکے، تم اکیلی نہیں جاؤ گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“

وہ دونوں باہر آگئے اور کچھ دیر میں باقی بھی بدمزہ ہوکر ..... اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

”تم کیا سمجھتی تھیں...“ لڑکی اس سے کہہ رہی تھی۔ ”کیا تم مجھے اتنی آسانی سے چھوڑ دو گی؟“

”میں ... تمہیں ... نہیں جانتی۔“ میرین نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

”اب تم مجھے بھول چکی ہو۔“ وہ ہنسی۔ ”لیکن بہت جلد میں تم کو سب یاد دلادوں گی۔“

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“ میرین نے بے بسی سے کہا۔

لڑکی ہنسی اور پھر اس کی ہنسی بھیانک ہوتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھ کر سفید ہوگئیں اور صورت بگڑ کر..... خوفناک ہوگئی۔ میرین کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نزدیک رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ میرین نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”کیا وہ میرے ذہن پر اتنی زیادہ سوار ہوگئی ہے؟“

رات ابھی تاریک تھی اور صبح ہونے میں وقت تھا۔ قبرستان سے آنے کے بعد اگلے دن اس نے ان سب کو لڑکی سے ہونے والی پوری گفتگو سنائی تھی۔ مگر ان سب کا یہی خیال تھا کہ لڑکی کہیں پاس سے آئی تھی اور اس نے ان کو بے وقوف بنایا تھا اس لیے اس پر زیادہ توجہ دینا فضول سی بات

خوش گمانی

بھارتی فوج کا ایک یونٹ جنگی مشقیں کررہا تھا۔ میدان میں کچھ دور مختلف نشانات پر مشتمل بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر جوان فائر کررہے تھے۔ اسی اثنا میں تیز ہوا چلی اور بورڈوں کو اڑا کر لے گئی۔ فائرنگ کرنے والوں نے سوالیہ انداز میں کمانڈر کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

”فائرنگ کرتے رہو بے وقوفو!“ کمانڈر چلّایا ”اس وقت دشمن بھاگ رہا ہے۔“

ہے مگر میرین کو لگ رہا تھا کہ یہ سب مذاق نہیں بلکہ اس کی تہ میں سنجیدگی تھی۔

اگلی صبح جیسن نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ ”آج ایلز کے ہاں جانا ہے۔“

”میرا موڈ نہیں ہو رہا۔“ اس نے کسلمندی سے کہا۔

”چلو۔“ جیسن نے اصرار کیا۔ ”موڈ خود ٹھیک ہو جائے گا۔“

میرین بستر پر بیٹھ گئی۔ ”جیسن! تمہارا کیا خیال ہے، وہ لڑکی مجھے اس طرح کیوں ملی تھی؟“

”وہ لڑکی ابھی تک تمہارے ذہن پر سوار ہے؟“ جیسن نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”تو یہ وجہ ہے تمہارا موڈ نہ ہونے کی؟“

”شاید۔“ اس نے جواب دیا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ جیسن چلا گیا۔ میرین اٹھ کر نیچے آئی اور ناشتا کر کے کافی کا مگ لے کر ٹیرس پر آگئی.... سامنے قبرستان تھا۔ سرسبز درختوں کے درمیان سے قبریں صاف نظر آرہی تھیں۔ ان قبروں کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا اور اسے ایک لڑکی یاد آگئی۔ یہ بہت پرانی بات تھی، شاید بارہ سال پرانی جب وہ لوگ یہاں نئے نئے آئے تھے۔ اس وقت آس پاس بہت کم مکانات تھے اور وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی تھی۔ آس پاس کھیلنے کے لیے اس کا ہم عمر بچہ نہیں تھا۔ جیسن اس سے چار برس چھوٹا تھا اور وہ

www.pkdigest.com

اسے بچہ سمجھتی تھی اس لیے اس کے ساتھ نہیں کھیلتی تھی۔ ایک دن وہ گھر سے نکلی اور سڑک عبور کرکے قبرستان میں داخل ہو گئی۔ وہ قبروں کے درمیان گھوم رہی تھی کہ اچانک کسی نے اسے پکارا۔

''اے، مجھ سے دوستی کرو گی؟''

اسے آس پاس کوئی نظر نہیں آیا تھا، وہ ڈر گئی تھی۔ لیکن جب دوبارہ آواز آئی تو اس نے لڑکی کو دیکھ لیا۔ وہ ایک اونچی قبر کے کتبے پر چڑھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی شاید دس گیارہ برس کی۔ لڑکی چھلانگ مار کر نیچے اتر آئی۔ میرین نے کہا۔ ''تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔''

لڑکی شرارت سے مسکرائی۔ ''مجھے یہاں مزہ آتا ہے اور جب میں کسی کو ڈراتی ہوں تو بہت مزہ آتا ہے۔''

''لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں ڈرتی ہوں۔''

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''واقعی؟... اچھا مجھ سے دوستی کرو گی؟''

میرین نے سر ہلا دیا۔ ذرا سی دیر میں دونوں برسوں پرانی سہیلیوں کی طرح بے تکلف ہو گئیں۔ پھر لڑکی نے اس سے بھوت کا پیچھا نامی کھیل کھیلنے کو کہا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کون سا کھیل ہے؟''

''آؤ میں تمہیں سکھاتی ہوں۔''

وہ اسے قبرستان کے وسط میں لے گئی اور پھر اس نے میرین کو یہ کھیل سکھایا۔ میرین کو بہت مزہ آیا۔ لڑکی کا نام امیلا تھا۔ امیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا گھر نزدیک ہی تھا۔ اس کے ماں باپ اسے باہر آنے جانے سے منع کرتے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح موقع پا کر نکل آتی تھی۔ ایک دو بار میرین اس کے گھر اسے بلانے گئی لیکن امیلا کی ماں نے بہت روکھے انداز میں اسے منع کر دیا۔ امیلا کی ماں نے کہا کہ وہ بیمار ہے اور اسے باہر کھیلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد میرین اس کے گھر نہیں گئی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، وہ اکثر خود قبرستان میں پائی جاتی تھی یا اس کے گھر آ جاتی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا جب ان کی ملاقات نہ ہوتی ہو۔ کئی مہینے تک وہی اس کی واحد دوست رہی۔

لیکن پھر یہ کالونی تیزی سے آباد ہونے لگی اور وہاں مزید خاندان آباد ہو گئے اور ان میں بہت سارے بچے بھی تھے۔ ایک دن میرین قبرستان میں گئی تو وہاں اور بچے آ گئے۔ یہ رائٹ، جانز، مارٹین اور ایلز تھے۔ انہوں نے اس سے دوستی کا کہا اور وہ مان گئی پھر اس نے ان کو بھوت کا پیچھا کھیلنا سکھایا۔ اتفاق سے امیلا کئی دن سے نہیں آئی تھی اور میرین اس کی ماں کے ڈر سے اسے پوچھنے بھی نہیں گئی۔ وہ بور ہو رہی تھی اس لیے جب ان بچوں نے اس سے دوستی کا کہا تو مان گئی۔

ایک شام تاریکی ہونے والی تھی جب وہ قبرستان میں کھیل رہے تھے۔ اچانک امیلا وہاں آ گئی۔ پہلے میرین نے اسے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ بھوت بن کر دوسروں کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک ہی امیلا سے اس کا سامنا ہو گیا۔ امیلا اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''میرین! تم کسی اور کے ساتھ کھیل رہی ہو؟''

''ہاں تو کیا ہوا؟'' میرین نے کہا۔ اس دوران میں اس کے باقی ساتھی بھی وہاں جمع ہو گئے۔ امیلا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرین کی اس حرکت سے صدمہ پہنچا ہے۔ اس نے پھر کہا۔

''تم دوسروں کے ساتھ کھیل رہی ہو؟''

''اگر میں دوسروں کے ساتھ کھیل رہی ہوں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' میرین کو غصہ آ گیا۔

''کیونکہ تم میری دوست ہو۔'' امیلا چیخ کر بولی۔ ''تم کسی اور کے ساتھ نہیں کھیل سکتیں۔''

''میں کھیلوں گی، تم مجھے نہیں روک سکتیں۔'' میرین نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''اگر تم کسی اور کے ساتھ کھیلو گی تو میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔'' امیلا نے چیخ کر کہا پھر اچانک اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ سب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ امیلا کو ان کی نظروں سے احساس ہوا تو اس نے اپنی ناک سے نکلنے والا خون دیکھا اور پھر روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ میرین کو کچھ احساس تو ہوا تھا لیکن اس کے ساتھیوں نے پھر سے کھیل شروع کرنے کو کہا تو وہ اس میں مگن ہو گئی۔

☆☆☆

میرین کو شک تھا۔ کیا یہ لڑکی امیلا ہی تھی؟ لیکن اسے امیلا کے جو خدوخال یاد تھے، وہ اس لڑکی سے مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ کبھی اسے لگتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی، نیچے سے رائٹ کی اسپورٹس کار کا شور گونجا اور رائٹ اتر کر نیچے آیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔

''تم آئیں کیوں نہیں؟''

میرین نے نیچے جھانکا۔ ''میرا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔'' رائٹ اوپر آ گیا۔ ''کیوں؟''

''بس ایسے ہی...''

رائٹ نے اسے لے جانے پر اصرار کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور رائٹ مایوس ہو کر چلا گیا۔ اس کا ذہن عجیب سا

ہو رہا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آ گئی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اسے رہ رہ کر امیلا کا خیال آ رہا تھا کہ وہ اب کہاں ہو گی اور کیا کر رہی ہو گی؟ اسی لیے اسے کھڑکی کی طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہی نیلی فراک والی لڑکی اسی لباس میں چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ میرین اچھل پڑی۔

''تم... کہاں سے آ گئیں؟''

''میں جانز کے پاس سے آ رہی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

میرین کے جسم میں اس کے الفاظ سے زیادہ اس کے لہجے نے سردی لہر دوڑا دی۔ ''تت... تم نے کیا کیا جانز کے ساتھ؟''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں میں نے اس کے ساتھ کچھ کیا ہے۔''

وہ کھڑکی سے اتر کر نیچے آ گئی۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ میرین سہم کر بستر میں سمٹ گئی۔ ''کک... کیا کیا ہے؟''

''تم دیکھو گی کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' اس نے دیوار کی ایک طرف ہاتھ لہرایا۔ دیوار اچانک ہی کسی ٹی وی کی طرح روشن ہو گئی اور اس پر ایک ورکشاپ کا منظر نظر آنے لگا۔ یہ جانز کی ورکشاپ تھی اور وہ کام کر رہا تھا۔ ایک طرف ایک مشین لگی تھی۔ اس میں بیک وقت گول آریاں اور ایک پیالہ حرکت کر رہا تھا۔ اصل میں وہ ریسے چھیلتے تھے جن کے دندانے آپس میں مل رہے تھے اور ان کے بیچ کوئی چیز آ جاتی تو اس کا قیمہ بن جاتا۔ جانز بیئر پیتے ہوئے اپنے کام میں مگن تھا اچانک اسے لگا جیسے ورکشاپ میں کوئی آیا ہو۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک ریک کے پیچھے کوئی حرکت کر رہا تھا۔ وہ ڈر گیا کیونکہ ریک کے پیچھے جو چیز تھی، وہ عجیب سی آواز نکال رہی تھی۔ جانز نے ایک لمبا سا پانا اٹھا لیا اور محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ ریک سامنے تھا لیکن خاصا لمبا تھا۔ اسے پیچھے جانے کے لیے گھوم کر جانا پڑتا۔ جیسے ہی وہ ریک کے پاس پہنچا، اچانک ہی اس کے پیچھے سے ایک بھیانک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا اور اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ چلتی مشین کے قریب آ گیا ہے۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ پیچھے کیا تو اس کا ہاتھ مشین کے دندانوں میں آ گیا۔ پہلے اس کی انگلیاں گئیں اور اس نے چیخ مار کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن مشین کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ کھنچتا چلا گیا۔ اس کا ہاتھ رفتہ رفتہ اندر جا رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور مشین اس کا ہاتھ کھاتی جا رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے ورکشاپ گونج رہا تھا۔

بیگم آسمان سے ستارے لا سکتا ہوں لیکن بجلی نہیں لا سکتا

لیکن وہاں کوئی سننے والا اور اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔

اچانک ہی جانز کو اپنے عقب میں وہی بھیانک صورت نظر آئی۔ وہ اس کے ہاتھ کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر اس نے جانز کا سر پکڑا اور اسے زبردستی مشین میں چلتی آری کی طرف لے جانے لگی۔ جانز... دوسرے ہاتھ سے مشین کا سوئچ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سوئچ ذرا دور تھا۔ اس کی کوشش ناکام رہی اور بھیانک صورت نے اس کا سر پکڑ کر مشین میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی پورا منظر سرخ ہو گیا۔ میرین کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لیکن لڑکی اب کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے پھر اسکرین کی طرف دیکھا۔ دیوار بھی سادہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر ایک کشمکش سی تھی کہ یہ سب حقیقت ہے یا محض ایک خواب..... اس نے پاس رکھا موبائل اٹھایا اور جانز کو کال کرنے لگی۔ اس کے موبائل پر بیل جا رہی تھی لیکن... جیسے کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میرین نے پھر رائٹ کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''جانز کہاں ہے؟''

''پتا نہیں، وہ بھی نہیں آیا۔'' رائٹ بولا۔ ''وہ کال بھی ریسیو نہیں کر رہا۔''

''میری کال بھی ریسیو نہیں کی ہے۔'' میرین ہچکچائی۔ ''کیا تم میں سے کوئی اس کی ورکشاپ جا کر دیکھ سکتا ہے؟''

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' رائٹ اس کے انداز پر چونک گیا۔

''نہیں، بس میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔''

''او کے، میں دیکھتا ہوں۔''

میرین نے موبائل بند کیا اور خود بھی جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اس نے نیچے آ کر کار کی چابی لی اور گیراج سے کار نکال کر روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ جانز کی ورکشاپ کی

طرف تھا۔ جب وہ ورکشاپ پہنچی تو رائٹ کی اسپورٹس کار وہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ اندر آئی تو رائٹ فریج سے کولڈ ڈرنک نکال رہا تھا۔ میرین نے بے ساختہ آرا مشین کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بند اور بالکل صاف ستھری تھی۔ اس نے کسی قدر اطمینان محسوس کیا۔ اگر وہ سب سچ ہوتا تو مشین اس وقت خون آلود ہوتی۔ رائٹ نے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے، تم خود آگئیں؟"

میرین ہچکچائی پھر اس نے رائٹ کو اپنے خواب کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "میرے خدا! تم نے خواب پر یقین کر لیا؟"

"رائٹ وہ خواب نہیں تھا۔ مجھے لگ رہا ہے جانز کے ساتھ حقیقت میں کچھ ہوا ہے۔"

رائٹ نے جانز کی مشین کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو بالکل صاف ہے تمہارے خواب کے مطابق اسے خون آلود ہونا چاہیے تھا۔ اگر جانز کے ساتھ کچھ ہوا ہے تو اس کی لاش بھی یہاں ہونی چاہیے۔"

میرین نے سر ہلایا۔ "ہاں یہ تو ہے لیکن پھر وہ کہاں ہے؟"

رائٹ نے ایک بار پھر اس کے موبائل پر کال کی تو پاس ہی اس کی ٹون بجنے لگی۔ جانز کا موبائل قریب ہی ایک ریک پر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پرس اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔ انہوں نے پوری ورکشاپ دیکھی اور پھر اس کے آس پاس بھی دیکھ لیا۔ جانز کی ورکشاپ ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ اس کی بائیک بھی وہیں کھڑی تھی۔

"کیا خیال ہے، ایلز کے گھر چلیں؟" رائٹ نے کہا۔

اس بار میرین مان گئی۔ وہ ایلز کے گھر آئے جہاں مارلین، ایلز اور جیسن ایلز کے کمرے میں جمع تھے۔ وہ کہیں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ رائٹ اور میرین کو دیکھ کر جیسن نے کہا۔ "ہم اسٹرالیک جانے کا سوچ رہے ہیں۔"

"پروگرام تو اچھا ہے لیکن جانز کہاں ہے؟" میرین نے کہا۔

"جانز اپنی ورکشاپ میں نہیں ہے۔" رائٹ نے بتایا۔ "ہم نے اسے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔"

مارلین فکرمند ہوگئی۔ "وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

جیسن نے شانے اچکائے۔ "کیا کہا جا سکتا ہے... یہ بتاؤ کہ لیک جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کچھ دیر میں باقی سب جانز کو بھول کر اس پر بحث کرنے لگے۔ صرف میرین سوچوں میں گم تھی۔ اسے رہ رہ کر وہی منظر یاد آرہا تھا جب جانز مشین میں آگیا تھا۔ اگر سچ مچ ایسا ہی تھا تو جانز کی لاش کہاں گئی اور مشین کیسے صاف ستھری ہوگئی؟ ایلز زور سے بولی۔

"تو بس طے ہے... ہم ابھی نکل رہے ہیں۔ کل ویک اینڈ ہے پرسوں واپسی ہوگی۔"

میرین چونکی۔ "میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں...؟" باقی سب چلائے۔

"بس میرا دل نہیں چاہ..." اس نے کہنا چاہا لیکن سب اس طرح اس کے پیچھے پڑے کہ اسے ان کی بات ماننا پڑی۔ طے ہوا کہ وہ رائٹ کی اسپورٹس کار میں روانہ ہوں گے۔ جب جانے کا وقت آیا تو انہوں نے ایک بار پھر جانز کی کھوج کی..... وہ اس کی ورکشاپ تک گئے تھے۔ وہاں سے اسٹرالیک کا فاصلہ کوئی بیس میل کا تھا۔ یہ بہت خوب صورت جھیل تھی۔ کیونکہ اس کا راستہ کسی قدر دشوار تھا اس لیے یہاں کم لوگ جاتے تھے۔ وہاں کچھ کیبن تھے جن میں سیاح رک سکتے تھے لیکن کھانے پینے اور دیگر... سامان ساتھ لے جانا پڑتا تھا جیسے بستر اور تکیے وغیرہ۔

جب وہ روانہ ہوئے تو ایلز نے تجویز دی۔ "کوئی ایڈونچر نہ کیا جائے؟"

"مثلاً کیا؟" مارلین نے پوچھا۔

"کسی اسٹور سے کچھ سامان لیتے ہیں۔"

"بغیر ادائیگی کے۔" رائٹ اس کی بات سمجھ گیا۔

"کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔" میرین نے ان کی مخالفت کی۔

لیکن وہ سب اس پر متفق تھے اس لیے میرین چپ ہوگئی۔ انہوں نے کار ایک ایسے گیس اسٹیشن پر روکی جس کے ساتھ اسٹور بھی تھا۔ ایلز اتر کر اندر گئی اور اس نے دکان دار کو جو ایک نوجوان لڑکا تھا، اس طرح الجھایا کہ وہ اسے لے کر دکان کے عقبی حصے میں چلا گیا اور اس کے جاتے ہی رائٹ، مارلین اور جیسن اندر گھس کر ریکس سے کھانے پینے کا سامان اٹھانے لگے۔ میرین کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن وہ چپ رہی۔ سامان سمیت وہ کار میں بیٹھ گئے اور رائٹ ہارن بجانے لگا۔ کچھ دیر بعد ایلز اندر سے ہنستی ہوئی برآمد ہوئی اور کار میں بیٹھ گئی۔

"کیسا بے وقوف بنایا۔" اس نے فخر سے کہا۔

"یہ سب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، ہم ادائیگی کر سکتے تھے۔" میرین نے ناگواری سے کہا۔

"کم آن... یہ صرف ایک شرارت ہے۔" ایلز بولی۔

"اگر تمہارے پاپا کو پتا چلا تو ان کو کتنا صدمہ ہوگا۔ وہ شیرف ہیں اس کاؤنٹی کے۔ اگر تم جرم کرتے ہوئے پکڑی گئیں تو وہ تمہیں بھی معاف نہیں کریں گے۔"

"تم میرے پاپا کی فکر مت کرو۔" ایلز نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ وہ سب خاموش ہوگئے اور ان کے ایڈونچر کا مزہ کرکرا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسٹرالیک کی طرف جانے والے راستے کی طرف مڑ گئے۔ یہ ان کی کالونی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ قبرستان کے ساتھ کچھ پہاڑیاں تھیں، جھیل ان کے عین پیچھے تھی لیکن جانے کے لیے راستہ نہیں تھا اور ان کو گھوم کر جانا پڑتا..... انہوں نے ایک کیبن کے سامنے کار روکی۔ سامان اندر رکھ کر وہ سب جھیل کی طرف دوڑے۔ جھیل کا پانی کسی قدر سرد تھا اور شروع میں انہوں نے اس میں اترتے ہوئے چیخیں ماریں لیکن پھر اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

میرین کنارے پر بیٹھی تھی۔ پھر ان لوگوں کے اصرار پر وہ بھی کپڑے اتار کر پانی میں اتر گئی۔ اس دن وہ سورج ڈوبنے تک وقفے وقفے سے تیراکی کرتے رہے۔ خاص طور سے ایلز تو پانی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے تیراکی کا بہت شوق تھا۔ شام کو انہوں نے کیبن کے سامنے آگ جلائی اور اس کے پاس بیٹھ کر ڈنر کیا۔ درمیان میں ایک دوبار جانز کا ذکر آیا لیکن میرین کی [illegible] ہونے کے لیے اٹھ گئے کیونکہ مسلسل تیراکی نے سب کو تھکا دیا تھا۔

www.pkdigest.com

میرین، مارلین اور ایلز ایک کمرے میں تھیں۔ انہوں نے فرش پر ہوا سے بھر جانے والے گدے بچھائے اور اوڑھنے کے لیے چادر لے لی۔ مارلین اور ایلز تو لیٹتے ہی سو گئیں لیکن میرین کو تھکن کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے رہ رہ کر نیلے لباس والی لڑکی کا خیال آرہا تھا۔ جیسے جیسے وہ اس کے بارے میں سوچتی، اسے یقین ہوتا جاتا کہ وہی اسپلا ہے۔ لیکن اس نے جانز کو کیسے مار دیا، وہ اتنی پراسرار کیسے ہوگئی؟

رات کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا، ایلز اپنے بستر پر نہیں تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ مارلین بے خبر سو رہی تھی۔ میرین نے کپڑے پہنے اور باہر آگئی۔ رائٹ اور جیسن بھی سو رہے تھے۔ باہر سورج نکلنے سے پہلے والی روشنی پھیل رہی تھی۔ جنگل کی طرف ابھی بھی تاریکی تھی۔ ایلز کیبن میں نہیں تھی۔ میرین کا خیال تھا کہ وہ شاید کسی وجہ سے جنگل کی طرف گئی ہو۔ اس نے جھیل کا رخ کیا تب اس نے ایلز کو جھیل میں تیراکی کرتے دیکھا۔ پانی سے ہلکی سی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ایلز اسے دیکھ کر چلائی۔

"بہت مزہ آرہا ہے۔ تم بھی آجاؤ۔"

ترقی

ایک کلرک نے۔ کچھ سنا تم نے....؟ ریاض بالکل بہرا ہوگیا ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے اب اسے ہمارے دفتر کی سرکاری ملازمت سے جواب مل جائے گا۔

دوسرا کلرک نے۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اس کی تو ترقی ہوگئی ہے۔ اس کا تبادلہ شعبہ شکایات میں کر دیا گیا ہے۔

"نہیں! مجھ سے اتنا سرد پانی برداشت نہیں ہوگا۔" میرین نے انکار کیا۔ اس کی نظر جھیل کی سطح پر تھی۔ وسط میں نشان دہی کے لیے ایک بڑا سا سرخ غبارہ پانی میں تیر رہا تھا۔ میرین کو اچانک ہی اس غبارے کے پاس ایک بچی دکھائی دی۔ وہ پانی سے ابھری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ تیرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرین نے بے تابی سے کہا۔

"ایلز! وہ دیکھو... جھیل میں ایک بچی ہے... غبارے کے پاس... وہ تیرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

ایلز نے مڑ کر دیکھا تو اسے بھی بچی کی جھلک نظر آگئی اور وہ اس کی طرف تیرنے لگی۔ میرین بے تاب تھی کہ ایلز بچی کے ڈوبنے سے پہلے اس تک پہنچ جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایلز اس تک پہنچتی، وہ پانی میں غائب ہوگئی۔ میرین چلائی۔ "ایلز! وہ ڈوب گئی ہے۔"

ایلز تیزی سے اس جگہ پہنچی مگر بچی اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے پانی میں ہاتھ پاؤں مارے۔ یہاں پانی کا رنگ گہرا سبز تھا اس لیے اسے نیچے نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور پانی میں غوطہ لگایا۔ اب اسے کسی قدر بہتر نظر آرہا تھا۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے حد نظر تین چار گز سے زیادہ نہیں تھی۔ ایلز کو تیراکی کا شوق تھا لیکن اسے غوطہ خوری میں اتنی مہارت نہیں تھی۔ کچھ دیر میں اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ وہ سانس لینے کے لیے اوپر آئی.... اور سانس لے کر پھر نیچے گئی۔ اس بار اسے تہ میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ اس طرف بڑھی۔ یہ کوئی انسان ہی تھا۔ جو پانی میں اوندھے منہ بے جان تیر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔ ایلز الجھ گئی کیونکہ اسے بچی نظر آئی تھی۔ جبکہ یہ جوان لڑکی یا عورت تھی۔ ایلز کا دم گھٹ رہا تھا لیکن وہ نیچے آتی رہی۔

آخر وہ اس تک پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا اور جیسے ہی اس کا چہرہ سامنے آیا، ایلز کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عورت کا نیلگوں چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ اس کی سفید آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایلز کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔

میرین بے تابی سے سطح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایلز کو نیچے گئے ہوئے ایک منٹ ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایلز اچھی غوطہ خور نہیں ہے۔ جب مزید کچھ دیر ہوئی تو میرین نے پانی میں اترنے کا ارادہ کیا اسی وقت ایلز پانی سے ابھری اور دیوانہ وار سانس لینے لگی۔ وہ بری طرح بدحواس ہو رہی تھی کیونکہ اس کے ناک منہ سے پانی نکل رہا تھا۔ جب اس کی سانس بحال ہوئی تو وہ کنارے کی طرف آنے لگی۔ میرین نے پکارا۔

”ایلز کیا ہوا؟“

لیکن ایلز کوئی جواب دینے کے بجائے تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اچانک وہ رک گئی اور کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی چیز نے اسے پکڑ لیا ہو۔ پھر ایلز نے چیخنا شروع کر دیا۔ میرین بھی چلا چلا کر اسے آگے آنے کو کہہ رہی تھی۔ اچانک اس نے ایلز کی پشت سے نیلا لباس نمودار ہوتے دیکھا اور ایک بھیانک چہرہ سامنے آیا۔ وہی چہرہ جو اس نے جانز کی ورکشاپ میں دیکھا تھا۔ اس کے ڈیلے سفید ہو رہے تھے۔ اس نے ایلز کو پشت سے پکڑا اور آرام سے اس پر سوار ہوتے ہوئے اسے پانی میں لے گئی۔ میرین بری طرح چیخ رہی تھی۔ ایلز پانی میں غائب ہو چکی تھی اور اب پانی کی سطح برابر ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ رائٹ نے اسے جھنجوڑا۔

”وہ... وہ ایلز کو لے گئی... پانی میں...“ میرین رو رہی تھی۔ اس کی کیفیت ہسٹریائی ہو رہی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر سب ہی دوڑے آئے تھے۔ بہ مشکل اس نے بتایا کہ ایلز جھیل میں ڈوب گئی اور نیلے لباس والی لڑکی اسے لے گئی ہے۔

”تمہارا دماغ درست ہے؟“ مارلین چلائی۔ ”وہ تمہارے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ میرین بولی۔ ”پلیز! ایلز کو دیکھو۔“

رائٹ اور جیسن اپنی قمیص اتارتے ہوئے پانی میں کود گئے۔ ان کے پیچھے مارلین بھی پانی میں اتر گئی۔ میرین کچھ دیر ان کو دیکھتی رہی پھر اسے خیال آیا، وہ اندر آئی اور اس نے موبائل پر ون ون ون پر کال کی۔ پولیس اور ایمبولینس بیس منٹ میں آ گئی۔ اس وقت تک رائٹ، جیسن اور مارلین ایلز کو تلاش نہیں کر سکے تھے۔ کچھ دیر میں ایلز کا باپ شیرف رچرڈ بھی آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا کیونکہ ایلز اس کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ جھیل میں غائب ہو گئی تھی، یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

اس نے رائٹ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

میرین نے کہنا چاہا لیکن رائٹ بول اٹھا۔ ”وہ صبح کسی وقت باہر آئی تھی پھر اس کی چیخیں سنائی دیں تو ہم باہر آئے۔ وہ غائب تھی اور اس کی یہ شرٹ یہاں پڑی تھی۔“

میرین نے حیرت سے رائٹ کو دیکھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ کچھ دیر بعد اسے موقع ملا تو اس نے سرگوشی میں رائٹ سے کہا۔ ”تم نے اصل بات کیوں نہیں بتائی؟“

”پاگل مت بنو، اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا اور ہم بلاوجہ شک کی زد میں آ جائیں گے۔“ رائٹ نے جواب دیا۔

پولیس کے غوطہ خور آ گئے تھے اور انہوں نے تلاش شروع کر دی تھی۔ لیکن دو گھنٹے میں ساری جھیل چھاننے کے باوجود ایلز کی لاش نہیں ملی۔ شیرف شک میں پڑ گیا۔ اس نے ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی لیکن سب ایک ہی بیان پر قائم تھے کہ انہوں نے سوتے میں ایلز کی چیخیں سنی تھیں اور باہر آ کر دیکھا تو وہ غائب تھی۔ جب وہ چاروں وہاں سے روانہ ہوئے تو پولیس نے تلاش کا دائرہ جنگل تک وسیع کر دیا۔ وہاں سے نکلتے ہی میرین پھٹ پڑی۔

”تم لوگ ایلز کے باپ کو حقیقت کیوں نہیں بتا رہے ہو؟“

”میرین پلیز۔“ مارلین سخت لہجے میں بولی۔ ”کیا اس طرح وہ مل جائے گی؟“

جیسن نے اس کی تائید کی۔ ”الٹا ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

”سوال یہ ہے کہ ایلز کہاں گئی؟“ رائٹ بولا۔

”میں نے بتایا تو اسے وہ نیلے لباس والی...“

”میرین خدا کے لیے یہ ہارر موی بند کرو۔“ مارلین چلائی۔ ”تم پاگل ہو گئی ہو۔“

”تب تم بتاؤ، جانز اور ایلز کہاں گئے؟“

میرین کے اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اب وہ سب فکرمند تھے۔ جیسن کی بائیک اور میرین کی کار ایلز کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔ رائٹ ان کو چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا..... جیسن اور میرین گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مارلین کا گھر ان کے گھر سے کچھ دور تھا، اس نے جیسن سے کہا کہ وہ اسے وہاں چھوڑ دے۔ مارلین، جیسن کے ساتھ

چلی گئی..... میرین بھی گھر آ گئی۔ اس نے کار گیراج میں کھڑی کی اور اوپر اپنے کمرے کے ٹیرس میں آ گئی جہاں سے قبرستان صاف نظر آتا تھا۔ جانز والا واقعہ اس نے اپنے گھر میں سوتی جاگتی کیفیت میں دیکھا تھا اس لیے اسے یقین نہیں آیا تھا لیکن ایلز والا واقعہ اس نے پورے ہوش و حواس میں دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب حقیقت میں ہو رہا ہے۔

جیسن، مارلین کو چھوڑ کر گھر آیا تو میرین نے اسے پھر سے پورا واقعہ سنایا۔ جیسن نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اس کے انداز سے میرین نے محسوس کیا کہ اس نے یقین نہیں کیا ہے۔ رات کو دس بجے میرین گھر سے نکلی اور اس نے سڑک کے ساتھ چلتے ہوئے کالونی کے اس حصے کا رخ کیا جہاں کبھی امیلا کا گھر ہوا کرتا تھا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر وہ ہچکچائی پھر اس نے کال بیل بجائی۔ جواب میں ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میرین نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ امیلا کی ماں نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

”معاف کرنا، یہاں امیلا نامی لڑکی رہتی ہے؟“

عورت نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں...“ وہ کہتے کہتے رکی۔ ”تم شاید یہاں پہلے رہنے والوں کی بات کر رہی ہو جن کی ایک لڑکی تھی؟“

”جی میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔“

”اس کے بارے میں مجھے زیادہ نہیں معلوم..... لیکن تم چاہو تو مسز ماریا سے معلوم کر سکتی ہو۔“

”مسز ماریا کون ہے؟“

”تم نہیں جانتیں؟“ اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”قبرستان کے ساتھ جو چرچ ہے اس میں قائم رفاہی ادارے کی سربراہ مسز ماریا ہے۔ اس ادارے میں بے سہارا اور معذور افراد کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔“

وہ واپس آ گئی۔ ابھی تک ایلز کا کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ رائٹ نے اسے کال کی۔ ”پولیس والوں نے سارا جنگل بھی دیکھ لیا ہے۔ جھیل کی مشینوں کی مدد سے بھی اسکینگ کر لی ہے۔ ایلز وہاں نہیں ہے۔“

”ایلز وہاں ہو گی بھی نہیں۔“ میرین نے کہا۔

”پھر کہاں ہو گی؟“

”وہیں جہاں جانز ہے۔“ میرین نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ”امیلا اسے وہیں لے گئی ہے۔“

”کون امیلا؟“ رائٹ نے تعجب سے کہا۔

لیکن میرین نے اسے جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ چرچ جا کر مسز ماریا سے ملے۔ اس نے اس بوڑھی عورت سے پوچھا نہیں تھا کہ امیلا کے بارے میں مسز ماریا کیوں بتا سکتی ہے۔

☆☆☆

مارلین ذہنی اور جسمانی طور پر تھک گئی تھی۔ وہ گھر آ کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اس نے ماں باپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا..... ایلز کی گمشدگی کی خبر ٹی وی پر آ چکی تھی اس لیے سب کو پتا چل گیا تھا۔ مارلین باری باری سب سے رابطہ کر رہی تھی۔ لیکن کسی کو بھی ایلز کے بارے میں کوئی خوش خبری نہیں ملی تھی۔ اب اسے جانز کی طرف سے بھی تشویش ہو چلی تھی۔ آخر وہ کہاں غائب تھا؟ اصل میں جانز ذرا دل پھینک قسم کا شخص تھا اور اکثر وہ ادھر ادھر منہ مارنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسی طرح غائب ہو جاتا تھا۔ اب تک مارلین یہی سمجھ رہی تھی کہ جانز کسی ایسے ہی چکر میں غائب ہے۔ مارلین خود بھی اس کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ اس کے خیال میں ابھی سنجیدگی کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر جانز کا نمبر ملانے کا ارادہ کیا۔ اس نے موبائل اٹھایا تھا کہ اس کی بیل بجی۔ اسے تعجب ہوا کہ نمبر جانز کا تھا۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

”جانز تم کہاں ہو؟ تم کو پتا ہے ہم پر کیا گزر رہی ہے؟“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ جانز عجیب سی آواز میں بولا۔ ”تم مجھ سے ملنے آ سکتی ہو؟“

”کہاں؟“

”قبرستان میں جہاں ہم نے بھوت والا کھیل کھیلا تھا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ جانز نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مارلین ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔ اس نے کال ملانے کی کوشش کی لیکن اس بار دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ اس نے فون بند کیا اور کھڑی ہو گئی۔ رات کا وقت تھا اور اسے وہاں جاتے میں ڈر لگ رہا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہاں جانز بھی تو ہو گا ڈرنے کی کیا بات ہے؟ وہ باہر آئی کیونکہ اس کے گھر سے قبرستان فاصلے پر تھا اس لیے اس نے گاڑی نکالی..... گھوم کر قبرستان میں پہنچنے میں اسے دس منٹ لگے..... اس نے کار سڑک پر روک دی۔ ذرا دور چرچ کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کی بیشتر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ البتہ قبرستان کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ اتر کر اندر والے حصے کی طرف بڑھی جہاں زیادہ تر اونچے کتبوں والی قبریں تھیں۔

اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اسے قبرستان میں

www.pkdigest.com

کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''جانز! میں آ گئی ہوں، تم کہاں ہو؟''

لیکن جانز کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی اس کے عقب سے تیزی سے گزرا ہو۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے پھر جانز کو آواز دی۔ ''جانز تم کہاں ہو، جواب کیوں نہیں دیتے؟''

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اسے غصہ آنے لگا۔ جانز اسے یہاں بلا کر خود غائب تھا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ کسی نے اس کے ساتھ مذاق تو نہیں کیا ہے۔ لیکن نہیں، کال جانز کے موبائل سے آئی تھی اور وہ جانز کی آواز پہچانتی تھی۔ اگر یہ کوئی مذاق تھا تو اس میں جانز بھی برابر کا شریک تھا۔ اس کا غصہ بڑھنے لگا اگر جانز اس مذاق میں شامل تھا تو وہ اسے معاف نہیں کرے گی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''دیکھو جانز اگر یہ کوئی مذاق ہے تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ اب اگر تم نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں واپس چلی جاؤں گی میں صرف تین تک گنوں گی۔ ایک.... دو....''

اسی لمحے اسے پھر لگا کہ کوئی اس کے پیچھے سے گزرا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس بار احساس اتنا واضح تھا کہ وہ کسی صورت اسے جھٹلا نہیں سکی۔.... وہ ڈر کر وہاں سے جانے لگی۔ ابھی وہ چند قدم چلی تھی کہ اس نے ایک نسوانی آواز سنی۔ ''اتنی جلدی بھی کیا ہے.... جانز سے نہیں ملو گی؟''

وہ اچھل پڑی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے ایک قبر کے کتبے کے پاس وہی نیلی فراک والی لڑکی نظر آئی جو اس دن ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہوئی تھی اور پھر پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔ مارلین نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم وہی ہو؟''

''ہاں میں وہی ہوں لیکن تم مجھے نہیں جانتیں۔'' اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

مارلین کو غصہ آنے لگا۔ ''مجھے.... جاننے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے اور جانز کہاں ہے؟''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ''جانز سے ملنا چاہتی ہو؟''

''ہاں میں اسی کے کہنے پر یہاں آئی ہوں۔'' مارلین کو خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی لمحے اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی اور اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا تو ایک ہاتھ اس کے منہ اور دوسرا اس کے سر پر آ کر جم گیا اور پھر پکڑنے والے نے اس کی گردن کو پوری طاقت سے گھما دیا۔ مارلین نے ہڈی چٹخنے کی آواز سنی اور اس کا سر پیچھے کی طرف گھوم گیا۔ تب اس نے یہ کام کرنے والے کو دیکھا۔ وہ جانز تھا اور.... اس کا سر بُری طرح کچلا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایلز اور جانز کے بعد مارلین کی گمشدگی نے ان سب کو پریشان کر دیا۔ مارلین کی ماں نے صبح سب کو فون کر کے مارلین کے بارے میں پوچھا.... مگر ان میں سے کسی کو مارلین کا پتا نہیں تھا۔ پھر مارلین کے ماں باپ نے پولیس سے رجوع کیا اور اسی دوران میں ایک پولیس کار نے قبرستان میں مارلین کی خالی کار دیکھ لی.... کار میں کوئی نشان نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ مارلین کہاں چلی گئی۔ اس کا سیل فون غائب تھا اور بند جا رہا تھا۔ ماں باپ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ رات کو کس وقت گھر سے نکلی تھی۔ رات دو بجے ہلکی سی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے سڑک بھیگ گئی تھی لیکن مارلین کی کار کے نیچے سڑک خشک تھی۔ یعنی وہ رات دو بجے سے پہلے یہاں آئی تھی۔ وہ یہاں سے کہاں گئی پولیس ابھی تک نہیں جان سکی تھی۔ قبرستان اور کار کے آس پاس کوئی نشان نہیں ملا۔

میرین، رائٹ اور جیسن ایک چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھے تھے۔ میرین رائٹ کو دیکھ کر بولی۔ ''یہ سب ایک خاص معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔''

''یعنی قبرستان میں ملنے والی لڑکی سے تعلق ہے اس کا؟'' رائٹ بولا۔ اس کا لہجہ شک سے بھرپور تھا۔

''بالکل، وہ میری بچپن کی دوست تھی، تمہیں بھی یاد ہوگی امیلا نامی ایک لڑکی جو مریض تھی اور اپنے گھر والوں سے چھپ کر میرے ساتھ کھیلنے آتی تھی۔ بھوت کا کھیل اسی نے مجھے کھیلنا سکھایا تھا اور پھر جب میں تم لوگوں کے ساتھ کھیلنے لگی تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔''

رائٹ نے ذہن پر زور دیا۔ ''ہاں، مجھے یاد تو آ رہا ہے لیکن تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی لیکن ہمیں چرچ جا کر سسٹر ماریا سے ملنا ہوگا۔''

''سسٹر ماریا؟'' رائٹ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ امیلا کے بارے میں جانتی ہیں۔ یہ بات مجھے اس مکان میں رہنے والی عورت نے بتائی ہے جہاں کبھی امیلا اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔''

''میرین! میرا خیال ہے ان واقعات کا امیلا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' جیسن نے کہا۔

''مجھے یقین ہے، امیلا سے ہی تعلق ہے۔''

جیسن کھڑا ہو گیا۔ ''لگتا ہے تم بھوتوں کے بارے میں پڑھتی رہی ہو یا کوئی ہارر مووی دیکھی ہے۔''

''یہ غلط ہے۔'' میرین برہم ہو گئی۔ ''میں ثابت کر سکتی ہوں۔''

لیکن جیسن نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ باہر پارکنگ کی طرف چلا گیا جہاں اس کی بائیک کھڑی تھی۔ رائٹ اپنی کافی ختم کر رہا تھا اور اس کی توجہ اب جیسن کی طرف نہیں تھی۔ میرین کی توجہ جیسن کی طرف تھی تب اس نے دیکھا کہ جیسن نے بائیک اسٹارٹ کی اور اسی لمحے ایک لڑکی تیزی سے اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ میرین اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی لیکن نیلی فراک نے اسے چونکا دیا۔ بیٹھنے کے بعد لڑکی نے سر گھما کر میرین کی طرف دیکھا.... یہ وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں میرین کو یقین تھا کہ وہ امیلا ہی ہے۔ لڑکی میرین کو دیکھ کر مسکرائی۔ جیسن کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی کی موجودگی سے بے خبر ہے۔ جبکہ وہ اس سے بالکل چپک کر بیٹھی تھی۔ میرین کو لگا اس نے خاص طور سے میرین کو دکھایا ہے اور اسے کچھ جتا رہی ہے۔

''رائٹ، دیکھو وہی لڑکی جیسن کی بائیک پر۔'' میرین نے ہیجانی انداز میں رائٹ کو متوجہ کیا۔ لیکن رائٹ نے باہر دیکھا تو اسے جیسن اکیلا نظر آیا۔

''لڑکی کہاں ہے؟''

میرین الجھن میں پڑ گئی کیونکہ اب لڑکی اسے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس دوران میں جیسن نے بائیک چلا دی۔ میرین نے کہا۔ ''وہ لڑکی ابھی آ کر بائیک پر جیسن کے پیچھے بیٹھی تھی۔''

رائٹ نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا.... ''میرین تم نے اسے ذہن پر سوار کر لیا ہے۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔'' وہ جھنجلائی۔ ''آخر تم لوگ میری بات کیوں نہیں مان رہے ہو؟''

''کیونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔'' رائٹ نے کہا۔ ''ایک لڑکی جو بارہ سال پہلے ہمارے ساتھ کھیلتی تھی اچانک ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے، اسے ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے اور پھر وہ اکیلی لڑکی ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

''اس نے بگاڑ دیا ہے۔'' میرین کھڑی ہو گئی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ایلز، جانز اور مارلین کہاں غائب ہوئے ہیں؟''

''ان کے ساتھ کوئی اتفاقی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔'' رائٹ بولا۔

''نہیں، یہ امیلا کی کارستانی ہے۔ میں یہ بات ثابت بھی کر دوں گی۔'' میرین نے تیز لہجے میں کہا اور ریستوران سے باہر آ گئی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ امیلا ابھی کیوں دکھائی دی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف لپکی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسن کے پیچھے جا رہی تھی۔ اسے جیسن کی فکر تھی۔ اس کی بائیک طاقت ور تھی اور میرین کی کار اس کا پیچھا نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی وہ ہر ممکن رفتار سے جا رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ جیسن زیادہ رفتار سے نہیں جا رہا ہوگا۔ وہ محتاط ڈرائیونگ کا قائل تھا۔

☆☆☆

جیسن واقعی سست تھا۔ اسے عام حالات میں تیز رفتاری پسند نہیں تھی۔ قصبے سے نکلنے کے بعد اس نے رفتار کچھ تیز کی تھی۔ اچانک اسے عقبی آئینے میں کوئی چیز تیزی سے پیچھے آتی دکھائی دی۔ اس کی رفتار اتنی تھی کہ وہ صحیح سے اسے دیکھ بھی نہیں سکا.... لیکن وہ کوئی گاڑی نہیں تھی ایسا لگا جیسے کوئی انسان بہت تیزی سے بھاگ رہا ہو۔ اس نے بے ساختہ سر گھما کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا کیونکہ اس نے آئینے میں صاف دیکھا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ یہاں سڑک بار بار مڑ رہی تھی۔ سامنے دیکھنا لازمی تھا۔ اس لیے وہ اس بات کو ذہن سے جھٹک کر سامنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اچانک ہی بائیک کا انجن بند ہو گیا اور وہ رک گئی۔ اس نے کک ماری لیکن انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ بار بار کک مارنے کے بعد وہ اترا اور انجن کا معائنہ کرنے لگا۔ پیٹرول ٹینک نصف سے زیادہ بھرا تھا اس لیے اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے پلگ کھول کر دیکھا اور اسے صاف کر کے دوبارہ لگا دیا۔ پھر وہ جیسے ہی کک مارنے لگا انجن گھر گھرا کر خود سے اسٹارٹ ہو گیا۔ اسے حیرت ہوئی، اس نے اپنی.... بائیک کے انجن کو از خود اسٹارٹ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال وہ بائیک پر بیٹھ کر آگے چل پڑا۔ ذرا دیر بعد بائیک کی رفتار خود بخود تیز ہونے لگی حالانکہ اس نے ایکسی لیٹر نہیں دیا تھا۔ اس نے بریک لگا کر رفتار کم کرنے کی کوشش کی لیکن رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھنے لگی اور ذرا سی دیر میں رفتار سو میل فی گھنٹہ تک جا پہنچی۔ اس جگہ یہ رفتار بہت زیادہ تھی اور اسے بائیک قابو کرنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ موڑ بہت تنگ تھے۔ اس وقت بائیک ایک بلند جگہ سے گزر رہی تھی جب اسے عقبی آئینے میں کسی کا چہرہ نظر آیا اور وہ اس کی بائیک تھا۔ وہ بری طرح چونکا اور اس نے بے ساختہ سر گھمایا عقبی نشست خالی تھی۔ اس نے سامنے دیکھا تو ایک موڑ

قریب تھا، اس نے بائیک موڑنے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی، بائیک نہیں مڑ سکی اور سڑک سے اتر کر نشیب میں گرتی چلی گئی۔ جیسن کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اسی وقت میرین نے اپنی کار سے اسے بلندی سے گرتے دیکھا تو اس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

میرین کا برا حال تھا۔ اگر رائٹ نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ جیسن کی تدفین کے موقع پر شاید کھڑی بھی نہ رہ پاتی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بھائی جو اس کا دوست بھی تھا یوں اچانک اس کے سامنے مر جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس موت میں بھی امیلا کا ہاتھ تھا۔ اس کے ماں باپ بھی غم زدہ تھے لیکن انہوں نے خود کو کسی حد تک سنبھال رکھا تھا۔ البتہ جب جیسن کا تابوت قبر میں اتر رہا تھا تو اس کی ماں دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ تدفین کے بعد لوگ رخصت ہونے لگے۔ میرین کا باپ اس کی ماں کو سہارا دے کر وہاں سے لے گیا۔ البتہ میرین اور رائٹ وہیں رک گئے...... میرین اسے اس بارے میں سب بتا چکی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے رائٹ کو دیکھا۔

''اب تم کیا کہتے ہو؟''

رائٹ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر ان کے چار ساتھی ان سے بچھڑ چکے تھے، ان میں سے صرف جیسن کی لاش ملی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ یہ حادثہ میرین کے سامنے ہوا تھا۔ باقی تین کی لاشیں بھی نہیں ملی تھیں۔ لیکن اب بھی وہ میرین کی امیلا والی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ البتہ اس نے یہ بات کہی نہیں۔

''اگر تمہارے خیال میں ان سب وارداتوں میں امیلا نامی لڑکی ملوث ہے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہمیں اسے تلاش کرنا چاہیے اور پھر اسے روکنا چاہیے ورنہ وہ ہم سب کو مار دے گی۔''

رائٹ کے خیال میں یہ بات احمقانہ تھی۔ امیلا صرف ایک لڑکی تھی کوئی گینگسٹر یا سیریل کلر نہیں جو اتنی کامیابی سے کئی افراد کو قتل کر دے اور پولیس کو ذرا بھی سراغ نہ ملے کیونکہ جب جانز غائب ہوا تھا تب ہی شیرف نے تفتیش شروع کر دی تھی، وہ ان لوگوں سے بھی کئی بار پوچھ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی ان کے گروپ کا دشمن بن گیا تھا۔ وہی ان کے خلاف کارروائی کر رہا تھا۔ میرین نے ایک دو بار اسے امیلا کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی لیکن رائٹ اور دوسروں نے اسے روک دیا تھا۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے بتایا کیوں نہیں۔ اب

شک شیرف اس کی بات پر یقین نہیں کرتا لیکن وہ امیلا کے بارے میں تفتیش ضرور کرتا۔ میرین نے آنسو صاف کیے۔

''رائٹ ہمیں امیلا کا کھوج لگانا ہوگا۔''

''کیسے؟''

''ہمیں چرچ جانا ہوگا۔''

رائٹ نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں گہرے سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے۔ ''ابھی موسم ٹھیک نہیں، کل دیکھیں گے۔''

''ابھی کیوں نہیں؟'' میرین بولی۔ ''اب میں مزید کوئی نقصان نہیں اٹھا سکتی۔''

''کچھ نہیں ہوگا......''

میرین چلا اٹھی۔ ''...... سب دیکھنے کے بعد بھی تم یہ کہہ رہے ہو؟''

''اوکے...... اوکے۔'' رائٹ نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔''

''تو پھر چرچ چلو۔'' میرین نے مطالبہ کیا۔

وہ درختوں اور قبروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چرچ کی طرف جانے لگے، ابھی راستے میں تھے کہ گرج چمک کے ساتھ تیز بارش شروع ہو گئی۔ وہ تیزی سے چرچ کی طرف بھاگنے لگے۔ میرین کو بارش دیکھ کر وہ واقعہ یاد آ گیا اور اس نے رائٹ کو بتایا۔

www.pkdigest.com

☆☆☆

میرین نے امیلا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسے ڈر تھا کہ امیلا کی ماں نہ نکل آئے لیکن جب امیلا نے دروازہ کھولا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ امیلا اسے دیکھ کر آہستہ سے بولی۔ ''کیا بات ہے کیوں آئی ہو؟''

''میں سوری کرنے آئی ہوں۔'' میرین نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ کھیلنے آئی ہوں۔''

امیلا کا سخت چہرہ نرم پڑ گیا۔ جب سے اس نے میرین کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تھا، وہ اس سے نہیں ملی تھی۔ اس نے اندر دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''ماما نہیں آنے دیں گی۔''

''پلیز۔'' میرین نے التجا کی۔ امیلا نے سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔ وہ آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ وہ دونوں قبرستان کی طرف بڑھیں، آسمان پر گہرے سیاہ بادل تھے اور تیز ہوا چل رہی تھی جو خشک پتے اڑا رہی تھی۔ ''ہم بھوت کا پیچھا کھیلیں گے۔''

امیلا خوش ہو گئی۔ پہلے وہ بھوت بنی...... میرین چھپنے کے لیے بھاگی اور امیلا گنتی پوری ہوتے ہی اس کے پیچھے

آئی۔ میرین ایک کتبے کے پیچھے چھپی تھی۔ امیلا اسے تلاش کرتی کرتی وہاں آ گئی۔ میرین دوسری طرف منہ کر کے کھڑی تھی۔ امیلا نے اسے عقب سے پکڑ لیا اور چلائی۔

''میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے اب تم بھوت ہو۔''

''ہاں اب میں بھوت ہوں۔'' میرین نے بھاری آواز میں کہا اور امیلا کی طرف مڑی تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ میرین کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے چاروں طرف سیاہ رنگ کے حلقے نظر آ رہے تھے۔ وہ خوفناک لگ رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' امیلا بولی۔ اس کا سانس تیز ہو گیا۔

''ابھی بتاتی ہوں...... میرے دوستو! اسے پکڑ لو۔''

میرین چلائی اور آس پاس خشک پتوں تلے چھپے اس کے دوست نکلنے لگے، وہ بھی اسی طرح خوفناک لگ رہے تھے۔ ان سب نے پاؤڈر اور سیاہی کی مدد سے یہ میک اپ کر رکھا تھا۔ امیلا ڈر کر بھاگی تو وہ بھی اسے ڈرانے والے انداز میں آوازیں نکالتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ امیلا بے تحاشا بھاگ رہی تھی اور اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ اسی لمحے تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش میں بھیگتے اور بھاگتے ہوئے امیلا کا سانس پھول رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ ابھی [illegible] جیسے جا [illegible] قبروں کے درمیان سے گزرتے [illegible] اپنے گھر کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ اچانک زمین پر گر گئی اور اس کے نحیف جسم کو تشنجی انداز میں جھٹکے لگنے لگے۔

میرین اور اس کے ساتھی اس کے پاس جمع ہونے لگے۔ پھر اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تو میرین کے ساتھی بھاگ گئے۔ وہاں صرف میرین اور امیلا رہ گئے۔ امیلا کو لگنے والے جھٹکے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے منہ سے پیلا جھاگ ابل رہا تھا اور پھر ایک شدید جھٹکے کے بعد وہ ساکت ہو گئی۔ میرین بے ساختہ وہاں سے بھاگی۔ اگلے دن اسے پتا چلا کہ امیلا کی حالت بہت خراب ہے اور وہ کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے کچھ دن بعد میرین اور اس کے ساتھی معمول پر آ گئے۔ پھر قبرستان میں دیوار بن گئی اور امیلا کے گھر کی طرف جانے کے لیے لمبا چکر لگانا پڑتا تھا اس لیے ان کا آنا جانا بھی بند ہو گیا اور پھر وہ امیلا کو بھول گئے۔

☆☆☆

وہ گیلے لباس میں سسٹر ماریا کے دفتر میں داخل ہوئے تو اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ میرین آگے آئی۔ ''سسٹر ماریا...... ہمیں آپ کے ادارے میں داخل ایک لڑکی امیلا کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔''

''امیلا ایڈگر؟'' سسٹر ماریا نے سوال کیا۔

''جی سسٹر وہی......'' میرین نے جلدی سے سر ہلایا۔

سسٹر ماریا تقریباً ساٹھ برس کی لیکن صحت مند عورت تھی۔ اس نے دبیز فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ ان کی بات سن کر اس نے عینک اتار دی اور بولی۔ ''ہاں وہ ہمارے ادارے میں داخل تھی لیکن افسوس تم لوگ اس سے نہیں مل سکتے۔''

''لیکن کیوں سسٹر؟'' میرین بے چینی سے بولی۔

''اس کا ایک ہفتے پہلے انتقال ہو گیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔''

میرین سن رہ گئی۔ ''خودکشی؟''

سسٹر ماریا نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس نے پنسل کے شارپنر کا بلیڈ نکال کر اس سے اپنی ہاتھ کی نسیں کاٹ لی تھیں۔''

میرین سوچ رہی تھی کہ یہ سارے واقعات بھی ایک ہفتے کے دوران میں پیش آئے ہیں۔ اس نے سسٹر ماریا کو بتایا کہ امیلا اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ کیا وہ اسے اس کی کوئی تصویر دے سکتی ہے؟ اتفاق سے سسٹر ماریا کے پاس ایک تصویر موجود تھی۔ وہ اس نے میز کی دراز سے نکال کر میرین کے سامنے رکھ دی۔ میرین اسی نیلی فراک والی لڑکی کو تصویر میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے تصویر خاموشی سے رائٹ کی طرف بڑھا دی۔ وہ بھی حیران ہوا...... اس نے کہنا چاہا۔ ''یہ تو واقعی......''

لیکن میرین نے اس کی بات کاٹ کر سسٹر ماریا سے کہا۔ ''آپ کے تعاون کا بہت شکریہ سسٹر...... ویسے امیلا یہاں کیوں داخل تھی؟''

''اس کا مرض علاج کی حد سے گزر چکا تھا اور اسے مستقل دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس کے ماں باپ اسے یہاں چھوڑ گئے۔ ویسے وہ بے ضرر تھی، سارا دن بیٹھی کاغذ پر پنسل سے خاکے بناتی تھی اور اس نے کبھی کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کوئی قدم اٹھا لے گی۔''

وہ سسٹر ماریا کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔ رائٹ اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے باہر آتے ہی کہا۔ ''یہ کیا تھا؟ لڑکی وہی ہے اور وہ ایک ہفتہ پہلے مر چکی ہے۔ تب ہمیں اور تم کو کیسے نظر آتی رہی؟''

''میں جانتی تھی، وہ امیلا ہی نکلے گی۔ مجھے یقین ہے جیسن کی موت اور ان تینوں کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

''لیکن کیسے؟''

میرین چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے رائٹ کی طرف دیکھا۔ ''تم اب بھی نہیں سمجھے؟ وہ مرنے کے بعد سچ مچ بھوت بن چکی ہے اور ہم سے اپنا انتقام لے رہی ہے۔ ہم نے مذاق کر کے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔''

رائٹ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ میں نہیں جانتی لیکن ایسا ہو رہا ہے۔ وہ ہم سے انتقام لے رہی ہے۔ چار کو وہ مار چکی ہے اور اب ہماری باری ہے۔''

بارش بہت تیز ہو گئی تھی اور ساتھ میں بجلی کی گرج چمک بھی بے پناہ بڑھ گئی تھی۔ وہ قبرستان سے گزر رہے تھے۔ اچانک بجلی چمکی تو میرین کو لگا سامنے کوئی کھڑا ہے۔ وہ رک گئی۔ ''سامنے کوئی ہے۔''

''کون؟'' رائٹ نے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے بجلی پھر چمکی تو اس نے سامنے نیلی فراک میں امیلا کو دیکھ لیا۔ لیکن اس وقت اس کا چہرہ نہایت بھیانک ہو رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو اس کا پاؤں کسی گڑھے میں چلا گیا۔ میرین نے بھی دیکھ لیا تھا مگر رائٹ کی چیخ نے اسے متوجہ کر لیا۔

''کیا ہوا؟''

''میرا پاؤں پھنس گیا ہے۔'' رائٹ چلایا۔ اس کا پاؤں گھٹنے تک گڑھے میں چلا گیا تھا۔ وہ اسے نکالنے کے لیے زور لگا رہا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا پاؤں پکڑ لیا ہے۔ اسے بے بس دیکھ کر میرین بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی اور زور لگانے لگی مگر رائٹ کا پاؤں نہیں نکل رہا تھا بلکہ وہ اور دھنستا جا رہا تھا۔ میرین نے جدوجہد کرتے ہوئے امیلا کی طرف دیکھا تو وہ اسے نظر نہیں آئی۔ میرین نے چیخ کر کہا۔

''امیلا تم یہ اچھا نہیں کر رہی ہو۔''

''تم نے میرے ساتھ بہت اچھا کیا تھا۔'' امیلا کی آواز آئی۔ ''تم سب نے مل کر کس طرح میرا مذاق اڑایا تھا اور مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

میرین روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے رونے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں انتقام لینا ہے تو مجھ سے لو... پلیز! رائٹ کو چھوڑ دو۔''

''تم نے ان دوستوں کی خاطر مجھے چھوڑا تھا۔'' امیلا بولی۔ ''اب میں ان دوستوں کو تم سے چھین لوں گی تاکہ تمہیں بھی اس اذیت کا سامنا کرنا پڑے جو ایک دوست چھن جانے پر ہوتی ہے۔''

''پلیز نہیں۔'' میرین روتے ہوئے بولی کیونکہ رائٹ کا ایک پاؤں نصف ران تک زمین میں جا چکا تھا اور وہ اذیت سے چلا رہا تھا۔ اس کا دوسرا پاؤں دور جانے سے وہ تکلیف میں تھا۔ اس کی اذیت دیکھ کر میرین غصے سے چلائی۔

''سنو تم مجھے کیوں نہیں مار دیتیں۔''

''تم زندہ رہو گی۔'' امیلا بولی تو اس بار اس کی آواز زمین سے آئی... میرین نے دیکھا کہ جہاں رائٹ کا پاؤں زمین میں دھنسا ہوا تھا، اس کے برابر سے امیلا کا سر نکلا ہوا تھا۔ اس کا بھیانک چہرہ دیکھ کر میرین چیخ کر پیچھے ہٹی اور اسی لمحے امیلا نے رائٹ کو زمین...... میں کھینچ لیا۔ اس کی ایک ٹانگ جو باہر تھی مڑ کر اوپر اٹھی اور آخر میں وہ بھی زمین میں چلی گئی اور ایک لمحے پہلے جہاں گڑھا تھا وہاں اب ہموار زمین تھی۔ میرین پھٹی پھٹی نگاہوں سے کچھ دیر زمین کو دیکھتی رہی پھر پاگلوں کی طرح زمین سے مٹی ہٹانے لگی لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ امیلا نے اپنا انتقام پورا کر لیا تھا۔

☆☆☆

وہ اس کمرے میں سر جھکائے خاموشی سے ڈرائنگ بورڈ پر پنسل سے اسکیچ بنا رہی تھی۔ اسکیچ میں چند بچوں کو ایک قبرستان میں کھیلتے دکھایا گیا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور مسز ماریا کے ساتھ شیرف رچرڈ اندر آیا۔ اس کی طرف دیکھ کر اس نے مسز ماریا سے ... لگ ... یا ... ہے۔

''تم ... میرین ... ماریا ... پورا ایک سال نفسیاتی اسپتال میں رہی ہے۔ اسے لاعلاج قرار دے کر یہاں بھیجا گیا ہے۔''

شیرف رچرڈ نے گہری سانس لی۔ ''شاید یہی جانتی ہے کہ اس کے... ساتھیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ کہاں غائب ہیں۔''

''ممکن ہے... ویسے جس روز یہ واقعہ ہوا یہ میرے پاس آئی تھی اور اسی کمرے میں رہنے والی ایک لڑکی امیلا ایڈگر کے بارے میں پوچھ رہی تھی، وہ اس کی بچپن کی دوست تھی اور بارہ سال سے دماغی طور پر مفلوج تھی۔ تقریباً اسی حالت میں تھی جیسی یہ اب ہے۔ اس نے کلائی کی نسیں کاٹ کر خودکشی کر لی تھی۔''

وہ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ اب وہ امیلا کے قبضے میں تھے اور وہ اس کی جگہ یہاں قید تھی جب تک اس کی موت کا وقت نہیں آ جاتا، اسے یہیں قید رہنا تھا اور یہی امیلا کا انتقام تھا۔

ثمر عباس

وبالِ دل

انسانی زندگی خواہشات کا مجموعہ ہے... ہر شخص اپنے اپنے انداز میں ایک نئی خواہش کا ... کی گردشیں اس کی آرزو اور خواہش کے درمیان حائل رہتی ہیں... چند ایسے ہی کرداروں کی عکاسی کرتی تحریر جو اپنی دانست میں خواہشات کی تکمیل کر چکے تھے

موسم نہایت خراب تھا۔ برف باری کے ساتھ تیز ہواؤں کا طوفان آیا ہوا تھا اور ایسے میں باہر نکلنا بہت مشکل تھا۔ نک اور اس کی بیوی جولی اداس بیٹھے تھے۔ امریکا کی انتہائی شمالی ریاست مونٹانا کے دارالحکومت ہیلینا کے شمال میں کینیڈا اور امریکا کو ملانے والی ہائی وے پر ان کا چھوٹا سا موٹیل تھا۔

گرمیوں میں جب سیزن عروج پر ہوتا ہے تو نک اور جولی کو سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی اور ان کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ لیکن گرمیوں کے چار مہینے نکالنے کے بعد باقی سال کاروبار ہلکا پھلکا چلتا ہے۔ شدید سردیوں کے چار مہینے کاروبار بند ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔

ہائی وے پر ہونے کی وجہ سے یہ جگہ آبادی سے ذرا فاصلے پر تھی۔ بیس سال پہلے نک نے جب یہ موٹیل قائم کیا تو اس کے ساتھ صرف جولی تھی اور اب اس کے تین بچے بھی اس کام میں شامل ہو چکے تھے۔ بانگ کالج کی تعلیم مکمل کر کے نک کے ساتھ موٹیل میں بھی کام کرتا تھا۔ اسی طرح میو اور اینجس بھی کام کرتی تھیں تینوں کی عمریں بالترتیب انیس، سترہ اور پندرہ برس تھیں۔ میو ماں کے ساتھ کچن میں کام کرتی تھی۔ اینجس کو کھانا بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ موٹیل میں صفائی ستھرائی اور دوسرے کام کرتی تھی۔ موٹیل کے ساتھ انہوں نے ایک چھوٹا سا ریستوران بھی کھول رکھا تھا جس میں عام طور سے لنچ کے وقت رش ہوتا تھا۔ اس وقت وہ سب ہی آ جاتے تھے ورنہ صرف نک اور جولی ہوتے تھے۔ موٹیل کے عقب میں ان کا خوب صورت گھر تھا۔ نک نے رات کے لیے ایک نوجوان بوگی کو رکھ لیا تھا۔ بوگی تین سال سے ان کے پاس کام کر رہا تھا۔ وہ شام میں...

اکاؤنٹنگ کورس کر رہا تھا اور رات میں ان کے پاس کام کرتا تھا۔ صبح وہ سوتا تھا۔ نک اور جولی کو اس کے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ اپنا کام بہت اچھی طرح کرتا تھا۔ ویسے رات کو کام نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا اور بوگی زیادہ تر بیٹھا اپنے کورس سے متعلق کتابیں پڑھتا رہتا یا کوئی میگزین لے کر وقت گزاری کرتا۔

بوگی آٹھ مہینے ان کے پاس کام کرتا تھا اور جب شدید سردیوں میں اس کا کالج بند ہو جاتا تو وہ جنوب کی سیاحت کے لیے چلا جاتا۔ وہ فری ٹورسٹ تھا یعنی لفٹ لے کر سفر کرتا ...اور رات کو کھلے میں سو جاتا تھا۔ اس کا چھوٹا سا خیمہ نما سلیپنگ بیگ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان دنوں بھی بوگی گیا ہوا تھا اس لیے نک اور جولی رات بارہ بجے تک خود موٹیل میں ہوتے تھے۔ جولی کچھ ضروری امور نمٹاتی تھی اور نک کاؤنٹر پر موجود رہتا۔ اگرچہ کوئی گاہک شاذ ہی آتا... لیکن یہ ان کا اصول تھا کہ وہ موٹیل میں بارہ بجے تک رہا کرتے۔ اپنے بچوں سے وہ جز وقتی کام لیتے تھے کیونکہ وہ پڑھتے تھے اور ان کے خیال میں ان کی تعلیم زیادہ اہم تھی۔

''آج موسم بہت خراب ہے۔'' نک نے باہر دیکھا۔ اس وقت موٹیل مکمل طور پر خالی تھا۔ بارہ بجنے میں ابھی تین منٹ تھے، اس کے بعد وہ یہاں سے جا سکتے تھے۔ جولی نے اپنا کام سر شام نمٹا لیا تھا اس لیے اسے فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے اور نک کے لیے کافی بنا لائی۔ باہر درجۂ حرارت یقیناً منفی میں تھا۔ اس کا اثر اندر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ گرم کافی نے انہیں کافی سکون پہنچایا۔

''ہاں لیکن یہ معمول کی بات ہے۔'' جولی بولی۔ ''ویسے ہمیں ان دنوں کے لیے بھی کوئی جز وقتی ملازم رکھ لینا چاہیے۔''

''اس موسم میں کوئی ملازم مشکل سے ہی ملے گا۔'' نک نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''اور اگر ملا بھی تو منہ مانگا معاوضہ لے گا۔''

''تو دے دو... اس مصیبت سے تو جان چھوٹے۔ تین چار گھنٹے بلاوجہ بیٹھنا پڑتا ہے۔''

نک سوچ میں پڑ گیا۔ جولی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب ان کی عمر بھی نہیں رہی تھی۔ نک باون سال کا ہو گیا تھا اور جولی آنے والی دسمبر کی دوسری تاریخ کو اڑتالیس کی ہو جاتی۔ مسلسل محنت اور آرام کی کمی نے ان کو تھکا دیا تھا۔ ان کی آمدنی بھی اچھی تھی۔ سارے اخراجات اور ٹیکس نکال کر وہ سال میں چالیس پچاس ہزار ڈالرز بچا لیا کرتے تھے۔ اگر اس میں سے کچھ وہ اپنے آرام پر خرچ کر دیتے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

نک نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں کل ہی اخبار میں اشتہار دے رہا ہوں۔ ممکن ہے کوئی اچھا آدمی مل جائے۔''

جولی خوش ہو گئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''بارہ بجنے والے ہیں۔''

وہ رات کو ریستوران اور دفتر بند کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے دفتر کے داخلی دروازے پر ایک انٹرکام لگا رکھا تھا جس سے ان کی خواب گاہ میں رابطہ ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی گاہک رات کے وقت آ جاتا تو اسے مایوس واپس جانا نہیں پڑتا تھا۔ وہ اٹھ گئے۔ جولی مگ کچن میں رکھنے چلی گئی۔ نک دفتر بند کرنے لگا تھا کہ اسے سڑک کی طرف سے روشنی لہراتی دکھائی دی اور چند لمحے بعد ایک پرانی سی خستہ حال کار آ کر پارکنگ میں رکی۔ اس سے ایک نوجوان نکل کر بھاگتا ہوا دفتر تک آیا۔ نک دروازہ لاک کرتے کرتے رک گیا۔ لڑکا اندر آ گیا۔ وہ نحیف اور کسی قدر فاقہ زدہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکینی تھی اور اس نے ایک پرانا سا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ سردی سے اس کی حالت بُری ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے کالر پر گری برف جھاڑی اور بولا۔

''مجھے ایک کمرا چاہیے... لیکن کرایہ کم ہو۔''

نک عام طور سے سنگل کمرے کا کرایہ تیس ڈالرز لیتا تھا لیکن یہ میزبان [illegible] کرایہ نصف کر دیتا تھا۔ وہ [illegible] گھڑی کی طرف آیا۔ [illegible] میں نصف کرایہ لیتے ہیں۔ صرف پندرہ ڈالرز۔''

نوجوان نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''میری اتنی گنجائش نہیں ہے، میں صرف دس ڈالرز دے سکتا ہوں۔''

نک عام طور سے کرائے کے معاملے میں سمجھوتا نہیں کرتا تھا کیونکہ اس نے بھی گاہکوں کو دی جانے والی سہولتوں میں بھی سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک ساکھ تھی اور اسے اپنی ساکھ کا بہت خیال تھا لیکن اس نوجوان کی حالت دیکھ کر اسے ترس آنے لگا۔ یقیناً اس سے سردی برداشت نہیں ہوئی تھی تبھی وہ یہاں چلا آیا تھا۔ نک نے سر ہلایا۔ ''او کے! تمہارے لیے دس ڈالرز ہیں لیکن کمرا صبح بارہ بجے تک کے لیے ہوگا۔''

نوجوان نے سر ہلایا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

نک نے رجسٹر کھولا۔ ''نام اور ڈرائیونگ لائسنس۔''

نوجوان نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا نام جارج مائیکل تھا۔ نک نے نام اور لائسنس نمبر لکھا اور اس سے دس ڈالرز طلب کیے۔ اس نے اپنے مڑے تڑے بٹوے سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیا، اس کا بٹوا بھی خالی تھا۔ نک نے اپنا کوٹ پہنا اور چابی لے کر اس کے ساتھ باہر آیا۔ سردی واقعی قیامت خیز تھی۔ ہوا جیسے کپڑوں سے گزر کر ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ وہ جارج کو سنگل روم والی لائن میں لایا۔ اس نے لاک کھول کر اسے کمرا دکھایا۔ تمام چیزوں کے بارے میں بتایا۔

''اپنا اطمینان کر لو... میں اب سونے جاؤں گا۔'' نک نے کہا۔ ''رات کو دفتر بند ہوتا ہے، تم کوئی شکایت نہیں کر سکتے۔''

نوجوان نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے دس ڈالرز میں مجھے چھپانے کی جگہ دے دی، میرے لیے یہی کافی ہے۔''

''پھر بھی تم دیکھ لو۔'' نک نے اصرار کیا تو اس نے ایک نظر ہر چیز پر ڈال لی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' وہ بولا تو نک نے کمرے کی چابی اس کے حوالے کر دی۔ جارج ہچکچایا۔ ''کیا کھانے کو کچھ ملے گا؟''

''اس وقت تو نہیں، صبح مل سکے گا۔'' نک نے جواب دیا۔ ''اپنی کار یہاں لے آؤ۔ تم نے اسے دفتر کے سامنے پارک کر دیا ہے... اور دوسرے اگر صبح سے پہلے جاؤ تو چابی یاد سے دروازے میں لگا کر جانا۔''

''تم فکر مت کرو، میرا اتنی صبح جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

وہ نک کے ساتھ آیا اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ نک اندر آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ جولی کچن سے برآمد ہوئی جو دفتر کے ساتھ ہی تھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''پتا نہیں... لیکن غربت کا مارا ہے۔ میں نے اس سے دس ڈالرز چارج کیے ہیں۔ کھانے کا بھی پوچھ رہا تھا۔''

جولی بولی۔ ''دو تین سینڈوچز بچ گئے ہیں، وہ اس کو دے دو۔''

نک نے پہلے انکار کا سوچا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ گھر جانے کے لیے باہر تو نکلنا تھا۔ وہ اسے سینڈوچز دیتا ہوا چلا جائے گا۔ جولی نے فریزر سے نکال کر ایک منٹ میں سینڈوچز گرم کر دیے اور خود چلی گئی۔ نک ڈسپوزیبل ٹرے لے کر جارج کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو نک نے ٹرے آگے کر دی۔

''بس یہی بچے تھے۔ یہ موٹیل کی طرف سے ہیں، تم سے ان کی قیمت نہیں لی جائے گی۔''

جارج کی باچھیں کھل گئیں۔ ''بہت شکریہ جناب۔'' اس نے جلدی سے ٹرے لے لی۔ نک گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی جارج نے دروازہ بند کیا اور سینڈوچز پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے گزشتہ تیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آخری کھانا اس نے کل رات ایک رات بھر کھلے رہنے والے ریستوران میں کھایا تھا اور یہ ایک چیز برگر تھا۔ یہی سب سے سستی چیز تھی جو وہ وہاں سے لے سکتا تھا۔

جارج ایک چور تھا... معمولی درجے کا اور چھوٹی موٹی چیزیں چرانے والا۔ اصل میں اس میں حوصلہ نہیں تھا اور وہ کوئی بڑی واردات کرنے سے ڈرتا تھا جس میں پکڑے جانے کا امکان ہو۔ اس لیے وہ چھوٹی موٹی چیزوں پر گزارہ کرتا تھا۔ مثلاً کسی گھر کے کھلے دروازے سے گھس کر جو چیز سامنے آئی، وہ اٹھالی یا کسی دکان سے کچھ پار کر لیا۔ جارج ایک کام اور کرتا تھا۔ وہ موٹیلز میں گھس کر وہاں سے چیزیں چرا لے جاتا تھا۔ خاص طور سے دفتر سے اسے بہت کچھ مل جاتا تھا۔

لیکن موسم سرما شدید ہونے کی وجہ سے جارج کا کام بھی ٹھپ تھا۔ اول تو اسے کسی گھر میں گھسنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ چھوٹی عمارتیں جہاں کوئی چوکیدار نہیں ہوتا اور لوگ اپنی ٹوپیاں، کوٹ اور چھتریاں نیچے لابی میں چھوڑ جاتے ہیں، اب وہ بھی بند ملتی تھیں۔ موٹیلز بند ہو گئے تھے۔ جارج نے جنوب کی طرف جانے کا سوچا جہاں موسم بہتر تھا اور ساتھ ہی مواقع بھی بہتر تھے۔ وہ کینیڈا کی سرحد کے پاس واقع ایک چھوٹے سے شہر سے جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں برف باری کے ساتھ طوفان نے آ لیا اور یہاں پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے یہ موٹیل نظر آیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں رک گیا۔

موٹیل کا دفتر دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ یہ ذرا خوشحال قسم کا موٹیل ہے اور ممکن ہے کہ اسے یہاں سے کچھ مل جائے۔ نقد رقم نہ سہی، کوئی ایسی چیز جسے فروخت کر کے وہ جنوب تک جانے کے لیے رقم حاصل کر سکتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس صرف تیس ڈالرز تھے اور اسے معلوم تھا کہ اس موٹیل میں کمرے کا کرایہ زیادہ ہوگا اس لیے جب نک نے اسے پندرہ ڈالرز بتائے تو اسے حیرت ہوئی اور اس نے منت بھرے انداز میں بات کر کے کرایہ دس ڈالرز کرا لیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ موٹیل کا مالک شریف آدمی ہے۔ پھر اس نے اسے کھانے کو بھی دیا تھا۔

سردی سے زیادہ بھوک سے اس کا بُرا حال تھا اور سینڈوچز کھا کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے باتھ روم میں آ کر دیکھا۔ وہاں باتھ ٹب تھا اور گرم پانی بھی آ رہا تھا۔ جارج کو کئی دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے ٹب گرم

نے تجوری کھولی ہی نہیں تھی۔

اس سے اگلی بار نک یا جولی میں سے کسی نے پین کی پوزیشن چھیڑ دی تھی اس لیے وہ تجوری کی ریکارڈنگ نہیں کر سکا..... اس کے بجائے ساری ریکارڈنگ ایک طرف دیوار کی آئی تھی لیکن بوگی نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ روز رات کو جا کر پین رکھ آتا اور اس سے اگلے دن لا کر اس کی ریکارڈنگ چیک کرتا۔ اسی دوران سیزن خاتمے کے قریب آ گیا اور وہ اب تک تجوری کھولنے کی ویڈیو حاصل نہیں کر سکا تھا۔ بوگی مایوس ہونے لگا کہ شاید اب اسے موقع نہ ملے۔ البتہ اس پین سے ایک فائدہ ہوا تھا۔ اس میں آواز کی ریکارڈنگ بھی ہوتی تھی۔ اس نے نک اور جولی کی بہت ساری باتیں بھی سنی تھیں اور ان سے اسے پتا چلا کہ نک یہ رقم اگلے سال کے شروع تک اسی تجوری میں رکھے گا اور پھر اسے بینک میں جمع کرا دے گا۔ یعنی اس کے پاس ابھی تین مہینے کا وقت تھا۔

اکتوبر کے شروع تک کینیڈا سے واپس آنے والے سیاحوں کا رش بھی ختم ہو گیا۔ اب معمول کا کام چل رہا تھا اور پندرہ اکتوبر تک بوگی بھی رخصت ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد کام اتنا کم ہو جاتا کہ نک اور جولی کو اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ بوگی کو اس سے پہلے ہی تجوری کے نمبرز حاصل کرنا تھے۔ وہ کوشش کرتا رہا اور بالآخر اپنی روانگی سے پہلے وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ سرما میں وہ طویل سفر کر کے میامی چلا جاتا جہاں ان دنوں سیاحتی سیزن عروج پر ہوتا۔ وہاں اس کا ایک کزن کشتی چلانے کا کام کرتا تھا اور سیاحوں کو سمندر اور آس پاس کے جزائر کی سیر کراتا تھا۔ بوگی اس کے پاس کام کر لیتا۔ اس طرح اس کا خرچ بھی نکل آتا اور وہ مفت میں سیر و تفریح بھی کر لیتا۔ یہاں بھی اس کی رہائش اور کھانا پینا سب کزن کے ذمے ہوتا۔ پچھلی بار وہ گیا تو کزن نے اس سے کہا کہ اس کی کشتی خستہ حال ہو رہی ہے اور وہ اسے فروخت کر کے کوئی بہتر کشتی لینا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہے، اگر وہ اس کو کچھ رقم دے تو وہ اسے اپنا شریک بنا سکتا ہے۔ بوگی کے خیال میں یہ اچھی پیش کش تھی لیکن اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ البتہ جب اسے تجوری میں موجود ساٹھ ہزار ڈالرز کی امید ہوئی تو اس نے سوچا کہ اگر وہ یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب رہا تو وہ کزن کے ساتھ شراکت کر سکتا ہے۔

جب اس نے کمبی نیشن لاک کے نمبرز حاصل کیے تو اسے یقین نہیں آیا اگرچہ وہ کب سے اس کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ آنے والی رات جب وہ دفتر پہنچا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ آج اسے آزمائشی طور پر تجوری کھولنا تھی کیونکہ اس کا ارادہ ابھی رقم نکالنے کا نہیں تھا ورنہ شک سیدھا اس پر جاتا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب وہ چھٹی لے کر یہاں سے چلا جائے گا تو کسی رات چپکے سے آ کر تجوری کا صفایا کر دے گا اور پھر اس پر شک نہیں جائے گا۔ رات جب نک اور جولی چلے گئے تو اس نے بڑی مشکل سے رات دو بجے تک کا انتظار کیا اور اس کے بعد کمرے میں داخل ہو کر لرزتے ہاتھوں سے تجوری کا لاک کھولنے لگا۔ اس نے نمبرز اتنی بار پڑھے تھے کہ اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ کاغذ پر دیکھ دیکھ کر نمبرز ملا رہا تھا۔ بالآخر سارے نمبرز مل گئے اور اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ تجوری کا ہینڈل گھمایا۔ جب اس کا دروازہ کھلا تو اسے کچھ دیر کے لیے سکتہ ہو گیا۔ سامنے ساٹھ ہزار ڈالرز کی رقم پڑی تھی۔

اس کے ہاتھ بے ساختہ رقم کی طرف گئے لیکن پھر وہ رک گیا۔ یہ اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ وہ ابھی رقم چرا لیتا تو اس کے بعد سکون سے نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی اور وہ کبھی بھی پکڑا جاتا۔ دل پر جبر کر کے اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور پھر تجوری کی باقی چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس میں کاغذات تھے اور چند اہم چیزیں تھیں لیکن صرف نک اور جولی کے لیے... بوگی کے لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بادل ناخواستہ تجوری بند کر کے وہ واپس آیا۔ اس ساری رات اسے رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ وہ جا کر تجوری سے رقم نکالے اور یہاں سے بھاگ جائے۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس نے نک سے کہا۔ ”اس بار مجھے جلدی چھٹی چاہیے۔“

نک کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ رات کو تو اب کوئی نہیں آتا تھا۔ سردی کا موسم شروع ہونے کے بعد اس علاقے میں صرف ٹرک رات کو سفر کرتے تھے اور عام افراد سفر کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس کا کاروبار عام لوگوں سے ہی چلتا تھا اس لیے اس نے بوگی کو جانے کی اجازت دے دی اور اس کا حساب کتاب کر دیا۔ اس بار کیونکہ نک کو منافع زیادہ ہوا تھا اس لیے اس نے بوگی کو پانچ سو ڈالرز کا خصوصی بونس دیا۔ وہ خوش ہوا لیکن اس کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ گھر آیا اور رقم چرانے کا منصوبہ بنانے لگا۔ معمول کے مطابق وہ جنوب کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ بعد میں انکوائری سے بچ سکے۔ وہ بارہ تیرہ سو کلومیٹر دور نیو میکسیکو کے شہر سانتا فے آ گیا۔ یہاں اس نے ایک ٹریلرز پارک میں ایک چھوٹا سا ٹریلر کرائے پر لے لیا اور شمال میں سرما تیز ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک مہینے بعد جب اس نے موسم کی رپورٹ دیکھی جس کے مطابق ... تو ... برفانی طوفان ... آنے کا امکان تھا تو اس نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ وہاں پہنچا تو برف باری کا آغاز ہو گیا تھا اور اگلے روز طوفان کی پیش گوئی تھی۔ بوگی یہاں اپنی موجودگی چھپانے کے لیے غریبوں کے لیے مخصوص ایک فری شیلٹر ہوم میں رکا تھا۔

اگلے روز شام سے برف باری میں شدت آنے کے بعد ہواؤں نے بھی زور پکڑا اور ایک گھنٹے بعد طوفان شدید ہو گیا۔

بوگی رات گیارہ بجے کے وقت چپکے سے شیلٹر سے نکل گیا کیونکہ اس موسم میں کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے پاس کار نہیں تھی اس لیے وہ پیدل ہی موٹیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے بھاری اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور دستانوں کے ساتھ کنٹوپ اور گرم جوتے بھی تھے، اس کے باوجود سردی سے اس کا برا حال تھا۔ ہواؤں سے بچنے کے لیے وہ درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اس کے باوجود سرد ہوائیں جیسے رگ و پے میں گھسی جا رہی تھیں۔ اسے خاصا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا، اس کے بعد ہی وہ نک اور جولی کے موٹیل تک پہنچ پاتا۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کا جسم گرم تھا اور سردی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ کوئی دو گھنٹے بعد موٹیل کے سامنے پہنچا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ... کے ... کے لیے بند کرتا تو رات کے وقت اس کی بیرونی روشنیاں بھی بند رہا کرتی تھیں۔

www.pkdigest.com

بوگی کو موٹیل کے کھلے یا بند ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس کی دلچسپی تو دفتر کی تجوری میں رکھے ساٹھ ہزار ڈالرز سے تھی اور اسے پوری امید تھی کہ یہ رقم اسے تجوری سے مل جائے گی لیکن جب وہ دفتر کے سامنے پہنچا تو اسے موٹیل کی بغلی سمت میں ایک پرانی سی کار کھڑی نظر آئی۔ اسے تعجب ہوا کہ کون اس موسم میں سفر کر رہا ہے اور موٹیل میں آ کر رکا ہے۔ کار سنگل رومز کے سامنے والی پارکنگ میں کھڑی تھی... یعنی جو بھی تھا وہ سنگل ہی تھا۔ بوگی نے مناسب سمجھا کہ جا کر دیکھ لے۔ ممکن ہے وہ شخص جاگ رہا ہو اور کسی وجہ سے دفتر تک چلا آئے۔ وہ اس کمرے تک آیا جس کی روشنی کھڑکی سے جھلک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے ذرا سے کھلے رہ جانے والے پردے سے جھانکا تو اسے ایک شخص کمبل میں لپٹا بستر پر سوتا دکھائی دیا۔ تعجب کی بات تھی کہ کمبل سے اس کے جوتے جھانک رہے تھے۔ اس نے جوتے تک اتارنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ بہرحال، بوگی کو اطمینان ہو گیا کہ وہ سو رہا ہے۔ بوگی پلٹ کر دفتر کی طرف واپس آیا۔ اس کے پاس ریسٹوران کے بیرونی دروازے کی چابی بھی تھی۔ اس نے آرام سے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ دروازہ کھلنے سے گھنٹی بجی... لیکن اسے امید تھی کہ گھنٹی کسی نے نہیں سنی ہو گی۔ اول تو نک اور جولی اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے جو یہاں سے ویسے ہی کچھ فاصلے پر تھا۔ دوسرے باہر طوفان اور ہواؤں کا اتنا شور تھا کہ اس میں کچھ سنائی دینا ناممکن ہی تھا۔ اندر آ کر اس کی جان میں جان آئی۔ اگرچہ ریسٹوران میں ہیٹنگ کا کوئی سسٹم نہیں تھا پھر بھی بند ہونے کی وجہ سے اندر سردی کسی قدر کم تھی اور ہواؤں سے بھی بچت ہو گئی تھی۔ بوگی کے پاس وقت نہیں تھا اس لیے وہ فوری طور پر دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ اسے رقم لے کر صبح سے پہلے شیلٹر ہوم واپس پہنچنا تھا اور اس کے بعد کل اس کے لیے یہاں سے نکل جانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔

☆☆☆

جارج خراٹے لے رہا تھا کہ اچانک باہر کسی بڑی چیز کے گرنے کی آواز آئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تک تو اسے یاد ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ پھر وہ چونکا۔ وہ موٹیل میں تھا اور اس کا ارادہ یہاں کی صفائی کر کے بھاگنے کا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے باہر جھانکا۔ اسے اس آواز کی فکر تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے باہر جھانکا تو اسے پارکنگ کے ساتھ لگا موٹیل کا بڑا سا سائن بورڈ زمین بوس نظر آیا۔ دھماکا اس کے گرنے سے ہوا تھا۔ اسے فکر لگ گئی کہ یہ دھماکا موٹیل کے مالک نے بھی سنا ہو گا اور وہ یہاں آ سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنا کام کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دے اور ذرا دیر بعد اپنی کارروائی کا آغاز کرے۔

جارج بنیادی طور پر بزدل تھا اور ذرا سا خطرہ مول لیتے ہوئے اس کی جان نکل جاتی تھی اس لیے وہ ممکنہ حد تک خطرے سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی اسے ڈر تھا کہ وہ اوزار لینے اپنی کار تک گیا اور موٹیل کا مالک آ گیا تو وہ اسے کیا جواب دے گا؟ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بورڈ گرنے سے اس پر لگی لائٹ بھی ٹوٹ گئی تھی اور پارکنگ میں کسی قدر اندھیرا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

نک گہری نیند میں تھا کہ جولی نے اسے بیدار کیا۔

”نک! اٹھو... یہ باہر سے کیسی آواز آئی ہے؟“

نک ہڑبڑا گیا تھا۔ ”کیسی آواز... کہاں سے؟“

"باہر ہے۔" جولی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "جیسے کوئی بھاری چیز گری ہو۔"

"طوفان ہے، ممکن ہے کوئی درخت گر گیا ہو۔"

"نہیں، یہ درخت گرنے کی آواز نہیں ہے۔" جولی نے نفی میں سر ہلایا۔

مجبوراً نک کو اٹھنا پڑا حالانکہ اس کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ ایک اور خیال نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ موٹیل میں ٹھہرے مسافر نے تو کوئی گڑبڑ نہیں کی ہے۔ ممکن ہے وہ کار لے کر کہیں جا رہا ہو اور اس نے کار کہیں ٹکرا دی ہو۔ وہ اٹھا، اس نے شب خوابی کے لباس کے اوپر ہی اوورکوٹ پہنا اور پاؤں میں جوتے پہن کر باہر جانے لگا۔ جولی بھی دروازے تک آئی۔ اس نے وہیں دیوار سے لگی رائفل اتار کر نک کی طرف بڑھا دی۔ "یہ لے جاؤ، ممکن ہے باہر کوئی مسئلہ ہو۔"

رائفل لوڈ تھی، نک اسے لے کر باہر آیا۔ گرم بستر سے نکل کر باہر آنے پر وہ لرز اٹھا لیکن اسے دیکھنا تو تھا۔ وہ درمیان کا لان عبور کر کے موٹیل کی طرف بڑھا۔ اس طرف ریستوران اور اس کے دفتر والی عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ موٹیل کے رہائشی کمرے دائیں طرف تھے۔ اس نے چابی سے عقبی دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ اسے فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ وہاں کچھ ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہاں کیا تبدیلی آئی تھی۔ وہ ذرا آگے آیا تو اسے یاد آیا کہ اس نے کاؤنٹر کے عقب میں جلنے والی لائٹ کھلی چھوڑ دی تھی اور اب وہ لائٹ بند تھی۔ نک یک دم چوکنا ہو گیا اور اس نے رائفل مضبوطی سے پکڑ لی۔

☆☆☆

بوگی اس وقت تجوری کھول رہا تھا اور اس نے سارے کمبی نیشن لگا دیے تھے، بس ہینڈل گھما کر دروازہ کھولنا باقی تھا۔ اچانک اسے باہر سے دھماکا سنائی دیا۔ اس کا دل رک سا گیا۔ اسے بالکل نہیں معلوم تھا کہ دھماکا کس نوعیت کا ہے لیکن اس نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ اس نے جلدی سے تجوری کا ہینڈل چھوڑا اور لپک کر دفتر کے دروازے تک آیا۔ اس نے اس ذرا سی جھری کر کے باہر جھانکا لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ بہت دیر تک کھڑا سن گن لیتا رہا کہ کوئی آواز .... آئے لیکن جب کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ واپس آیا اور اس نے تجوری کا ہینڈل گھما کر اس کا دروازہ کھولا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سامنے نوٹوں کی کئی گڈیاں رکھی ہیں۔ مارے خوشی کے اس پر کچھ دیر کے لیے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ یہ رقم اسے ساٹھ ہزار سے زیادہ لگ رہی تھی پھر اس نے چونک کر لرزتے ہاتھوں سے گڈیاں اٹھائیں۔ یہ سو سو کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں اور ہر گڈی میں دس ہزار ڈالرز تھے جبکہ ایسی کل نو گڈیاں تھیں۔ مارے خوشی کے .... پھر اسے سکتہ ہو گیا۔ وہ تو ساٹھ ہزار کی آس میں آیا تھا اور یہاں تجوری میں نوّے ہزار ڈالرز موجود تھے۔ اس نے جلدی جلدی گڈیاں نکال کر اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ٹھونس لیں۔ پھر تسلی کے لیے اس نے تجوری کا مزید معائنہ کیا کہ شاید کچھ اور بھی مل جائے لیکن اندر مزید رقم یا کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ اس نے تجوری بند نہیں کی، اسے یونہی کھلا رہنے دیا۔

وہ دفتر کے کمرے سے نکلا۔ اس نے اسے بھی بس ایسے ہی بند کر دیا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ کسی پیشہ ور چور کا کام ہے اور ظاہر ہے چور جاتے ہوئے تجوری یا دروازے کا لاک لگا کر نہیں جاتے... لیکن جیسے ہی وہ باہر آیا، اسے ریستوران کا عقبی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس وقت بوگی نے بہت پھرتی سے کام لیا۔ وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر کاؤنٹر کے پاس روشن بلب بند کر دیا اور خود کاؤنٹر کے نیچے گھس گیا۔ کامیابی کا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور وہ پکڑے جانے کے خوف سے کانپ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اسے [illegible] قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اسے معلوم تھا کہ عقبی دروازے کو کھول کر صرف نک یا جولی اندر آ سکتے ہیں۔ یہ ان میں سے کوئی تھا۔ پھر بوگی نے نک کے جوتے دیکھے اور اسے اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر آئی۔ رائفل دیکھ کر اسے اس موسم میں بھی پسینا آ گیا۔ اگر وہ پکڑا جاتا اور نک کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کی تجوری کا صفایا کر کے جا رہا ہے تو شاید وہ اسے گولی مار دیتا اور وہ اس میں حق بہ جانب ہوتا۔ نک اس کے بالکل پاس سے گزر کر دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اندر کسی چور کی موجودگی کی توقع ہو۔ بوگی کو اندازہ نہیں تھا کہ نک کو دفتر میں کسی کی موجودگی کا شبہ کیسے ہوا۔ نک نے اندر جا کر لائٹ جلائی اور پھر تجوری کی طرف گیا۔

بوگی کے پاس یہی ایک موقع تھا۔ اس نے اٹھ کر پھرتی سے دفتر کا دروازہ کھینچ کر اسے باہر سے بولٹ کر دیا اور باہر کی طرف لپکا۔ اندر دفتر میں نک شور مچا رہا تھا۔ ریستوران کی عمارت سے باہر نکل کر نک نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ آیا تو پیدل تھا لیکن یہاں سے پیدل جانے کا مطلب تھا کہ پولیس راستے میں کہیں بھی آ کر گرفتار

کر سکتی تھی۔ اسے یہاں سے جانے کے لیے ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ نک کی کار اور پک اپ اس کے گھر کے گیراج میں ہوتی تھیں۔ ان کو وہاں سے لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب صرف ایک گاڑی تھی جو موٹیل کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ اگرچہ اس کی حالت نہایت خستہ تھی لیکن بوگی کو امید تھی کہ وہ چلتی بھی ہوگی۔ آخر اس کا مالک اسے چلا کر ہی یہاں تک لایا ہوگا۔ وہ پارکنگ کی طرف لپکا اور اس نے دل ہی دل میں کار کا دروازہ کھلا ہونے کی دعا مانگی... اس نے دروازہ کھینچا تو وہ کھل گیا۔

☆☆☆

جارج کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ چور تھا اور اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا بھی کسی چور سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ وہ شخص پوری دیدہ دلیری سے اس کے سامنے اس کی کار میں گھسا ہوا تھا اور شاید اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کار کے دروازوں کے لاک برسوں پہلے خراب ہو چکے تھے اور جارج نے ان کو ٹھیک کرانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ کار میں چرانے لائق کچھ تھا ہی نہیں، اس وجہ سے بھی جارج مطمئن تھا۔

لیکن یہ شخص اس کی کار ہی چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چابی جارج کے پاس تھی لیکن وہ شخص تاروں کی مدد سے بھی [illegible] اسٹارٹ کر سکتا تھا۔ جارج کا خون [illegible] اس وقت وہ اپنی بزدلی بھی بھول گیا۔ [illegible] ادھر دیکھا تا کہ اسے کوئی ایسی چیز نظر .... آ جائے جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ وہ باتھ روم میں آیا۔ یہاں ٹب کے اوپر المونیم کا ہلکا سا پائپ لگا تھا، اس نے وہی اتار لیا۔ کچھ نہ ہونے سے یہی بہتر تھا۔ وہ پائپ لے کر باہر آیا اور کار کی طرف بڑھا۔ وہ شخص نیچے جھکا یقیناً تاروں کی مدد سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کار کے پاس پہنچ کر جارج جھک گیا اور سن گن لینے لگا۔ یہاں تک تو وہ آ گیا تھا لیکن اب اس پر خوف طاری ہو رہا تھا کہ کہیں اس چور کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہ ہو۔

پھر اسے ڈکی میں رکھے جیک کے لیور کا خیال آیا۔ وہ اچھا ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس المونیم کے پائپ سے کسی کو بے ہوش کرنا چمچ سے پہاڑ کھودنے کے برابر تھا۔ وہ جھکے جھکے ڈکی تک آیا۔ اس نے چابی سے اس کا لاک کھولا... کیونکہ ڈکی میں اس کے اوزار اور سامان ہوتا تھا اس لیے اس کا تالا اس نے ہموار رکھا تھا۔ ڈکی ذرا سی کھول کر اس نے ہاتھ اندر ڈالا اور ٹٹول کر جیک لیور تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

نک اس وقت گولیاں اگلنے والی مشین بنا ہوا تھا۔ اسے اس دیدہ دلیر چور پر شدت سے غصہ آ رہا تھا جس نے نہ صرف اس کی تجوری کھول کر نوّے ہزار کی خطیر رقم چرائی تھی بلکہ اسے دفتر میں بھی بند کر گیا تھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے میز پر رکھے فون سے گھر میں کال ملائی اور جیسے ہی جولی نے فون اٹھایا، وہ بولا۔

"جولی! جلدی سے ریستوران میں آؤ۔ ڈپلی کیٹ چابی لیتی آنا۔ ایک خبیث چور نے مجھے دفتر میں بند کر دیا ہے۔ عقبی دروازہ اندر سے بند ہے، تم اسے صرف چابی سے کھول سکتی ہو۔"

"میرے خدا!" جولی بولی۔ "میں آ رہی ہوں۔"

جولی کو آنے میں دو منٹ لگے۔ وہ بنا کوئی گرم چیز پہنے آ گئی تھی۔ جیسے ہی اس نے دفتر کا دروازہ کھولا، نک اندر سے بگولے کی طرح نکلا۔ اس نے جولی سے کہا۔ "تم پولیس کو کال کرو، وہ تجوری کھول کر ساری رقم لے گیا ہے۔"

"نہیں۔" جولی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ فون کی طرف لپکی۔ نک باہر بھاگا۔ اس نے رائفل سامنے کر رکھی تھی اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ .... چور نظر آ گیا تو وہ اسے بنا کسی وارننگ کے شوٹ کر دے گا۔ اسے دفتر کے سامنے تو کوئی نظر نہیں آیا لیکن موٹیل کی پارکنگ میں اندھیرا دیکھ کر وہ چونکا اور اس طرف بڑھا تو اسے موٹیل کا بورڈ زمین پر گرا نظر آیا۔ اب اسے سمجھ آیا کہ دھماکا کس چیز کا ہوا تھا۔

چور اسے کہیں نظر نہیں آیا لیکن جب اس نے موٹیل کی طرف دیکھا تو اسے جارج کی کار کے پاس ایک سایہ نظر آیا جو اس کی ڈکی کے ساتھ بیٹھا اور ہاتھ ڈال کر ڈکی سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نک جوش سے بھر گیا۔ چور اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا... اس نے رائفل سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور ڈکی کے ساتھ بیٹھا آدمی اچھل کر زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ نک بھاگ کر اس کے پاس آیا۔ یہاں موٹیل کے برآمدے کی روشنی آ رہی تھی۔ اسے زمین پر جارج پڑا نظر آیا۔

'اچھا تو یہ چور ہے۔' نک نے سوچا اور جلدی جلدی اس کی تلاشی لی۔ اسے نوّے ہزار ڈالرز کی تلاش تھی۔ وہ پولیس کی آمد سے پہلے انہیں اپنے قبضے میں کر لینا چاہتا تھا۔ ورنہ ایک بار ان کا اندراج سرکاری ریکارڈ میں ہو جاتا تو اسے اتنی بڑی رقم اپنے انکم ٹیکس ریٹرن میں ظاہر نہ کرنے پر جواب دہی کرنا پڑتی اور امکان یہی تھا کہ وہ مصیبت میں پڑ

www.pkdigest.com

جاتا۔ اس لیے رقم حاصل کرنا لازمی تھا لیکن جارج کے لباس کی مکمل تلاشی لینے پر بھی اسے کچھ نہیں ملا.... نوٹ گڈیاں معمولی حجم نہیں رکھتیں اور اس کے پاس بٹوے میں سوائے دس ڈالرز کے اور کچھ نہیں تھا۔ نک کا پریشانی سے بُرا حال ہوگیا۔

'کہیں میں نے چور سمجھ کر ایک بے گناہ آدمی کو تو نہیں مار دیا؟' اس نے سوچا اور جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، اسے جولی کی یاد آئی۔ ہر مشکل میں وہی اس کی بہترین مشیر ہوتی تھی۔ وہ دفتر کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

کار میں دبکا ہوا بوگی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ رائفل کا دھماکا سن کر اسے یہی لگا جیسے فائر اس پر ہوا ہے لیکن پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ بند کار میں بھلا کون اس پر فائر کر سکتا تھا؟ اس نے احتیاط سے سر ذرا اوپر کر کے دیکھا تو اسے عقب میں رائفل بدست نک کھڑا نظر آیا۔ بوگی جلدی سے نیچے ہو کر سیٹوں کے درمیان میں گھس گیا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ نک ابھی اسے پکڑ لے گا اور پھر اسے شوٹ کر دے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نک نے کس پر فائر کیا تھا؟ اس وقت وہ رقم بھی بھول گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح یہاں سے صحیح سلامت نکل جائے۔

کچھ دیر بعد اس نے احتیاط سے سر اوپر کر کے دیکھا تو نک اسے ریسٹوران کی عمارت کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اس کے غائب ہوتے ہی بوگی سرک کر سیٹ سے نکلا اور دروازہ کھول کر کار سے باہر آتے ہی ہائی وے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہر لمحے اسے لگ رہا تھا کہ ابھی پیچھے سے اس پر فائر ہو گا لیکن کوئی فائر نہیں ہوا اور وہ صحیح سلامت ہائی وے تک پہنچ گیا۔ یہاں رک کر اس نے اپنا سانس درست کیا اور پھر آگے قدم بڑھایا تھا کہ ایک پولیس کار نمودار ہوئی اور اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس کے پاس بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔

☆☆☆

دفتر میں نک، جولی کو صورت حال سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اس کی بات نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس نے سر پکڑ لیا۔ "اف... نک! تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے چور کو شوٹ کر دیا اور وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا... یہ کیسے ممکن ہے؟"

نک نے چند گہری سانسیں لے کر اپنی بدحواسی پر قابو پایا اور بولا۔ "جولی! بات یہ ہے کہ میں نے مسافر کی کار کے پاس اسے دیکھ کر گولی چلا دی اور جب میں نے اس کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے رقم نہیں نکلی۔"

"رقم نہیں نکلی!" جولی کا صدمے سے بُرا حال ہوگیا۔ "تو رقم کہاں گئی؟"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں، میں نے غلطی سے جارج کو چور سمجھ کر شوٹ کر دیا... حالانکہ چور کوئی اور ہے اور وہ رقم لے کر فرار ہوگیا ہے۔"

"میرے خدا!" جولی نے سر تھام لیا۔ "اب کیا ہوگا؟ پولیس آنے والی ہوگی۔"

"ہم نوّے ہزار ڈالرز کا ذکر نہیں کر سکتے... اور پولیس کو کیا بتائیں گے کہ ہم نے اپنے ہی گاہک کو چور سمجھ کر شوٹ کر دیا۔"

جولی کراہی۔ "ہماری ساری ساکھ تباہ ہو جائے گی اور کوئی ہمارے موٹیل میں پھٹکے گا بھی نہیں۔"

"اب سوچو کہ کیا کرنا ہے؟"

"اگر میں نے پولیس کو اطلاع نہ دی ہوتی تو ہم لاش غائب کر دیتے۔" جولی نے کہا۔ "اب تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔"

نک نے سرد آہ بھر کر کچھ کہنا چاہا مگر اسی لمحے موٹیل کے سامنے پولیس کار نمودار ہوئی۔ اس کی اوپری بتیاں دور سے نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

جارج کو یوں لگا جیسے فائر کی آواز کے ساتھ اس کے جسم میں دہکتا ہوا انگارہ گھس گیا ہو اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ برف پر پڑا تھا۔ وہ اپنے اندر اتنی ناتوانی محسوس کر رہا تھا جیسے اب تب میں اس کا انتقال ہونے والا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ گولی اسے کسی نازک جگہ لگی تھی اور شاید اسے اس لیے ہوش آگیا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکے۔ کچھ دیر ساکت پڑے رہنے کے بعد اسے اپنا زخم دیکھنے کا خیال آیا اور اس نے جسم کو ٹٹولا لیکن پورا جسم دیکھنے کے بعد اسے کہیں بھی کوئی زخم نہیں ملا۔ وہ کھڑا ہوگیا اور یہ جان کر اس کی ناتوانی بھی رخصت ہوگئی کہ اسے گولی نہیں لگی ہے۔

'وہ سب میرے تخیل کا کرشمہ تھا۔' اس نے تعجب سے سوچا۔ فائر کی آواز سن کر اس نے فرض کر لیا تھا کہ اسے گولی لگ گئی ہے۔ اس پر فائر یقیناً اس چور نے کیا تھا جو اس کی کار میں گھسا ہوا تھا۔ اس پر گولی چلا کر وہ سمجھا کہ اس نے اسے قتل کر دیا ہے اور پھر وہ ڈر کر بھاگ گیا جبکہ جارج صرف خوف سے بے ہوش ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کار میں جھانکا۔ اسے خالی پا کر جارج کو بے پناہ خوشی ہوئی۔ وہ ڈکی کی طرف آیا کہ اس میں لگی چابی نکال لے۔ اچانک ہائی وے کی طرف سے پولیس کار نمودار ہوئی۔ اس کے اوپر جگمگاتی روشنیاں اس موسم میں بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ جارج پھرتی سے کار میں گھس گیا۔ موٹیل کے کمرے میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ کار میں گھس کر وہ سیٹ پر لیٹ گیا تا کہ باہر سے نظر نہ آسکے۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا اور مرتے مرتے بچا تھا مگر چور کے پاؤں نہیں ہوتے۔ وہ پولیس کے سامنے کس طرح کھڑا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

پولیس کار سے دو پولیس والے اترے اور دفتر کی طرف آئے۔ نک نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ آنے والوں میں ایک علاقے کا ڈپٹی شیرف کوکر مولین تھا۔ اس نے نک سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کوئی دفتر میں گھسا اور اس نے تجوری کھول لی۔" نک نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"کوئی نقصان ہوا؟"

"ہاں، تجوری میں دس ہزار ڈالرز تھے... چور وہ لے گیا۔"

کوکر نے ایک نوٹوں کی گڈی سامنے کی۔ "یہ دس ہزار ڈالرز؟"

نک کو سکتہ ہوگیا، یہ اسی کی رقم تھی۔ جب پولیس نے ایک گڈی برآمد کی تھی تو باقی رقم بھی پولیس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔ اس نے بہ مشکل اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں، یہی رقم ہے۔"

"ہم نے چور کو پکڑ کر اس کے پاس سے رقم برآمد کر لی ہے۔" کوکر نے کہا۔ "وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

نک اور جولی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ کیا معمّا ہے؟ چور نوّے ہزار ڈالرز لے گیا تھا اور پولیس نے اس کے پاس سے دس ہزار ڈالرز برآمد کیے تھے۔ باقی رقم کہاں گئی؟ جولی جذباتی ہو کر کہنے لگی۔ "وہ جھوٹ بولتا ہے..."

"وہ ہے کہاں؟" نک جلدی سے بیوی کی بات کاٹ کر بولا۔

"کار میں بیٹھا ہوا ہے۔ ابھی ہم نے اس سے کچھ پوچھا نہیں ہے... لیکن مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔"

نک اور جولی باہر آئے۔ جب انہوں نے پولیس کار کی پچھلی نشست پر ہتھکڑی بدست بوگی کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔

"یہ بوگی ہے... ہمارے پاس کام کرتا تھا۔"

جھک کر بوگی سے سرگوشی میں پوچھا۔ "باقی رقم کہاں ہے؟"

"خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔" بوگی منمنا کر بولا۔ "مجھے ان پولیس والوں سے بچالو۔"

"تمہیں بچالیں...؟ جس نے ہماری پشت میں چھرا گھونپا ہے۔" جولی زہریلے لہجے میں بولی۔ "ہماری تو کوشش ہوگی کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ سزا ہو اور تم پانچ چھ سال سے پہلے جیل سے واپس نہ آؤ۔"

اس دوران میں کوکر نے پارکنگ میں کھڑی جارج کی کار دیکھی۔ اس نے نک سے پوچھا۔ "یہ کس کی کار ہے؟"

نک کی حالت جارج کی لاش کا سوچ کر خراب ہو گئی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "ایک آدمی ہے، رات کو یہاں رکا ہے۔"

کوکر کار کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اور نک سوچ رہا تھا کہ ابھی اسے لاش نظر آجائے گی، اس کے بعد اسے جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ وہ ہر طرف سے پھنس رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوکر مریضانہ حد تک ایمان دار پولیس افسر ہے اور نوّے ہزار کیا، نوّے لاکھ بھی اس کا ایمان نہیں ڈگمگا سکتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ باقی کے اسّی ہزار کہاں گئے؟ بالآخر کوکر نے کار سے نظر ہٹائی اور اس سے کہا۔ "اندر چلو، مجھے تم دونوں کا بیان لینا ہے۔"

نک نے سکون کا سانس لیا اور اسے فوراً اندر لے آیا۔

☆☆☆

جارج خوف زدہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس جلد یا بدیر اس کار کا رخ کرے گی اور اسے ان کے بہت سارے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔ پولیس کے پاس اس کا سابقہ ریکارڈ تھا اور وہ اسے فوراً دھر لیتے۔ ممکن ہے اس چوری کا کیا دھرا بھی اس کے سر ڈال دیا جاتا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ پولیس بلاوجہ نہیں آئی تھی بلکہ اسے موٹیل کے مالک نے بلایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چور اس کے دفتر سے کچھ چرا کر بھاگ رہا تھا اور اس نے جاتے جاتے جارج کی کار چرانے کی کوشش کی تھی۔ پولیس کار دفتر کے سامنے کھڑی تھی اور یہ جگہ یہاں سے نظر نہیں آرہی تھی اس لیے کچھ دیر بعد جارج نے سر اٹھا کر دیکھا اور وہاں کسی کو نہ پا کر اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ کار لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، پولیس کار ایک منٹ میں اسے آلیتی۔ اسے یہاں سے پیدل ہی بھاگنا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ کے خانے میں اپنی کچھ چیزیں نکالنے کے لیے اگلی نشست پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ

www.pkdigest.com

کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے وہ چیز اٹھا کر روشنی میں کی تو مارے خوشی کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ سو ڈالرز کے نوٹوں والی ایک گڈی تھی اور یہ دس ہزار ڈالرز تھے۔ گڈی پا کر جارج سب بھول گیا اور اس نے ڈیش بورڈ سے چیزیں نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگر وہ ذرا اور آگے ہو کر دیکھتا تو اسے نشست کے آگے پڑی مزید سات گڈیاں بھی مل جاتیں۔

اب اس کا یہاں سے جلد نکل جانا اور بھی ضروری تھا۔ وہ پکڑا جاتا تو اس رقم سے بھی جاتا۔ وہ محتاط انداز میں کار سے اترا اور ڈکی سے اپنا اوزاروں والا بیگ نکال کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

نک نے اپنا بیان ختم کیا۔ جولی ایک طرف بیٹھی خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اس رقم سے اس نے اپنے گھر کی تزئین و آرائش کا سوچا تھا لیکن اب ان کے پاس صرف دس ہزار ڈالرز تھے اور وہ بھی فی الحال پولیس کی تحویل میں تھے۔ جب تک بوگی کی عدالت میں پیشی نہیں ہوتی، انہیں یہ رقم بھی نہیں مل سکتی تھی۔

کوگر نے نک کے بعد جولی کا بیان لیا۔ نک ڈر رہا تھا کہ وہ جذباتی ہو کر پوری رقم کے بارے میں نہ بتا دے۔ وہ دس ہزار کی وضاحت تو کر سکتا تھا لیکن نوے ہزار کی وضاحت بہت مشکل کام تھا۔ جولی کا بیان لینے کے بعد کوگر نے نک سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کوشش کریں گے کہ جلد از جلد اس کا مقدمہ عدالت میں پیش کر دیں اور اسے سزا دلوا دیں۔ تمہاری رقم ایک ہفتے میں مل جائے گی۔''

کوگر ان سے رقم کی حوالگی اور بیان پر سائن لے کر رخصت ہو گیا۔ باہر طوفان اسی شدت سے جاری تھا۔ نک اب تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ کوگر کو جارج کی لاش کیوں نظر نہیں آئی؟ پولیس کے جاتے ہی وہ اور جولی پارکنگ کی طرف لپکے۔ وہاں پہنچ کر نک کو اپنی آنکھیں ملنا پڑیں۔ جارج کی لاش غائب تھی۔ جولی نے غور سے نک کو دیکھا۔

''لاش کہاں ہے؟''

''وہ یہیں تھا۔'' نک نے ڈکی کے پاس زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' جولی نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ''ورنہ لاش خود بہ خود تو غائب ہونے سے رہی۔''

نک نے کار کے آس پاس دیکھا پھر اس نے ٹارچ سے کار میں جھانکا تو اچھل پڑا۔ اسے اگلی نشست کے ساتھ نوٹوں کی گڈیاں پڑی نظر آ گئیں.... اس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور گڈیاں اٹھائیں تو کل سات گڈیاں نکلیں۔ جولی تو ان کو دیکھ کر ہی خوشی سے پاگل ہو گئی۔ جو رقم وہ اپنے طور پر گنوا بیٹھی تھی، وہ بالکل غیر متوقع طور پر اسے مل گئی تھی۔ اس نے نک سے گڈیاں چھین کر سینے سے لگا لیں۔ پھر اسے خیال آیا اور اس نے گڈیاں گنیں۔ ''یہ تو سات ہیں... ایک کوگر کے پاس ہے تو ایک اور کہاں گئی؟''

''ہاں، ایک کہاں گئی؟'' نک نے کار کے اندر جھانکا پھر اس نے کار میں گھس کر معائنہ کیا۔ اس نے ڈکی تک کھول کر دیکھ لی مگر اس میں سوائے ایک خستہ حال سوٹ کیس کے اور کچھ نہیں تھا اور سوٹ کیس میں دو جوڑے اور چند معمولی سی چیزیں تھیں، گڈی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہے۔ نک نے جارج کو اس کے کمرے میں بھی جا کر دیکھا۔ کمرا خالی تھا اور اس کی چابی اندر میز پر پڑی تھی۔ نک نے چابی سے کمرا بند کیا، کچھ دیر جارج کو آس پاس تلاش کرتا رہا مگر وہ نہیں نظر نہ آیا پھر سردی نے ان کو اندر جانے پر مجبور کر دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اسے گولی نہیں لگی تھی۔'' نک نے برانڈی گلاسوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وہ مکاری کر رہا تھا... جیسے ہی میں اندر آیا، وہ اٹھ کر بھاگ گیا۔''

''مگر کیوں؟'' جولی نے کہا۔ ''اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟''

اس سوال کا نک کے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔

''شاید وہ میرے فائر کرنے سے ڈر گیا تھا۔''

''اسے جہنم میں جھونکو۔'' جولی بےزاری سے بولی۔ ''آج کل نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ بوگی نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔''

''اسے اس کے کیے کی سزا ملے گی۔'' نک نے کہا۔

دونوں میاں بیوی رقم سمیت گھر میں آ گئے۔ ایک گڈی گم ہونے کا معما ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے اس مسئلے پر لعنت بھیجی اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ نک نے جولی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں ایک بات آ رہی ہے...''

''کہ آخری گڈی کہاں ہو سکتی ہے؟'' جولی نے خوش ہو کر پوچھا۔

''نہیں بات یہ ہے کہ میں اگر یہ رقم بینک میں رکھ دیتا تو ہمارے ٹیکس کے چھ ہزار ہی زیادہ کٹتے نا... ہم مزید چار ہزار ڈالرز کے نقصان سے تو بچ جاتے۔''

پہلا رنگ

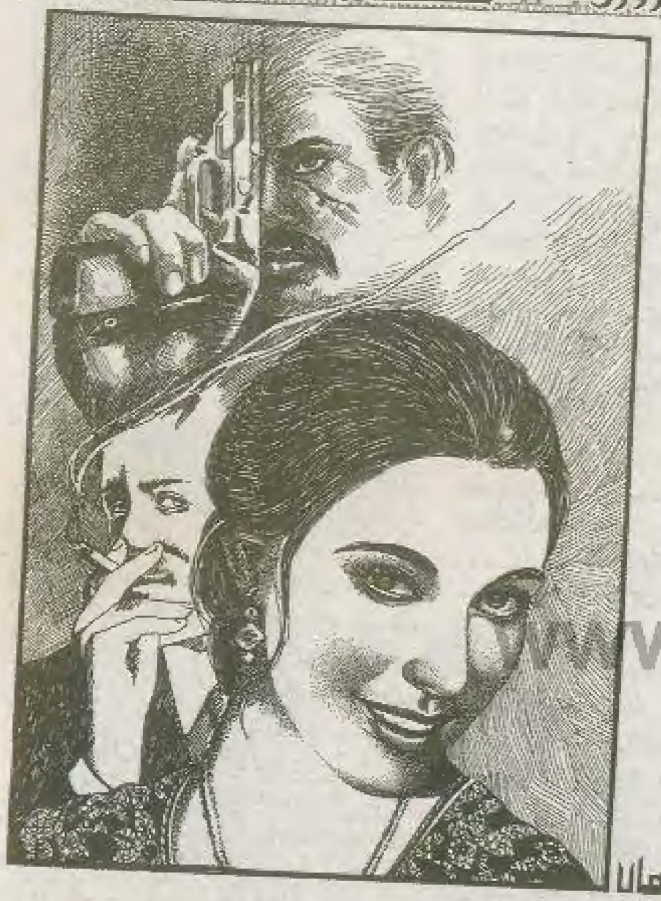

www.pkdigest.com

ڈگمگا

بابر نعیم

ہر شخص خواب دیکھنا چاہتا ہے ...... انسان جب تک زندہ ہے ...... خواب بنتا رہتا ہے ...... خواب دیکھتے رہنا اس کی ضرورت ہے ...... وہ خواب دیکھتے رہنا چاہتا ہے ...... ایک بلند حوصلہ لڑکی کا ماجرا جس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کی مسرت سے لبریز خواب بسیرا کیے ہوتے تھے۔ وہ ہر صورت اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتی تھی۔

شوبز کی چمکتی دمکتی دنیا کی پُرفریب داستان

بنگالی پاڑے میں پولیس موبائل کی آمد کوئی نئی بات نہیں تھی۔

روشی کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ آج پھر علاقے میں کوئی واردات ہوئی ہے اور پولیس اپنی کارروائی کرنے کے لیے یہاں کا رخ کرنے پر مجبور ہوئی۔ اسے بنگالیوں کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش بننے

کے پینتیس سال گزر جانے کے باوجود انہیں پاکستان میں غیر قانونی طور پر مقیم سمجھا جاتا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر کا دعویٰ ہے کہ وہ اور ان کے باپ دادا ہمیشہ سے پاکستانی شہری رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد ہزاروں کی تعداد میں بنگالی روزگار کی تلاش میں پاکستان چلے آئے اور ان کی وجہ سے تمام بنگالیوں کی پاکستانی شہریت کا دعویٰ مشکوک قرار پایا۔ چنانچہ جب بھی کوئی واردات ہوتی تو پولیس کو اپنی کارروائی کا موقع مل جاتا۔ وہ پوچھ گچھ کے بہانے آٹھ دس افراد کو پکڑ کر تھانے لے جاتی۔ ان میں سے کسی کے پاس شناختی کارڈ نہ ہوتا تو کوئی پاکستان میں اپنے قیام کا جواز پیش کرنے میں ناکام رہتا۔ اس کے بعد وہی ہوتا جو یہاں کی ریت ہے۔ پولیس اپنی ''کارروائی'' کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیتی یا پھر سرکار صاحب انہیں چھڑانے کے لیے تھانے پہنچ جاتے۔

اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ موبائل وین کے گرد بہت سے لوگ گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ روشی نے دیکھا کہ ایک پولیس والے نے ایک نوجوان کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ روشی اسے ہزاروں لوگوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ اس کا... کزن شرفو تھا اور اس وقت پولیس والوں کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور شاید اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ پھر اچانک ایک پولیس والے نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے دھکیلتے ہوئے موبائل وین میں بٹھا دیا۔ روشی تیزی سے آگے بڑھی لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی موبائل وہاں سے جا چکی تھی۔

مجمع چھٹنا شروع ہو گیا لیکن چند لوگ وہیں کھڑے اس واقعے پر تبصرہ کرتے رہے۔ روشی تقریباً روتی ہوئی گھر کی جانب پلٹی۔ وہ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہ رہی تھی کہ ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا اچانک ہی اس کے سامنے آ گیا اور دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''شرفو کو پولیس پکڑ کر لے گیا۔''

روشی جانتی تھی کہ وہ اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے اس لیے جل کر بولی۔ ''تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اور اسے چھڑانے کی کوئی ترکیب کرو۔''

''ہم کیا کر سکتا ہے؟'' وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''منجو گیا ہے، چاچا کو بلانے... وہی کچھ کرے گا۔''

شرفو کے باپ کا نام نذرالاسلام تھا لیکن سب اسے نذرل کہہ کر بلاتے تھے۔ مین روڈ پر اس کا پان سگریٹ کا کیبن تھا جو خوب چلتا تھا۔ اس کے باوجود نذرل ہر وقت پیسوں کا رونا روتا رہتا۔ وہ حد درجہ لالچی، خود غرض اور کنجوس شخص تھا اور پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی۔ شرفو اس کی اکلوتی اولاد تھی لیکن اسے بھی وہ ترسا ترسا کر جیب خرچ دیا کرتا۔ اس برائے نام رقم سے شرفو کا گزارہ نہ ہوتا تو وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اِدھر اُدھر چھوٹے موٹے ہاتھ مار لیا کرتا۔ نذرل ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد دوپہر میں دو تین گھنٹے گھر پر آرام کرتا اور اس کی غیر موجودگی میں شرفو کو کیبن پر بیٹھنا پڑتا۔ اسی دوران میں وہ گلے میں سے اپنی ضرورت کے مطابق دس بیس روپے پار کر لیا کرتا۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اول تو دوپہر میں گاہک بہت کم آتے تھے اس لیے گلے میں زیادہ رقم نہ ہوتی۔ دوسرے نذرل انتہائی کائیاں شخص تھا اور دوپہر میں گھر جانے سے پہلے پان اور سگریٹ کا اسٹاک چیک کر لیا کرتا۔ اس طرح شام کو واپس آنے کے بعد اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی کہ اس کی غیر موجودگی میں کتنی سیل ہوئی ہو گی۔ شرفو اپنے باپ کی فطرت سے بہ خوبی واقف تھا، اسی لیے کوئی بڑا ہاتھ مارنے سے کتراتا تھا۔

شرفو بچپن سے ہی شوقین مزاج واقع ہوا تھا۔ ٹی وی کے ڈرامے اور کیبل پر فلمیں دیکھ کر اسے بھی ایکٹر بننے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ شکل صورت اچھی تھی اور عام بنگالیوں کی نسبت اس کا رنگ قدرے صاف تھا۔ وہ خوش لباس تھا اور دن کا بیشتر وقت آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ڈائیلاگ بولنے میں گزار دیتا۔ اگر پیسوں کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی باپ کے کیبن کا رخ نہ کرتا۔ وہ پنواڑی نہیں بلکہ ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پرآسائش زندگی کے خواب سجے ہوئے تھے لہٰذا وہ اپنے سنہری مستقبل کو کتھے چونے کے دھبوں سے کیسے داغ دار کر سکتا تھا؟ اسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس کے سہارے وہ شو بزنس کی دنیا میں داخل ہو سکے لیکن ابھی تک وہ اس شخص کو ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ معروف ٹی وی چینلز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن دروازے سے ہی دھتکار دیا گیا۔ اس کے باوجود شرفو نے ہمت نہ ہاری اور اپنی کوشش میں لگا رہا کہ ایک نہ ایک دن اس کی قسمت کا ستارہ ضرور چمکے گا۔ بس ایک چانس ملنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز اس کے دروازے پر لائن لگائے کھڑے ہوں گے۔

خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ بہت سے لوگوں کو دن میں بھی خواب دیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔ مفلس و لاچار

اور بے بس لوگوں کے پاس خوابوں کا میلا سجانے کے سوا کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔ کوئی روزگار کا خواب دیکھتا ہے تو کسی کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے نوٹوں کی برسات ہو رہی ہوتی ہے۔ کوئی اپنی آنکھوں میں محبوبہ کی تصویر سجائے بیٹھا ہے تو کسی کے سپنوں کا محور عالی شان کوٹھی اور نئی چمچماتی کار ہے۔ خوابوں کی نگری کا ایک باسی شرفو بھی تھا جس کی ایک آنکھ میں ایکٹر بننے کا سپنا تھا تو دوسری آنکھ روشی کے تصور سے منور تھی۔ وہ شرفو کی پھوپی زاد بہن تھی اور بچپن میں ہی یتیم ہو کر اس کے گھر آ گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد اس کی ماں بھی چل بسی اور اس کی پرورش کی ساری ذمے داری نذرل پر آ گئی۔ اس نے روشی کو اپنی بیٹی کی طرح پالا اور شرفو سے زیادہ اس کے لاڈ اٹھائے۔ گو کہ نذرل فطرتاً کنجوس تھا لیکن روشی کی ضروریات پوری کرنے میں اس نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ شرفو نے تو پڑھ کر نہیں دیا لیکن روشی بہت ذہین تھی۔ لہٰذا جب اس نے میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لینے کی خواہش ظاہر کی تو نذرل نے اس کی مخالفت نہیں کی، البتہ اس کی بیوی لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھی۔ اس نے دبے دبے لفظوں میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروانا چاہا لیکن نذرل نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

روشی کو بھی شرفو کی چاہت کا اندازہ تھا۔ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے اس لیے ان کے درمیان انسیت کا پایا جانا ایک فطری بات تھی لیکن شرفو کی طرح روشی کے بھی کچھ خواب تھے۔ وہ بھی اس گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر ایک اچھی زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی وہ جان گئی تھی کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے پیسا کتنا ضروری ہے۔ اردگرد کے ماحول نے اسے حد درجہ حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ شرفو اسے بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کی مردانہ وجاہت، خوش پوشی اور دلچسپ باتوں سے محظوظ ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اسے اچھا لگتا تھا لیکن اپنے خوابوں کے شہزادے کے بارے میں روشی نے جو تصویر بنا رکھی تھی، شرفو اس فریم میں کہیں فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جس کا کوئی واضح مستقبل نہ ہو۔ پاڑے کے دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ خوابوں کی نگری میں بھٹکنے کے بعد ایک دن شرفو کو بھی اپنے باپ کا کیبن ہی سنبھالنا ہو گا۔ اس تصور سے ہی اسے جھرجھری آ جاتی، ایک پنواڑی کی بیوی بننا اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

شام سے پہلے شرفو گھر واپس آ گیا۔ نذرل جانتا تھا

> ایک لڑکا۔ ''کیا تمہیں وہ لڑکی ابھی تک یاد ہے جس سے تم نے پہلی بار محبت کی تھی؟''
> دوسرا لڑکا۔ ''نہیں، میری یادداشت بہت کمزور ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی بھی یاد نہیں، جس سے آج صبح میں نے اظہارِ محبت کیا تھا۔''

کہ وہ اکیلا تھانے گیا تو کوئی اس کی بات نہیں سنے گا۔ جیسے ہی منجو نے اسے بتایا کہ شرفو کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے، وہ کیبن بند کر کے سرکار صاحب کے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ سرکار صاحب کی حیثیت گاڈ فادر جیسی تھی۔ اس کے ماضی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا لیکن حال سے سب واقف تھے۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ ہوگی۔ وضع قطع سے وہ کوئی شریف آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، بائیں گال پر زخم کا نشان اور چہرے پر چھائی کرختگی دیکھ کر کوئی بھی اس کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا... لیکن کسی نے اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی بلکہ علاقے میں اس کا اچھا خاصا اثر رسوخ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ جو شخص بھی سرکار صاحب کے پاس پہنچ جائے، وہ اس کا کام ضرور کرتا ہے۔ بنگالی پاڑے کے رہنے والوں کو آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ درپیش رہتا۔ کسی کو شناختی کارڈ بنوانا ہے، کوئی پاسپورٹ کے لیے پریشان ہے، ملازمت کے لیے ضمانت کی ضرورت ہے یا کوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے... ان سب کے لیے سرکار صاحب کی بلا معاوضہ خدمات حاضر تھیں۔ وہ ہر ایک کے کام آتا اور لوگوں کی دعائیں لیتا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس نے کبھی کسی کام کا معاوضہ وصول نہیں کیا بلکہ اگر کوئی اپنی خوشی سے اسے کچھ دینے کی کوشش کرتا تو وہ اسے سختی سے جھڑک دیتا۔ بظاہر اس کی آمدنی کا ذریعہ یہ چھوٹا سا ہوٹل ہی تھا جہاں صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک بنگالیوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اسی ہوٹل کے عقبی کمرے میں سرکار صاحب نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا جہاں وہ دن کا بیشتر وقت ملاقاتیوں سے ملنے میں گزارتا۔

سرکار صاحب کا طرزِ زندگی دیکھ کر بہت سے لوگوں کو شک گزرتا کہ ہوٹل کی آمدنی سے یہ ٹھاٹ باٹ ممکن نہیں لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی بول سکے۔ ویسے بھی لوگوں کو آم کھانے سے غرض تھی، پیڑ گننے سے کیا حاصل۔ سرکار صاحب کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان میں کچھ سرپھرے ایسے بھی تھے جو اس کے خلاف کچھ سننا برداشت نہیں کرتے تھے۔ کسی کو اس سے غرض نہیں

www.pkdigest.com

تھی کہ سرکار صاحب کے یہ ٹھاٹ باٹ کس طرح پورے ہوتے ہیں۔ وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ مصیبت کے وقت وہی ان کا ساتھ دیتا ہے اور پائی پیسا لیے بغیر ان کا کام کروا دیتا ہے۔ ان کے لیے وہ گاڈ فادر جیسا درجہ رکھتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ سرکار صاحب اگر کسی الیکشن میں حصہ لے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔

نذرل ہانپتا کانپتا سرکار صاحب کے ہوٹل پہنچا تو وہ اس وقت اپنے دفتر میں تنہا بیٹھا ٹی وی سے دل بہلا رہا تھا۔ نذرل کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ”ارے نذرل تم! خیریت تو ہے، کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟“

”صاب! خیریت نہیں ہے۔ وہ لوگ ہمارا شرفو کو لے گیا ہے۔ اب اسے مارتا ہوگا۔ صاب! اسے بچالو۔ ہم تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہے۔“ نذرل اس کے سامنے دوزانو ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”ارے ارے... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہاں بیٹھو۔ ادھر کرسی پر اور مجھے بتاؤ کہ شرفو کو کون لے گیا ہے؟“

”صاب! اس کو پولیس لے گیا ہے... موبائل آیا تھا۔ اس میں ڈال کر لے گیا۔“

”شرفو کو پولیس لے گئی ہے مگر کیوں؟ اس نے کیا جرم کیا ہے؟“ سرکار صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

”صاب! ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ ہم ادھر کیبن پر تھا۔ منو نے بتایا تو ہم سیدھا آپ کے پاس آیا۔ ابھی کچھ کرو صاب۔“

”ہاں ہاں، کچھ کرتے ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ مجھے سوچنے دو۔“ یہ کہہ کر سرکار صاحب نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر کچھ سوچ کر رک گیا اور نشان زدہ گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”چلو! تھانے چلتے ہیں۔ معلوم تو ہو کہ انہوں نے شرفو کو کیوں اٹھایا ہے؟“

یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور نذرل کے ساتھ ہوٹل کی عمارت سے باہر آگیا۔ اس کے پاس پرانے ماڈل کی ٹویوٹا تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتا تھا۔ اس نے نذرل کو ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا اور چند منٹ کے اندر تھانے پہنچ گیا۔ ایس ایچ او سے اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی اس لیے شرفو سے بات کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اس نے خود کوئی جرم نہیں کیا تھا البتہ چوری کا موبائل فون خریدنے کی غلطی ضرور کی تھی۔ موبائل چور پکڑا گیا اور جب اس سے مالِ مسروقہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے ان تمام لوگوں کے نام بتا دیے جن کے ہاتھ اس نے چوری کیے ہوئے موبائل فروخت کیے تھے۔ پولیس والے شرفو سے موبائل سیٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ سرکار صاحب سمجھ گیا کہ شرفو وہ موبائل واپس نہیں کرنا چاہتا جو اس نے موبائل چور سے پانچ سو روپے میں خریدا تھا کیونکہ ایسی صورت میں اسے پیسوں کے ساتھ ساتھ موبائل سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جاتے۔ اس نے ایس ایچ او کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ شرفو کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ البتہ اسے سخت الفاظ میں تنبیہ ضرور کی کہ آئندہ وہ چوری کا مال خریدنے سے باز رہے ورنہ اس پر بھی اعانتِ جرم کا کیس بن سکتا ہے۔

سرکار صاحب نے شرفو اور اس کے باپ نذرل کو گلی کے نکڑ پر چھوڑا اور خود اپنے ہوٹل چلا گیا لیکن گھر پہنچتے ہی نذرل نے بیٹے کی گردن پکڑ لی اور غصے سے بولا۔ ”پولیس نے تو سرکار صاحب کے کہنے پر تم کو چھوڑ دیا لیکن ہم حساب کتاب ضرور کرے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس پانچ سو روپیا کہاں سے آیا؟ چوری کیا یا کسی سے چھینا؟“

”قسم لے لو۔ ہم چور نہیں ہے۔ ہم نے کوئی چھینا جھپٹی نہیں کیا۔“

”پھر تمہارے پاس پانچ سو روپیا کہاں سے آیا؟“

”وہ... وہ... ہم نے ایک کام کیا تھا۔ ادھر سے یہ پیسا ملا تھا۔“ شرفو نے صاف جھوٹ بولا۔ وہ کافی دنوں سے [illegible] کی صفائی دکھا رہا تھا اور یہ پیسے اس نے مختلف اوقات میں کیبن کے گلّے سے پار کیے تھے۔

”کیا کام کیا تھا تم نے؟“ نذرل اس کے کان مروڑتے ہوئے بولا۔ ”اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟ تم کیا کام کرے گا۔ سچ سچ بتاؤ... یہ پیسا کہاں سے آیا؟“

شرفو اپنا کان مسلتے ہوئے بولا۔ ”سڑک کھدائی کیا، گٹر صفائی کیا، بلڈنگ پر مزدوری کیا۔ تم کو اس سے کیا؟ اگر شک کرے گا تو آئندہ ہم بھی تمہارے کیبن پر نہیں جائے گا۔ تم ہم کو چور سمجھتا ہے۔“

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا معاملہ تھا۔ نذرل کی بیوی نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مداخلت کرنا ضروری سمجھا اور نذرل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”ابھی آپ تھک گیا ہے۔ منہ ہاتھ دھولو۔ ہم آپ کے لیے کھانا لگاتا ہے۔“

نذرل اسے گھورتا ہوا چلا گیا تو شرفو کی جان میں جان آئی اور وہ وہاں سے کھسک لیا۔ وہ جانتا تھا کہ تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ اس سے اگلا سوال موبائل کے بارے میں ہوتا۔ جس کے بارے میں اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا تو نذرل کو کیسے بتا دیتا؟ وہ دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا

اور گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر نذرل کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے کھانے کے بعد نذرل اور اس کی بیوی جلد سو جانے کے عادی تھے جبکہ شرفو بارہ بجے کیبن بند کر کے واپس آتا تو روشی ہی اس کے لیے دروازہ کھولتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ روشی نے دروازہ کھولا اور شرفو سے کوئی بات کیے بغیر ہی اپنے بستر کی طرف چل دی۔ شرفو سمجھ گیا کہ وہ بھی اس سے ناراض ہے ورنہ کھانے کے لیے ضرور پوچھتی۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آگیا اور راستہ روکتے ہوئے بولا۔

”اے روشی! تم کو کیا ہوا؟ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا؟“

”تم نے حرکت ہی ایسی کی ہے۔ ہم لوگ تو محلے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہے۔“ روشی منہ بچلاتے ہوئے بولی۔

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم کو کیا معلوم تھا کہ وہ چوری کا مال بیچتا ہے۔“

”کبھی تو عقل سے کام لے لیا کرو شرفو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ دو ہزار کی چیز پانچ سو میں کیوں بیچ رہا ہے؟ ویسے بھی تمہارے پاس موبائل موجود ہے پھر دوسرا لینے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہم نے اپنے واسطے نہیں تمہارے لیے خریدا ہے۔“ شرفو جیب سے موبائل نکالتے ہوئے بولا۔ [illegible]

[illegible] ...اور پھر ماما، مامی کو کیا بتاؤں گی کہ یہ موبائل کہاں سے آیا؟“

”نہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ شرفو اس کی جرح سے چڑتے ہوئے بولا۔ ”چھپا کر رکھنا۔ دیکھو روشی! جب تم کالج جاتا ہے، ہماری نظروں کے سامنے نہیں آتا تو ہم کو بہت گھبراہٹ ہونے لگتا ہے۔ ہم اداس ہو جاتا ہے۔ اب تمہارے پاس موبائل ہوگا تو ہم تم سے بات کرے گا۔ تم کو مسیج دے گا۔ یہ موبائل رکھ لو روشی! ورنہ ہم کھانا نہیں کھائے گا۔ بھوک ہڑتال کر دے گا۔“

”اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر میں یہ موبائل رکھ لوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مانتی ہوں کہ تم نے یہ موبائل چوری نہیں کیا لیکن جن پیسوں سے خریدا گیا ہے، وہ تو چوری کے تھے نا؟“

”دیکھو روشی! اگر ہم نے ابا کے گلے سے پیسا نکالا تو کوئی چوری نہیں کیا۔“ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دکان ہمارا بھی ہے۔ ہم کو ضرورت ہوگی تو پیسا نکالے گا۔ اب تم زیادہ بحث مت کرو اور یہ موبائل رکھ لو۔“

روشی اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ بھی ہو، وہ اس کا... معصوم سا، بھولا بھالا کزن تھا۔ اس نے موبائل لے لیا اور بولی۔ ”آخر اس طرح کب تک چلے گا شرفو؟ تم کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے؟ کیا ساری زندگی پان کے کیبن پر بیٹھے ہی گزار دو گے؟“

”روشی! تم جانتا ہے نا کہ اچھی نوکری کے لیے تعلیم چاہیے اور کاروبار کے لیے پیسا۔ ہمارے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔ بس دعا کرو کہ ایک چانس مل جائے پھر دیکھو کہ ہم کیا کمال دکھاتا ہے۔“

”زندگی یوں خوابوں کے سہارے نہیں گزرتی شرفو۔“ روشی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی تمہاری طرح شارٹ کٹ مارنا چاہتی ہوں۔ اس پڑھائی سے مجھے کچھ نہیں ملنا۔ بی اے، ایم اے کر کے بھی کون سا تیر مار لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ یا دس ہزار کی نوکری مل جائے گی۔ اس سے کیا ہوتا ہے شرفو! میرے خواب بہت اونچے ہیں۔ مجھے گاڑی، بنگلا، نوکر چاکر، بینک بیلنس یہ سب کچھ چاہیے۔ ساری عمر کوششیں کرتی رہوں گی، تب بھی یہ چیزیں میری دسترس سے باہر رہیں گی۔“

”پھر تم نے کیا سوچا ہے روشی؟“

”اس کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ میں کسی بوڑھے دولت مند سے شادی کر لوں یا کوئی گلیمرس جاب کر لوں۔ مثلاً ایئر ہوسٹس بن جاؤں، ماڈلنگ شروع کر دوں وغیرہ وغیرہ۔ شادی والا آئیڈیا بھی دل کو نہیں لگتا کیونکہ اس صورت میں بھی مجھے پیسوں کے لیے شوہر کے آگے ہاتھ پھیلانا ہوگا۔ ایئر ہوسٹس بننا بھی آسان نہیں۔ اس کے لیے تگڑی سفارش چاہیے۔ ہاں، ماڈلنگ والا آئیڈیا ٹھیک ہے۔“

شرفو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ غور سے روشی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا کہا تم نے... ماڈل بنے گا؟ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟“

”کیوں... اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ اگر تم ایکٹر بن سکتے ہو تو میں ماڈل کیوں نہیں بن سکتی؟“

”کیا بولتا ہے روشی؟“ شرفو سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ابا کبھی نہیں مانے گا۔“

”دیکھو شرفو! یہ میری زندگی ہے۔ اسے جس طرح چاہوں گزاروں۔ کسی کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں۔ تم پریشان مت ہو، یہ میرا مسئلہ ہے۔ اس سے میں خود ہی نمٹوں گی۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ میرا ساتھ دے سکتے ہو یا نہیں؟“

شرفو کا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ روشی نے کم از کم اسے اس قابل تو سمجھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

www.pkdigest.com

''فکر مت کرو روشی! اس دنیا کے آخری سرے تک تمہارے ساتھ جائے گا۔ بولو کیا کرنا ہے؟ کدھر جانا ہے، کس سے ملنا ہے... ہم تمہارے ساتھ ہے۔''

''میں تمہاری طرح احمق اور جذباتی نہیں ہوں کہ سوچے سمجھے بغیر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔ اس کے لیے ہمیں پلاننگ کرنی ہوگی۔ دیکھو شرفو! آج کے دور میں کوئی کام سفارش اور پیسے کے بغیر نہیں ہوتا۔ ہم دونوں ہی ایک کشتی کے مسافر ہیں۔ زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے ہمیں کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جو ہماری انگلی پکڑ کر صحیح جگہ تک پہنچا دے۔''

''اگر تم کہو تو میں سرکار صاحب سے بات کروں؟ ان کے بہت لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔''

''ابھی نہیں۔ آج ہی وہ تمہیں تھانے سے چھڑا کر لائے ہیں۔ اتنی جلدی دوبارہ کسی کام کے لیے کہنا اچھا نہیں لگتا۔ کچھ دن بعد ان سے مل لینا۔''

شرفو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر اسے خیال آیا کہ وہ دونوں اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں اور روشی نے اسے کھانے تک کے لیے نہیں پوچھا۔ ایک دم ہی اسے بھوک ستانے لگی اور وہ بے چین ہوتے ہوئے بولا۔ ''اے روشی! بھوک لگی ہے، کچھ کھانے کو دو نا۔''

''تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔''

☆☆☆

روشی کی باتوں نے شرفو کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ سیدھی سادی اور معصوم سی نظر آنے والی روشی اپنے مستقبل کے بارے میں اتنی سنجیدہ اور حساس ہو سکتی ہے۔ وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کا خواب دیکھ رہی تھی اور اس کے لیے عملی جدوجہد کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو وہ اس سے بہت پیچھے رہ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک دیکھ کر شرفو کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب کچھ کر گزرے گی اور پھر ان دونوں کے درمیان ایسی خلیج حائل ہو جائے گی جسے عبور کرنا شرفو کے بس سے باہر ہو گا۔ اس خطرے کو ٹالنے کا بس ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ روشی کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے لیکن اس کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ شرفو جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں ایک بار جو سما جائے وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتی ہے... اور اگر بالفرض محال اس کے دماغ سے ماڈل بننے کا خناس نکل گیا، تب بھی اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ اسے اپنا جیون ساتھی مان لے گی کیونکہ اس کے خیالات جان کر شرفو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا مستقبل ایک چھواڑی کے ساتھ وابستہ کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوگی۔ اسے اپنانے کے لیے شرفو کو کوئی ایسا کام کرنا ہوگا جس میں دولت جمع کرنے کے بے پناہ مواقع ہوں جس کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔

ایک ہفتے تک وہ اسی سوچ میں الجھا رہا کہ روشی کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کیا ترکیب کی جائے۔ اسے لگا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ اس کی دسترس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس نے فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھایا تو عمر بھر کا پچھتاوا اس کا مقدر بن جائے گا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ وہ ابا کو اس کے عزائم سے آگاہ کر دے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ روشی ضد پر آ جاتی تو نذرل کیا دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ روشی سے وعدہ کر چکا تھا کہ اس کا ساتھ دے گا اور وہ وعدہ خلافی کر کے اس کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ روشی اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ اگر اس طرح روشی کی خواہشوں کی تکمیل ہو جاتی تو یہ سودا مہنگا نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ فلم کی دنیا میں نام بنانے کے بعد روشی اس کی مدد کر سکے اور وہ اس کا سہارا لے کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہو سکے۔ لیکن یہ بہت دور کی بات تھی، فی الحال تو اسے سرکار صاحب کو آمادہ کرنا تھا کہ وہ روشی کے لیے کچھ کرے۔

شرفو کا خیال تھا کہ سرکار صاحب اس کی بات سن کر بھڑک اٹھے گا اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے نکال دے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ سرکار صاحب نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور حسب عادت اپنا بایاں گال کھجاتے ہوئے بولا۔ ''لڑکی نادان ہے۔ اسے دنیا کا کچھ پتا نہیں... مگر تم تو زمانے بھر میں گھومتے پھرتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے پھر بھی تم نے اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی اور میرے پاس اس کی سفارش کرنے چلے آئے؟''

''سرکار صاب! ہم نے اس کو بہت سمجھایا مگر وہ کچھ نہیں سنتا پھر ہم یہی سوچ کر ادھر آیا کہ آپ کا ہاتھ اس کے سر پر رہے گا تو کوئی اس کی جانب بری نیت سے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اس کے لیے کچھ کرے گا نا صاب؟''

''دیکھو شرفو! اگر یہ کوئی تھانے کچہری یا روزگار کا مسئلہ ہوتا تو میں اسی وقت تمہارے ساتھ چل دیتا لیکن یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔ اول تو میری اس فیلڈ میں کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو سارا بنگالی پاڑا میری بوٹیاں نوچ لے گا کہ میں نے ہی اس لڑکی کو یہ راستہ دکھایا تھا۔''

''نہیں صاب! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' شرفو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''روشی اپنا حفاظت کرنا جانتا ہے۔ وہ اپنا جان دے دے گا لیکن عزت پر حرف نہیں آنے دے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں کچھ سوچتا ہوں لیکن اس کے لیے پہلے روشی کو نذرل سے اجازت لینا ہوگی۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کر سکوں گا۔''

سرکار صاحب نے بڑی کڑی شرط لگا دی تھی۔ شرفو کا منہ لٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کبھی یہ اجازت نہیں دے گا لیکن جب اس نے روشی کو سرکار صاحب سے ہونے والی گفتگو کی رپورٹ دی اور ساتھ ہی اپنے خدشات کا اظہار کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ ظاہر ہے کہ ماما کی اجازت کے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''تم کیا سمجھتا ہے، وہ آسانی سے مان جائے گا؟''

روشی ... جانتا، وہ ... ''میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہوں۔ اگر وہ آسانی سے مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنی بات منوانا اچھی طرح جانتی ہوں۔''

پھر وہی ہوا جیسا روشی چاہتی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی نذرل آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس دوران روشی کچھ نہ بولی۔ جب نذرل کا غصہ کچھ کم ہوا تو وہ اس کے پاس آ کر بولی۔ ''ماما! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ اپنے انداز میں سوچتے ہیں اس لیے آپ کا غصہ بھی بجا ہے... لیکن آپ ہی مجھے بتائیں کہ جب عورتیں دنیا بھر کے کام کر سکتی ہیں تو پھر اس کام پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے؟''

''کیونکہ یہ دوسرے کاموں سے مختلف ہے۔'' نذرل تیز آواز میں بولا۔ ''اس میں عورت کا نمائش ہوتا ہے، اس کا فوٹو اخبار میں چھپتا ہے... ٹی وی پر اس کا اشتہار چلتا ہے۔ ساری دنیا اس کو دیکھتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ تم کو یہ اچھا لگے گا؟''

''پردے میں رہ کر تو کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ جب عورت صدر، وزیراعظم، جج، وکیل یا ڈاکٹر کے روپ میں گھر سے باہر نکلتی ہے تب بھی تو لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ ان پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔''

''ہم کچھ نہیں جانتا... بس بول دیا کہ تم یہ کام نہیں کرے گا۔''

''ماما! آپ زیادتی کر رہے ہیں لیکن میری بات بھی سن لیجیے کہ میں ساری عمر سسک سسک کر اور اپنی خواہشوں کے لیے ترستے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھے آگے بڑھ کر اس دنیا کی آسائشوں میں سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔ آج آپ مجھے روک لیں گے تو کل، پرسوں یا جب بھی موقع ملا تو میں اپنی خواہش کی تکمیل ضرور کروں گی۔ آج مجھے پتا چلا کہ جن لڑکیوں کے ماں باپ نہیں ہوتے انہیں کس طرح اپنی آرزوؤں اور امنگوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔''

نفسیاتی داؤ کارگر ثابت ہوا۔ نذرل کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس نے روشی کے لہجے میں چھپی دھمکی کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ روشی کا باپ نہیں بلکہ ماموں تھا اور سرپرست کی حیثیت سے اسے ایک حد تک ہی کنٹرول کر سکتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ جب اولاد جوان ہو جائے تو اس کی مرضی کے گھوڑے کو لگام دینا آسان نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کو قابو نہیں کر پا رہا تھا، روشی تو پھر اس کی بھانجی تھی۔ لہٰذا اس نے وقتی طور پر خاموش رہنے میں ہی مصلحت جانی اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب ہم کچھ نہیں بولے گا۔ تمہارا جو مرضی ہو وہی کرو... لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ کل کو اگر کوئی اونچ نیچ ہو گیا تو پھر تمہارے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگا۔''

''اوہ ماما! یو آر گریٹ۔'' روشی اپنی جگہ پر اچھلتے ہوئے بولی۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔ بس دعا کریں کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔''

شرفو نے یہ خبر سرکار صاحب کو سنائی تو وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ وہ اجازت دے دے گا۔ گھر آئی ہوئی دولت کسے بری لگتی ہے۔ خیر، تم ایسا کرو کل شام چار بجے روشی کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ میں نے اس کے لیے ایک جگہ بات کی ہے۔ پہلے وہیں کوشش کرتے ہیں۔''

دوسرے دن شرفو اور روشی مقررہ وقت پر سرکار صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ روشی پر ایک نظر ڈالتے ہی سرکار صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ اگر یہ لڑکی صحیح جگہ پہنچ گئی تو اس کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے روشی سے

www.pkdigest.com

زیادہ بات نہیں کی، بس اتنا بتایا کہ وہ اسے میڈم نسیم سے ملوانے لے جا رہا ہے جو ایک بیوٹی پارلر چلاتی ہے اور اس کے شوبزنس ورلڈ میں خاصے گہرے تعلقات ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس سلسلے میں روشی کی کچھ مدد کر سکے۔

میڈم نسیم نے بڑے تپاک سے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ سرکار صاحب پہلے ہی فون پر اپنی آمد کا مقصد بیان کر چکا تھا۔ میڈم نسیم نے گہری نظروں سے روشی کا جائزہ لیا اور سرسری انداز میں بولی۔ ”میں عام طور پر ان کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتی لیکن سرکار صاحب کی بات ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا... لیکن میں چاہتی ہوں کہ کام شروع کرنے سے پہلے ہی ہمارے درمیان تمام معاملات طے ہو جائیں تاکہ بعد میں کوئی شکوہ شکایت نہ ہو۔“

روشی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس عورت کی بات کا کیا جواب دے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے پہلے شرفو اور پھر سرکار صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی پریشانی بھانپ گیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ”روشی کو ان باتوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ میں اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اس کی راہنمائی کریں اور آگے بڑھنے میں مدد کریں۔“

”سب سے پہلے تو تمہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ تم اپنی آنکھوں میں جو خواب بسائے ہوئے ہو، اس کی تعبیر بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس فیلڈ میں مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے۔ اچھے اچھے گھرانوں کی پڑھی لکھی لڑکیاں اس فیلڈ میں قدم جمانے کے لیے اپنا بہت کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم حسن کی دولت سے مالا مال ہو لیکن بیک گراؤنڈ، تعلیم اور حیثیت کے لحاظ سے تمہارے نمبر بہت کم ہیں۔ میں کوئی کچا کام نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے کسی جگہ متعارف کرانے سے پہلے تمہاری گرومنگ کرنا ہو گی۔ اس میں تین سے چھ مہینے لگ سکتے ہیں۔ بولو! تم اس کے لیے تیار ہو؟“ وہ براہ راست روشی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”آپ جس طرح کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔“ روشی نے جواب دیا۔

”گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور وہ یہ کہ آج کے دور میں مطلب کے بغیر کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ تمہیں ماڈل بنانے میں میرا کافی وقت اور پیسا خرچ ہو گا، لہٰذا تمہیں ان اخراجات کے ساتھ ساتھ میرے وقت کی قیمت بھی ادا کرنا ہو گی۔ اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ ایک کنٹریکٹ سائن کرنا ہو گا جس کے تحت میں دو سال تک تمہارے لیے منیجر کے طور پر کام کروں گی اور تمہارے سارے معاملات ہینڈل کروں گی۔ اس کے عوض تم اپنی آمدنی میں سے نصف مجھے ادا کرو گی۔ اس کنٹریکٹ کے ختم ہونے کے بعد تم اپنے طور پر کام کرنے کے لیے آزاد ہو گی۔ اس دوران تم صبح 9 بجے سے شام پانچ بجے تک میرے ساتھ رہو گی۔ کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے تمہیں گھر واپس جانے میں دیر ہو سکتی ہے۔ تم کسی کو بھی اپنی فیملی اور گھر کے بارے میں نہیں بتاؤ گی اور نہ ہی میڈیا کو انٹرویو دو گی۔ تمہارا نام روشن آرا نہیں بلکہ روشانہ ہو گا لیکن تمہیں روشی کے نام سے ہی متعارف کرایا جائے گا۔ اگر تم نے دو سال کے دوران کسی بھی وقت اس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ اگر یہ شرائط منظور ہیں تو ہم کل سے ہی کام شروع کر سکتے ہیں۔“

”مجھے آپ کی تمام شرائط منظور ہیں۔ آپ کنٹریکٹ تیار کروا لیں، میں کل ہی سائن کر دوں گی۔“

”اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اچھی طرح سوچ بچار کر لو بلکہ اپنی فیملی سے بھی مشورہ کر لو تو بہتر ہے۔“

سرکار صاحب اس پوری گفتگو کے دوران میں خاموش بیٹھا رہا لیکن جب وہ چلنے لگے تو اس نے میڈم نسیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”روشی کے لیے اس شہر کے راستے اجنبی ہیں۔ وہ اپنے اور کالج کے سوا کہیں اور نہیں جاتی۔ اس لیے جب تک وہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہو جاتی، شرفو اس کے ساتھ آتا رہے گا۔“

”مجھے اس کے آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ روشی اور شرفو کا مسئلہ ہے۔“ میڈم نسیم نے بے نیازی سے کہا۔

واپسی میں سرکار صاحب نے روشی اور شرفو کو گلی کے نکڑ پر اتارا اور روشی کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولا۔ ”اسے سنبھال کر رکھ لو۔ اس پر میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ ضرورت کے وقت تم مجھے کال کر سکتی ہو۔“

روشی بہت خوش تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ جائے گی، حالانکہ یہ اس کی خام خیالی تھی۔ ابھی اس کی ملاقات صرف میڈم نسیم سے ہوئی تھی جو اسے کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھی لیکن میڈم نے جس اعتماد کے ساتھ اس سے بات کی تھی، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میڈم کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اگر وہ اس قابل نہ ہوتی تو میڈم کبھی بھی اس سے کنٹریکٹ وغیرہ کی بات نہ کرتی۔ یہ سب کچھ

www.pkdigest.com

سرکار صاحب کی بدولت ہوا تھا۔ اگر وہ میڈم سے اس کی ملاقات نہ کرواتا تو وہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی۔ اس کے دل میں سرکار صاحب کے لیے عقیدت اور بڑھ گئی۔

روشی نے اپنے ماموں نذرل کو بھی میڈم نسیم سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا دیا لیکن کنٹریکٹ کی شرائط کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا ماما بنیادی طور پر لالچی شخص ہے اور وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ روشی کی کمائی کا آدھا حصہ میڈم نسیم ہڑپ کر جائے۔ اسے ضرور اس شرط پر اعتراض ہوتا۔ وہ اس مرحلے پر کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی تھی اس لیے ماما کو ان معاملات سے لاعلم رکھنا ضروری تھا۔ نذرل اپنے اطمینان کے لیے میڈم نسیم سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن روشی نے اسے سمجھایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سرکار صاحب کی معرفت وہاں گئی تھی اس لیے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں۔ فی الحال اس کی ٹریننگ شروع ہو جائے، بعد میں کسی مناسب موقع پر وہ میڈم نسیم سے اس کی ملاقات کروادے گی۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق وہ شرفو کے ساتھ میڈم نسیم کے بنگلے پر پہنچ گئی جو شہر کے پوش علاقے میں واقع تھا اور وہاں کوئی بس نہیں آتی تھی۔ وہ دونوں صدر تک بس سے آئے اور وہاں سے انہیں ٹیکسی کرنی پڑی۔ روشی نے اپنے جیب خرچ سے کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے۔ وہی کام آئے لیکن روزانہ یہ ممکن نہیں تھا۔ روشی نے سوچا کہ دو چار دن گزر جانے کے بعد وہ اس سلسلے میں میڈم سے بات کرے گی۔ روشی کو تو فوراً ہی اندر بلا لیا گیا لیکن شرفو کو کسی نے گھاس بھی نہ ڈالی اور وہ بے چارہ باہر برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میڈم نسیم اسی وقت ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ روشی کو دیکھتے ہی بولی۔ ”بہت خوب... وقت کی پابند معلوم ہوتی ہو۔ مجھے تیار ہونے میں پندرہ منٹ لگیں گے پھر تم میرے ساتھ ہی پارلر چلنا۔ تمہارا حلیہ بھی تو ٹھیک کرنا ہے۔“

یہ کہہ کر میڈم تیار ہونے چلی گئی اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھی ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی جو قیمتی فرنیچر اور سجاوٹی اشیا سے مزین تھا۔ روشی نے تو کبھی خواب میں بھی یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ نہ جانے وہ بھی کبھی زندگی میں ایسا گھر بنا سکے گی یا نہیں؟

میڈم تیار ہو کر آئی تو روشی انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میڈم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”روشی! تم بہت پیاری اور معصوم سی لڑکی ہو۔ میرے بس میں ہوتا تو کبھی تمہیں اس فیلڈ میں نہ آنے دیتی لیکن تمہاری بھی اپنی مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے تم نے یہ کڑوا گھونٹ پینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں، مجھے یقین ہے کہ تم نے ان پر اچھی طرح غور کر لیا ہوگا۔ اگر تمہیں وہ شرائط منظور ہیں تو ہم اسی وقت کام شروع کر سکتے ہیں ورنہ تمہارے لیے واپسی کا دروازہ کھلا ہے۔“

”اب واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں اور میرے پاس قدم آگے بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

”اچھا، اب چند باتیں غور سے سن لو۔ ان پر عمل کرنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے، ورنہ اپنے نقصان کی خود ذمے دار ہو گی۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں جو کچھ دیکھو، سنو اور محسوس کرو... وہ کسی سے ڈسکس کرنے کی ضرورت نہیں۔ کامیابی کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ گھر کی بات باہر اور باہر کی بات گھر میں نہ کی جائے۔ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی، پروڈکشن ہاؤس یا میڈیا کے لوگوں سے اس معاہدے کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں جو میرے اور تمہارے درمیان طے پایا ہے۔ آج سے ہی انگریزی بولنے کی کوشش شروع کر دو اور اگر میں نے ضروری سمجھا تو تمہیں کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلوا دوں گی جہاں کم عرصے میں انگریزی روانی سے بولنا سکھائی جاتی ہے۔ کل سے تم ٹیکسی میں آؤ گی اور شام کو میرا ڈرائیور تمہیں گھر چھوڑ دیا کرے گا۔ پیسوں کی فکر مت کرو۔ تمہیں اپنے اخراجات کے لیے پاکٹ منی ملتی رہے گی۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ بس اتنا یاد رہے کہ تمہیں اب مکمل طور پر وہی کچھ کرنا ہے جو میں تم سے کہوں گی۔ اسی میں تمہارا فائدہ اور بھلائی ہے۔“

روشی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میڈم نسیم اس پر اتنی مہربان کیوں ہو رہی ہے؟ پھر اسے یاد آیا کہ یہ سب کچھ تو ادھار کی ایک شکل ہے۔ میڈم اس پر جو کچھ خرچ کرے گی، اس سے کئی گنا زیادہ پچاس فیصد کمیشن کی صورت میں وصول کر لے گی۔ اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ میڈم نے اس کے آنے جانے کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اس طرح وہ بسوں کے دھکے کھانے سے بچ گئی۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ چائے آ گئی۔ میڈم نے پیالی اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”پارلر سے واپسی پر تمہارے لیے شاپنگ بھی کرنی ہے۔ اس وقت جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں، یہ دوبارہ تمہارے جسم پر نظر نہ آئیں۔ تم نے ٹی وی پر ماڈلز کو تو

دیکھا ہوگا۔ بس تمہیں بھی انہی جیسا بننا ہے۔“

روشی کی نظروں کے سامنے ٹی وی کے وہ اشتہار چلنے لگے جن میں ماڈلز انتہائی جدید قسم کا لباس پہن کر........ مختلف برانڈز کے لیے ماڈلنگ کیا کرتی ہیں۔ اس نے خود کو ان کی جگہ رکھا تو اس تصور سے ہی اسے جھرجھری آ گئی کہ اب اسے بھی ان ماڈلز جیسا لباس پہننا ہوگا۔ یا اللہ! وہ کس طرح اس حلیے میں گھر اور محلے والوں کا سامنا کر پائے گی۔ کیا ماما اور شرفو یہ سب کچھ برداشت کر پائیں گے؟ دل سے ایک صدا ابھری ’اب بھی وقت ہے روشی! واپس چلی جا۔ تو اس ماحول میں فٹ نہیں ہو سکتی۔ ابھی تو معاملہ لباس کی حد تک ہے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی حدوں کو پھلانگنا ہوگا۔ کیا تو اور تیرے گھر والے اسے برداشت کر سکیں گے؟‘

روشی نے ان آوازوں کو سختی سے دبا دیا۔ وہ جو قدم آگے بڑھا چکی تھی، وہ واپس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی دنیا سے نرالی اور انوکھی لڑکی نہیں۔ آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی اور بہن ہوں گی جو اشتہاروں میں ماڈلنگ اور ڈراموں میں ایکٹنگ کرتی ہیں۔ وہ بھی تو دنیا والوں کا سامنا کسی نہ کسی انداز میں کرتی ہوں گی پھر مجھے کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے؟ اگر ڈھنگ کے کپڑے پہن لوں گی تو کوئی طوفان نہیں آ جائے گا۔

وہ میڈم نسیم کے ہمراہ باہر نکلی تو برآمدے میں بیٹھے شرفو کو دیکھ کر چونک گئی۔ میڈم سے باتوں کے دوران وہ شرفو کو بھول ہی گئی تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میڈم کی طرف دیکھا تو وہ شرفو کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ”تم جا سکتے ہو... روشی شام کو گھر آ جائے گی۔“

شرفو نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”ہم روشی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ یہ بات ہم سرکار صاحب کو پہلے ہی بول چکا ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر تم یہیں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرو۔ ہم چار بجے تک واپس آ جائیں گے۔“

”نہیں، ہم اس کے ساتھ جائے گا۔ جدھر جدھر یہ جائے گا، اُدھر اُدھر ہم بھی جائے گا۔ ہم اس کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

میڈم نسیم کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، اگر تمہارے پاس اتنا ہی فالتو وقت ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

میڈم نسیم نے روشی کو اپنے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور شرفو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ روشی کے طفیل اسے بھی میڈم کی نئی چمچماتی کار میں سفر کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ کار اسٹارٹ ہوئی تو شرفو کے دماغ میں بھی خیالات کی یلغار ہونے لگی۔ وہ اس سفر کو اپنے اور روشی کے لیے نیک شگون سمجھ رہا تھا۔ ان دونوں کو پہلے دن ہی اتنی شاندار ....کار میں گھومنے کا موقع مل گیا۔ یہ گویا قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ بہت جلد ان کے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی ہوگی۔ ادھر میڈم نسیم دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس وقت اسے شرفو کا وجود زہر لگ رہا تھا۔ اسے یوں لگا کہ اس کی موجودگی میں وہ روشی سے کھل کر بات نہیں کر پائے گی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر شرفو کو گاڑی سے اتار دیتی لیکن سرکار صاحب کو اعتماد میں لیے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

بیوٹی پارلر پہنچ کر میڈم نے وہاں کام کرنے والی ایک لڑکی کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور روشی کو اس کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔ شرفو کو ایک بار پھر باہر بیٹھ کر انتظار کی گھڑیاں گننے پر مجبور ہونا پڑا۔ سب سے پہلے روشی کے بالوں کو شیمپو سے دھویا گیا پھر اس کا فیشل ہوا۔ بھویں اور پلکیں بنائی گئیں۔ ہاتھوں اور پیروں کے ناخن ایک مخصوص انداز میں تراشے گئے۔ تھریڈنگ ہوئی اور ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس کا ہلکا سا میک اپ کیا گیا۔ روشی کے لیے یہ ایک طلسماتی دنیا تھی۔ اب تک وہ لپ اسٹک اور نیل پالش لگانے کو ہی میک اپ سمجھا کرتی تھی لیکن اس روز پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ چہرے کی آرائش کیسے کی جاتی ہے۔ جب وہ فائنل ٹچ کے بعد میڈم کے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ پرجوش انداز میں بولی۔ ”واؤ! یقین نہیں آ رہا کہ تم روشی ہی ہو۔ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی تھی۔ اب تمہارا حسن اصلی رنگ میں سامنے آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج تک تم سے زیادہ حسین لڑکی اس فیلڈ میں نہیں آئی ہوگی۔ تم تو قیامت ڈھا دو گی... قیامت۔“

اپنی تعریف سن کر روشی شرما گئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”مجھے تو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ میں ہی ہوں۔ واقعی، یہ میک اپ بھی کمال کی چیز ہے۔“

”یہ تو ہلکا سا ٹریلر ہے۔“ میڈم قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”دیکھتی جاؤ کہ آگے کیا ہوتا ہے۔“

لنچ کے بعد میڈم، روشی کو ساتھ لے کر شاپنگ کے لیے چلی گئی۔ شرفو بھی ساتھ تھا۔ میڈم نے روشی کے لیے مختلف قسم کے لباس خریدے جن میں ریڈی میڈ شلوار سوٹ، جینز، بلاؤز اور ٹی شرٹس وغیرہ شامل تھیں۔ روشی ان قیمتی کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ اس نے ٹی وی پر ایکٹرسوں اور

ماڈلز کو ان ملبوسات میں دیکھا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن اسے اس طرح کے کپڑے پہننا پڑیں گے۔ پھر اسے گھر والوں کا خیال آیا۔ ماما اور بابی تو اسے اس لباس میں دیکھ کر ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور محلے والوں کی نظروں میں وہ تماشا بن کر رہ جائے گی۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ کپڑے لے کر گھر نہیں جائے گی اور میڈم کے گھر آنے کے بعد لباس تبدیل کر لیا کرے گی۔

کپڑوں کے بعد جوتوں اور کاسمیٹکس کی باری آئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو میڈم نے اسے لباس تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ روشی جدید فیشن کے کپڑوں میں کیسی لگتی ہے۔ روشی نے ان ملبوسات میں سے ایک سوٹ منتخب کیا اور لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ واقعی ان کپڑوں میں اس کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔ میڈم کی نظریں اس کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے تحسین آمیز نظروں سے روشی کو دیکھا اور بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں فرصت میں بنایا گیا ہے۔ تم ایک پرفیکٹ ماڈل ہو... ہر لحاظ سے مکمل۔ کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔''

روشی نے اس تبصرے کا جواب ایک شرمیلی مسکراہٹ سے دیا اور جھجکتی ہوئی لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ واپس آئی تو میڈم اسے پرانے کپڑوں میں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ ''یہ کیا... تم نے دوبارہ پھر وہی کپڑے پہن لیے؟''

''جی میڈم! میں یہ سب سامان لے کر گھر نہیں جا سکتی۔ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے جن کے جوابات دینا میرے بس میں نہ ہوگا۔ اس لیے میں یہ سب چیزیں یہیں چھوڑے جا رہی ہوں۔ یہاں آ کر لباس تبدیل کر لیا کروں گی۔''

''اگر اس طرح گھر والوں سے ڈرتی رہیں تو تمہارے لیے اس فیلڈ میں آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ تو ابتدا ہے۔ بعد میں اور بھی کئی کٹھن مرحلے آئیں گے پھر تم کیا کرو گی؟''

''میڈم! سیانے کہتے ہیں کہ گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ اس لیے ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیں گے۔''

اتنی احتیاط کے باوجود گھر پہنچنے کے بعد روشی کو باتیں سننے کو ملیں۔ اس کا اجلا اجلا نکھرا چہرہ دیکھ کر بابی سمجھ گئی کہ وہ کسی بیوٹی پارلر سے ہو کر آئی ہے۔ وہ اس پر خوب چیخی چلائی اور اسے آوارہ بدچلن کے خطاب سے نواز دیا۔ اصل تکلیف تو اس بات کی تھی کہ روشی سارا دن باہر رہی اور اسے گھر کے کام خود ہی نمٹانے پڑے۔ یہی حال نذرل کا تھا۔ اس نے شرفو کے کان کھینچے کہ وہ دوپہر میں کیبن پر ڈیوٹی دینے کیوں نہیں آیا۔ روشی کو بھی الجھن ہو رہی تھی کہ شرفو کو اس کی خاطر سارا دن وہاں بیٹھنا پڑا۔ اس نے شرفو سے کہا کہ وہ دو چار دن اس کے ساتھ چلا جائے، جب اسے راستے سے واقفیت ہو جائے گی تو وہ خود ہی چلی جایا کرے گی۔ بلاوجہ ہی اسے سارا دن وہاں بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ کیبن پر جا کر ماما کا ہاتھ بٹائے لیکن شرفو کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ تڑخ کر بولا۔

''ہم تم کو ایک منٹ کے لیے بھی اُدھر اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ وہ عورت ہم کو ٹھیک نہیں لگتا۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے۔''

''تم بلاوجہ ہی ان پر شک کر رہے ہو۔ اتنی اچھی تو ہیں وہ۔ دیکھو، میرا کتنا خیال رکھ رہی ہیں۔ آج کل کون کسی کے لیے اتنا کچھ کرتا ہے۔''

''تم نہیں جانتا روشی۔ وہ بہت چالاک عورت ہے۔ ایک لگا کر چار وصول کرے گا۔ ہم کو تو اس کی نیت میں کھوٹ نظر آتا ہے۔''

''وہم ہے تمہارا۔ وہ ایسی عورت نہیں ہیں۔ رہی پیسوں کی بات تو دو سال بعد میں آزاد ہو جاؤں گی اور پھر سب کچھ میرا ہوگا... صرف میرا۔''

''کچھ بھی ہو، ہم تم کو وہاں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ ساتھ جائے گا، ساتھ رہے گا اور ساتھ ہی واپس آئے گا۔ اگر تم کو یہ منظور نہیں تو یہ کام چھوڑ دو۔ گھر بیٹھ جاؤ۔ ہم کمائے گا۔ محنت کرے گا اور تمہاری ہر ضرورت پوری کرے گا۔''

روشی جانتی تھی کہ شرفو کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو اس کے دماغ میں آ جائے۔ لہٰذا اس نے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور لمبی تان کر لیٹ گئی۔

اگلے روز روشی، میڈم کے پاس پہنچی تو میڈم نے اسے کچھ فیشن میگزین پکڑا دیے اور کہا کہ وہ ان رسالوں میں چھپنے والے اشتہارات اور فوٹوز کو غور سے دیکھے۔ اس کی یہ ڈیوٹی بھی لگائی گئی کہ وہ ٹی وی پر چلنے والے کمرشلز اور ڈرامے باقاعدگی سے اور ان میں کام کرنے والی لڑکیوں کے لباس، فیشن، چال ڈھال، نقل و حرکت غرض ہر چیز پر نگاہ رکھے۔ جو بھی نیا فیشن آئے اسے اپنانے کی کوشش کرے۔ ایک ٹیوٹر کا بھی بندوبست کر دیا گیا جو اسے انگریزی بولنا سکھاتا۔

روشی نے میڈم کی ہدایات کو غور سے سنا اور ان پر فوراً ہی عمل کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے ان میگزینز کی ورق گردانی کی اور ان میں شائع ہونے والی تصویریں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان میں سے کچھ نے تو ایسا بے ہودہ لباس پہنا ہوا تھا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے میڈم کی توجہ اس جانب دلانا چاہی تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ارے، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ کل میں تمہیں کچھ انڈین میگزین لا کر دوں گی۔ انہیں دیکھ کر تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

روشی کا دل چاہا کہہ دے کہ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے میگزینز پر... لیکن وہ صرف ایسا سوچ سکتی تھی۔ زبان سے کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ روم میں رہنا ہے تو رومنوں کی طرح رہو۔ یہ مثل اس پر پوری طرح صادق آ رہی تھی۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ اب تو اسے وہی کرنا ہے جو میڈم کہیں گی، چاہے وہ صحیح ہو یا غلط۔ اس روز میڈم بیوٹی پارلر نہیں گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے لے کر ٹی وی لاؤنج میں گئی اور ڈی وی ڈی میں ایک سی ڈی لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کچھ فیشن شوز اور ریمپ واک کی موویز ہیں۔ انہیں غور سے دیکھو۔ ان میں حصہ لینے والی ماڈلز کے لباس، ہیئر اسٹائل، فیشن اور حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرو اور خود بھی اس کی پریکٹس کرو۔ ایک دن تمہیں بھی یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔''

میڈم نے ڈی وی ڈی پلیئر آن کر کے ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود وہاں سے چلی دی۔ روشی حیرت کے عالم میں ٹی وی اسکرین پر یہ مناظر دیکھتی رہی۔ ریمپ واک دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ میڈم کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''ایک دن تمہیں بھی یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔'' اس نے دیکھا کہ ایک ماڈل نیم عریاں لباس میں ریمپ پر چل رہی تھی اور اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کے سراپا پر نظریں گاڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ کیا وہ یہ سب کچھ کر سکے گی؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ شاید نہیں۔ وہ اتنی بے باکی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ اس کے ذہن میں ماڈلنگ کا تصور ٹی وی پر چلنے والے ٹوتھ پیسٹ، شیمپو اور کوکنگ آئل کے اشتہاروں تک محدود تھا۔ جو کچھ اس نے میگزین اور ویڈیوز میں دیکھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور ابھی نہ جانے کیا کچھ دیکھنا باقی تھا۔ پھر وہ کیا کرے... واپس چلی جائے؟ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ سے پوچھا جس کا جواب فوراً ہی آ گیا۔ نہیں، ایسا کرنا بزدلی اور کم ہمتی کے برابر ہوگا۔ اب پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے صرف اور صرف آگے کی طرف دیکھنا ہے۔

سارا دن وہ ویڈیوز دیکھتی رہی۔ ان سے اسے بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ ایک انڈین فلم بھی دیکھی اور دوبارہ ایسا کرنے سے توبہ کر لی۔ میڈم نے لنچ کے لیے بلایا تو اسے شرفو کا خیال آیا۔ وہ اسے دیکھنے باہر گئی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے بتایا کہ وہ کھانا کھانے گیا ہے۔ وہ خاموشی سے واپس آ گئی اور بے دلی سے کھانا کھانے لگی۔ اس کی خواہش تھی کہ شرفو بھی اس کے ساتھ ہی لنچ کرتا لیکن وہ یہ بات میڈم سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اسے تو شرفو کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

روشی کی ٹریننگ جاری تھی اور میڈم اس کے سیکھنے کی رفتار سے بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ایک ہفتہ یونہی گزر گیا پھر ایک دن میڈم نے اسے بتایا کہ انہیں ایک فیشن شو میں جانا ہے اور ان کی واپسی دیر سے ہوگی لہٰذا وہ شرفو کو گھر بھیج دے کیونکہ دعوتی کارڈ صرف دو آدمیوں کے لیے ہے۔ روشی نے یہی بات شرفو سے کہی تو اس نے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ میڈم نے سنا تو بری طرح جھنجلا گئی اور بولی۔

''میں تو صرف تمہاری خاطر اسے برداشت کر رہی ہوں لیکن دوسرے لوگ جن سے تمہارا کام کے سلسلے میں واسطہ پڑے گا، اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لڑکا تمہاری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے۔''

''میڈم! وہ جذباتی انسان ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھا لوں گی۔'' روشی نے میڈم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میڈم کو شرفو سے کیا پرخاش ہے؟ اگر وہ اس کی خاطر باہر بیٹھا رہتا ہے تو اس سے میڈم کو کیا تکلیف ہو رہی ہے؟ سچ تو یہ تھا کہ شرفو کی موجودگی میں اسے خود بھی تحفظ کا احساس رہتا تھا۔ اس نے اس ایک ہفتے کے دوران میڈم کے گھر کچھ ایسے لوگوں کی آمد و رفت دیکھی تھی جن کا بیوٹی پارلر کے بزنس سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ لڑکیاں بھی میڈم کے پاس آتی رہتی تھیں۔ روشی نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ لوگ یہاں کیوں آتے تھے۔ کیا میڈم کا بیوٹی پارلر کے علاوہ بھی کوئی بزنس تھا؟ لیکن وہ تو زیادہ تر گھر پر ہی رہتی تھی۔ بیوٹی پارلر بھی برائے نام ہی جانا ہوتا تھا۔ وہاں کا سارا کام لڑکیوں نے سنبھال رکھا تھا۔ میڈم سارا دن کیا

www.pkdigest.com

فون پر لوگوں سے باتیں کرتی رہتی یا پھر روشی کا دماغ کھاتی۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے روشی کو بھی شک ہونے لگا تھا کہ میڈم حقیقت میں وہ نہیں جیسی نظر آتی ہے... لیکن جب تک کوئی ٹھوس بات سامنے نہ آتی، وہ اس شک کو یقین میں نہیں بدل سکتی تھی۔

میڈم نے اس فیشن شو میں جانے کے لیے اسے خاص طور پر تیار کیا تھا۔ میکسی نما سیاہ گاؤن میں وہ شعلہ جوالہ لگ رہی تھی۔ اوپر سے میڈم نے ایسا غضب کا میک اپ کیا کہ اسے خود آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس تیاری کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ میڈم سے پوچھ ہی بیٹھی۔

"اچھا ہوا تم نے یہ سوال خود ہی کر لیا ورنہ مجھے سمجھانا پڑتا۔" میڈم اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں کوئی کام بلاسبب نہیں کرتی۔ آج تمہاری شوبز ورلڈ میں پہلی انٹری ہے۔ وہاں بڑے بڑے سرمایہ دار، ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے مالکان، ڈائریکٹرز، کری ایٹوز فوٹوگرافرز اور دوسرے بہت سے لوگ ہوں گے۔ تمہیں ان سے متعارف کروانے کا یہ ایک اچھا موقع ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو گی۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" روشی نے معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں... میں تمہیں لوگوں سے متعارف کرواؤں گی۔ اگر وہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں تو مصافحہ کر لینا ورنہ مسکرا کر روش کر دینا۔ یاد رکھو، تمہارا سب سے بڑا ہتھیار یہی مسکراہٹ ہے جس سے تم لوگوں کو گھائل کر سکتی ہو۔ مادھوری کو تو جانتی ہونا؟ ارے، وہی انڈین ایکٹریس... اس نے اپنی اداکاری سے زیادہ مسکراہٹ اور ڈانس کے ذریعے لوگوں کے دل جیتے۔ تمہیں بھی یہی کچھ کرنا ہے۔ کسی سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کی باتوں کے جواب میں آئی سی اور گڈ، گڈ کہہ کر سر ہلاتی رہنا۔ میرا خیال ہے کہ اب تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی کہ تمہیں وہاں کیا کرنا ہے؟"

وہ فیشن شو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد کیا گیا تھا۔ وہاں کی سجاوٹ اور آرائش دیکھ کر روشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک بالکل ہی مختلف دنیا تھی جہاں بنگالی پاڑے میں رہنے والے کسی فرد کا داخلہ ممکن نہیں تھا لیکن وہ اسی بستی سے اٹھ کر اس ہوٹل تک چلی آئی تھی۔ شاید قسمت اسی کو کہتے ہیں کہ وہ معززین شہر کے جمگھٹے میں کھڑی ان سے اپنے حسن کا خراج وصول کر رہی تھی جبکہ اس کا حقیقی کزن ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا فراق کی گھڑیاں گن رہا تھا جس کے باپ کے ٹکڑوں پر پل کر وہ جوان ہوئی تھی۔

فیشن شو میں وہی کچھ تھا جو وہ ویڈیوز میں دیکھ چکی تھی۔ صرف پروڈکٹ اور ماڈلز بدل گئی تھیں لیکن روشی اس سارے تماشے کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی اس کی تربیت کا حصہ تھا۔ کل کو اسے بھی ان ماڈلز کی طرح ریمپ واک کرنی ہو گی چنانچہ اس کے لیے اس پورے عمل کا مشاہدہ کرنا بہت ضروری تھا لیکن میڈم بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ جلدی سے شو ختم ہو اور وہ ڈنر کے دوران روشی کو متعلقہ لوگوں سے متعارف کروا سکے۔

نتیجہ میڈم کی توقع کے مطابق نکلا۔ ڈنر کے دوران ہی روشی بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ کئی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں پھر کچھ بے صبرے اس کی جانب بڑھے تو میڈم نے ایک ادائے بے نیازی سے اس کا تعارف اپنی بھانجی کے طور پر کروایا جو دبئی میں مقیم تھی اور ان سے ملنے پاکستان آئی ہوئی تھی۔ اشتہاری کمپنیوں کے مالکان اور کری ایٹوز خاص طور پر اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ انہی میں یونیک کا کری ایٹو ڈائریکٹر ارسلان بھی تھا جو ایک کونے میں کھڑا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی معمولی لڑکی پر بھی ہاتھ رکھ دے تو وہ کندن بن جاتی ہے۔ اس کی نظریں مسلسل روشی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس انتظار میں تھا کہ کب میڈم نسیم اس لڑکی سے اس کا تعارف کرواتی ہے۔ خود آگے بڑھ کر پروانوں کی صف میں شامل ہونا اس کی شان اور وقار کے خلاف تھا اور یہی بات اسے دوسرے لوگوں سے ممتاز و منفرد بناتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی میڈم نسیم، روشی کا ہاتھ تھامے اس کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی۔

"ہائے ارسلان! ان سے ملو۔ یہ میری بھانجی روشانہ ہے اور ان دنوں مجھ سے ملنے دبئی سے آئی ہوئی ہے۔"

ارسلان تعظیماً جھکا اور قریبی میز پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے بولا۔ "نائس ٹو میٹ یو مس روشانہ! کیا میں آپ کی مصروفیات کے بارے میں جان سکتا ہوں؟"

روشی بولنا نہیں صرف مسکرانا جانتی تھی لہٰذا اس کی ترجمانی کا فریضہ بھی میڈم نسیم کو ہی انجام دینا پڑا۔ "ابھی تو اس کی پڑھائی مکمل ہوئی ہے۔ اب سوچ رہی ہے کہ اسے کچھ کام کرنا چاہیے لیکن ابھی کچھ طے نہیں کیا۔"

ارسلان سمجھ گیا کہ میڈم نسیم کیا چاہ رہی ہے۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور روشانہ کی طرف

بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو ضرور رابطہ کریں۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔"

روشی سے پہلے میڈم نے ہاتھ بڑھا کر وہ کارڈ لپک لیا اور چہکتے ہوئے بولی۔ "تھینک یو ارسلان! اگر روشی نے اس فیلڈ میں آنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے ہم تمہیں ہی اپروچ کریں گے۔"

یہ جملہ وہ ان تمام لوگوں سے بھی کہہ چکی تھی جن کے کارڈ اس کے پرس میں پہنچ چکے تھے لیکن ارسلان کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ذرّے کو آفتاب بنا سکتا تھا۔ اگر روشی کی لانچنگ ارسلان کے ذریعے ہوتی تو پھر اس کے مقدر کا ستارہ چمکنے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ ارسلان پیدائشی آرٹسٹ اور تخلیق کار تھا۔ اس نے ایک بیوروکریٹ کے گھر میں آنکھ ضرور کھولی تھی لیکن اس کا خمیر آرٹ اور کلچر سے بنا تھا۔ باپ نے سر توڑ کوشش کر لی کہ وہ کسی طرح سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لے لیکن ارسلان کا رجحان فنونِ لطیفہ کی جانب تھا۔ وہ ایم بی اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے بہانے بیرونِ ملک چلا گیا جہاں اس نے ایڈورٹائزنگ فلم پروڈکشن اور فوٹوگرافی کے حوالے سے متعدد کورس کیے اور واپس آنے کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ فرم جوائن کر لی۔ وہ والدین کا اکلوتا تھا۔ ایک بہن تھی جو شادی کے بعد امریکا میں رہائش پذیر تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ باپ نے سروس کے دوران ہی اتنے اثاثے بنا لیے تھے کہ وہ ساری عمر گھر بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ اس کے بھی دوست اور کلاس فیلوز اچھے عہدوں پر فائز تھے یا پھر اپنا کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ ان میں ارشد سے اس کی بہت گہری دوستی تھی جو پولیس میں اے ایس پی تھا اور وہ دونوں دن میں ایک بار ضرور رابطہ کرتے تھے۔

ارسلان کو جاسوسی ناول اور کہانیاں پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا جس کی وجہ سے اس کے اندر بھی سراغ رسانی کے جراثیم پروان چڑھ رہے تھے۔ وہ جب بھی کسی جرم کے بارے میں پڑھتا تو اس کا دماغ کسی سراغ رساں کی طرح اس جرم کی تہ تک پہنچنے اور مجرم کا سراغ لگانے میں مصروف ہو جاتا۔ وہ سگریٹ پینے کا عادی تھا لیکن اس عالم میں اس کی سگریٹ نوشی کی رفتار بھی بڑھ جاتی اور وہ کسی چمنی اسموکر کی طرح اس وقت تک ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگاتا رہتا جب تک کیس کے حوالے سے کسی نتیجے پر نہ پہنچ جاتا۔ اس نے ارشد کو بھی کئی کیسز میں گائیڈ کیا تھا جس کی بدولت وہ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ اگر پاکستان میں پرائیویٹ سراغ رسانی کا رواج ہوتا تو اس شعبے میں بھی ارسلان ہی سب سے آگے ہوتا۔

ارسلان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ گو کہ وہ پینتیس سال سے زیادہ کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ شاید اسے شادی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ ماں اس کی شادی کا ارمان لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور باپ کو اس کے معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ کبھی کبھی اتفاقاً رات کے کھانے پر ان دونوں کی ملاقات ہوتی تو وہ بڑے سرد لہجے میں اسے شادی کرنے کا مشورہ دیتا اور ارسلان ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح اس کا مشورہ سنتا اور سر جھکا کر اپنی تصوراتی دنیا میں گم ہو جاتا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس روز روشی سے ملنے کے بعد پہلی بار ارسلان نے کسی لڑکی کے لیے اپنے دل میں عجیب و غریب قسم کے جذبات محسوس کیے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کے لیے ترسا ہوا تھا۔ اس کے تو کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ صبح سے شام تک لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا۔ ایک سے ایک حسین اور طرح دار ماڈل اس کی نگاہِ التفات کی منتظر رہتی لیکن اسے صرف اپنے کام سے غرض تھی۔ وہ خالص پیشہ ورانہ انداز میں ان کی صلاحیتوں کو پرکھتا اور اپنے مطلب کی لڑکی چن کر اسے بھرپور انداز میں پروموٹ کرتا۔ اب تک وہ جتنی بھی لڑکیوں سے مل چکا تھا، روشی ان میں سب سے منفرد اور یکتا تھی۔ آج تک کوئی لڑکی اس کے ذہن یا دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکی تھی۔ ان میں سے کئی ایک کے نام بھی اسے یاد نہیں تھے لیکن روشی دو منٹ کی ملاقات میں ہی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اتر گئی اور اب کسی طرح جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

میڈم نسیم جہاں دیدہ عورت تھی۔ اس نے ارسلان کی کیفیت محسوس کرتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ روشی اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ میڈم کو یقین تھا کہ دوسری ملاقات میں وہ اپنی کسی پروڈکٹ کی لانچنگ کے لیے روشی کو لینے پر تیار ہو جائے گا چنانچہ اس نے ارسلان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی پلاننگ شروع کر دی۔ سب سے پہلے تو وہ روشی کو لے کر ایک ماہر فوٹوگرافر کے پاس گئی اور اس سے روشی کا پورٹ فولیو بنوایا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا جس کے لیے روشی کو کئی دنوں تک فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو جانا پڑا۔ روزانہ مختلف لباس، میک اپ اور ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس کی تصویریں بنوائی جاتیں پھر ویڈیو شوٹنگ شروع ہوئی۔ پہلے کچھ ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں بنے ہوئے سیٹ پر ہوئی۔ اس کے بعد آؤٹ ڈور کا مرحلہ آیا۔ اس کے لیے روشی کو ساحل

www.pkdigest.com

سمندر، مختلف ہوٹلوں، پارکوں اور گھروں میں شوٹنگ کروائی پڑی اور جب یہ تصویریں اور ویڈیو بن کر آئی تو میڈم نسیم داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ روشی نے غضب کی پرفارمنس دی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ پیدائشی ایکٹریس اور ماڈل ہے۔ میڈم اپنی کامیابی پر پھولی نہ سما رہی تھی۔ صرف ایک ماہ سے بھی کم وقت میں روشی اس جگہ پہنچ چکی تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے دوسری لڑکیوں کے لیے چھ مہینے بھی کم تھے۔

لوہا گرم تھا۔ اب چوٹ لگانے کی دیر تھی۔ میڈم نسیم نے اپنے منصوبے کے مطابق ارسلان کا فون نمبر ڈائل کیا اور لہجے میں دنیا بھر کی شیرینی سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”ارسلان! میری بھانجی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو...“

ارسلان کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اندر سے آواز آئی۔ 'تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔' اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ضرور... ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔ آپ جب چاہیں آسکتی ہیں۔“

”میں کچھ مصروف ہوں۔ شاید نہ آسکوں لیکن وہ کل صبح دس بجے تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔“

یہ بھی میڈم نسیم کی ایک چال تھی۔ اس طرح وہ ارسلان پر جتانا چاہ رہی تھی کہ اسے روشی کے اس شوق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ جن لڑکیوں کو اس فیلڈ میں متعارف کروا چکی تھی، انہوں نے ہی میڈم کا بھانڈا پھوڑ دیا اور اس کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ وہ ماڈل بننے کی شوقین لڑکیوں سے اپنا کمیشن وصول کرتی ہے۔ چنانچہ اسی تاثر کو زائل کرنے کے لیے اس نے روشی کو ارسلان کے پاس تنہا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن اس نے ایک بار پھر روشی کو پرانا سبق دوبارہ پڑھایا اور اسے اچھی طرح تیار کر کے ارسلان کے پاس بھیج دیا۔ روشی پہلی بار میڈم کے بغیر کسی اجنبی جگہ پر جارہی تھی اس لیے اس کا نروس ہونا فطری سی بات تھی لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی شرفو کو تھی جو اپنی عادت کے خلاف بالکل خاموش تھا اور دل ہی دل میں روشی کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ارسلان کے دفتر پہنچ چکے تھے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ روشی جھجکتی ہوئی ارسلان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ حسب عادت منہ میں سگریٹ دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ روشی کو دیکھتے ہی اس نے سگریٹ بجھا دی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آیئے... آیئے مس روشانہ! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

اس نے روشی کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”پورٹ فولیو لائی ہیں؟“

روشی نے ایک فائل اس کی جانب بڑھا دی جس میں اس کی تصویریں اور سی ڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے غور سے وہ تصویریں دیکھنا شروع کیں اور پھر سی ڈی نکال کر برابر میں رکھے کمپیوٹر میں لگا دی۔ جونہی اسکرین پر روشی کا متحرک جسم نمودار ہوا اور جیسے جیسے ویڈیو آگے بڑھتی گئی، اس کے چہرے پر حیرت اور تجسس کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے کمپیوٹر بند کر دیا اور سی ڈی نکال کر فولڈر میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”ونڈرفل مس روشانہ! لگتا ہے کہ میڈم نے آپ پر خوب محنت کی ہے؟“

”جی... جی... جی نہیں تو...“ وہ بری طرح گڑبڑا گئی اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ واقعی سچ کہا ہے کسی نے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

ارسلان اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ گھبرا کیوں رہی ہیں؟ میں نے ایسے ہی ایک بات پوچھی تھی۔ خیر، یہ بتائیں کہ آپ اس فیلڈ میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟“

”جی... جی... وہ... بس... مجھے شوق ہے۔“ روشی نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا... اچھا... یہی جواب مناسب ہے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ اس شوق کی تکمیل کے لیے پاکستان کیوں چلی آئیں؟ دبئی میں زیادہ مواقع ہیں۔ وہاں کافی بڑا بزنس ہے اور پیسے بھی اچھے ملتے ہیں۔“

روشی کے لیے اس سوال کا جواب دینا بھی مشکل ہو گیا۔ میڈم نے اسے کس مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ وہ دبئی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس لیے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جانتی تھی کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص بہت تیز ہے۔ جتنا بولے گی، اتنی ہی پھنستی چلی جائے گی۔

ارسلان نے بھی اصرار نہیں کیا اور سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”مس روشانہ! اس فیلڈ میں داخل ہونے سے پہلے ایک دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیجیے۔ بظاہر اس پروفیشن میں بڑی کشش ہے اور لڑکیاں اس کے گلیمر سے متاثر ہوکر اس جانب کھنچی چلی آتی ہیں لیکن یہ راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے۔ یہاں قدم قدم پر بہت کچھ سننا اور سہنا پڑتا ہے۔ اگر آپ میں برداشت کا حوصلہ ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اب بھی واپسی کا راستہ کھلا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“ یہ وہ رٹا رٹایا جملہ تھا جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ادا کر چکی تھی لہٰذا اسے بولنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کو اسکرین ٹیسٹ کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی ہم مزید کوئی بات کرسکیں گے۔“

اس نے انٹرکام پر کسی سے کچھ بات کی۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی اندر آئی۔ ارسلان نے روشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انہیں اسکرین ٹیسٹ کے لیے لے جائیں۔“

روشی کے جانے کے بعد ارسلان نے سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اس بے وقوف لڑکی کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے۔ وہ میڈم نسیم سے اچھی طرح واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ بیوٹی پارلر کی آڑ میں کیا کچھ کرتی رہتی ہے۔ اس روز فیشن شو میں روشی کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ گوکہ میڈم نسیم نے اسے اپنی بھانجی کہہ کر متعارف کروایا تھا لیکن روشی کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ میڈم نسیم جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ لڑکی پہلی نظر میں ہی اسے بھا گئی تھی...... روشی کی معصومیت اور سادگی نے اسے بے حد متاثر کیا اور دو منٹ کی ملاقات میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ میڈم نسیم کا نیا شکار ہے اور اپنی کسی مجبوری کے سبب اس کے جال میں پھنس گئی ہے۔ [illegible] تجسس پسند طبیعت نے اسے اکسایا کہ وہ روشی کے بارے میں پوری جانکاری کرے۔ دوسرے دن ہی اسے روشی کے بارے میں مکمل رپورٹ مل گئی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جس آدمی کو اس نے روشی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے مامور کیا تھا، اس کے کہنے کے مطابق روشی بنگالی پاڑے کے رہائشی نذر دل کی بھانجی تھی اور ماڈل بننے کے شوق میں میڈم نسیم کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ ارسلان کے لیے اتنا ہی جاننا کافی تھا۔ اب اسے بے چینی سے میڈم نسیم کے فون کا انتظار تھا اور جیسے ہی میڈم نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے روشی کو بلانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسکرین ٹیسٹ کا نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ روشی کو کسی نہ کسی بہانے اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرے گا۔ یہی ایک طریقہ تھا جس کے ذریعے وہ روشی کو اپنے سے قریب اور میڈم نسیم سے دور رکھ سکتا تھا۔ اچانک اسے اپنے دوست ارشد کا خیال آیا۔ وہ یقیناً اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ اس نے ارشد کا نمبر ملایا اور اسے مختصراً روشی کے بارے میں بتا کر میڈم نسیم پر نظر رکھنے کی درخواست کی۔ ارشد جانتا تھا کہ ارسلان کو کبھی بھی لڑکیوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ اس لیے وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”مبارک ہو، پتھر میں بھی جونک لگ ہی گئی۔“

”کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”یہی کہ مسٹر بارڈاسٹون بھی بالآخر پگھل ہی گئے لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقیناً وہ کوئی توپ شے ہوگی جس نے تم جیسے شخص کو راستے پر لگا دیا۔“

”یار! کبھی تو سنجیدہ ہوجایا کرو۔“ ارسلان جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی تو پولیس آفیسر کے بجائے کامیڈین لگتے ہو۔ لگتا ہے کہ سنجیدگی تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔“

”کہتے ہیں عشق جس کو، خلل ہے دماغ کا۔ مجھے بھی تمہاری باتوں سے ایسا ہی لگ رہا ہے۔ خیر، ہمیں تو یار کی یاری سے مطلب ہے، تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔ میں آج ہی ایک بندے کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں جو اس عورت کی سرگرمیوں پر نظر رکھے گا۔ ویسے کب ملوا رہے ہو اس قتالہ عالم سے جس کے طفیل ہمیں بھی بھائی کے ولیمے کے چاول کھانا نصیب ہوں گے۔“

”بلی کو ہمیشہ خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ منہ دھو کر رکھو۔ فی الحال دور دور تک ایسا کوئی امکان نہیں۔“

یہ کہہ کر ارسلان نے فون بند کر دیا۔ اب اس کے اندر سویا ہوا سراغ رساں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسکرین ٹیسٹ ختم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اسے معلوم تھا کہ روشی اپنے کزن شرفو کے ساتھ آئی ہے۔ اس نے انٹرکام پر استقبالیہ کلرک کو ہدایت کی کہ مس روشانہ کے ساتھ آنے والے صاحب کو اندر بھیج دیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ہی شرفو اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کی طلبی کس سلسلے میں ہوئی ہے۔

ارسلان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حسب عادت سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کیا کام کرتے ہیں مسٹر...؟“

”شرفو... شرفو... نام تو ہمارا شرف الاسلام ہے لیکن سب لوگ ہم کو شرفو بولتا ہے۔“

”میں نے پوچھا ہے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟“

”ابھی تو کچھ نہیں کرتا لیکن چانس مل جائے تو بتائے گا کہ ہم کیا کیا کرسکتا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ ارسلان اس کی گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ کیا کام کرنا چاہتے ہیں؟“

www.pkdigest.com

''صاب! ہم کو ایکٹر بننے کا شوق ہے۔ ہم نے بہت کوشش کیا لیکن کوئی بھی ہم کو چانس دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ روشی ماڈل بن جائے تو وہ ہمارے لیے کچھ کرے گا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''صاب! آپ بھی ہمارا خیال رکھنا لیکن روشی کو یہ بات نہیں معلوم ہونی چاہیے ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔''

''بہت ڈرتے ہو روشی سے؟''

''صاب! بات ہی کچھ ایسا ہے۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو کیا بتائے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم روشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟''

''ہم کو نہیں معلوم۔ ابھی ہمارا کوئی ڈائریکٹ بات نہیں ہوا۔ بس ایک بار ہم کو ایکٹر بن جانے دو پھر ہم اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا۔''

''ہوں۔'' ارسلان نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ یک طرفہ ٹریفک ہے اور شرفو ایک ایسا خواب دیکھ رہا ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ تاہم اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ شرفو کے خواب چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ یہ سیدھا سادہ بے ضرر سا لڑکا، روشی کو بچانے کے مشن میں اس کا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو شرفو! میں جان گیا ہوں کہ روشی تمہارے لیے کتنی اہم ہے اور ماڈل بن جانے کے بعد وہ ہمارے لیے بھی اتنی ہی اہم ہو جائے گی، لہٰذا ہم دونوں کو ہی مل جل کر اس کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا روشی کو کوئی خطرہ ہے؟''

''گھر سے نکلنے والی لڑکی کو قدم قدم پر خطرہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے لڑکیاں مرد کی پناہ میں تحفظ تلاش کرتی ہیں۔ اور اس فیلڈ میں تو ویسے بھی ایک سے ایک گھاگ شکاری بیٹھا ہوا ہے۔ یہاں رقابت، حسد، جلن سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جیسے جیسے روشی کی شہرت اور مقبولیت بڑھتی جائے گی، اسی حساب سے اس کے دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ اسے اغوا بھی کیا جا سکتا ہے اور قاتلانہ حملہ بھی ممکن ہے۔''

''صاب! ایسی باتیں مت کرو۔ ہم کو ڈر لگتا ہے۔''

''ضروری نہیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں ویسا ہی ہوگا لیکن امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میں اس کا خیال رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

شرفو نے بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا اور فکرمند ہوتے ہوئے بولا۔ ''صاب! ہم کو کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلی بات تو یہ کہ کسی پر بھی ظاہر نہیں کرو گے کہ تم مجھ سے رابطے میں ہو۔ روشی کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ روشی کے ساتھ سائے کی طرح چپکے رہو گے اور کسی حال میں اسے تنہا نہیں چھوڑو گے۔ اگر کہیں بھی کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو فوراً مجھ سے رابطہ کرو گے۔ موبائل تو ہے نا تمہارے پاس؟''

''جی... جی۔'' شرفو نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''گڈ!'' ارسلان نے میز پر سے اپنا کارڈ اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''اپنے موبائل میں یہ نمبر فیڈ کر لو اور مجھے مس کال دے دو۔ اس طرح تمہارا نمبر میرے موبائل پر آ جائے گا۔''

''صاب! یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ آپ نے جو بولا ہم ویسا کرے گا لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتا کہ آپ روشی کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہے؟''

ارسلان سمجھ گیا کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا شرفو اتنا سیدھا بھی نہیں ہے۔ اس کا ذہن بھی موقع کی مناسبت سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نے شرفو کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ''میڈم نسیم جیسی عورتیں کبھی کبھی دو نمبر کام بھی کرنے لگتی ہیں اس لیے ان سے محتاط اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ تم اور روشی دونوں ہی بہت سیدھے ہو اور تمہیں دنیا کی ہوا بھی نہیں لگی۔ روشی کے لیے میں یوں فکرمند ہوں کہ اب وہ میری ماڈل ہے اور میں تمہارے لیے بھی کوئی موقع تلاش کرتا ہوں۔ میری کئی پروڈیوسرز سے جان پہچان ہے۔ کہیں نہ کہیں تمہارا کام بن ہی جائے گا۔''

آخری جملہ سن کر شرفو نہال ہو گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ارسلان کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور انتہائی جذباتی انداز میں بولا۔ ''صاب! ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گا۔ ہم کو اپنا غلام سمجھو۔ جان بھی مانگے تو انکار نہیں کرے گا۔''

''ارے ارے... یہ کیا کر رہے ہو؟'' ارسلان اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''بس اب تم جاؤ اور باہر بیٹھ کر روشی کا انتظار کرو۔''

شرفو کے جانے کے بعد روشی بھی آ گئی۔ وہ اسکرین

ٹیسٹ میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ارسلان نے اسے مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''اوکے مس روشانہ! پہلے مرحلے میں تو آپ کامیاب رہیں۔ دو دن بعد کلائنٹ سے میٹنگ ہے۔ ان کی منظوری ملنے کے بعد ہم اس کمپین پر کام شروع کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں۔''

''آپ آنٹی سے بات کریں۔ وہی اس بارے میں کچھ کہہ سکیں گی۔''

روشی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے اور اس کے سارے معاملات میڈم نسیم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی آمدنی پر بھی میڈم کا کنٹرول ہوگا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور انڈے کھائیں کوّے۔ ارسلان کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں انہیں بتا دوں گا لیکن آپ کو بروقت فیصلہ کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے ورنہ اس دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ جائیں گی۔''

☆☆☆

ارشد نے میڈم نسیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری انسپکٹر شہباز کے سپرد کر دی تھی کیونکہ یہ [illegible] واقع تھا۔ ابتدائی اطلاعات کے مطابق میڈم نسیم کو سو فیصد کلیئر نہیں قرار دیا جا سکتا تھا اور اس کی بعض سرگرمیاں مشکوک نوعیت کی تھیں۔ مخبر نے اپنی رپورٹ میں بتایا تھا کہ اس کے یہاں نوجوان لڑکیوں اور دیگر افراد کا آنا جانا لگا رہتا ہے لیکن یہ لوگ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرتے۔ یہ اطلاعات ناکافی تھیں اور ان سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا جسے بنیاد بنا کر میڈم نسیم کے گھر پر چھاپا مارا جا سکے۔ انسپکٹر شہباز جانتا تھا کہ میڈم نسیم جیسی عورتوں کی پہنچ بہت دور تک ہوتی ہے لہٰذا اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے مضبوط ثبوت اکٹھا کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے اس ابتدائی رپورٹ سے اے ایس پی ارشد کو آگاہ کر دیا جس نے اسے ناکافی قرار دیتے ہوئے انسپکٹر شہباز کو ہدایت کی کہ وہ میڈم نسیم کی نگرانی سخت کر دے۔

ارسلان نے میڈم نسیم اور روشی کے تعلق کے بارے میں جس شبہے کا اظہار کیا تھا، اسے ارشد کسی اور ہی انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ملک میں ٹی وی چینلز کی بھرمار کے ساتھ ہی لاتعداد پروڈکشن ہاؤس وجود میں آ گئے تھے جو چینلز کے لیے مختلف نوعیت کے پروگرام تیار کیا کرتے تھے۔ ان میں کچھ دو نمبر کے لوگ بھی تھے جو نوجوان لڑکیوں کو سنہرے مستقبل کا جھانسا دے کر انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ان نام نہاد پروڈیوسرز کے خلاف کئی شکایات منظرِ عام پر آ چکی تھیں لیکن کسی واضح ثبوت کے بغیر ان پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ ابھی تک کسی بھی متاثرہ فرد نے ان کے خلاف کسی تھانے میں کوئی شکایت درج نہیں کروائی تھی تاہم اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں کی بنیاد پر حکامِ بالا نے اے ایس پی ارشد کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ ان افراد پر نظر رکھے اور مناسب ثبوت ملنے پر ان افراد کے خلاف بھرپور کارروائی کی جائے۔

ارشد اور ارسلان اس نکتے پر متفق ہو چکے تھے کہ میڈم نسیم، روشی کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ جھوٹ تھا جو اس نے روشی کو اپنی بھانجی ظاہر کر کے بولا تھا۔ ارسلان نے روشی سے باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ ایک معاہدے کے تحت دو سال تک اس کے احکامات پر عمل کرنے کی پابند ہے اور میڈم نسیم اس کی منیجر کے طور پر تمام معاملات ہینڈل کرے گی۔ لیکن اس معاہدے کی بنیاد پر میڈم نسیم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس بزنس میں اس طرح کی ڈیل معمول کی بات ہے۔ ارسلان کو شبہ تھا کہ میڈم نسیم وہ نہیں جو نظر آتی ہے اور ارشد بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔ ان کے خیال میں تو روشی کو ماڈلنگ کے لیے تیار کرنا ایک ڈھونگ تھا۔ دراصل میڈم کے عزائم کچھ اور تھے اور وہ روشی کے ذریعے کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں تھی۔

حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنا ہر پولیس آفیسر کے لیے ضروری ہے۔ ارشد بھی اسی خیال کے تحت اخبار کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا کرتا تھا اور عوامی اشتہارات سمیت کسی بھی کالم کو پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کی تیز نظریں بعض اوقات ان میں سے کچھ بوگس اشتہاروں کے پیچھے چھپی ہوئی جرم کہانی کو بھی تلاش کر لیا کرتی تھیں۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ اس کی نظر ایک تین سطری اشتہار پر جم گئی۔ یہ اشتہار کسی غیر معروف پروڈکشن ہاؤس کی جانب سے تھا اور اس میں ایک نئی ڈراما سیریل میں کام کرنے کے خواہش مند لڑکے اور لڑکیوں سے درخواستیں مانگی گئی تھیں۔ ارشد نے فوراً اس اشتہار کے گرد نشان لگایا اور لیڈی اے ایس آئی شاہینہ کو بلا کر وہ اخبار اس

www.pkdigest.com

کے حوالے کر دیا۔

"مس شاہینہ! میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پروڈکشن ہاؤس کی حقیقت معلوم کریں کیونکہ اس طرح کے فراڈ کی کئی شکایتیں سامنے آ چکی ہیں۔ یہ معلومات خفیہ طور پر حاصل کی جائیں تو بہتر رہے گا تاکہ ٹھوس ثبوت ملنے پر ہم ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔"

"یس سر! میں پوری کوشش کروں گی کہ اس بارے میں آپ کو جلد از جلد رپورٹ دے سکوں۔" شاہینہ نے اپنے آفیسر کو سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"گڈ! میں آپ کی رپورٹ کا منتظر رہوں گا۔"

شاہینہ نے اپنی سیٹ پر آ کر اس اشتہار کو بہ غور پڑھا اور فوراً ہی ایک اسکیم اس کے ذہن میں آ گئی۔ وہ دفتر سے اٹھ کر قریبی پی سی او تک گئی اور اشتہار میں دیا گیا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف سے بھی ایک لڑکی نے ہی فون اٹھایا۔ شاہینہ نے اپنی ٹون تبدیل کی اور اٹک اٹک کر بولی۔

"وہ جی... آپ نے آج کے اخبار میں اشتہار دیا ہے نا... تو جی مجھے بھی بڑا شوق ہے ایکٹنگ کرنے کا۔ کیا مجھے آپ کے ڈرامے میں چانس مل سکتا ہے؟"

"یہ فیصلہ تو آپ سے ملنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ آپ شام پانچ بجے کے قریب آ جائیں۔ پروڈیوسر صاحب آپ سے انٹرویو کریں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی بات ہو سکے گی۔" لڑکی نے کھنکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس روز شاہینہ مقررہ وقت سے پہلے ہی گھر چلی گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔ اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو گئی۔ اب وہ پولیس آفیسر کے بجائے... مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھنے والی ایسی لڑکی لگ رہی تھی جس کا بیشتر وقت ڈرامے دیکھنے اور ڈائجسٹ پڑھنے میں گزر جاتا ہے اور جو دن رات اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔

پروڈکشن ہاؤس کا دفتر تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ڈیفنس میں واقع ایک کمرشل بلڈنگ کے دوسرے فلور پر کمرا نمبر چار کے دروازے پر وہ رکی۔ وہاں کوئی نیم پلیٹ موجود نہیں تھی۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہاں آٹھ دس لڑکے اور لڑکیاں اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی ایک لڑکی فون پر مصروف گفتگو تھی اور اس کی میز پر ریسپشن کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ شاہینہ اس کی جانب بڑھی تو اس لڑکی نے کچھ کہے بغیر میز کی دراز کھول کر ایک فارم اسے پکڑا دیا۔ شاہینہ نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک خالی کرسی دیکھ کر وہاں بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے کہ فارم میں اصل کوائف درج کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا اس نے تمام معلومات فرضی لکھ ڈالیں یہاں تک کہ دستخط بھی بدل کر کیے اور فارم اس لڑکی کے حوالے کر دیا۔

شاہینہ کا خیال تھا کہ اس کی باری کافی دیر میں آئے گی لیکن شاید پروڈیوسر صاحب بہت جلدی میں تھے اس لیے تمام امیدوار آدھ گھنٹے میں ہی فارغ ہو گئے۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کا سامنا ایک ادھیڑ عمر شخص سے ہوا۔ شاہینہ نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ اس کا واسطہ کسی جرائم پیشہ سے ہے۔ پولیس میں اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے وہ چہرے پڑھنے کے فن سے خوب واقف ہو چکی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں شیطان ڈیرا جمائے بیٹھا تھا اور وہ شاہینہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے قسائی بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے جانچتا ہے۔

شاہینہ نے اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اپنے جسم کو چادر میں اچھی طرح سمیٹ لیا اور اس طرح باادب ہو کر بیٹھ گئی جیسے کسی اسکول میں استانی کے لیے انٹرویو دینے آئی ہو۔ اس شخص نے فارم کو ایک نظر دیکھا اور انتہائی بے ڈھنگے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "مس صائمہ! آپ اس فیلڈ میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟"

شاہینہ نے فارم میں یہی نام لکھا تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "جی... مجھے بچپن سے ہی ایکٹنگ کا شوق ہے۔ اسکول کے ڈراموں میں بھی کام کرتی رہی ہوں۔ مجھے کئی بار انعام بھی ملا ہے جی۔"

"اسکول کے ڈراموں اور ٹی وی پر ایکٹنگ میں بہت فرق ہے۔ یہاں شوق کے ساتھ ساتھ ٹیلنٹ کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ بہرحال، کل آپ کا آڈیشن ہوگا۔ آپ اس میں کامیاب ہو گئیں تو اسکرین ٹیسٹ لیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔ کل آپ ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آئیں۔ میرا مطلب ہے جیسا کہ آج کل ٹی وی ڈراموں میں ہماری اداکارائیں پہنتی ہیں۔"

"جی بہتر... اب میں جاؤں؟"

"جی ہاں۔ آپ جا سکتی ہیں۔ کل صبح گیارہ بجے آپ کا آڈیشن ہوگا۔"

اس دفتر کا ماحول دیکھنے کے بعد شاہینہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں کوئی اور چکر چلا رہے ہیں۔ اب اسے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس نام نہاد پروڈیوسر کی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ انٹرویو کے لیے آئے ہوئے دوسرے امیدواروں سے بھی کچھ اگلوانے کی کوشش کرے گی لیکن جب وہ پروڈیوسر کے کمرے سے باہر آئی تو سب جا چکے تھے۔

دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر تیار ہو کر آڈیشن دینے پہنچ گئی۔ آج اس نے جدید طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور میک اپ پر بھی خاص توجہ دی تھی۔ گوکہ یہ سب کچھ اس کے مزاج اور پروفیشن کے خلاف تھا لیکن بعض اوقات فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں یہ سب کچھ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پروڈیوسر نے اسے ایک صفحہ پکڑایا اور اس پر لکھے ہوئے مکالمے بولنے کے لیے کہا۔ شاہینہ نے ایک ہی سانس میں وہ لائنیں پڑھ ڈالیں تو وہ بولا۔ "اس طرح نہیں... بلکہ یہ مکالمے ادا کرتے وقت ان کے موڈ کے مطابق تاثرات ہونے چاہئیں۔"

شاہینہ نے ایک بار پھر اسکرپٹ پر نظر دوڑائی۔ وہ ایک طربیہ سین تھا لہٰذا اس نے لہجے میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے ان مکالموں کو دہرایا۔ پروڈیوسر نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے رات آٹھ بجے اسکرین ٹیسٹ کے لیے آنے کو کہا تو وہ فکرمند ہو گئی۔ اس نے پروڈیوسر سے پوچھا۔ "اسکرین ٹیسٹ کے لیے آٹھ بجے کا وقت ہی کیوں؟ کیا یہ ٹیسٹ دن میں نہیں ہو سکتا؟"

"یہ آپ ہماری مجبوری سمجھیں۔ ہمارے پاس اپنا اسٹوڈیو نہیں ہے اور ہمیں سب کچھ کرائے پر لینا پڑتا ہے۔ جس پارٹی سے ہمارا ایگریمنٹ ہے، اس کا سامان پہلے ہی کسی دوسری ریکارڈنگ میں بک ہے۔ اس ٹیسٹ کے لیے بڑی مشکل سے آٹھ بجے کا وقت ملا ہے۔ ہم انہی کی لوکیشن پر یہ ٹیسٹ لیں گے۔"

شاہینہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پہلے اس نے سوچا کہ ٹیسٹ دینے سے انکار کر دے لیکن وہ اپنے مشن کو ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے اس ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ پروڈیوسر نے اسے اس لوکیشن کا پتا بتا دیا جہاں اسے پہنچنا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھی اپنے دفتر گئی اور اس نے اے ایس پی ارشد کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ارشد اس آئیڈیے سے متفق نہیں تھا۔ اس نے شاہینہ کو وہاں جانے سے منع کیا اور کہا کہ وہ معاملے کی کھوج لگانے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرے لیکن شاہینہ اپنے پلان پر بضد رہی تو ارشد نے اسے آگے بڑھنے کا سگنل دے دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ وہ مناسب نفری کو اس لوکیشن کے آس پاس تعینات کر دے تاکہ بروقت ضرورت اس کی مدد لی جا سکے۔ شاہینہ نے اس کے کہنے پر چار افراد کی پارٹی تیار کی اور انہیں مجوزہ آپریشن کے بارے میں ضروری ہدایات دے دیں۔

شام سات بجے کے قریب وہ اپنے گھر سے روانہ ہوئی اور ٹیکسی کے ذریعے پروڈیوسر کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی۔ اس نے حفاظت کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے پرس میں ریوالور رکھ لیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً غیر آباد علاقہ تھا جہاں فاصلے سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس نے ٹیکسی سے اتر کر موبائل فون کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا اور یہ جان کر مطمئن ہو گئی کہ وہ سب اس کے آس پاس موجود ہیں۔ شاہینہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیل بجائی تو اندر سے کسی نے انٹرکام پر اس کی شناخت دریافت کی۔ شاہینہ نے اپنا نام بتایا تو مرکزی گیٹ کھل گیا۔ اس نے احاطے میں داخل ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ بیرونی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور اس کے ساتھی ضرورت پڑنے پر دیوار کود کر اندر آ سکتے تھے۔ پورچ میں صرف ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے بلڈنگ کے داخلی دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس کی نظر ایک لمبے تڑنگے شخص پر پڑی جو گارڈ کی وردی میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے داہنے ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا تھا جس کی نال اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ شاہینہ اس کے چہرے پر چھائی کرختگی دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے جس انداز میں ریوالور پکڑ رکھا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اسی وقت فائرنگ شروع کر دے گا۔ شاہینہ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اس سے پروڈیوسر کے بارے میں پوچھا تو اس نے دائیں جانب بنے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ شاہینہ آگے بڑھی تو وہ بھی ریوالور کی نال اوپر اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ ایک عام سا کمرا تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ پروڈیوسر نے اسے دیکھا تو خوش دلی سے بولا۔ "اچھا ہوا، تم وقت سے پہلے آ گئیں۔ ہمیں ایک گھنٹے میں اپنا کام مکمل کرنا ہے ورنہ دوسرے گھنٹے کا کرایہ بھی دینا پڑ جائے گا۔ بس کیمرا ٹیم اور کریو اسٹاف بھی آنے والا ہی ہوگا۔"

شاہینہ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ فہم تھی۔ یہ کیسا پروڈکشن ہاؤس تھا جہاں ایک پروڈیوسر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گوکہ وہ اس فیلڈ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن اتنا تو معلوم تھا کہ اس موقع پر چار پانچ افراد یعنی ڈائریکٹر، کیمرامین، اسکرپٹ رائٹر، میک

www.pkdigest.com

اپ مین اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر وغیرہ کی موجودگی ضروری ہوتی ہے لیکن یہاں تو کوئی چیز اسے بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ذہن پر زیادہ زور نہیں دیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد پروڈیوسر کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون سننے کے بعد کہا۔ ''وہ لوگ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ سامنے والے کمرے میں جا کر یہ لباس تبدیل کر لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے آنے تک آپ بالکل تیار رہیں تاکہ ہم فوراً ہی کام شروع کر دیں۔'' یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھا ہوا تھیلا اسے پکڑا دیا۔

شاہینہ نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ اس میں ساڑی، پیٹی کوٹ، بغیر آستینوں کا بلاؤز اور میک اپ کا سامان رکھا ہوا تھا۔ شاہینہ نے پہلے کبھی ساڑی نہیں پہنی تھی لہٰذا اسے الجھن ہونے لگی۔ اس نے پروڈیوسر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''لباس تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے... ان کپڑوں میں کیا برائی ہے؟''

''آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔'' پروڈیوسر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس اسکرین ٹیسٹ کا رزلٹ فنانسر بھی دیکھے گا اور وہی آپ کو کاسٹ کرنے کا فیصلہ کرے گا۔ یہ ڈریس اسی لیے پہنایا جا رہا ہے کہ آپ گلیمرس نظر آئیں اور فنانسر پہلی ہی نظر میں آپ کو اوکے کر دے۔''

یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ وہی جلاد صفت گارڈ ریوالور ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوا۔ حسبِ معمول ریوالور کی نال کا رخ اوپر کی جانب تھا۔ پروڈیوسر نے اس سے کہا۔ ''مس صائمہ کو سامنے والے کمرے کا راستہ دکھاؤ۔''

وہ گارڈ گھوم کر شاہینہ کے پاس آیا اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ 'چلتی ہو یا اٹھا کر لے جاؤں؟'

شاہینہ نے اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی دھمکی کو پڑھ لیا اور تھیلا اٹھا کر خاموشی سے باہر چلی گئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے غور سے وہاں کا جائزہ لیا لیکن اسے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ کمرے کے وسط میں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا جبکہ ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ شاہینہ نے وہ تھیلا بیڈ پر رکھ دیا اور خود ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی تقدیر کو کوسنے لگی۔ وہ بری طرح پھنس چکی تھی اور اسے ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس گیم گارڈ کو دیکھ کر ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ اپنے مطلب کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی لباس تبدیل نہیں کرے گی۔ اسے یقین تھا کہ اس کمرے میں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں

اور ان کی مدد سے بنائی گئی فلم اسے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کی جائے گی۔ اس نے باتھ روم میں جا کر دروازہ بند کیا اور موبائل پر باہر کھڑے اے ایس آئی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نے مختصر لفظوں میں اسے اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ فی الوقت اسے گھر میں پروڈیوسر اور ایک مسلح گارڈ کے سوا کوئی تیسرا فرد نظر نہیں آیا۔ اس نے پولیس پارٹی کو الرٹ رہنے کا کہہ دیا اور کہا کہ جیسے ہی وہ مس کال دے، وہ گھر کے اندر داخل ہو جائیں۔

اب اسے آنے والے لمحات کا انتظار تھا۔ اس دوران اس نے اپنی حکمتِ عملی تیار کر لی تھی۔ اسے ٹریننگ کے دنوں میں بتایا گیا تھا کہ جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو دفاع کے بجائے جارحیت ہی بہترین حکمتِ عملی ہے۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر حملہ کر دینا بعض اوقات کامیاب رہتا ہے۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر وہ گارڈ کو کسی طرح قابو کر لے تو اس کے ساتھی بہ آسانی صورتِ حال کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پرس سے ریوالور نکالا اور دروازے کی آڑ میں ہوتے ہوئے بولٹ گرا دیا۔ آنے والا شاید نشے میں تھا اس لیے اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ شاہینہ نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر ریوالور کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ آنے والے کے حلق سے غوں کی آواز نکلی اور وہ منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ شاہینہ نے اپنا پرس اٹھایا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ منحوس گارڈ سامنے ہی کھڑا تھا۔ شاہینہ نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بولی۔

''دیکھو، انہیں کیا ہوا؟''

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، شاہینہ نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ گارڈ کے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے جیسے وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن ریوالور کی ضرب بہت شدید تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ شاہینہ جلدی سے باہر نکلی اور اس نے دروازہ لاک کر دیا۔ چند لمحے تک وہ دیوار کے ساتھ لگی اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتی رہی پھر اس نے ساتھیوں کو مس کال دی اور محتاط انداز میں پروڈیوسر کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

وہ صوفے پر بیٹھا موبائل فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ شاہینہ کو دیکھ کر اس نے موبائل بند کر دیا اور چونکتے

ہوئے بولا۔ ''آپ نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے؟''

''اب اس کی ضرورت نہیں۔'' شاہینہ نے سرد لہجے میں کہا اور اس پر ریوالور تان لیا۔ ''سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو اور پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں کیا دھندا کر رہے ہو؟''

پروڈیوسر جس کا نام ملک مشتاق تھا، اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر سیدھی سادی نظر آنے والی یہ لڑکی اتنی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا ہاتھ گھنٹی کی جانب بڑھا ہی تھا کہ شاہینہ کڑک کر بولی۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔ تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ دونوں فی الحال آرام کر رہے ہیں۔''

ملک مشتاق کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ دھان پان سی لڑکی اس گیم گارڈ کو کس طرح قابو کر سکتی ہے لیکن اس کے پاس شاہینہ کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ احاطے میں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ شاہینہ کو اطمینان ہو گیا۔ اس کے ساتھی مکان میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ ملک مشتاق کو کور کیے ہوئے پیچھے ہٹی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ چند ہی لمحوں بعد ملک مشتاق گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے پچاس ہزار کے نوٹ برآمد ہوئے۔ یہ رقم غالباً اس نے اس ایجنسی سے وصول کی تھی جس کے لیے اس نے شاہینہ کا سودا کیا تھا۔ گارڈ اور اس شخص کو بھی بے ہوشی کی حالت میں ہی اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیا گیا۔

ملک مشتاق سے سچ اگلوانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس نے تھانے پہنچ کر اعتراف کر لیا کہ وہ نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا جھانسا دے کر انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ پہلے ان لڑکیوں کی شرمناک فلمیں بنائی جاتی تھیں اور پھر انہیں بلیک میل کیا جاتا تھا۔ اس کا تعلق ایک منظم گروہ سے تھا جس کا کاروبار دوسرے ملکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں جو لڑکیاں زیادہ حسین اور خوب صورت ہوتی تھیں، انہیں بیرونِ ملک ریکارڈنگ کے بہانے خلیج کی ریاستوں میں اسمگل کر دیا جاتا تھا۔ ملک مشتاق نے بتایا کہ وہ گروہ کے سرغنہ کو نہیں جانتا اور اس کی ساری ڈیلنگ میڈم نسیم سے تھی جو خود بھی بیوٹی پارلر کی آڑ میں یہ دھندا کر رہی تھی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ملک مشتاق کے انکشاف کے بعد فوراً ہی میڈم نسیم پر بھی ہاتھ ڈال دیا جاتا لیکن ارشد اس کے حق میں نہیں تھا۔ اس طرح گروہ کا سرغنہ اور دوسرے ارکان چوکنا ہو جاتے اور پولیس ان تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔

ویسے بھی ٹھوس ثبوت کے بغیر میڈم نسیم کی گرفتاری بے سود ہوتی۔ وہ عدالت میں بیان دے سکتی تھی کہ وہ ملک مشتاق کو نہیں جانتی اور اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایسی صورت میں پولیس کے لیے ثابت کرنا مشکل ہو جاتا کہ ملک مشتاق اور میڈم نسیم ایک ہی گروہ کے لیے کام کر رہے تھے۔

مشتاق کی گرفتاری کو خفیہ رکھا گیا۔ ارسلان کی ایجنسی کے ساتھ روشی کا کنٹریکٹ ہو گیا تھا اور ان دنوں وہ اس کے پہلے ایڈ کی تیاری میں مصروف تھا۔ ارسلان کو یقین تھا کہ اس اشتہار کے ریلیز ہوتے ہی روشی کے دن پھر جائیں گے اور دوسری ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں بھی اس کی جانب لپکیں گی۔ لیکن اس ساری محنت کا روشی کو کیا فائدہ ہوتا؟ اس کی آدھی کمائی تو میڈم نسیم ہڑپ کر جاتی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ایک دفعہ روشی کے قدم جم جائیں پھر وہ اسے اس نام نہاد معاہدے سے آزاد کروانے کی کوشش کرے گا۔

میڈم نسیم بھی روشی کی پرفارمنس سے بہت خوش تھی۔ اس نے روشی کو ایک پروڈیوسر سے ملوایا جو اپنے ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے دبئی جا رہا تھا۔ اس نے روشی کو ہیروئن کا رول آفر کیا اور بتایا کہ اس ڈرامے کی تمام تر ریکارڈنگ دبئی میں ہو گی جس کے لیے انہیں وہاں کم از کم ایک مہینا قیام کرنا پڑے گا۔ روشی اس خیال سے ہی بہت خوش تھی کہ اس بہانے اسے دبئی دیکھنے کا موقع مل جائے گا لیکن اس نے شرط عائد کی کہ شرفو بھی اس کے ساتھ جائے گا۔ یہ سن کر میڈم نسیم بہت چیں بہ جبیں ہوئی اور جھلاتے ہوئے بولی۔ ''اسے لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جو چل رہی ہوں۔''

''پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' روشی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

میڈم کو اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ دوسرے دن ہی وہ شرفو اور روشی کو لے کر پاسپورٹ آفس گئی اور ان کے ارجنٹ پاسپورٹ بننے کے لیے دے دیے۔ میڈم نے ان دونوں کو سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ فی الحال کسی سے بھی دبئی جانے کا تذکرہ نہ کریں کیونکہ پروڈیوسر نہیں چاہتا کہ وقت سے پہلے یہ خبر باہر نکلے۔ اس کی کچھ کاروباری مجبوریاں تھیں۔ روشی تو یہ سن کر خاموش ہو گئی لیکن شرفو نے اسی روز موبائل فون کے ذریعے ارسلان کو یہ ساری رپورٹ دے دی جسے سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے فوری طور پر ارشد کو اس بارے میں مطلع کر دیا۔

سادہ لباس میں ملبوس دو پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ میڈم نسیم کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ ادھر ملک مشتاق کے اچانک غائب ہو جانے سے میڈم نسیم بہت

www.pkdigest.com

پریشان تھی۔ باس کے حکم کے مطابق اسے اسی مہینے چار لڑکیوں کو دبئی بھیجنا تھا اور ملک مشتاق نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس بار اخبار میں دیے گئے اشتہار کا رسپانس بہت اچھا آیا ہے۔ اس لیے اسے ان لڑکیوں کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں ہوگی لیکن اب اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے مناسب سمجھا کہ وہ باس کو اس بارے میں بتا دے۔ یہ خبر سن کر وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے ہر تھانے، اسپتال اور ہوٹلوں کا ریکارڈ چیک کر لیا لیکن کہیں سے بھی ملک مشتاق کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا۔ تھک ہار کر وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ ملک مشتاق اپنے کسی ذاتی مسئلے کی وجہ سے روپوش ہو گیا ہے یا کسی مصیبت میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پیسوں کے لین دین پر اس کا کسی پارٹی سے جھگڑا چل رہا ہو اور وہ اسی ڈر کی وجہ سے کہیں چھپا بیٹھا ہو۔ اب ان کے پاس ملک مشتاق کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کئی دن گزر جانے کے بعد بھی ملک مشتاق کا کوئی پتا نہ چلا تو باس کی ہدایت پر میڈم نسیم نے روشی کے ساتھ ہی دبئی جانے کا فیصلہ کر لیا... کیونکہ وہاں سے پارٹی کے فون پر فون آ رہے تھے اور مزید تاخیر کی صورت میں پارٹی کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ بھی تھا۔ روشی اور شرفو کے پاسپورٹ بن کر آ چکے تھے اور میڈم نسیم نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وہ دونوں اپنی تیاری مکمل رکھیں۔ وہ کسی وقت بھی دبئی کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں۔

شرفو پل پل کی خبریں ارسلان کو پہنچا رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ان کی دبئی روانگی میں زیادہ دیر نہیں ہے تو اس نے ارشد پر زور دیا کہ وہ کسی طرح بھی انہیں وہاں جانے سے روک دے۔ ارشد کے پاس انہیں روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ فوری طور پر ملک مشتاق کے بیان کی بنیاد پر میڈم نسیم کو گرفتار کر لے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن وہ کوئی کچا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میڈم کی پہنچ دور تک ہے۔ دوسرے دن ہی اس کی ضمانت ہو جائے گی اور وہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میڈم کو رنگے ہاتھوں پکڑے اور اسے ایسے ہی کسی موقع کا انتظار تھا۔

لیکن ارسلان کے پاس انتظار کی گنجائش ختم ہو رہی تھی۔ اسے ہر قیمت پر روشی کو دبئی جانے سے روکنا تھا۔ اس نے شرفو سے کہا کہ وہ اس پروڈیوسر کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ ان کے ساتھ یونٹ کے کتنے لوگ دبئی جا رہے ہیں لیکن وہ پروڈیوسر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ روشی کو کوئی اسکرپٹ نہیں دیا گیا اور نہ ہی کوئی کنٹریکٹ سائن ہوا۔ یہی سب باتیں جب روشی نے میڈم سے کہیں تو وہ اسے جھڑکتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ تمہیں صرف کام سے غرض ہونی چاہیے۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔''

ارسلان کو یقین تھا کہ روشی کی ملاقات جس شخص سے کروائی گئی تھی، وہ پروڈیوسر نہیں بلکہ باس کا کوئی کارندہ تھا۔ اب خطرہ پوری طرح سامنے آ چکا تھا۔ وہ لوگ ڈرامے کی شوٹنگ کے بہانے روشی کو دبئی اسمگل کر رہے تھے جہاں سے وہ پھر کبھی واپس نہ آتی۔ اب فوری ایکشن لینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ارشد کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے میڈم نسیم کی نگرانی مزید سخت کر دی اور ارسلان کو یقین دلایا کہ وہ روشی کو دبئی جانے سے روکنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ ویسے تو یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ چاہتا تو روشی کو راتوں رات کسی ایسی جگہ منتقل کر دیتا جہاں میڈم کے فرشتے بھی نہ پہنچ پاتے لیکن اس طرح وہ گروہ کے سرغنہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو اس کا اصل ہدف تھا۔

نذرل کو جب معلوم ہوا کہ روشی، شرفو کے ساتھ ڈرامے میں کام کرنے کے لیے دبئی جا رہی ہے تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ ایک نیم پڑھا لکھا قدامت پرست شخص تھا جسے مذہبی اقدار بہت عزیز تھیں۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی بھانجی ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر غیر مردوں کے ساتھ عشق و محبت کا ناٹک رچائے اور ہزاروں لاکھوں لوگ صبح شام یہ تماشا دیکھیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟ وہ تو کسی کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔ اس نے اپنے آپ کو اس وقت بہت بے بس محسوس کیا جب روشی نے اس کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں لیا اور دبئی جانے کے لیے بضد رہی۔ اسی رات نذرل کو دل کا دورہ پڑا اور اسے تشویش ناک حالت میں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

دوسرے دن اس کی حالت سنبھل گئی اور تیسرے روز اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے ایک ماہ تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اب کیبن پر بیٹھنے کی ذمے داری شرفو پر آ گئی کیونکہ یہی کیبن ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ ایسی صورت میں شرفو کے لیے دبئی جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے روشی سے بھی کہا کہ وہ میڈم کو انکار کر دے۔ روشی احسان فراموش نہیں تھی جو اپنے ماما کو اس حال میں چھوڑ کر چلی جاتی۔ وہی تو اس کے سر کا سائبان تھا جس نے بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی سگی بیٹی کی طرح اس کی پرورش کی تھی اور اسے کبھی ماں باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر شرفو تھا جو اس کے ایک اشارے پر جان دینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ وہ اسے مصیبت کی اس گھڑی میں تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی؟ دبئی کا کیا ہے، زندگی رہی تو ایسے کئی چانس ملتے رہیں گے لیکن اس کی غیر موجودگی میں ماما کو کچھ ہو گیا تو وہ کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکے گی۔

روشی کا انکار میڈم کے لیے ایک دھماکا ثابت ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''بھاڑ میں گیا تمہارا ماموں اور شرفو۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ تمہیں ہر صورت ہمارے ساتھ دبئی جانا ہوگا۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' روشی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیسے نہیں جاؤ گی؟ جانتی ہو تمہارے نہ جانے سے کتنا نقصان ہوگا؟ وہاں سب تیاریاں مکمل ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔ اتنی جلدی کسی دوسری لڑکی کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو ایڈوانس بھی پکڑ لیا ہے۔''

''میں کم از کم دو ماہ تک کہیں نہیں جا سکتی اور جب تک ماما ٹھیک نہیں ہو جاتے، میں یہاں بھی نہیں آؤں گی۔ ارسلان صاحب کو میری ضرورت ہو تو وہ کال کر لیں۔ میں شوٹ پر پہنچ جاؤں گی۔''

''او ہو... بڑی باتیں کرنا آ گئی ہیں۔'' میڈم آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''جانتی ہو اب تک تم پر کتنی رقم خرچ ہو چکی ہے؟ وہ سارا حساب کیسے پورا ہوگا؟''

''میں آپ کی پائی پائی چکا دوں گی لیکن فی الحال مجھے گھر پر رہنا ہے اور ماما کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو بلا سکتی ہیں۔''

''دیکھو، مجھے اپنا کام نکالنے کے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی بڑا نقصان اٹھانا پڑ جائے۔''

''میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ آپ کا جو دل چاہے کریں۔'' روشی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

میڈم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ روشی اتنی خودسر ہو سکتی ہے۔ وہ تو اسے ایک غریب اور سیدھی سادی لڑکی سمجھ کر اپنے اشاروں پر چلا رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اپنوں کی محبت کمزور سے کمزور انسان کو بھی مضبوط بنا دیتی ہے اور اس میں پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میڈم کچھ دیر تو گم صم بیٹھی رہی پھر اس نے موبائل پر باس سے رابطہ کیا اور اسے روشی کی ہٹ دھرمی کے بارے میں بتا دیا۔

''زیادہ سختی سے کام بگڑ سکتا ہے۔ اگر وہ پولیس کے پاس چلی گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ میں پہلے ہی ملک مشتاق کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو... لیکن ایسا لگتا نہیں ہے ورنہ پولیس اب تک تم پر ہاتھ ڈال چکی ہوتی۔ بہرحال، تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ فی الحال روشی کو بھول جاؤ۔ دو چار دن میں اس کے ماموں کی طبیعت سنبھل جائے پھر اس سے رابطہ کرنا۔''

شرفو نے ان تمام حالات سے ارسلان کو مطلع کر دیا تھا۔ وہ بھی مطمئن ہو گیا کہ وقتی طور پر روشی کے دبئی جانے کا پروگرام ٹل گیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ میڈم چین سے بیٹھنے والی نہیں اور وہ روشی کو گھیرنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور کرے گی۔ اس نے شرفو کو سختی سے تاکید کی کہ وہ روشی کو تنہا گھر سے باہر نہ نکلنے دے اور خود بھی زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارے۔

ارسلان کے ساتھ ساتھ ارشد کو بھی یقین تھا کہ میڈم اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں اور وہ روشی کو دبئی لے جانے کے لیے کوئی نہ کوئی چال ضرور آزمائے گی۔ اب وہ دونوں بے چینی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ملک مشتاق کو بھی زیادہ دیر تک اس طرح قید نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ گو کہ ارشد نے یقین دلایا تھا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ عدالت میں اپنی گرفتاری کے بارے میں کوئی بیان نہ دے۔ تھانے میں اس کے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھا جا رہا تھا اور اسے باور کرا دیا گیا تھا کہ اسے محض حفاظت کے خیال سے یہاں رکھا گیا ہے تاکہ باس کے آدمی اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔

باس کے لیے زیادہ انتظار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے میڈم کو ہدایت کی کہ وہ کسی بہانے روشی کو بلائے اور اسے لے کر کسی محفوظ مقام پر روپوش ہو جائے۔ اس نے سیٹیں بک کرا دی ہیں اور ویزے کا بھی بندوبست کر دیا ہے۔ انہیں دبئی ائرپورٹ پر ویزا مل جائے گا۔

''اس کا باڈی گارڈ بھی ساتھ ہوگا۔ اس کا کیا بندوبست کروں؟''

''یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ اس سے کیسے جان چھڑاتی ہو لیکن اسے اتنا موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ پولیس تک پہنچ سکے۔''

باس کی ہدایت کے مطابق میڈم نے روشی کو فون کیا اور انتہائی میٹھے لہجے میں بولی۔ ''ہیلو روشی! کیا حال ہیں؟ تمہارے ماموں کی طبیعت کیسی ہے؟''

''کافی بہتر ہے۔ اور آپ کیسی ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دبئی والا معاملہ تو فی الحال

ملتوی ہو گیا ہے۔ پروڈیوسر کا کہنا ہے کہ وہ انتظار کرے گا لیکن تمہارے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو کاسٹ نہیں کرے گا۔ تم چیز ہی ایسی ہو۔ ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہو۔ اب دیکھو نا، ریبون اسٹار والے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نئی کمپین میں تمہیں لینا چاہ رہے ہیں۔ اگر تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو ان سے ایک میٹنگ کر لو۔"

"میڈم... وہ... میں..." روشی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔

"میں تمہاری پریشانی سمجھ رہی ہوں لیکن ان سے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔ کام تو پندرہ بیس دن بعد شروع ہوگا۔ اس وقت تک تم بھی ریلیکس ہو چکی ہوگی۔ یہ ایک اچھا چانس ہے اور اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگر تمہاری مرضی ہو تو کل صبح لینے آ جاؤں؟"

روشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میڈم نے اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تم دس بجے تیار رہنا۔"

فون سننے کے بعد روشی سوچ میں پڑ گئی گو کہ میڈم کی زبانی اسے یہ سن کر اطمینان ہو گیا تھا کہ دبئی والا معاملہ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے اور میڈم کی جانب سے اس سلسلے میں اس پر کوئی دباؤ باقی نہیں رہا لیکن نہ جانے کیوں اب وہ اس کے ساتھ مزید کام کرنے سے کترا رہی تھی۔ شرفو بھی اسے یہی سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ میڈم سے تعلق توڑ دے اور آزادانہ طور پر کام کرے۔

"ارسلان صاحب نے کہا ہے کہ تمہارے لیے کام کا کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر تم کیوں اس سے الگ نہیں ہو جاتا؟"

"تم تو جانتے ہی ہو کہ میں معاہدے کے تحت اس کے ساتھ دو سال تک کام کرنے کی پابند ہوں۔ اس سے پہلے کیسے الگ ہو سکتی ہوں؟"

"ہم نے بتایا تھا ارسلان صاحب کو۔ وہ بولتا ہے کہ اس معاہدے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ کورٹ اس کو نہیں مانتا۔"

"پھر بھی وہ رقم تو واپس کرنی ہوگی جو میڈم نے مجھ پر خرچ کی ہے۔" روشی بے بسی سے بولی۔

"تم ایک بار فیصلہ کر لو پھر اس پر بھی سوچے گا۔"

شرفو رات کو کام سے واپس آیا تو روشی نے اسے میڈم کے فون کے بارے میں بتایا۔ شرفو نے فوراً ہی اسے میڈم کے ساتھ جانے سے منع کر دیا لیکن روشی نے اسے سمجھایا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تاکہ جلد سے جلد پیسے جمع کر کے میڈم کا حساب بے باق کر دے اور اپنی جان چھڑائے۔ شرفو نے نیم دلی سے ہامی بھر لی لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی جائے گا۔ دو تین گھنٹے کیبن بند رہنے سے کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد شرفو ٹہلنے کے لیے باہر نکل گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ارسلان ابھی جاگ رہا ہوگا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ارسلان کا نمبر ڈائل کر کے اسے ساری صورتِ حال بتا دی۔

"ویری گڈ! میں جانتا تھا کہ میڈم ضرور روشی سے رابطہ کرے گی۔ تم اس کے ساتھ ہی رہنا اور ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس سے الگ مت ہونا۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

دوسرے دن وقتِ مقررہ پر میڈم اسے لینے آ گئی۔ روشی نے نذرل کو بتا دیا تھا کہ وہ اور شرفو، میڈم کے ساتھ ایک کام سے جا رہے ہیں۔ دو گھنٹے تک واپس آ جائیں گے۔ نذرل دل سے نہیں چاہتا تھا کہ روشی کہیں جائے لیکن اس نے کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ میڈم نے روشی کو اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا جبکہ شرفو حسبِ معمول فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میڈم نے سب سے پہلے نذرل کی خیریت پوچھی اور پھر روشی سے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اچانک اس نے اپنا موبائل نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پھر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"اوہو... بیلنس ختم ہو گیا۔ ڈرائیور! کوئی دکان نظر آئے تو گاڑی روکنا۔"

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دور جا کر ایک دکان کے پاس گاڑی روک دی۔ میڈم نے اپنے پرس میں سے سو کا نوٹ نکالا اور بڑے پیار سے بولی۔ "شرفو بیٹا! ذرا بھاگ کر ایک کارڈ تو لے آؤ۔"

شرفو نے بے دھیانی میں نوٹ پکڑا اور کار سے اتر گیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی گیا ہوگا کہ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ روشی گھبراتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ گاڑی روکو۔ شرفو کو کیوں چھوڑے جا رہے ہو؟"

"اس کا ساتھ بس یہیں تک تھا۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میڈم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس کے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ گاڑی روکو ورنہ میں چھلانگ لگا دوں گی۔" روشی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کر دی تو روشی کی جان میں جان آئی۔ اس کی توجہ ہٹی تو میڈم نے پرس میں سے ایک رومال نکالا اور بڑی پھرتی سے اس کی ناک پر رکھ دیا۔ روشی اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

شرفو بے بسی سے کار کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی نادانی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں میڈم کی باتوں میں آ کر کار سے اترا؟ مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ اس نے فوراً ارسلان کو فون کر کے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ ارسلان نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ فوراً نذرل کے ساتھ تھانے جا کر میڈم کے خلاف روشی کے اغوا کی رپورٹ درج کروا دے۔

شرفو نے عقل مندی یہ کی کہ گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ ویسے بھی وہ اس کار کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا کیونکہ کئی ماہ سے روزانہ شام کو وہ اور روشی اسی گاڑی میں گھر واپس آتے تھے۔ ادھر ارسلان نے فون کر کے ارشد کو اس واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "مجرم خواہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ میرے آدمی میڈم کی مسلسل نگرانی اور تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ ہماری نگاہوں کی زد میں ہے لیکن میں اسے اس وقت تک ڈھیل دیتا رہوں گا جب تک گروہ کے سرغنہ تک نہیں پہنچ جاتی۔"

"اور اگر وہ لوگ اس دوران روشی کو ملک سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو؟" ارسلان نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ایسا ہونے سے پہلے ہی میں ان پر ہاتھ ڈال دوں گا۔"

باس کی ہدایت کے مطابق میڈم نے اپنے گھر جانے کے بجائے کسی دوسرے ٹھکانے کا رخ کیا۔ اسے صرف چند گھنٹے وہاں گزارنے تھے۔ اسے یقین تھا کہ تھانے میں رپورٹ درج ہونے سے پہلے وہ یہ ملک چھوڑ دے گی کیونکہ اتنی جلدی تو پولیس بھی رپورٹ نہیں لکھے گی۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی لیکن اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کئی دنوں سے انڈر آبزرویشن ہے اور اس وقت بھی اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک نسبتاً غیر آباد علاقے میں واقع چھوٹے سے مکان میں پہنچی اور ڈرائیور کی مدد سے بے ہوش روشی کو اٹھا کر اندر لے گئی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کچھ فاصلے سے ایک طاقتور کیمرے کی مدد سے اس کی فلم بنائی جا رہی ہے۔

اس کام سے فراغت پانے کے بعد اس نے باس کو فون کر کے آپریشن کامیاب ہونے کی اطلاع دی۔ باس نے اسے مبارک باد دی اور کہا کہ وہ ٹھیک پانچ بجے روشی کو لے کر نکلے اور سیدھی ائرپورٹ پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹکٹ مل جائے گا۔ اپنا اور روشی کا پاسپورٹ وہ پہلے ہی پرس میں رکھ چکی تھی۔ باس نے یہ بھی تاکید کی کہ وہ اور روشی برقع پہن کر سفر کریں اور بورڈنگ کارڈ ملنے کے بعد برقع اتار دیں۔

شرفو دیوانہ وار روشی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ پولیس میں رپورٹ درج ہو جانے کے بعد سینٹرل کنٹرول کے ذریعے تمام تھانوں کو اطلاع دی جا چکی تھی اور اسنیپ چیکنگ کے دوران سیاہ رنگ کی ٹویوٹا کو بہ طورِ خاص چیک کیا جا رہا تھا۔ اے ایس پی ارشد بہ ذاتِ خود اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے آدمی مسلسل اس ٹھکانے پر نظریں جمائے ہوئے تھے جہاں میڈم، روشی سمیت روپوش تھی۔

شرفو میڈم کے گھر پہنچا تو وہاں نوکروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ میڈم کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ شرفو کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم، روشی کو لے کر ملک سے باہر جانے کی کوشش کرے گی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر ائرپورٹ کی جانب دوڑ لگا دی جہاں پہلے ہی سادہ لباس میں پولیس والے تعینات کر دیے گئے تھے۔ شرفو ایک ایسی جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں وہ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف آنے والی ہر گاڑی پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اس نے ارسلان کو بھی فون کر کے بتا دیا کہ وہ ائرپورٹ پر موجود ہے۔

پانچ بجے کے قریب میڈم اور روشی اس ٹھکانے سے باہر آئیں تو دونوں نے برقع اوڑھے ہوئے تھے اور چہرے پر بھی نقاب تھا۔ جیسے ہی ان کی گاڑی روانہ ہوئی، نگرانی کرنے والوں نے بھی ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ شام کا وقت تھا اور شارع فیصل پر بہت زیادہ ٹریفک ہونے کی وجہ سے اسنیپ چیکنگ کا کوئی امکان نہ تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں ائرپورٹ پہنچ کر گاڑی سے اتریں اچانک ہی ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے میڈم کے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑا دیے۔ اس کے فوراً بعد ہی اے ایس پی ارشد اچانک نمودار ہوا اور اس کے اشارہ کرنے پر پولیس والوں نے ان دونوں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ میڈم اس افتاد سے گھبرا گئی اور اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ارشد آگے بڑھا اور بولا۔ "خاتون! میرے پاس آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔"

"مگر کس جرم میں؟"

"آپ کے خلاف روشی کے اغوا کی رپورٹ درج کروائی گئی ہے اور آپ کو اسی جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔"

"مگر یہ تو اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہی ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"یہ پوچھ گچھ تھانے چل کر ہوگی۔ وہیں روشی کا بیان بھی لیا جائے گا۔"

www.pkdigest.com

اس سے پہلے کہ میڈم کچھ اور کہتی، ایک شخص مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور وضع قطع سے خاصا معزز نظر آرہا تھا۔ اس نے ارشد سے کہا۔ ''کیا بات ہے آفیسر! آپ نے ان خواتین کو کیوں روک رکھا ہے؟''

وہ سرکار صاحب تھا جسے دیکھ کر روشی اور شرفو حیران رہ گئے۔ ارشد نے غور سے سرکار صاحب کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا میں اس دخل اندازی کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

''یہ خاتون میری بزنس پارٹنر ہیں اور ہم لوگ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں دبئی جارہے ہیں۔''

''اوہ! پھر تو مجھے آپ کو بھی شامل تفتیش کرنا ہوگا۔ آپ پولیس کے طریقۂ کار سے تو واقف ہی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا جنھوں نے سرکار صاحب کے دونوں بازو پکڑ لیے۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ آپ مجھے جانتے نہیں۔ میں ایک سماجی کارکن اور معزز شہری ہوں۔ چاہوں تو آپ کو کھڑے کھڑے معطل کرواسکتا ہوں۔''

''ایک پولیس آفیسر کو سرعام دھمکی دے کر آپ نے اپنے جرائم کی فہرست میں ایک کا اور اضافہ کرلیا ہے۔ آپ اپنا یہ شوق بھی پورا کرسکتے ہیں۔ فی الحال تھانے چلیے۔''

یہ کہہ کر اس نے پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ سرکار صاحب کو گھسیٹتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میڈم، روشی اور شرفو کو دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

دوران تفتیش سرکار صاحب نے اعتراف کرلیا کہ وہی اس گروہ کا سرغنہ ہے اور کافی عرصے سے اس کاروبار میں ملوث ہے۔ اس کے کارندے بیوٹی پارلر، پروڈکشن ہاؤس اور مختلف فنکشن آرگنائز کرنے کے بہانے دولت مند بننے کی خواہش مند لڑکیوں کو اپنے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ ان میں معمولی شکل وصورت کی لڑکیوں کو عیاش طبع لوگوں کی دل بستگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور زیادہ خوب صورت لڑکیاں خلیجی ریاست کو اسمگل کردی جاتی ہیں۔ اس نے اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہوٹل کھول رکھا تھا اور علاقے کے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے ان کی ہمدردیاں سمیٹ لیتا تھا۔ معصوم اور سادہ لوح بنگالی اسے اپنا گاڈ فادر سمجھتے تھے اور ہر مشکل میں اسی کی طرف دیکھتے تھے۔ علاقے کی پولیس سمیت بھی کسی کو شبہ نہیں ہوا کہ اس کا اصل کاروبار کیا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن روشی اور شرفو، اے ایس پی ارشد کے دفتر میں بیٹھے سرکار صاحب کے سیاہ کارناموں کی تفصیل سن رہے تھے۔ روشی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سرکار صاحب، ائرپورٹ پر میڈم کو بچانے کے لیے کیوں آگے آیا؟ اگر وہ وہاں سے کھسک لیتا تو آپ لوگ اب تک اسے تلاش ہی کررہے ہوتے۔''

''بعض اوقات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی انسان کو مروا دیتی ہے۔ سرکار صاحب لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کروا کے اپنے آپ کو بہت بااثر اور معزز شخصیت سمجھنے لگا تھا۔ تم اس کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھیں۔ اس لیے وہ اتنی آسانی سے تمہیں ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اسے زعم تھا کہ پولیس اس کے رعب میں آکر میڈم کو چھوڑ دے گی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میڈم کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکے ہیں۔ بس اسی لاعلمی میں مارا گیا لیکن اگر اس وقت بچ نکلتا تو میڈم کے بیان کی روشنی میں ہم اسے پکڑ لیتے۔ آخر کب تک چھپ سکتا تھا۔''

''اف میرے خدا!'' روشی اپنا سر پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیسے کیسے لوگ بہروپ بدل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سرکار صاحب کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس قسم کا بندہ ہوگا۔''

''واقعی... اس دنیا میں بہروپیوں کی کوئی کمی نہیں۔'' ارشد مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تمہیں ایک ایسے بہروپیے کے بارے میں بتاؤں گا جس نے دوستی کی آڑ میں مجھے دھوکا دیا اور تم پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔''

روشی کا ذہن فوراً ارسلان کی جانب گیا لیکن وہ حیران تھی کہ ارشد اس کے بارے میں ایسی گفتگو کیوں کررہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ارشد بولا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ارسلان کی رگوں میں شریف باپ کا خون دوڑ رہا ہے لیکن اس فیلڈ میں جانے کے بعد اچھے اچھے لوگ بہک جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ اپنے کام سے مخلص ہے اور اس نے اپنے آپ کو ان خرافات سے دور رکھا ہوا ہے لیکن بہت جلد میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ گندگی کے پاس سے گزرو تو بھی کچھ چھینٹے کپڑوں پر آجاتے ہیں اور وہ تو گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ حسین لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں اور جب میڈم کے توسط سے تم اس تک پہنچیں تو وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اس نے اپنی دیوانگی کا ذکر مجھ سے بھی کردیا۔ اس کی زبانی تمہارے بارے میں جان کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ شک تو مجھے پہلے سے تھا لیکن کسی ثبوت کے بغیر میڈم پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ میں نے شرفو سے رابطہ کیا اور اس کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ میڈم نسیم کے بارے میں لمحے لمحے کی رپورٹ دیتا رہے۔ شرفو نے بڑی ہوشیاری سے اپنا کام کیا۔ ایک طرف وہ ارسلان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو دوسری جانب اس نے میڈم کے بارے میں بھی ایسی معلومات فراہم کیں جن کی مدد سے مجھے اپنی کارروائی آگے بڑھانے میں مدد ملی۔ پھر ملک مشتاق کی گرفتاری کے بعد میڈم کی حقیقت پوری طرح سامنے آگئی۔''

''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ارسلان بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس کھیل میں شریک تھا؟''

''بالکل۔ وہ اور میڈم نسیم اپنے اپنے طور پر لڑکیاں گھیر کر انہیں ماڈل یا ایکٹریس بننے کا جھانسا دیتے اور پھر کسی شوٹنگ کے بہانے انہیں دبئی بھیج دیا جاتا۔ تمہارے لیے بھی پلاننگ کی گئی تھی لیکن تمہیں دیکھ کر ارسلان کی نیت میں فتور آگیا۔ شاید وہ تمہارے بارے میں سنجیدہ ہوگیا تھا یا پھر اس کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ تھا اور اسی سلسلے میں اس کا میڈم سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اگر اتفاق سے میں نے اس کا فون نہ سن لیا ہوتا تو شاید کبھی یہ بات مجھے معلوم نہ ہوتی۔ ایک دن میں اس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ میز پر رکھا اس کا موبائل بجنے لگا۔ ارسلان اس وقت واش روم گیا ہوا تھا۔ میں نے یہ جانے بغیر کہ کس کا فون ہے، فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے میڈم بول رہی تھی۔ ''یہ تم کیا روشی کو ہر وقت اپنی سیدگی پٹی پڑھاتے رہتے ہو۔ یاد رہے کہ وہ ہمارے پاس کسی کی امانت ہے اور ہم اس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ویسے بھی تم ہمارے لیے جو کچھ کرتے ہو، اس کا معقول معاوضہ دیا جاتا ہے، پھر تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نے فوراً ہی فون بند کردیا۔ ارسلان کے بدکردار ہونے کا تو مجھے پہلے سے علم تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ میڈم نسیم جیسی گھٹیا عورت کے ساتھ مل کر کوئی دو نمبر کام کررہا ہے۔ میں نے اسی وقت ارسلان کو بھی انڈر آبزرویشن رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا تاکہ مناسب ثبوت ملنے پر ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جاسکے۔''

''میں نے تو ارسلان کو ائرپورٹ پر دیکھا تھا پھر وہ کہاں چلا گیا؟''

''ہماری پوری توجہ میڈم پر تھی پھر سرکار صاحب کے درمیان میں آجانے سے معاملہ گمبھیر ہوگیا۔ لگتا ہے کہ ارسلان بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی دبئی جارہا تھا۔ اس نے جب بازی پلٹتی دیکھی تو چپکے سے کھسک لیا اور خاموشی سے بورڈنگ کارڈ لے کر جہاز میں سوار ہوگیا۔ ویسے بھی اس وقت تک ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ارسلان بھی ان لوگوں کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ انکشاف تو سرکار صاحب نے اپنے ابتدائی بیان میں کیا ہے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ ارسلان صاحب کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ان کے پاس کس چیز کی کمی تھی؟'' روشی نے افسردگی سے کہا۔

''ایک بار انسان برائی کی طرف مائل ہوجائے تو پھر وہ اس دلدل میں پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ یہی کچھ ارسلان کے ساتھ بھی ہوا۔ پیسے کی ہوس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کرلی تھیں اور وہ بھول گیا تھا کہ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔''

''یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ شرفو سے رابطہ کس طرح ہوا؟''

''پولیس والوں کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ جب میں نے ارسلان کے کمرے میں فون پر میڈم کی گفتگو سنی تو تمہارے بارے میں مزید جاننے کا تجسس ہوا۔ اپنے آدمیوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان میں شرفو کا نام بھی سامنے آیا اور معلوم ہوا کہ یہ حضرت تمہارے باڈی گارڈ کے طور پر ہر جگہ ساتھ جاتے ہیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ موزوں شخص کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ میں نے اسے اپنے لیے کام کرنے پر راضی کرلیا۔''

''کمال ہے۔ اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی اور چپکے چپکے ہی اپنا کام کرتا رہا۔'' روشی منہ بناتے ہوئے بولی۔

''ہم نے صاب سے رازداری کا وعدہ کیا تھا۔ پھر تمہیں کیسے بتا سکتا تھا؟'' شرفو جھینپتے ہوئے بولا۔

روشی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''بہت بہت شکریہ ارشد صاحب! آپ نے بروقت کارروائی کرکے مجھے ایک بڑے عذاب سے بچالیا۔''

''اس کے لیے آپ کو شرفو کا شکرگزار ہونا چاہیے جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کا قدم قدم پر ساتھ دیا۔ بہرحال، جو ہوا سو ہوا، آئندہ کے لیے محتاط رہیں۔ اتنی جلدی لوگوں پر بھروسا کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔''

پولیس اسٹیشن سے باہر آنے کے بعد شرفو نے روشی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''روشی! اب تم کیا کرے گا؟ تمہارا گاڈ فادر تو بھاگ گیا۔''

روشی نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ''مجھے کسی گاڈ فادر کی نہیں بلکہ تم جیسے باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔''

www.pkdigest.com

دوسرا رنگ

دشمن

احمد اقبال

کچھ لوگ اب بھی ایسے موجود ہیں جو اپنی اقدار سے نامطمئن ہوتے ہوئے بھی انہیں ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے ...... ایک جذباتی لگاؤ اور مدتوں کی شناسائی کا خیال انہیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم انہیں سینے سے لگائے رکھیں ...... اسی پس منظر کے گرد گھومتی کہانی ...... جس کے کردار ...... ماضی کے مدفن پر مستقبل کے محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دینے والے قلم کار کی پرظرافت تحریر سرورق کا تیکھا رنگ

موہن لال کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ داڑھی... کناری مونچھوں... سرمہ لگی آنکھوں اور شلوار قمیص کے ساتھ ٹوپی والا ڈرائیور اسے صحیح سمت میں لے جارہا ہے یا نہیں اچانک وہ کسی اونچی دیواروں والے احاطے میں داخل ہو جائے گا جہاں تیغ آبدار لہراتے لوگ نعرے لگا کے اسے زمین پر گرائیں گے اور قتل کر دیں گے... اللہ کی راہ میں... اور پھر یہ ثواب خود ہی اپنے نامۂ اعمال میں درج کر لیں گے کہ ایک اور کافر کو جہنم رسید کیا۔

ڈرائیور صورت اور لب و لہجے سے شریف اور معتبر نظر آتا تھا لیکن نیت کا حال کون جان سکتا ہے... وہاں جو چار، چھ ٹیکسی والے فارغ کھڑے تھے، ان میں سے یہی ادھر آنے پر رضامند ہوا تھا اور وہ بھی انتہائی مناسب کرایہ لے کر... باقی سب اپنے لب و لہجے سے زیادہ خونخوار لگ رہے تھے۔

موہن لال نے اپنے حلیے اور انداز و اطوار سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس ملک میں اجنبی ہے اور سرحد پار سے آیا ہے۔ اس نے عام سی شرٹ پینٹ پہن رکھی تھی اور اس کے جوتے باٹا کے تھے جو ہر سرحد پر بکتے ہیں۔ اس کی خاصی حسین دھرم پتنی نے البتہ اپنی ضد سے کچھ مسائل کھڑے کیے تھے۔ مثلاً وہ اسٹار پلس فیشن کی ساڑی سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی جس میں اس کی پوری خوب صورت اور سنسنی خیز کمر کا نظارہ موہن لال کو مسحور کر دیتا تھا... اس نے اوما کو بہت سے ایسے مناظر دکھائے جن میں خواتین نے شلوار قمیص پہنی تھی اور وہ زیادہ پرکشش لگ رہی تھیں... آخری دلیل موہن لال نے یہ دی کہ اچھا یہ جو اشتعال انگیز لباس وہاں اغوا کرنے والوں نے درگت بنا دی تو رونا مت... اس کے بعد وہ مان گئی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اوما سے غلط نہیں کیا تھا... یہاں بھی وہ اپنا دیسی سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز پہن کر آ جاتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا... کیونکہ شہر میں بھی خواتین جو بے پردہ نظر آئیں، وہ بڑے محتاط انداز میں اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھیں۔ یہاں تو خواتین نے خود کو چادروں میں چھپا رکھا تھا اور وہ شٹل کاک برقع بھی نظر آرہے تھے جن کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اندر سے کیا برآمد ہوگا... اس نے سنا تھا کہ اندر جرائم پیشہ افراد کلاشنکوف لیے پھرتے ہیں اور ایڈونچر پسند عاشق اس میں روپوش ہو کے دن دہاڑے ... ہوٹل میں ... امکانات کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن موہن لال کا خیال تھا کہ ایسا ہر جگہ ہر وقت نہیں ہو سکتا تھا۔

تاہم ایک فرق واضح تھا۔ کہیں کہیں سرِ عام نظر آنے والی خواتین سرتاپا مکمل لباس میں تھیں اور چہرے یا ہاتھوں کے سوا ان کے جسم کا کوئی حصہ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دوپٹے کو بھی سنبھال کے رکھتی تھیں اور اکثر چادر یا شال کو ایسے استعمال کرتی تھیں کہ جسم کا اوپر والا حصہ آنکھوں کے سوا نظر ہی نہ آئے۔ شہروں کے ماحول میں زیادہ فرق نہیں تھا... وہاں اوما ساڑی یا جینز میں پھر سکتی تھی۔

موہن لال پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کا شین قاف درست رہے لیکن یہ احتیاط بھی اتنی ضروری نہیں تھی کیونکہ عام لوگ بھی کوئی کتابی ادبی زبان نہیں بولتے تھے۔ عوامی زبان میں لوگ مطلب سمجھ لینے کو کافی جانتے تھے۔ شہری اردو وہی تھی جو بھارتی فلموں میں ہندی کہلاتی تھی... حد تو یہ ہے کہ اس نے ایک جگہ لڑائی میں وہی گالیاں سنیں جو وہ خود بھی اتنی ہی روانی سے دیتا آیا تھا... وہی ماں، بہن کے رشتوں کی ایسی تیسی...

آسمان وہی تھا... زمین وہی تھی... درخت... کوّے...

www.pkdigest.com

سکے اور فقیر... بجلی کے تار... چاند سورج... سب یونیورسل ہے، چنانچہ یہاں بھی وہی تھے جو سرحد پار... تاہم یہ حقیقت ایک احساس بن کے ہوا، فضا اور ماحول میں محسوس ہوتی تھی کہ وہ سرحد پار ایک دشمن ملک میں تھا۔

اسے یقین دلایا گیا تھا کہ وہاں اسے کافرمان کے راہ چلتا کوئی بھی شخص بچہ، بوڑھا، جوان ثواب کے لیے قتل کر سکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس ٹیکسی ڈرائیور کے دل میں کیا ہے اور زبان پر کیا... اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے دوسرے ملک سے آنے والے کو محض سونگھ کے بتا سکتے تھے کہ وہ پاکستانی ہے یا ہندوستانی... اور ہندو ہے یا مسلمان... جسمانی معائنے سے تصدیق کی نوبت تو بعد میں آتی تھی۔

"میرے تو سر میں درد ہو گیا۔" اوما نے باہر دیکھتے دیکھتے بیزاری سے اپنا مکھڑا اس کی طرف گھمایا۔ "موہن! اب اور کتنی دیر لگے گی؟"

موہن کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اوما کو آنکھیں نکال کے گھورا۔ "اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" اس نے ہاتھ سے خنجر گھونپنے کا ایکشن بنایا۔

اوما کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بھگوان کرے اس وحشت زدہ حلیے والے ڈرائیور نے نہ سنا ہو... الو کی پٹھی کو کتنا سمجھایا تھا کہ عام جگہ پر عام لوگوں کے سامنے نام نہیں لیتا... یہ سراسر خودکشی ہوگی... ہم

دونوں ایک دوسرے کے لیے ڈیئر استعمال کریں گے۔ منے کی اماں یا منی کے ابا مشکل ہوگا۔

یہ اوما نے تیسری بار غلطی کی تھی۔ اس کا سوال ہی غلط تھا۔ وہ کیا بتائے کہ جہاں ساٹھ سال پہلے اس کا دادا رہتا تھا، وہ جگہ اب کتنی دور ہے۔ سورگ باشی پتاجی خود بھی آتے تو چکرا جاتے... دنیا ہر جگہ بدل چکی تھی... جو گاؤں تھے، وہ قصبے بن گئے تھے۔ جو قصبے تھے، وہ شہر... سڑکیں، کارخانے، عمارات اور ان میں رہنے والے انسان سب میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

مثال کے طور پر اس کا اپنا وہ قصبہ جہاں سے وہ دونوں اس سفر پر روانہ ہوئے تھے... اگر وہ تصور میں چالیس سال پہلے کا نقشہ دیکھے تو یہ سب کہاں ہوگا جو آج نظر آتا ہے... کشادہ سڑکیں... بارونق بازار... لوگوں کا ازدحام... خود ان کا چھوٹا سا تین کمروں والا مکان اب اسے یاد بھی نہیں تھا... وہ نئی آبادی کی ایک خاصی بڑی کوٹھی میں رہتے تھے جو تیس سال پہلے موہن کے پتاجی نے بنوائی تھی۔ اس وقت یہ خاندان کی ضروریات کے لیے بہت تھی... آج اس کے ہر کمرے میں ایک خاندان آباد تھا... سب کا کچن، ڈرائنگ روم اور صحن مشترک تھا... سارے بچے کونوں کھدروں، لاؤنج یا اسٹور میں سوتے تھے۔

اوما نے اس کی طرف دیکھے بغیر انگریزی میں سوال کیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے... یہ شخص انتہا پسند ہوسکتا ہے؟“

موہن نے اسے ٹالنا مناسب سمجھا۔ ”دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا ڈیئر۔“

”کیا اسے شک ہوگا... کہ ہمارا تعلق اس ملک سے نہیں ہے؟“

وہ چڑ گیا۔ ”اسی سے پوچھ لو نا۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈر کس سے لگ رہا ہے... اور کیوں؟ مجھے تو ایسی کوئی پریشانی کی بات نظر نہیں آتی... سڑک چل رہی ہے... ٹرک اور بس، تانگے اور کاریں سب آجا رہے ہیں... دکانیں کھلی ہوئی ہیں... ہر جگہ لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم جانتے ہو... دھماکا کہیں بھی ہوجاتا ہے... کسی بھی شہر میں...“

”ڈیئر... کیا سرحد پار ہمارے ملک میں کچھ نہیں ہو رہا ہے؟ ادھر تامل ٹائیگر... دوسری طرف نکسل پارٹی...“

”تم سے بات کرنا بے کار ہے۔“ اوما کی تیوری چڑھ گئی۔

”دیکھو... مرنے کا سوچنے سے کیا ہوگا؟ گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی آدمی کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے... تمہارے ابا سو رہے تھے... چھت گر گئی... میرے ماما کو بھینس نے ٹکر ماردی۔“

”لیکن یہ سب وہاں نہیں ہو رہا ہے جو یہاں ہو رہا ہے۔“ اوما خفگی سے بولی۔ ”تم کو سب نے کہا تھا کہ ابھی مت جاؤ... لیکن تمہیں تو جیسے ضد ہوگئی تھی۔“

”میں اور انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ حالات کا کیا پتا، کب تک ٹھیک نہ ہوں... لیکن ہمیں حالات سے کیا؟“

”مت بھولو کہ ان کے نزدیک ہم کافر ہیں۔“

وہ ہنسا۔ ”یہاں جو ایک دوسرے کو مار رہے ہیں... سب ایک ہی مذہب کو ماننے والے ہیں... مارنا ہو تو یہ معمولی اختلاف پر ایک دوسرے کو کافر قرار دے کر بھی مار دیتے ہیں... یہ مسئلہ نہ عقیدے کا ہے، نہ مذہب کا... یہ سیاست ہے ڈیئر... عام آدمی کسی سے نفرت نہیں کرتا... کسی کو نہیں مارتا۔“

”ذرا اسے بتاؤ کہ میں کون ہوں۔“ اوما نے طنز سے کہا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا اس سے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری... دو جنگوں نے نفرت کو گہرا کردیا ہے۔“

ڈرائیور نے سر گھمایا۔ ”آپ بالکل فکرمند نہ ہوں میڈم! امن ہو یا جنگ... اگر دشمن بھی مہمان ہے تو ہماری پناہ میں ہے... پھر اس کی حفاظت ہم جان دے کر بھی کرتے ہیں۔“

شاک کا ایک لمحہ بہت طویل ہوگیا جس میں وہ دونوں گنگ اور ساکت رہے... پھر موہن لال نے خود کو سنبھالا... ”تم انگریزی جانتے ہو؟“

”یس سر! میں نے سات سال پہلے گریجویشن کیا تھا... نوکری نہیں ملی... گھر کے حالات اچھے نہیں تھے... میرے والد نے سرکاری اسکیم کی پیلو کیب لی تھی... ان کا بھی انتقال ہوگیا تو گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آگئی... اب اللہ کا شکر ہے، دن رات محنت کر کے میں اچھی کمائی کر رہا ہوں۔“

”تم... کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”یہاں گوجر خان کا... شادی ایک پٹھان لڑکی سے ہوئی۔ اس کا باپ ادھر خیبر ایجنسی کی مسجد میں پیش امام تھا۔ وہ راولپنڈی آگئے اور ایک اسکول میں اسلامیات پڑھاتے رہے۔ اب ان کا بھی انتقال ہوچکا ہے... میرے دو سالے باہر ہیں... امریکا اور کینیڈا میں... مجھے بلاتے ہیں لیکن میں نہیں جاتا... آپ کہاں سے آئے ہو؟“

اچانک داغے جانے والے سوال نے اوما کی حالت غیر کردی۔ موہن نے صرف ایک لمحہ سوچنے میں صرف کیا... پھر کچھ نہ چھپانے اور سب کچھ صحیح صحیح بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ ”دلی سے۔“

”اندازہ تو مجھے ہوگیا تھا۔ میرا نام ہے گلباز خان۔“

”میرا موہن لال... یہ میری بیوی ہے اوما دیوی... میرے آباؤ اجداد...“

اوما چکرا گئی۔ ”کس کا تعلق تھا؟“

”ہمارے پرکھوں کا... باپ دادا کا۔“ موہن لال نے اسے گھورا۔

”تو ایسے کہو نا...“ اوما کسمسا گئی۔

موہن لال نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ تقسیم سے پہلے نہ جانے کئی نسلوں سے یہاں آباد تھے۔ ان کا سب کچھ یہیں تھا لیکن پاکستان بن گیا تو انہیں سب کچھ چھوڑ کے جانا پڑا... جیسے اُدھر سے لوگ آئے تھے۔“

گلباز نے سر ہلایا۔ ”کیا کرتے تھے وہ؟“

”میں نے سنا ہے وہ بہت بڑے زمیندار تھے... لاکھوں ایکڑ زمین تھی۔“

”لاکھوں ایکڑ...؟“ گلباز نے بے یقینی سے دہرایا۔

”ہزاروں ہوگی... داداجی کچھ بڑھا چڑھا کے بھی بتاتے ہوں گے۔“

گلباز ہنس پڑا۔ ”ہاں... یہاں بھی جو آیا نواب تھا... بڑے لطیفے بھی مشہور ہوگئے تھے... ہمارے تو وہاں باغات تھے... پوچھو کس چیز کے... تو سر اکڑا کے کہتے تھے... ایک دھنیے کا... دوسرا پودینے کا۔“

”ہاں... اُدھر بھی ایسے لوگ پہنچے تھے... کہتے تھے کہ ہمارا بڑا باغ تھا... پوچھو کتنا چوڑا... تو جواب ملتا تھا چھ انچ...“

اوما نے ناگواری سے کہا۔ ”جھوٹ سچ کا ہمیں پتا نہیں۔“

گلباز نے معذرت کی۔ ”معاف کرنا بہن جی... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا... ننانوے فیصد لوگ تباہ ہوگئے تھے۔“

”داداجی کا شمار علاقے کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ وہ انگریز کے خطاب یافتہ بھی تھے۔ رائے بہادر چمن لال... تم نے نام تو سنا ہوگا؟“

گلباز نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب ہم تاریخ نہیں پڑھتے... نہ کوئی ہمیں کچھ بتاتا ہے... میں نے ایم اے پاس نوجوانوں کو دیکھا ہے جو نہیں جانتے کہ پہلے پاکستان کے دو حصے تھے... ویسے دیکھا جائے تو یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔“

موہن لال باہر دیکھتا رہا۔ ”پتا نہیں اب کوئی جاننے والا بھی ملتا ہے یا نہیں؟“

گلباز نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اب آپ ایسے ہی آئے ہیں؟ گھومنے پھرنے...؟“

”یہی سمجھ لو... باتیں بہت سنی ہیں... ایک بار دیکھ لیں کہ وہ گاؤں کیسا تھا... وہ لوگ کیسے تھے...؟“

”پھر تو آپ کو مایوسی ہی ہوگی... کیونکہ وہ سب بدل گیا ہے۔“

”پھر بھی... آدمی امریکا چلا جائے یا کہیں اور... اپنے وطن کو کیسے بھول سکتا ہے۔“

”اب کیا وطن۔“ گلباز نے آہ بھری... ”لوگ صرف گاؤں یا شہر ہی نہیں، ملک چھوڑ کے جارہے ہیں... جہاں چار پیسے ملیں، وہی وطن...“

”میں نے دیکھا ہے... پہلی نسل کا رشتہ رہتا ہے وطن سے... دوسری اگر ماں باپ کے ساتھ کبھی آجائے تو آجائے... پھر سب ختم۔“

اوما نے سلسلۂ کلام منقطع کرنے کے لیے دخل دیا۔ ”اب اور کتنی دور جانا ہے ڈرائیور؟“

گلباز نے مختصر جواب دیا۔ ”ابھی کچھ وقت ہے جی۔“

ٹیکسی مین روڈ کو چھوڑ کر بائیں جانب کی چھوٹی سی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ان کے دونوں جانب کھیت تھے۔ اِکا دُکا سائیکل یا موٹر سائیکل کے علاوہ ایک سوزوکی پک اپ ان کے پاس سے گزری جس میں ڈھیروں سبزی پر چار چھ افراد چڑھے بیٹھے تھے۔ ان کی خوفناک مونچھیں اور رنگی دھوتیاں تھیں... غالباً وہ اپنی فصل کسی قریبی منڈی میں لے جارہے تھے۔

ٹیکسی اچانک رک گئی۔ ”میں دو منٹ میں آتا ہوں۔“

اوما کا دل دھک سے رہ گیا۔ گلباز ایک آبادی کے باہر بنی ہوئی مسجد میں چلا گیا تھا۔ بس اب خیر نہیں... اس پٹھان کو سب معلوم ہوگیا تھا۔ ابھی اندر سے چار بٹے کٹے خوں خوار جوان .... برآمد ہوں گے جو انہیں گھسیٹ کے اندر لے جائیں گے اور زمین پر گرا کے اسی طرح کاٹ ڈالیں گے جیسے یہ ماس خور گئو ماتا کو تڑپا تڑپا کے مارتے ہیں اور پھر سر سے پیر تک کھا جاتے ہیں... اندر کی کوئی چیز تک نہیں چھوڑتے... کلیجی کو آگ پر بھونتے ہیں... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا...

اوما نے ان خیالات کا اظہار اپنے پتی پرمیشور سے کرنے میں بھی حرج نہ سمجھا۔ موہن لال کا حال بھی بہت اچھا نہیں تھا لیکن اس نے اپنی مردانگی کی شان رکھنے کے لیے مسکرانا ضروری سمجھا۔ ”تم تو پاگل ہو۔“

گلباز کے آنے تک اوما کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہے... جب وہ آیا تو اکیلا نہیں تھا... اس کے ساتھ ایک ڈھول جیسے پیٹ اور خوفناک سیاہ داڑھی والا نوجوان شخص بھی

www.pkdigest.com

تھا جس نے قریب آ کے موہن لال سے مصافحہ کیا۔

"معلوم ہوا کہ آپ بڑی دور سے تشریف لائے ہیں۔" آنے والے نے کہا۔ "اگر ناگوار نہ ہو تو کچھ دیر قیام فرمایئے... کھانے کا وقت ہے۔"

اوما کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا... کم بخت زہر دینا چاہتا ہے۔

موہن لال نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "بس اب گاؤں پہنچ کے ہی کھانا کھائیں گے۔"

"آپ ہمارے بھی مہمان ہو... لیکن یہاں تو ملے گی دال روٹی..." وہ شخص گلا پھاڑ کے ہنسا۔

نہ جانے موہن لال کے دل میں کیا آئی کہ وہ ٹیکسی سے اتر گیا۔ اوما کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا... لیکن اس کا خاموش احتجاج رائگاں گیا۔

اس شخص نے انہیں صحن میں لگے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ کھانا لینے اندر گیا تو اوما بگڑ گئی۔ "آخر ایسی کیا جلدی تھی کھانے کی؟ اور تم... گاؤں جا کے نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؟"

گلباز نے نرمی سے کہا۔ "ہماری ہر نماز کا ایک وقت مقرر ہے میڈم... اس کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے۔"

موہن لال نے مزید کمینگی کا ثبوت دیا۔ "اسے ڈر ہے کہ وہ کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دے۔"

گلباز ہنسا۔ "یہ رسک تو آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ کیا گاؤں میں ایسا نہیں ہو سکتا؟ ان صاحب کو میں جانتا ہوں... میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا... یہ ساتھ والے بیڈ پر تھے... ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی... میری چار پسلیاں... ایک بازو... ایک ٹانگ... بڑا آپریشن ہوا تھا... یہ ہر روز مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔"

کھانے میں سچ مچ دال روٹی تھی۔ وہ سب چٹائی بچھا کے نیچے بیٹھے۔ اوما نے اب خود کو قائل کر لیا تھا کہ جتنا عرصہ وہ یہاں رہیں گے، بغیر کھائے تو نہیں رہ سکتے... جسے مارنا ہوگا ویسے بھی مار دے گا... مزید اطمینان کی بات یہ تھی کہ دال ایک ہی بڑے پیالے میں تھی... اس میں سے ایک پلیٹ میں نکال کے گلباز اور وہ شخص کھاتے رہے... دوسری پلیٹ میں اوما کے ساتھ صرف موہن لال شریک تھا... گرم روٹی اندر سے ایک بچہ دوڑ دوڑ کے لا رہا تھا جو شاید اس کی ماں پکا رہی تھی۔ پردہ کرنے کی وجہ سے وہ موہن لال کے سامنے نہیں آئی تھی... کھانے کے بعد موہن لال نے اوما سے کہا۔ "تم اندر جا کے مل آؤ۔"

اعتماد سازی کا یہ پہلا عملی مظاہرہ تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ موہن لال نے محسوس کیا کہ اوما اب پہلے کے مقابلے میں بہت ایزی ہو گئی ہے... گلباز اس علاقے میں آتا جاتا رہتا تھا۔ کافی راہ گیروں نے اسے پہچان کے ہاتھ کو سلام کے انداز میں اٹھایا۔

گاؤں اچانک ہی آ گیا۔ سڑک دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سے گزری۔ موہن لال نے قدرے بلندی سے پورے گاؤں کی وسعت کو دیکھ لیا۔ اسے گاؤں کہنا غلط تھا۔ یہ اچھا بھلا قصبہ تھا جسے دیکھ کر موہن لال کی پریشانی بڑھ گئی۔ پرانے لوگ تو مر کھپ چکے... ان کی اولادوں کا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ آخر وہ اس جگہ کو کیسے تلاش کریں گے جو پولیس کی زبان میں "جائے واردات" تھی۔

بات معمولی ہوتی تو وہ اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیتے لیکن یہ ان کے لیے زندگی اور موت سے بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ ان کے مستقبل کا اور ان کے بچوں کے مستقبل کا سوال تھا۔

جان کی بازی لگانے کا یہ مشکل فیصلہ کرنے میں موہن لال کو کئی سال لگے تھے۔

☆☆☆

رائے بہادر چمن لال علاقے کے رئیس... انتہائی وضع دار اور شریف آدمی سمجھے جاتے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کو انگریز غدر کا نام دیتے تھے۔ ان کے پتاجی روشن لال نے کسی انگریز فوجی افسر کے بیوی بچوں کو جان بچانے کے لیے کہیں چھپا کے رکھا۔ ان دنوں وہ خود بھی بڑے بانکے جوان تھے اور گاؤں میں ان سے اچھی کبڈی کوئی نہیں کھیلتا تھا۔ دس دن بعد انہوں نے میم کو سال بھر کے بچے سمیت چھاؤنی پہنچا دیا لیکن ان دس راتوں میں ایک رات ایسی بھی آئی جب میم نے خود ہی روشن لال کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

روشن لال بعد میں مرتے دم تک اس میم کو اور اس کے ساتھ گزاری ہوئی رات کو یاد کرتے رہے۔ ان کے لیے یہ انعام بھی بہت بڑا تھا لیکن انگریز حاکم اور مالک نے ایک غلام کو اس جاں نثاری اور وفاداری کا انعام زمین کی صورت میں الگ دیا۔ انگریز کا یہی قاعدہ تھا کیونکہ زمین کون سی ان کے باپ کی تھی۔ غلام ملک کی زمین جتنی چاہو بانٹو... جسے چاہو دو... اسے خیرات سمجھو یا انعام...

روشن لال نیچ ذات کے تھے اور کسی سڑک کے کنارے ایک سرائے میں آتے جاتے مسافروں کے گھوڑوں کی سیوا کرتے تھے۔ اچانک وہ بہت بڑے زمیندار بن گئے۔ بے وقوف اہلِ وطن نے ان کی وفاداری کو غداری

اور جاں نثاری کو ضمیر فروشی کا نام دیا لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ یہ سب وقتی جذباتی باتیں تھیں... جب زمین نے سونا اگلا اور وہ دولت مند ہو گئے تو گرگٹ کی طرح لمبی زبان نکال کے بکواس کرنے والوں نے گرگٹ کی طرح رنگ بھی بدل لیا۔ ان کی زبانیں روشن لال کو لالہ جی کہنے لگیں اور وہ آتے جاتے انہیں ہاتھ جوڑ کے پرنام کرنے لگے۔

بالآخر بغاوت فرو ہوئی اور انگریز کی حکومت ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قائم ہو گئی۔ مغل فرماں رروا کی عیاش اولادیں دربدر ہو کے درسِ عبرت بن گئیں۔ خودساختہ اشراف اور امرا خوار ہو چکے اور حریت پسند سولیوں پر لٹک گئے تو انگریز نے غداروں اور غلام زادوں کو انعام و اکرام سے نوازنے کے عزت دار بنانے کا فیصلہ کیا۔ زمین کے ساتھ خان بہادر یا رائے بہادر کے خطابات بھی ملے... یوں جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔

روشن لال کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازنے کے لیے دلی دربار میں طلب کیا گیا لیکن وہ پہلے ہی پرلوک سدھار چکے تھے۔ یوں چمن لال اپنے پتا کی جگہ بڑی آن بان شان سے خطاب لے کر لوٹے۔ یوں مسافروں کے گھوڑوں کی مالش کرنے والے کا بیٹا چار گھوڑوں کی بگھی میں نکلنے لگا اور نہ صرف انہیں بلکہ سرکاری طور پر معزز ہو گیا۔

چمن لال فطرت اور مزاج کے اعتبار سے باپ کے مقابلے میں کمینہ ثابت ہوا۔ باپ نے جب غیر آباد زمینوں کو آباد کیا تھا تو اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس کا کوئی ملازم ہندو نہ ہو۔ ذات کے اعتبار سے وہ خود سب سے کمتر تھا... مزارعہ اس کا دیا کھا کے بھی اپنی اونچی ذات پر غرور نہ بھولتا... چمن لال نے ایک قدم آگے جا کے ہندوؤں کو یکسر خارج کر دیا اور صرف مسلمانوں کو ملازم رکھا۔

مسلمانوں میں ذات پات کی بنیاد کوئی نہ تھی لیکن ہندوؤں کے ساتھ رہ کے انہوں نے خود ہی پیشوں کو بنیاد بنا لیا۔ نائی، موچی، قسائی، کمہار، تیلی اور ترکھان بلکہ ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمانے والے سب ہی کمین یا رذیل بنا دیے گئے۔ چمن لال نے انہی غریب مسلمانوں کو زمین کاشت کے لیے دی۔ رہائش کے لیے جگہ فراہم کی اور قرضے دے کر ان کے گھر کی عورتوں، بچوں کو بھی گروی رکھ لیا۔ تین چوتھائی منافع خود چمن لال کے حصے میں آیا لیکن بقیہ پچیس فیصد نے بھی ان زرخریدوں کی زندگی میں وہ آسانی پیدا کی کہ وہ چمن لال کی غلامی اور اس سے وفاداری کو اپنی جان سے بڑھ کر سمجھنے لگے۔

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

گاؤں رفتہ رفتہ آباد ہوا... چمن لال احسان کے بار کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔ وقت پڑنے پر وہ مدد کرتا تھا تو مدد کی قیمت بھی مع سود وصول کرتا تھا۔ آبادی میں اضافہ ہوا تو چمن لال نے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول بھی قائم کر دیا۔ کبھی ان کے بچے بھی پڑھیں گے... یہ ایسا خواب تھا جو معاشرے کے کم حیثیت والے لوگ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ بعد میں اس نے علاج کے لیے شفا خانہ قائم کیا تو گرد و نواح میں اس کے دیالو ہونے کی دھوم مچ گئی۔ لوگ اسے انسان سے زیادہ دیوتا سمجھ کے پوجنے لگے۔

چمن لال کی دولت میں دن رات اضافہ ہوتا گیا اور اس کے رابطے بڑھتے گئے۔ اس نے اپنے لیے ایک حویلی تعمیر کی جس کا مہمان خانہ باہر تھا... درمیان میں باغ تھا اور اس کے آگے جنگل جہاں تیتر اور بٹیر بہت تھے... پہلے گرد و نواح کے دوسرے اسی جیسے رئیس اور بعد میں مقامی انگریز حاکم بھی اس کے مہمان ہونے لگے۔ وہ ہر طرح کا شکار کھیلنے آتے تھے۔ ایک طرف حیوان بنتے تھے، دوسری طرف انسان... کبھی شکار جنگل سے ملتا تھا تو کبھی خود اپنے پیروں پر چل کے اور باغ سے گزر کے آتا تھا۔

یہ انہی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ چمن لال کی اولاد اچھے گھروں میں بیاہی گئی۔ یوں اس کے رشتے دار بھی رئیس اور معزز لوگ ہو گئے جو ذات پات کے مقابلے میں آنے والی دولت کو زیادہ اہم سمجھتے تھے اور عقل مند لوگ تھے۔

چمن لال نے تجارت اور سیاست کے اصول اپنے انگریز آقاؤں سے سیکھے تھے۔ لاٹ صاحب نے تمام راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں پر اپنے عمل سے واضح کر دیا تھا کہ اپنی رعایا کو تم جیسے چاہو رکھو... انہیں اپنا کتا سمجھو یا غلام... انہیں جوتے مارو یا کوڑے... ننگا بھوکا رکھو یا نجی جیل میں زنجیروں سے باندھ کے... ان کی جان و مال اور آبرو کے مالک تم ہو لیکن تمہاری جان و مال اور آبرو ہمارے ہاتھ میں ہے... جس دن تم نے ہمارے سامنے نظر اٹھائی اور سر نہ جھکایا، اسی دن ہم تمہیں نمونۂ عبرت بنا دیں گے... توپ دم کر دیں گے یا چوک میں پھانسی پر لٹکا دیں گے... ہم ایسا کر چکے ہیں اور تاریخ کا یہ سبق زیادہ پرانا نہیں ہے۔

چمن لال نے ہمیشہ اسی اصول کو سامنے رکھا... وہ حاکموں کے قدموں میں کتے کی طرح لوٹ سکتا تھا اور ان کے جوتے بھی چاٹ سکتا تھا لیکن خود اس کے سامنے کوئی عزت کی بات بھی کرے تو ملازم کی بے عزتی کا تماشائے عبرت سب دیکھتے تھے۔ پھانسی اور عمر قید جیسی انتہائی سزائیں دو تھیں... مجرم کو ننگا کر کے دن رات کسی درخت سے الٹا لٹکائے رکھنا اور اس کے گھر والوں کو پچاس گز کے دائرے سے باہر رہ کے تماشا دکھانا... یا مجرم کے گھر کی بہو بیٹیوں کو ننگا کر کے سارے گاؤں میں پھرانا اور دوسروں کو یہ تماشا دیکھنے پر مجبور کرنا۔

اس رحم دلی اور سخاوت کے ساتھ سنگ دلی اور بے رحمی کی دوغلی پالیسی کے باعث چمن لال کا نہ کوئی دوست تھا، نہ دشمن... یہ مشہور تھا کہ اس نے ایک اونچی ذات کے برہمن کو اپنے پاؤں دبانے اور کتے نہلانے پر ملازم رکھ لیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اس کی جوان اور خوب صورت بیوی ہفتے میں ایک بار چمن لال کے پاس پہنچ جاتی تھی... چمن لال نے برہمن سے اس کی کوئی اولاد ہونے نہیں دی تھی... اس کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں چمن لال نے پیدا کیے تھے... ان کی شادیاں اونچی ذات والوں میں ہو گئیں تو معاہدے کے مطابق اس برہمن ملازم کو اتنی زمین اور نقد روپیا ملا کہ وہ خود رئیس ہو گیا... چمن لال جب نشے میں ہوتا تھا تو اپنی دھرم پتنی سے کہتا تھا کہ اس نے اپنی نیچی ذات کے ہونے کا انتقام لیا ہے... سات برہمن گھرانوں کے پوتر خون میں اپنا خون ڈال دیا ہے... [illegible] بات کسی اور کے سامنے [illegible]۔

اچانک حالات بدل گئے۔ انگریز نے ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ تو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہی کر لیا تھا لیکن مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمیں آزادی ہی نہیں پاکستان بھی چاہیے ورنہ انگریز کے بعد ہم ہندو کے غلام ہو جائیں گے... بیداری کی اس لہر نے سارے ہندوستان کو متاثر کیا تھا تاہم چمن لال مطمئن تھا۔ قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے سے بھی اسے فرق نہیں پڑا تھا لیکن ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو اسے فکروں نے گھیر لیا۔ جیسے جیسے یہ امکان واضح ہوتا گیا کہ اس کا گاؤں بھی نئے ملک پاکستان کی حدود میں شامل ہوگا، چمن لال کی نیندیں اڑ گئیں۔

دیکھتے دیکھتے لوگوں کی نظر بدل گئی۔ اسے اتنا وقت ملا تھا کہ حالات خراب ہونے سے پہلے سودا کر لیتا لیکن اس نے فائدہ اٹھانے میں دیر کر دی۔ جب اس نے یہ سوچا تو مسلمانوں کے تیور کچھ اور تھے۔ انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا کہ لالہ جی... یہ زمین اپنے ساتھ ہی بھارت لے جاؤ ورنہ ہم تو ایسے ہی لے لیں گے... ایسا سچ ہو گیا۔ جو دوست تھے، دشمن بن گئے... سارے نمک خوار جیسے نمک حرام

ہو گئے... چھپے ہوئے دشمن کھل کر سامنے آ گئے اور بہ قول لالہ جی... گیدڑ بھی شیر بن گئے۔

چمن لال کو اچانک جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔ اسے کسی خیر خواہ نے اطلاع دی تھی کہ کل رات حویلی لوٹ لی جائے گی۔ اس کے لیے باہر سے بھی لوگ بلائے گئے ہیں۔ وہ سب کو قتل کر کے حویلی کو آگ لگا دیں گے۔ بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ وقت بہت کم تھا... چمن لال نے خود اپنی خواب گاہ کا فرش توڑا اور سارا زیور دبا دیا۔ رات بھر میں سیمنٹ کا فرش سوکھ کے برابر ہو گیا۔ لالہ جی نے دوبارہ اس پر مسہری رکھ دی۔ دن خیریت سے گزرا تو چمن لال کچھ مطمئن ہو گیا کہ حملے کی بات کسی دشمن کی افواہ تھی۔ مگر رات کو جب حملہ آور آئے تو اسے بیوی کا ہاتھ پکڑ کے پچھلی طرف سے نکلنا پڑا۔

چمن لال کی فیملی ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی۔ ایک بیٹی کا خاندان دور اندیش تھا کہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے خرابی سے پہلے نکل گیا۔ دوسری بیٹی لاہور میں تھی اور شاہ عالمی میں سکھوں کے ساتھ اس کا پورا خاندان بھی تہ تیغ ہوا۔ بڑا بیٹا ناخلف تھا۔ باپ نے اتنے ارمانوں سے بیرسٹری پڑھنے ولایت بھیجا تھا کہ جناح اور گاندھی کی طرح سیاست میں نام پیدا کرے گا۔ وہ کسی میم کے عشق کی دلدل میں اتر گیا۔ شادی کے بعد [illegible] مجھے وکالت اور آپ کی ولدیت دونوں کو چھوڑنے سے فرق نہیں پڑتا... میں ولایت کو اور ولایتی دھرم پتنی کو نہیں چھوڑوں گا۔

چھوٹا روشن لال اور اس کی فیملی بھی جان بچا کے نکلنے میں کامیاب رہے لیکن تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہ لے جا سکے۔ لاہور سے روانہ ہونے والی شرنارتھی اسپیشل ٹرین نے انہیں امرتسر پہنچایا... وہاں سے وہ کسی صورت دلی پہنچے تو ان کی فیملی میں ایک فرد کی کمی ہو گئی... راستے کی سختی اور صدمات کی تاب نہ لاتے ہوئے چمن لال کی پچاس سالہ دھرم پتنی اکیلی ہی پرلوک سدھار گئی۔

خود چمن لال حواس باختہ اور نیم پاگل تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ مغلوں کی طرح اس کی سلطنت بھی بے وجود ہو چکی ہے۔ اس کی شان و شوکت کا سفر ایک صدی بھی جاری نہ رہا تھا کہ اس مفلسی پر تمام ہوا جس میں ذلت تھی... یہی ان کے آبا و اجداد کا پرانا اثاثہ تھا... زمین، حویلی، نوکر چاکر... دولت مندی کے ٹھاٹ باٹ... اختیار اور دبدبہ... سب جیسے خواب کی طرح تھا... جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔

شرنارتھی ہر سمت سے دلی پہنچ رہے تھے۔ دلی میں نظام الدین اولیا کے اسٹیشن سے مسلمان اسی طرح اسپیشل ٹرینوں میں پاکستان جا رہے تھے... دنیا کو جیسے کسی تخریب کار قوت نے الٹا دیا تھا... ایسے میں چمن لال کی پتا کون سنتا؟ اس کے بیٹے روشن لال نے جیسے تیسے کر کے ایک مکان پر قبضہ کیا جس کے مکین ہجرت کر چکے تھے اور باپ کو پاگل خانے میں چھوڑ آیا۔

مکان میں ضرورت کا سامان موجود تھا۔ انہیں بہت بعد میں پتا چلا کہ مکان کسی مسلمان سرکاری ملازم کا تھا۔ وہ بیوی کو لینے سسرال گیا... وہ خوش حال لوگ تھے اور جہاز سے بمبئی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے جہاں سے وہ بحری جہاز میں کراچی جاتے... انہوں نے داماد صاحب کو واپس جانے ہی نہیں دیا۔ چمن لال کے ملازموں کے گھر بھی اس سے بہتر ہوتے تھے لیکن فاقے میں سوکھی روٹی بھی اس کیک سے اچھی لگتی ہے جو بھرے پیٹ والوں کے لیے بدہضمی کا باعث ہوتا ہے۔

روشن لال سب سے پہلے فکرِ معاش کے لیے نکلا اور کسی نے اس کی دکھ بھری کہانی سن کے ملازمت بھی دے دی۔ ... رحم دلی کا جذبہ اس وقت دونوں طرف بہت زوروں پر تھا۔ روشن لال نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نئی نئی زیادہ دل پر اثر کرنے والی کہانیاں سنا کے آئے دن نئی ملازمت حاصل کرتا رہا... وہ ذہین آدمی تھا اور موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھ چکا تھا۔ پھر اسے ایک سچا ہمدرد دوست مل گیا۔ اس نے سمجھایا کہ بیٹے... نوکری تمہارے باپ نے نہیں کی... تم کب تک جھوٹ بول کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرو گے اور کہاں تک... جیسے مکان پکڑا ہے، ایسے ہی کوئی دکان پکڑو۔

اسی مہربان دوست کی راہنمائی... حوصلہ افزائی اور مدد سے روشن لال نے ایک دکان کا تالا توڑا... راتوں رات ''مہتا اینڈ برادرز'' کا بورڈ ہٹا کے چمن لال اینڈ سنز کا بورڈ لگایا اور دکان کا مالک بن گیا۔ دکان میں بجلی کا سامان تھا۔ جب مل ملا کے اور بیوی کے دونوں سونے کے کڑے دے کر اس نے دکان اپنے نام الاٹ کرالی اور وہ زمینداری سے بزنس کی طرف گیا تو اس پر اپنی کاروباری صلاحیت کے جوہر کھلے... پہلے اس نے بجلی کا کام کیا پھر اس کا دھیان ریڈیو کی طرف گیا جو تیزی سے مقبول ہوتے جا رہے تھے۔

مارکیٹ میں کم قیمت ہونے کے باعث انگلینڈ کے بنے ہوئے ریڈیو ہی زیادہ ملتے تھے۔ ان میں جنرل الیکٹرک کمپنی... بش، پائی اور مرفی جیسے نام لوگوں کی زبان پر تھے۔ حکومت انگریز کی تھی۔ جرمنی اور جاپان جنگِ عظیم میں ان

کے حریف تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ان کی مصنوعات کی فروخت یہاں ہو... روشن لال نے جرمنی کی شہرت سنی تو جرمن ریڈیو منگوائے... ان کی خوب صورتی اور اعلیٰ معیار نے لوگوں کو متوجہ کرلیا۔ ایک دم جرمنی کے ریڈیو مقبول ہوگئے۔ ان کی فروخت نے روشن لال کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ٹیلی ویژن کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی وہ لکھ پتی بن چکا تھا۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد چاچی رائے بہادر چمن لال کو گزر رہا ہی تھا... وہ سرکاری پاگل خانے میں پرانے وقتوں کی باتیں کرتے، پرانے لوگوں کو پکارتے بھگوان کے پاس چلے گئے۔ روشن لال کی بیوی نے بھی کم ہمت نہیں کی۔ وہ بڑی تن دہی سے بچے جننے میں لگ گئی اور تاج محل میں سوئی ہوئی ممتاز محل کے مقابلے پر اس نے بھی چودہ بچے جنم دیے... ان میں دس بیٹیاں تھیں اور چار بیٹے... پہلے ان بچوں کو پالتے اور پھر جہیز دے دے کر دس بیٹیوں کو گھر سے رخصت کرنے کے چکر میں روشن لال کی حالت اس دریا جیسی رہی جس میں آنے والا سارا پانی نہروں میں بہہ جائے۔

پیچھے رہ جانے والے چار سپوت ماں کے چاہنے اور باپ کی زور زبردستی کے باوجود عالم فاضل نہ بنے۔ انہوں نے نوجوانی کا بہترین وقت آوارہ گردی میں صرف کیا اور جوانی آنے سے قبل ہی جوان بھی ہوگئے۔ باپ دن رات کمانے میں لگا ہوا تھا اور پیسا خود ہی آرہا تھا تو وہ تردد کیوں کرتے... میٹرک تو انہوں نے رو دھو کے کرلیا لیکن اس کے بعد اتفاق رائے سے اس نتیجے پر پہنچے کہ کامیابی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں... خصوصاً خوش حالی کا... باپ کی اور اس سے پہلے دادا کی مثال ان کے سامنے تھی... وہ دیکھ رہے تھے کہ ایم اے پاس کالج کے پروفیسر سے زیادہ کچھ نہیں بنتے اور ان کی ساری عمر بسوں میں دھکے کھاتے یا سائیکلوں پر سفر کرتے گزرتی ہے۔

وہ باری باری کاروبار میں باپ کی مدد کرنے لگے اور ماں انہیں باری باری بیاہ کے بندھن میں جکڑتی گئی۔ دیکھنے میں وہ سب بڑی معصوم، گھڑ اور سعادت مند لڑکیاں لگتی تھیں لیکن بیویاں بنتے ہی انہوں نے رنگ ڈھنگ بدلے اور اپنے شوہروں کو نکیل ڈال دی... روشن لال کی بیوی کا سارا وقت چار بہوؤں سے چوکھی لڑنے میں گزرتا تھا۔ وہ رات کو شوہروں سے لڑتی تھیں کہ ساری عمر اس گھر کے دو کمروں اور باپ کے مقرر کیے ہوئے وظیفے میں گزارہ کیسے ہوگا... آخر تم خود اپنی کمائی کب لاؤ گے؟

شوہر کیا کرتے... باپ ساری دولت پر سانپ بنا بیٹھا تھا۔ وہ مالک بھی تھا اور کنجوس بھی... بیٹے تنگ کریں تو فوراً پکڑے جاتے تھے۔ بیویاں بھی احتجاج کرنے کے لیے روٹھ کے میکے چلی جاتی تھیں مگر کچھ دن بعد شوہر مناکر لاتے تھے ورنہ وہ خود ہی تھک ہار کے لوٹ آتی تھیں... میکے میں کون سا نوٹ چھاپ کے بانٹنے والے بیٹھے تھے۔

بچے اور جھگڑے بڑھتے گئے... ایک کی بیوی نے تو حد ہی کردی۔ اس نے شوہر کو دھمکی دی کہ فلاں اس پر ڈورے ڈال رہا ہے اور وہ اسی کے ساتھ فرار ہوجائے گی۔ شوہر نے کہا۔ ''جاتے وقت دروازہ بند کر جانا۔'' اور منہ پھیر کے سو گیا۔ شوہر سب ایک جیسے مجبور تھے اور ایک ہی بات کہتے تھے... بس کچھ دن صبر کرو... بڈھا مر جائے تو کاروبار ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور پھر سب اپنا... وارے نیارے... عیش ہی عیش... بیویاں دل میں خیال آنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آخر تم کوشش کیوں نہیں کرتے؟

جب وہ شبھ گھڑی آئی... کسی کی کوشش کے بغیر... اور دنیا کی رسم کے مطابق سوگ کا ڈراما بھی ختم ہوگیا تو روشن لال اینڈ سنز الیکٹرانکس میں حصے داری کے فساد کا آغاز ہوا... بڑے بھائی کو پتا کا رول اور بزنس کا کنٹرول دینے کا خاندانی اصول اب نہیں چل سکتا تھا۔ ایک دکان کے چار الگ حصے نہیں ہو سکتے تھے۔ انجام کار دکان فروخت ہوگئی اور حاصل ہونے والی رقم سب نے آپس میں بانٹ لی۔ دس بہنوں کو پھوٹی کوڑی نہ ملی کیونکہ جہیز میں وہ اس سے کہیں زیادہ لے جا چکی تھیں جو بھائیوں کو ملا تھا... دو چار ایسے لالچی اور کمین بہنوئی تھے کہ انہوں نے بیویوں کو مارا کوٹا اور گھر سے نکالا کہ جاؤ، باپ مرا ہے تو کچھ لاؤ... لیکن حاصل کچھ نہ ہوا... گھر کی مالک اب بھابیاں تھیں۔

چار بھائیوں کو جو رقم ملی، کم نہ تھی اگر وہ باپ کی عقل اور مالیاتی ڈسپلن سے کام لیتے تو بہت کچھ کرسکتے تھے لیکن وہ تمام عمر کے ترسے ہوئے تھے اور بیویوں نے سالہا سال کے مطالبات کی فہرست سامنے رکھ دی تو تین اپنی کمزوری کا شکار ہوگئے... صرف ایک کامیاب رہا... اس نے پرانی بیوی کو نکال باہر کیا اور اپنی پسند کی برانڈ نیو بیوی لے آیا جس کا تعلق بھی کاروباری خاندان سے تھا... ایک نے ذاتی کار کو ٹیکسی بنا لیا... دو کا سلسلہ روتے پیٹتے چلتا رہا... وہ کبھی نوکری کرتے... کبھی چھوٹا موٹا کوئی کاروبار۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ باپ نے سر چھپانے کی جو جگہ چھوڑی تھی وہ ان کے پاس تھی ورنہ دلی میں کرائے آسمان کو چھو رہے تھے... شاید یہ کوٹھی بھی فروخت ہوجاتی لیکن ماں اڑ گئی تھی کہ میرے جیتے جی یہ نہ ہوگا اور کوٹھی پتا جی نے اسی کے نام کر رکھی تھی، چنانچہ سب بے چینی سے اس کی وفات حسرت آیات کا انتظار کرنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

ایک ہی گھر میں غربت اور امارت کے فرق کے ساتھ رہنا عذاب تھا لیکن چاروں بھائی مجبور تھے... ان کی بیویاں دن رات لڑتی تھیں... طعنے دیتی تھیں اور ان کے بچے جو آپس میں فرسٹ کزن تھے، سب دیکھتے اور سنتے تھے اور یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ان کی بدقسمتی کے ذمے دار دوسرے ہیں۔ وہ خود غرض... تنگ دل اور کمینے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ والدین انہیں ایسا بنا رہے تھے۔

موہن لال سب سے چھوٹا اور ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ وہ بڑے بھائیوں کے مقابلے میں ذہین اور بامروت بھی تھا اور اسے بیوی بھی ایکسپورٹ کوالٹی کی ملی تھی۔ خوب صورت... سمجھ دار اور ہمدرد... ان کا ایک رومانس ٹائپ کا فلمی عشق چلا تھا جس میں ظاہر ہے عقل کا دخل نہ تھا لیکن قسمت مہربان تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں فٹ بیٹھ گئے جیسے ڈبے سے نکلنے والے چمکتے ہوئے جوتوں کا جوڑا دونوں پیروں میں فٹ ہوجائے... کوئی کسی کو نہ کاٹے... چنانچہ ان کا عشق بھی حیرت انگیز طور پر چار سال بعد بھی باقی تھا... یہ پہلا چمتکار تھا۔

موہن لال کی زندگی میں دوسرا چمتکار یہ ہوا کہ اس کی بیوی نے کم بچوں پر اکتفا کرلیا... بچے دو ہی اچھے کے گولڈن رول کے مطابق... ان میں بڑا لڑکا تھا اور چھوٹی لڑکی... لیکن اصل چمتکار اس کے سورگ باشی دادا رائے بہادر چمن لال نے دکھایا... وہ ایک رات اپنی دھوتی چوٹی اور سادھوؤں جیسی داڑھی کے ساتھ موہن لال کے خواب میں نمودار ہوئے... پرلوک سدھارتے وقت ان کا ڈیزائن یہی تھا۔

حسب عادت انہوں نے موہن لال کو ایک سو ایک گالیاں دیں... موہن لال نے انہیں اسی طرح ہذیان بکتے اور سب کی ایسی تیسی کرتے دیکھا تھا... انہوں نے فرمایا۔ ''سور کے بچے... بڈحرام کتے... وہ جو سونا میں دفن کر آیا تھا... وہ نکال کیوں نہیں لیتا... چار سو تولے سونے کی قیمت پتا ہے؟''

موہن لال نے سر کھجایا۔ ''مگر دادا... وہ سونا ہے کہاں؟''

''میں بتاتا ہوں...'' انہوں نے ایک شان دار گالی دے کر ایک انتہائی شرمناک حرکت کی۔

وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا... اس کی دھرم پتنی نے گھبرا کے کہا۔ ''کیا ہوا... کسی نے کاٹ لیا؟''

موہن لال بھونچکا بیٹھا رہا۔ بیوی نے پھر پوچھا کہ کیا خواب میں ڈر گئے لیکن جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ ''آج کل سونے کا بھاؤ کیا ہے؟'' اور ایک کاغذ پر حساب کرنے لگا۔ بھاؤ کو چار سو سے ضرب دے کر پٹ سے تکیے پر گرا اور چھت کو گھورنے لگا۔

اوما نے دہشت زدہ ہو کے اس کی آنکھوں کی ٹھہری ہوئی پتلیوں کو دیکھا۔ ''ہائے رام... کیا ہوگیا ہے تمہیں؟''

موہن اسپرنگ والے گڈے کی طرح اٹھ بیٹھا۔ ''اوما... سونا... چار سو تولے سونا... پانچ سیر سونا۔''

اوما نے اپنے لاکٹ کو دیکھا۔ ''تم یہ پانچ تولے سونا بھی ٹھکانے لگانا چاہتے ہو؟''

''پانچ تولے نہیں پاگل کی بچی... پانچ سیر... ذرا سوچو، ہم کتنے امیر ہوجائیں گے۔''

اوما نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''کیا کہیں ڈاکا ڈالنے کا خیال ہے... دماغ چل گیا ہے تمہارا... نہیں بننا مجھے دولت مند... چلو سو جاؤ۔''

لیکن موہن لال نے اسے خواب میں سورگ باشی دادا کی جلوہ نمائی کے بارے میں بتایا۔ ''انہوں نے جو کہا... اس کا ایک ایک لفظ درست تھا... میں نے یہ قصہ بہت سنا ہے... اپنی ماں سے بھی۔''

''پچاس سال پہلے ایسا ہوا ہوگا... لیکن اب اس کا خواب دیکھنا بھی پاگل پن ہے۔''

''کیوں پاگل پن ہے؟... وہ سونا وہیں ہوگا۔''

''لیکن وہ دوسرا ملک ہے... سیکڑوں میل دور... دشمن کا علاقہ ہے... ہم سونا نکالنے جائیں گے تو سونے کی جگہ دفن کر دیے جائیں گے۔''

مگر موہن لال کے دماغ میں سونے کا خیال کینسر کا پھوڑا بن گیا جو نظر نہیں آتا تھا اور اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کی سوچ کو مغلوب اور مفلوج کرتا جا رہا تھا... وہ دن رات سوچتا رہا اور دروازے بند کر کے اپنی دھرم پتنی سے اپنا خاندانی خزانہ بازیاب کرنے کا پلان ڈسکس کرتا رہا... اوما اپنے فیصلے میں اٹل رہی۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔''

''یہ نپولین کہتا تھا... تم موہن لال ہو۔''

''ہم کوشش ضرور کرسکتے ہیں۔''

''خواہ اس میں جان چلی جائے؟'' اوما نے کہا۔

''جان ایک ہی بار جاتی ہے میری جان... پھر ایسے مر کے جینے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم جان کی بازی لگا دیں۔''

www.pkdigest.com

کامیاب رہے تو کروڑ پتی ہو جائیں گے۔"

"موہن پیارے... میں ایسا کیوں سوچوں کہ میں بھوکے آدم خور شیر کے سامنے جا کے اسے میرا کا بھجن سناؤں تو وہ میرے قدموں میں سر رکھ دے گا... پھر میں اس پر سواری کروں گی۔"

لیکن موہن نے بالآخر اسے قائل کر لیا۔ اس نے دلائل دیے... پھر قسمیں دیں اور آخر میں دھمکی دی کہ ٹھیک ہے... "تم مت جاؤ میرے ساتھ۔" میں اکیلا ہی جاتا ہوں... یہ زیادہ آسان ہوگا میرے لیے کہ لوٹ کر ہی نہ آؤں، جو اس گھر میں رہتے ہوں گے... انہی کی کسی لڑکی سے نکاح پڑھوا لوں...

اس ایک دھمکی میں اتنی دھمکیاں پوشیدہ تھیں کہ اوما کو ہنسی نہیں آئی... وہ سچ مچ ڈر گئی... زمانہ ایسا ہی ہے... پیسے کے آگے دھرم، ذات کی کوئی حیثیت نہیں رہی... لوگ سارے رشتے توڑ کے سات سمندر پار جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتے... موہن کے دماغ میں بھی لالچ گھس کے بیٹھ گیا ہے... وہ جو کہہ رہا ہے کر بھی سکتا ہے... وہ بنا بچے کے رہ سکتی تھی، بنا موہن کے نہیں... موہن کے ساتھ مر سکتی تھی، اس کے بغیر نہیں جی سکتی تھی۔

جب ایک بار اوما نے خودکشی کے اس سفر میں موہن کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تو سب کچھ بدل گیا۔ اس کے دماغ نے یوٹرن لیا اور موہن کے ساتھ چلنے لگا۔ پانچ سیر سونا ملنے کی آس پہلے ایک فیصد تھی، اب وہ اس پودے کی طرح بڑھنے لگی جسے بنجر زمین سے نکال کر زرخیز مٹی، کھاد اور پانی فراہم کر دیا جائے۔ وہ دولت مندی کے خوابوں میں موہن کے ساتھ شریک ہو گئی اور رفتہ رفتہ قائل ہونے لگی کہ موہن نے جو سوچا ہے، وہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

وہ دروازے بند کر کے اس مشن ناممکنات کی تفصیلات ڈسکس کرتے رہے اور اپنے منصوبے کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ ظاہر ہے انہوں نے پاگل دادا والے خواب کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ بڑی بھابی تو ایسی ظالم تھی کہ کسی عامل کے ذریعے ان کی روح کو بلواتی اور پھر ان سے لڑتی کہ انہوں نے بڑے کو چھوڑ کے خزانے کا راز چھوٹے کو کیوں بتایا؟

انہوں نے اپنے ارادوں کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور اپنے سفر کے عزائم سے سب کو بے خبر رکھا۔ موہن لال نے بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ چار سو تولے سونے کے وارث چار بھائی ہیں لیکن کچھ پتا نہیں دس بہنوئی بھی اپنی بیویوں کو آگے بڑھا دیں کہ یہ باپ کا نہیں، دادا کا مال ہے۔ ہم کس کس کو حصہ دیں گے اور آخر میں ہمارے پاس کیا رہ جائے گا... پانچ سیر میں سے وہی پانچ تولہ...

اوما عورت تھی جو سونے کا عشق اپنی فطرت اور سرشت میں رکھتی ہے... پھر بھابیوں اور نندوں سے عداوت رکھے بغیر بھی گزارہ نہ تھا... یہ خیال اسے بڑی مسرت اور طمانیت دیتا تھا کہ وہ سونے میں پیلی پھرے... دولت صرف اسے باعزت کرے، باقی سب اس سے حسد کرنے والے ہوں۔ چنانچہ اس نے اتنی بڑی بات ہضم کر لی ورنہ اتنا عرصہ دراز کو راز رکھتی... دیواروں کو بھی نہ بتاتی جن کے کان ہوتے ہیں... تو بیمار پڑ جاتی... موہن لال احمق تھا جو سمجھ رہا تھا کہ یہ کسی سوگند... قسم... التجا یا دھمکی کا اثر تھا۔

مسائل بہت سے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ بچوں کا تھا۔ انہیں نانا نانی کے گھر میں چھوڑا جا سکتا تھا جہاں ویسے بھی وہ ہر سال گرمی کی چھٹیاں گزارتے تھے۔ ان کا گھر بہت شاندار تھا اور وہاں بچوں کی خوب آؤ بھگت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ ہر سال بڑی بے چینی سے اسکول بند ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اس سال اوما کو نہیں جانا تھا... اس سے بچوں کو قطعی فرق نہیں پڑا تھا لیکن اوما کا دل اس خیال سے بار بار ڈوب جاتا کہ کیا اس جنم میں وہ پھر اپنے بچوں کو دیکھ سکے گی... اس کے بچے بن ماں کے تو نہیں رہ جائیں گے... اس کے وجود کے ان دو ٹکڑوں کی قیمت پانچ سیر سونے سے اتنی کم تھی؟

موہن نے سخت کوشش سے اوما کی امید کا گراف ڈپریشن کی سطح تک نہیں گرنے دیا اور اسے آنے والے اچھے دنوں کے خواب دکھاتا رہا... جب وہ دولت مند ہوں گے تو ان کے بچے چم چم کرتی گاڑی میں جسے باوردی شوفر چلا رہا ہوگا، دہلی کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھنے جائیں گے... ابا کی طرح وہ پھر الیکٹرانکس کا خاندانی بزنس شروع کریں گے کہ مزید دولت آئے گی اور ساری دنیا گھومیں گے۔

پاکستان کا ویزا حاصل کرنا سب سے مشکل کام تھا لیکن ایک انتہائی چالاک ایجنٹ نے ناممکن کو بھی ممکن کر کے دکھا دیا۔ یہ معرکہ سر کرنے میں جتنا پیسا خرچ ہوا، وہ موہن کے تصور سے بھی زیادہ تھا مگر اس نے اپنے تمام وسائل استعمال کیے... جہاں سے ادھار مل سکتا تھا، ادھار لیا... جھوٹ بول کے اوما نے میکے والوں سے بیس ہزار حاصل کیے... اس میں سے دس ہزار اس کے بھائی نے امریکا سے بھیجے تھے... راز داری دوسرا مسئلہ تھا لیکن ایک دن آیا کہ وہ آخری جھوٹ بول کے گھر سے نکلے۔ انہوں نے کہا کہ وہ گھومنے کے لیے

www.pkdigest.com

بمبئی جارہے ہیں اور دہلی سے لاہور جانے والی دوستی بس سروس میں پاکستان روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

رائے بہادر چمن لال کے نام سے آشنا پہلا شخص ایک سفید ریش اور بیمار بوڑھا تھا جو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا معذور پڑا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی عمر سو سال ہے، وہ پہلے پہلوانی کرتا تھا... اور بہ قلم خود چمن لال سے ملا تھا۔

موہن اور اوما کے لیے اس فاترالعقل بوڑھے کی چارپائی کے سامنے دو کرسیاں رکھ دی گئی تھیں... مختصر سے گھر میں بڈھے کے ساتھ اس کا پوتا اور پوتے کی بیوی رہتے تھے... پوتا رات گئے دکان بند کر کے لوٹتا تھا۔ اس کی تیس سالہ بیوی بھارت سے آنے والے مہمانوں کے لیے چائے بنانے چلی گئی... اس کے دو بچے دروازے کی اوٹ سے جھانک رہے تھے... چھوٹا والا لڑکا شرارت سے کنپٹی پر انگلی گھما کر پیغام دے رہا تھا کہ پردادا پاگل ہیں۔

''لو جی، میں اور چمن لال دلی گئے۔ پہلے تاج محل دیکھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے حلیم بھی کھایا اور نہاری بھی کھائی۔ تیرا دادا چھپ کے ماس بھی کھا لیتا تھا۔ رات کو چمن لال نے کہا کہ چل گانا سنتے ہیں... لو جی، ہم ایک کوٹھے پر چڑھ گئے... موتی بائی کی ادھر بڑی دھوم تھی... اب کرنا خدا کا یہ ہوا پتر موہن لال... کہ ہم دونوں ہی اس پر مر مٹے... ادھر چمن لال کہے کہ میں اس کے لیے اپنا دھرم چھوڑ دوں گا... میں نے کہا کہ میں اپنا خاندان... معاملہ چھوڑا موتی بائی پر... اس نے کہا کہ مجھے دونوں منظور...''

یہ واقعہ سننے کے بعد موہن لال نے اس بچے کا اعتبار کیا جو انہیں اپنے پردادا کی ذہنی کیفیت پر صحیح رپورٹ دے رہا تھا... اسے اپنے دادا کے بارے میں یہ علم تو نہیں تھا کہ وہ چھپ کر ماس کھاتے تھے یا موتی بائی کے کوٹھے پر گئے تھے لیکن بڈھے کی اسٹوری میں تاج محل کو آگرے سے دہلی شفٹ کر دیا گیا تھا... وہ سب جھوٹ بول رہا تھا... نہ وہ سو سال کا تھا... نہ کبھی پہلوان رہا تھا اور نہ چمن لال سے ذاتی طور پر ملا تھا... جب وہ چائے پی رہے تھے تو بڈھے کی پوتی بہو نے بھی کہا۔ ''دادا جی کا کچھ پتا نہیں... یہ تو ہر کہانی میں خود کو ڈال دیتے ہیں... ابھی آپ جنگِ عظیم کی بات کرو گے تو یہ کہیں گے کہ میں ہٹلر کے ساتھ تھا۔''

موہن لال مایوس نہیں ہوا... اس کے باپ کو کافی بڈھے جانتے تھے جو اب تراسی کے پیٹے میں تھے اور ان کی یادداشت میں تقسیم سے پہلے کے بہت سے واقعات تھے۔

ایک نے لحاظ کیے بغیر روشن لال کو بہت گالیاں دیں اور یہ بتایا کہ وہ کتنا خر دماغ... عیاش اور ظالم تھا... غریب مزارعین اور ان کی فیملی کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا اور وہ فرار نہ ہوتا تو اس کا خون پینے کے خواہش مند بہت تھے... ان میں اس کا باپ بھی شامل تھا۔

موہن لال نے بے عزتی ضرور محسوس کی لیکن برا نہیں مانا... دنیا کو کیا پڑی ہے کہ مروت میں شیطان کو اچھا انسان کہے... دوسرے بوڑھے نے بات کو ٹال دیا کہ اب ان کو کیا کہنا جن کی ہڈیاں بھی گل گئیں... ان کی نیکی بدی ان کے ساتھ گئی... روشن لال کی وجہ سے اس گاؤں کے بچوں نے پڑھا اور لوگوں کو علاج کی سہولت میسر آئی... وہ پرائمری اسکول اب ہائی اسکول ہے اور اسپتال سرکاری انتظام میں چل رہا ہے۔

پھر وہ موہن لال اور اس کی بیوی کو اپنے ساتھ اس جگہ لے گیا جہاں روشن لال کی حویلی تھی اور باغ تھا۔ موہن لال نے محسوس کیا کہ جوان سے ملتے ہیں، یہ جان کے خوش ہوتے ہیں کہ وہ صرف اپنی جنم بھومی دیکھنے کے لیے بھارت سے آیا ہے۔ سب کا اخلاق اچھا تھا۔ سب مہمان نوازی کے جذبات کا بھرپور مظاہرہ کرتے تھے۔ نہ کسی کے رویے میں عداوت تھی، نہ کسی کے لہجے میں نفرت... چائے کا پوچھنا تو معمولی بات تھی... لوگ انہیں کھانے پر مدعو کر رہے تھے اور قیام کی پیش کش کر رہے تھے۔

خوف اب اوما کے دل سے بھی نکل گیا تھا۔ اس نے جہاں یہ کہا کہ ہمیں ڈر لگتا ہے، لوگ ہنسنے لگے... ''ہماری آپ سے کیا دشمنی جی۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''ہم خود انڈیا جاتے رہتے ہیں... تین بار اپنی فیملی کے ساتھ خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری دے چکا ہوں۔ دہلی اور آگرہ بھی جا چکا ہوں... یہ کوئی سن سینتالیس تھوڑا ہی ہے۔''

ایک جگہ موہن لال کا راہنما رک گیا۔ ''لو پتر! یہ ہے تیرے دادا کی حویلی... اس کے ساتھ ہی باغ تھا۔''

موہن لال نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''کہاں؟''

''اس کا نقشہ اب وہ نہیں رہا۔'' اس نے سمجھایا۔ ''یہ جو سڑک ہے، بعد میں نکالی گئی تھی۔ سڑک کے پار حویلی تھی۔''

''یہ سب دکانیں حویلی میں تھیں؟''

''نہیں... یہ جو کونے کی دکان ہے... کانچ شو اسٹور... یہ آخری حد تھی، اس کے بعد گلی ہے... آگے کھلی زمین تھی جس پر آبادی بعد میں ہوئی۔ شو اسٹور سے لے کر الٹے ہاتھ پر تنور تک... کچھ لے آدھا بازار حویلی کے باہر کی جگہ ہے۔''

''اور حویلی؟''

''وہ پیچھے کا حصہ ہے... باغ پر لوگوں نے قبضہ کر کے گھر بنا لیے ہیں۔''

''حویلی میں اب کون رہتا ہے؟''

''میرا خیال ہے اوپر والا حصہ بعد میں بنا... نیچے کی جگہ چار گوجر بھائیوں نے پکڑ لی تھی... وہ طاقتور تھے اور انہوں نے بعد میں ٹل ملا کے اسے اپنے نام بھی کرا لیا تھا... سب ہو جاتا ہے دنیا میں... اوپر بھی انہی کی اولادیں ہوں گی۔''

''آپ انہیں جانتے ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بعد میں آیا تھا اور بہت دور رہتا ہوں... میری کسی سے جان پہچان نہیں... لیکن میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔''

''آپ کی بڑی مہربانی... ہم خود مل لیں گے۔''

''گیٹ یہ سامنے ہے... جانے سے پہلے ملنا ضرور۔'' خوش اخلاق بوڑھے نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

بڑا سا گیٹ آج بھی وہی تھا۔ اس کے دو پھاٹک تھے۔ ہر پھاٹک دس فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ مکینوں نے ایک پھاٹک کو مستقل طور پر بند کر دیا تھا۔ دوسرے کے بیچ میں چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید بڑا گیٹ کسی گاڑی کے آنے پر کھولا جاتا ہوگا۔

موہن لال آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ سڑک پر سے گزرنے والے ان کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں تھے۔ بتائے بغیر کسی کو کیسے یہ علم ہو سکتا تھا کہ وہ بھارت سے آیا ہے اور چمن لال کا پوتا ہے۔ ان کے اور عام لوگوں کی شکل و صورت یا حلیے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک مختصر سی ڈیوڑھی یا راہداری سے گزر کے وہ اچانک صحن میں پہنچ گئے جو حویلی کے چار حصوں کے بیچ درمیان میں پھیلا ہوا تھا۔ اوپر والے چار حصے اسی کے نقشے پر بنائے گئے تھے۔

چاروں طرف آج بھی برآمدہ موجود تھا۔ برآمدے سے صحن میں آنے کے لیے محرابی دروازے بھی موجود تھے۔ ہر برآمدے کی لمبائی کا اندازہ موہن نے تیس چالیس گز کے درمیان کیا... پرانے وقتوں کے حساب سے یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر سے اس میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔

چند بچے جو اینٹوں کے بنے ہوئے صحن میں کرسی رکھ کے ٹینس کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے، رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے... اوپر والے حصوں میں برآمدے نہیں تھے۔ کمروں کی دیواریں نیچے برآمدے کے محرابی دروازوں کے ستونوں پر اٹھا دی گئی تھیں... اس طرح اوپر والے کمرے بہت بڑے ہو گئے ہوں گے یا ایک کی جگہ دو کمرے بنانے کی گنجائش نکل آئی ہوگی۔ صحن کے اوپر ایک قطار میں ہر طرف تین کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں... دو کھلی کھڑکیوں سے عورتوں کے متجسس چہرے ان کو تک رہے تھے۔

پھر برآمدے میں جھولنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک سفید ریش شخص سیڑھیاں اتر کے ان کی طرف آیا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس سے زیادہ غصہ تھا... قریب آ کے اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ہاں جی... کس سے ملنا ہے؟''

موہن لال نے کہا۔ ''جو بھی اس گھر کا بڑا ہو۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''بڑا تو میں بھی ہوں... تمہارے باپ کے برابر ہوں لیکن تم بتاؤ ایسے منہ اٹھا کے اندر کیسے چلے آئے... جب جانتے کسی کو نہیں۔''

موہن نے عاجزی سے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں... دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے باہر کہیں کوئی گھنٹی کا بٹن نظر نہیں آیا۔''

اوما نے کہا۔ ''چاچا جی! ہم بڑی دور سے آئے ہیں۔''

موہن نے مسکرا کے کہا۔ ''یہ گھر ہمارا ہے... میرا مطلب ہے پہلے ہم یہاں رہتے تھے۔''

چاچا جی کہنے سے اس کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ ''تم رہتے تھے؟ پچاس سال سے تو میں ہوں یہاں اور تمہاری عمر مجھے اس سے آدھی بھی نہیں لگتی...''

''میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا تھا... جب میرے بڑے یہاں رہتے تھے... تقسیم سے بھی پہلے۔''

ان الفاظ کا اثر بجلی کے کرنٹ جیسا ہوا۔ وہ شخص بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ ''کون ہو تم؟''

ایک نوجوان نے قریب آ کے کہا۔ ''کیا ہوا نانا جی؟''

''اوئے، اس کو دیکھ... سیدھا اندر آ گیا اور اب کہتا ہے کہ یہاں میرے بڑے رہتے تھے... پاکستان بننے سے پہلے...''

نوجوان بھی تیس سال کے لگ بھگ اور موہن کا ہم عمر تھا۔ اس نے لٹھے کی کھڑکھڑاتی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''میرا نام موہن لال ہے... اور یہ میری دھرم پتنی ہے... اوما دیوی... ہم دہلی سے آئے ہیں۔'' اس نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس کے چہرے پر خوش گوار حیرت پھیل گئی۔ ''میرا نام نواب دین ہے... یہ میرے نانا ہیں بشیر علی...''

اس وقت تک متعدد کھڑکیوں سے عورتوں، بچوں کے چہرے باہر جھانکنے لگے تھے۔ پیچھے برآمدے سے اتر کے تین

www.pkdigest.com

چار مختلف عمروں کے مرد ان کی طرف بڑھ رہے تھے... کرکٹ کھیلنے والے بچے ان کے گرد جمع ہوگئے تھے۔

موہن لال نے کہا۔ ''یہ حویلی میرے دادا رائے بہادر چمن لال نے بنوائی تھی۔''

نواب دین نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''اچھا اچھا... یہ تو بہت پرانی بات ہے... میری پیدائش سے بھی پہلے... نانا آپ کو یاد ہے؟''

''کیوں نہیں یاد... اس وقت میں چودہ سال کا تھا... لیکن ابھی تک انہوں نے بتایا نہیں کہ یہ کیوں آئے ہیں... حویلی واپس لینے؟''

موہن لال ہنسا۔ ''ہاں جی... اسے سوٹ کیس میں ڈال کے دلی لے جانے کا خیال ہے۔''

نواب دین نے کہا۔ ''آؤ... اندر آؤ... گھر کے بڑے بڑے نانا ہیں... انہیں نظر تو کم آتا ہے لیکن یاد سب ہے۔''

یہ خبر تیزی سے حویلی کے ایک گوشے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئی کہ حویلی کے پرانے مالک سرحد پار سے آئے ہیں... یہ سوال خود بخود ذہنوں اور زبانوں پر آیا ہوگا کہ کیوں آئے ہیں... ممکن ہے کچھ کم عقل اور زیادہ عمر کی خواتین تشویش کا شکار بھی ہوئی ہوں۔

انہیں ایک صاف ستھرے مہمان خانے میں بٹھا دیا گیا۔ موہن لال کے لیے یہ احساس ہی بہت عجیب تھا کہ وہ اس ہوا میں سانس لے رہا ہے اور اس ماحول کو دیکھ رہا ہے جس میں اس کے پرکھوں کی تین نسلوں نے اپنا اپنا وقت گزارا تھا... قدیم دیواروں کے درمیان اسے ہر طرف سے ان کی آنکھیں محبت سے دیکھتی نظر آرہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھے اور آنسو تھے۔ خود موہن لال کو یہ فضا سخت جذباتی کر رہی تھی۔

کشادہ کمرے میں پرانے صوفے اور بید کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے مختلف عمروں کے بہت سے نوجوان اندر آنے لگے۔ وہ موہن لال سے ہاتھ ملاتے تھے اور اسے یوں دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے جیسے وہ کوئی عجیب و غریب خلائی مخلوق ہو... دروازوں کی اوٹ سے جھانکنے والے بچوں کے بھی ایسے ہی تاثرات تھے... انڈیا سے آئے ہیں... ہندو ہیں... ایسے ہوتے ہیں ہندو؟... پھر کیسے ہوتے ہیں؟... موہن لال کے کانوں تک ان کے سوال جواب پہنچتے رہے۔

نواب دین کسی کا چاچا تھا تو کسی کا ماموں۔ اب اس کا رویّہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ خود بڑی مسرت سے نوجوانوں کو بتا رہا تھا کہ یہ حویلی کے اصل مالکوں کے پوتے ہیں... بھارت سے آئے ہیں... موہن لال کو اس تعارف کے بعد کسی کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے... وہ خوشی سے زیادہ حیرت کا اظہار کرتے تھے اور بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے... یہ نہ جانے کتنی بار کہا گیا کہ حویلی اب بھی آپ کی ہی ہے... انتظار اب گھر کے سب سے بڑے کا تھا جو نواب دین کے بڑے نانا اور بشیر کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ درمیان والے دو ہستیوں کے بارے میں بتایا گیا کہ گزر چکے ہیں...

بڑے نانا اور بڑے دادا کہلانے والے بلا شبہ ان تمام عہدوں پر فائز رہنے کے مستحق تھے... وہ دھوتی باندھے کھدر کا سلیٹی کرتہ پہنے اور خمیدہ کمر کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا آیا تو کمرے میں چاروں طرف بیٹھ کے موہن اور اس کی بیوی کو کسی عجیب مخلوق کی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے کھڑے ہوگئے مگر سفید داڑھی اور سفید بھووں والے اس شخص نے پروا نہیں کی۔ وہ احترام کے اس مظاہرے کا عادی تھا... سر پہ کروشیا کی بنی ٹوپی کو ڈھکن کی طرح لگانے اور آنکھوں پہ ہاتھ رکھے وہ موہن کے بالکل سامنے آکے رک گیا۔ صرف دو فٹ کے فاصلے سے اس نے موہن کا اور پھر اوما کا جائزہ لیا... صاف نظر آتا تھا کہ اس کی نظر کمزور ہے۔

''کون ہے بھئی تو...؟'' اس نے بالآخر اپنی کانپتی آواز میں کہا۔

چھوٹے بھائی نے [illegible] کے لیے ایک کرسی قریب کر دی اور موہن لال کے بارے میں تفصیل سے کان میں بتایا... وہ سر ہلاتا رہا... نواب دین نے اس کا نام اشرف علی بتا کے وقتی طور پر معاملات سے علیحدگی اختیار کی۔

اب اشرف کے ردعمل کا سب کو انتظار تھا۔ آنے والے بھارتی تھے۔ ہندو تھے یا صرف مہمان تھے... ان کے اسٹیٹس یا حیثیت کا فیصلہ ہو جانے پر ہی ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کا انحصار تھا۔ فی الحال ردعمل ملا جلا تھا اور ایک طرح سے فیصلہ چیف جسٹس صاحب کے زیرِ غور تھا۔

اشرف علی کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ خاندان کا سربراہ پرانے وقتوں کا مردم شناس اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ موہن کو یقین تھا کہ پرانے لوگوں کی طرح اس کے دل میں وسعت اور نگاہ میں مروت ہوگی... یہ الگ بات تھی کہ وہ موہن کی نیت پر شک کرے اور خواہ مخواہ فرض کرے کہ وہ حویلی کا پرانا اور اصل دعوے دار بن کے انہیں بے دخل کرنے آیا ہے۔

اچانک اشرف کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ کا اجالا پھیلا... اس نے فیصلہ سماعت مکمل ہونے تک ملتوی کر دیا تھا لیکن ایک باعزت ضابطۂ اخلاق کا نفاذ فوری طور پر کر دیا۔ ''اوئے نواب دین... باقی باتیں ہم کرلیں گے... اس کاکی کو ادھر کیوں بٹھا رکھا ہے... جا بھئی کڑی... تو اندر جا کے زنانیوں سے مل۔''

''جی دادا جی...'' دروازے کی اوٹ سے بارہ چودہ سال کی ایک لڑکی شرماتی اٹھلاتی، دوپٹا سر پر سنبھالتی فوراً اندر آگئی... یوں جیسے وہ انہی احکامات کی منتظر کھڑی تھی... ''آؤ جی آپ میرے ساتھ...''

موہن کے اشارے سے قبل ہی اوما اٹھ کھڑی ہوئی۔ اشرف علی نے کہا۔ ''اپنی دادی سے کہنا کہ یہ بھی اس گھر کی بچی ہے... خیال کرے۔''

یک لخت شکوک و شبہات کا غبار چھٹ گیا... موہن اور اوما کی حیثیت کا فیصلہ ہوگیا... نہ وہ مہمان تھے... نہ بھارتی اور نہ ہندو... ان کا رتبہ اس سے بھی بڑھ کے گھر والوں کے برابر کر دیا گیا تھا... اس کے ساتھ ہی ایک ہلچل شروع ہوئی... صرف دلچسپی رکھنے والے نوجوان نکل گئے... زیادہ عمر کے چاچے تائے چھ افراد رہ گئے جن کی عمریں چالیس سے اوپر تھیں۔ اس کے ساتھ ہی خاطر تواضع کا پہلا مرحلہ شروع ہوا۔ موہن کے لیے جگ میں شربت لایا گیا۔ ابھی آخری گھونٹ اس کے حلق سے اترا ہی تھا کہ خالص دودھ کی کھیر جیسی گرم گرم چائے آگئی جس کے ساتھ بڑی صحت مند جلیبیاں تھیں۔ انکار یا تکلف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ موہن نے اپنے معدے کو بھرنا شروع کیا۔ اسے معلوم تھا کہ رات کے کھانے تک اس پر کتنا ظلم ہوگا۔

کسی تجربہ کار صحافی کی طرح موہن کا انٹرویو خود اشرف علی نے لیا کیونکہ موہن کے جواب میں کسی غلط بیانی کو وہ خود پکڑ سکتا تھا۔ باقی لوگ تاریخ سے نابلد تھے اور بڑے بھائی صاحب کے کانوں میں ہر سوال کا جواب بشیر ڈالتا تھا۔

یک طرفہ سوالات کا یہ سلسلہ دو گھنٹے جاری رہا۔ یہ سیشن آدھے وقت میں ختم ہو جاتا مگر موہن کے جواب کو ہیڈ آف دی فیملی کے ہیڈ تک پہنچانے میں دگنا وقت صرف ہوتا تھا۔ تاریخ کی حد تک موہن نے وہی بتایا جو اسے بتایا گیا تھا۔ واقعات کی تفصیل موہن بھی بہت جانتا تھا لیکن حقائق میں کہیں فرق نہ نکلا... اشرف علی اس سو سالہ بوڑھے پہلوان کے مقابلے میں بہت سمجھ دار تھا جس کو پڑپوتے کی میڈیکل رائے پاگل قرار دے چکی تھی۔

اشرف علی نے بڑی بردباری سے موہن کی بات سنی۔ کہیں تصحیح بھی کی کہ یوں نہیں یوں تھا لیکن اپنی داستانِ حیات کو موہن کے ماضی کی کہانی میں زبردستی نہیں ڈالا۔ حالانکہ دونوں کا رشتہ سوکنوں جیسا تھا جن کا شوہر بہر حال ایک ہوتا ہے... اس کے مقابلے میں کچھ لوگ زیادہ بے چین طبیعت کے مالک تھے اور دخل در معقولات کے شوقین نظر آتے تھے لیکن خاندانی نظام میں ایک ڈسپلن تھا۔ خود نواب دین نے انہیں ٹوک دیا کہ تمہیں کیا معلوم... جب نانا جی بات کر رہے ہیں تو چپ کر کے بیٹھو۔

سوالات موہن کے دماغ میں بھی کلبلا رہے تھے لیکن مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ انہیں دبا دیا جائے... پچاس سال بعد مہاجر برادران کے ناجائز قبضے یا ان کے بارے میں عوامی رائے کا اظہار کرنے سے معاملہ خراب ہو جاتا... موہن ان کو اپنی شرافت... وضع داری اور سعادت مندی سے متاثر کر کے ہی اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔

رات کے کھانے کا وقت قریب تھا جب اشرف علی نے فیصلہ سنا دیا۔ ''تیرا سامان کدھر ہے پتر؟''

''سامان...؟''

''ہاں... اتنی دور خالی ہاتھ تو نہیں آیا ہوگا... پہننے کے کپڑے تو ساتھ لایا ہوگا؟'' اشرف علی نے کہا۔

''جی... وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور یہاں تک لایا تھا... اسی کے گھر میں رکھ دیا تھا۔''

کسی بھانجے بھتیجے نے کہا۔ ''وہی ہوگا... گلباز خان۔''

''جب اپنا گھر تھا تو سامان کہیں اور رکھنے کی کیا ضرورت تھی... جا اوئے تو لے آ سامان...''

مونچھوں والا ایک دبلا پتلا نوجوان بڑی مستعدی سے اٹھا۔ موہن لال نے نوٹ کیا کہ اشرف علی کی حیثیت بزرگ کے ساتھ اس گھر کی مملکت میں ایک مطلق العنان حاکم کی بھی ہے۔ اس کا کہا حرفِ آخر تھا جسے کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک شفیق اور منصف مزاج حکمراں تھا ورنہ نئی نسل ہو یا پرانی... بغاوت پر اتر آتی ہے... ناانصافی کون برداشت کرتا ہے۔

اپنے دادا کے بسائے ہوئے گاؤں کو اتنے بڑے قصبے کی صورت میں دیکھ کر موہن لال کو اتنی حیرانی نہیں ہوئی، جتنی اس کی ترقی دیکھ کر... یہاں بھی جدید شہری زندگی کی ساری سہولیات دستیاب تھیں... موہن لال کا اسباب منگوانے کے لیے جو گاڑی بھیجی گئی، وہ زیادہ پرانے ماڈل کی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ احاطے میں رات تک ایک چھوٹا اور ایک بڑا ٹرک بھی آکے کھڑے ہوگئے تھے۔ یہاں بجلی ہی نہیں، ٹیلی فون... ٹی وی اور کیبل سروس موجود تھے۔ بچوں کے لباس دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ بعد میں

جب وہ عمر رسیدہ خواتین سے ملے تو مزید حیران ہوئے... نوجوان لڑکیوں کے فیشن وہی تھے جو دلی کے...

موہن اور اوما کے قیام کے لیے ایک کمرا خالی کر دیا گیا جو نہ جانے کس کا بیڈروم تھا۔ اس میں ایک شادی کے جہیز والی مسہری تھی۔ کپڑوں کی الماری مقفل تھی لیکن پرانی ڈریسنگ ٹیبل پر تمام سامان ویسے ہی چھوڑ دیا گیا تھا... یہاں ابھی اٹیچ باتھ نہیں بنے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ کون سے غسل خانے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ غسل خانہ کمرے کے باہر برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور ہر برآمدے کے آخر میں زینے کے ساتھ بنا دیا گیا تھا۔

کھانے سے پہلے موہن لال کو بزرگ خواتین کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان میں سے ایک نابینا تھی اور دوسری چلنے پھرنے سے معذور... انہوں نے موہن کے سر پر ہاتھ پھیر کے دعا دی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ موہن کا ان سے تعارف اوما نے کرایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود وہ پہلے ہی سب سے مل کے ان کی دعائیں لے چکی تھی اور اسے یاد بھی ہو گیا تھا کہ کون کیا ہے... رشتوں کے معاملے میں خواتین کی یادداشت یقیناً کارکردگی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔

نسبتاً کم عمر... خود کو جوان سمجھنے والی... جوان اور نوجوان خواتین سے تعارف تو نہیں کرایا گیا لیکن موہن لال نے ہر جگہ انہیں آتے جاتے دیکھا۔ وہ سر پر دوپٹا ڈھانپے اس بھاری جوڑے کو کن انکھیوں سے دیکھتی تھیں جو گویا اسٹار پلس کے ڈراموں سے نکل کے ان کے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ وہ سب پردے دار خواتین تھیں اور ان کے مرد زیادہ تر نمازی تھے۔ عشا کی آواز پر بیشتر مرد غائب ہو گئے۔ وہ چار نے گھر میں ہی نماز پڑھی تھی... لیکن موہن لال اور اوما کو گھر کے بچے ہونے کا سرکاری سرٹیفکیٹ جاری ہونے کے بعد گویا سارے تکلفات اٹھ گئے۔

ابھی تک موہن کا پلان توقعات کے مطابق کامیابی کی جانب گامزن تھا تاہم اسے حیرانی یہ تھی کہ اس گھر میں بچے سے بوڑھے تک سب غیر متعصب اور خوش اخلاق اور مہمان نواز کیسے تھے؟ یہ فیملی ڈسپلن تھا... عادت اور فطرت تھی یا واقعی پرانی نفرتوں کا الاؤ بجھ چکا تھا اور دشمنی کے جذبات کو زندہ رکھنے کی کوشش محض ایک سیاسی ناٹک تھا جو میڈیا پر چلتا تھا... ورنہ یہاں بھی لوگ اجتابھ اور شاہ رخ کے دیوانے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کا باپ مہدی حسن کی غزلوں پر سر دھنتا تھا اور دادا نور جہاں کا عاشق رہا تھا۔

باتوں اور سوال جواب کا سلسلہ تو شاید ساری رات چلتا لیکن پہلے بچے لڑھکے یا لڑھکا دیے گئے کیونکہ انہیں صبح اسکول جانا تھا... پھر ان کی مائیں جمائیاں لینے لگیں... بالآخر اشرف علی نے اعلان کر دیا کہ چلو بھئی، مہمان تھکے ہوئے ہیں... انہیں سونے دو... باقی کل...

تنہائی میسر آتے ہی موہن نے اوما کو لپٹا لیا۔ "یہ تو کمال ہو گیا اوما... ایسے سواگت کی مجھے امید نہیں تھی۔"

اوما گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کے بیٹھ گئی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

"کیا بات ہے... تم خوش نہیں ہو؟"

"یہ بڑے اچھے لوگ ہیں موہن... نیک دل اور بھروسا کرنے والے... اور ہم کیا کرنے آئے ہیں؟ ان کو دھوکے سے لوٹنے...؟"

موہن نے ضبط سے کام لیا۔ "نہیں ڈارلنگ... ہم اس گھر میں رہنے والوں کی پھوٹی کوڑی بھی نہیں لے جائیں گے۔ ہم وہی لے جائیں گے جو ہمارا ہے۔"

"اونہہ... یہ بات ہے تو انہیں بتا دو... وہ خود کب تمہارا مال رکھیں گے... حقیقت یہ ہے کہ اس پر اب ہمارا کوئی قانونی حق نہیں۔"

"اخلاقی تو ہے... وہ ہمارے باپ دادا کی جائز کمائی سے خریدا گیا سونا تھا... انہوں نے کہیں ڈاکا نہیں ڈالا تھا... اور اب یہ بحث چھیڑنے کا فائدہ... بعد میں بھول گئی ہو... اتنا لمبا سفر ہم نے کس لیے کیا تھا؟ ہم سے بڑا بےوقوف کون ہو گا کہ اتنے خطرات اور مشکلات سے گزر کے یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم خالی ہاتھ لوٹ جائیں۔" موہن بگڑ گیا۔

"میں ایسا تو نہیں کہہ رہی۔"

"اپنا اور میرا دماغ خراب مت کرو... قسمت ہمارا ساتھ نہ دے رہی ہوتی تو ہمیں اتنی پذیرائی نہ ملتی۔"

"اس کام میں کتنے دن لگ جائیں گے موہن؟"

"یہ میں کیسے بتاؤں؟ لیکن ہاں... کام بہت آسان ہو گیا ہے... دو چار دن میں ہو جانا چاہیے... ہم چاہیں تو دس دن یہاں رہیں... انہیں اعتراض نہیں ہو گا... لیکن میں خود اتنے دن لگانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے یہاں آ کے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔" اوما لیٹ گئی۔

"تمہیں کیا عجیب لگا؟" موہن لائٹ آف کر کے اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

"یہ تو بالکل اندھیرا ہو گیا۔" اوما اس سے چمٹ گئی۔

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" موہن ہنسا۔ "یہاں زیرو واٹ کا کوئی بلب نہیں ہے۔"

"اچھا تو لائٹ جلا دو۔"

"مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی... تم جانتی ہو۔"

"بجھا دینا سوتے وقت۔"

موہن نے سوئچ آن کر دیا۔ "اندھیرے میں تمہیں آتمائیں بھٹکتی دکھائی دیتی ہیں... پرکھوں کی؟"

"تم نے دیکھا موہن... یہ لوگ کیسے رہتے ہیں... جو بڑا ہے اس کا حکم چلتا ہے... جوائنٹ فیملی سسٹم سے کسی کو شکایت نہیں۔"

"شکایت ہو گی... بغاوت ابھی کسی نے نہیں کی یا ہمارے سامنے سب اچھا اچھا پیش کر رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے ناٹک کر رہے ہیں؟"

"نہیں... یہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے لیکن اوما ڈیئر... یہ مت بھولو کہ تم گاؤں میں ہو... دلی جیسے ہر شہر کے مسائل وہی ہوں گے... کراچی یا لاہور میں جوائنٹ فیملی سسٹم ایسے ہرگز نہیں چل سکتا۔"

اوما سوچتے ہوئے بولی۔ "ہم نے تو کوشش ہی نہیں کی۔"

"ہم بھی رہتے تو ہیں ایک ساتھ... [illegible]

جیسے قیدی رہتے ہیں... جائیں تو جائیں کہاں... کوئی کسی کے گھریلو معاملات میں حکم چلا کے دکھائے... ہر ایک اپنی کرتا ہے... ہم کیا سب کے بیچ میں ایسے رہ سکتے ہیں؟"

موہن نے بات ٹالی۔ "بات یہ ہے اوما ڈیئر! بھگوان نے سب کی تقدیر جدا بنائی ہے... جو زیادہ ذہین ہے... زیادہ محنتی ہے... وہ ترقی کیوں نہ کرے؟ زیادہ کیوں نہ کمائے... اور کمائے تو فائدہ اس کے بچوں کو کیوں نہ ملے... سب کی طرح وہ خراب حال میں کیوں رہے۔"

لیکن اوما نہ جانے کب سو گئی تھی۔ یہ فرق موہن نے ہر جگہ ایسے ہی دیکھا تھا۔ مرد مشکل سے سوتے تھے... عورتوں کے ہاتھ میں تو جیسے کوئی سوئچ تھا۔ آف کیا اور غائب... موہن کی نیند اس رات بہت ڈسٹرب ہوئی۔ خود اوما بار بار چونکتی رہی... نتیجتاً یہ کہ صبح وہ دیر سے جاگے... وہ کمرے سے باہر آئے تو حویلی میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ مرد کام پر چلے گئے تھے... بچے اسکول اور کالج... عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف تھیں اور دونوں بوڑھے بھائی اشرف علی اور بشیر علی برآمدے میں موڑھے ڈالے حقے گڑگڑا رہے تھے۔

ابھی وہ کسی بھابی کے ہاتھ کے دیسی گھی والے گرم گرم پراٹھے، دیسی مکھن اور گھی میں تر تراتے حلوے سے کھا رہے تھے کہ نیچے سے بلاوا آ گیا... اوپر نیچے دو باورچی خانے کی ذمے داری تمام بہوئیں یا بہوؤں کی بہوئیں مل جل کے باری باری سنبھالتی تھیں... گھر میں ایک ایسی تقسیم کار تھی جو کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہتی تھی۔

اشرف علی کے پاس کوئی وردی والا تھانے دار بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے موہن لال اور اوما کو دیکھا۔ "تم آئے ہو دلی سے؟"

موہن نے سر ہلایا۔ "ہم کل ہی پہنچے تھے۔"

"تم نے قانون کے مطابق تھانے میں رپورٹ نہیں کی؟"

اشرف علی نے کہا۔ "اوئے، اب زیادہ تھانے دار نہ بن... یہ مہمان ہیں ہمارے... جو لکھنا ہے لکھ لے۔" پھر اس نے اوما کو ڈانٹا۔ "تو کیوں کھڑی ہے... جا اندر۔"

تھانے دار نے معذرت کی۔ "کارروائی تو ڈالنی پڑتی ہے چودھری صاحب..." موہن نے اپنے پاسپورٹ پیش کیے... تھانے دار نے ضابطے کے مطابق ان کا اندراج کیا۔ "مقصد کیا لکھوں؟"

"جو تجھے ٹھیک لگے خود ہی لکھ لے... بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا کیا تو وردی کا لحاظ نہیں کرنا میں نے۔"

تھانے دار کھسیانا ہو گیا۔ "آپ بھی حد کرتے ہو جی۔"

اشرف علی نے اس کی نہیں سنی۔ "لے بھئی پتر موہن لال... یہ جو تھانے دار ہے نا... اس کو میرے... وڈے بیٹے نے پڑھایا ہے... بڑے ڈنڈے کھڑکائے ہیں اس کو... ابھی تک ہوں گے نشان... اور وہ جو اس کا باپ تھا..."

تھانے دار شربت کا گلاس حلق میں انڈیل کے کھڑا ہو گیا۔ "آپ بھی کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔"

اشرف علی نے تھانے دار کی ایسی تیسی اس کے جانے کے بعد بھی جاری رکھی۔ موہن لال سخت متاثر ہوا۔ اس نے یہ تو سنا تھا کہ ان کی آبائی حویلی پر قبضہ کرنے والے ڈاڈے لوگ تھے... طاقتور... اس کا مطلب بدمعاش بھی ہو سکتا تھا... دولت مند بھی اور بااثر بھی... موہن لال دیکھ رہا تھا کہ وہ آج بھی ڈاڈے ہیں۔

ایسے لوگ موہن لال اور اوما کو غائب کر بھی سکتے تھے اور کرا بھی سکتے تھے... جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کرا سکتے تھے اور مروا بھی سکتے تھے... کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے... ان کے گھر والے کیا جانیں وہ کہاں ہیں... سال بھر بعد سب ہم بھی بھول جائیں گے... ابھی پانچ سیر سونا کہاں...

www.pkdigest.com

☆☆☆

ایک پورا دن حویلی کے اندر ہی تاریخ کے آثار دیکھتے گزر گیا۔ اشرف علی اور بشیر علی انہیں بتاتے رہے کہ جب حویلی انہوں نے خریدی تو انہیں اندر کیا کچھ ملا تھا اور اس میں سے کیا ابھی تک موجود تھا... یہ بات موہن لال کو عجیب نہیں لگی کہ وہ حویلی ”خریدنے“ کی بات کر رہے تھے۔ ان کی جگہ وہ خود بھی ہوتا تو یہ کیوں تسلیم کرتا کہ اس نے زور زبردستی سے حویلی پر قبضہ کیا تھا۔

یہ مسہری یہاں...... دوسرے کمرے میں تھی... وہ سنگھار میز تھی... وہ بڑا صندوق تھا جس میں رضائیاں، کمبل بھرے ہوئے تھے... ظاہر ہے پچاس سال بعد پرانے کیسے ہو سکتے ہیں، پھٹ کے ختم ہوئے... فرنیچر بھی زیادہ نہیں بچا تھا لیکن پرانے شیشم کی لکڑی تھی اس لیے ہر کمرے میں ایک مسہری اب بھی استعمال ہو رہی تھی۔

موہن لال نے پوچھا۔ ”نانا جی! آپ کا آنا جانا تھا؟“

”آنا جانا کیوں نہیں تھا... تیرا دادا ذرا ڈرپوک تھا... کوئی خطرہ محسوس کرتا تھا تو مجھے بلا لیتا... میری بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی... چھوٹے موٹے بدمعاش میرے نام سے کانپتے تھے۔“

’کیونکہ آپ بہت بڑے بدمعاش تھے۔‘ موہن لال نے سوچا۔ ’مگر نہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں اور نہ آپ یہ مان سکتے ہیں۔‘

”آپ کو کچھ علم ہے... میرے دادا کا کمرا کون سا تھا؟“

”کیوں نہیں... ہندوؤں کے گھر میں وہ پردہ تو نہیں تھا جو مسلمان گھرانوں میں ہوتا تھا... لیکن اپنے پرائے کا فرق اتنا ہی تھا... غیر مرد حویلی میں نہیں آ سکتے تھے اور ہندو عورتیں گھونگھٹ نکالتی تھیں... گھر میں بھی جیٹھ اور سسر کے سامنے... جب حویلی ہم نے خریدی تو سامان جوں کا توں تھا۔“

”میں نے سنا تھا... حویلی کو آگ لگا دی گئی تھی؟“

اشرف علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”چمن لال کو ڈرا کے بھگانے کے لیے ایسی بات کی گئی ہوگی۔ گاؤں کا کوئی بندہ لوٹ مار میں شریک بھی نہیں ہوا... باہر سے کچھ لوگ آئے تھے، تیرے دادا نے مجھے حفاظت کے لیے بلایا تھا لیکن اس نے بھاگنے میں بڑی جلدی کی... مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی... لیکن حملہ آوروں کو میں نے للکار کے بھگا دیا تھا۔“

”سامان آپ کو صحیح سلامت مل گیا تھا؟“

”ہاں...... اسی سے اندازہ ہوا کہ تیرے دادا کا یہ کمرا تھا... جس میں ہم کھڑے ہیں۔“

موہن لال دم بخود رہ گیا۔ ”یہ...“

”ہاں... چمن لال کی ایک تصویر بھی نہیں ورنہ میں دکھاتا... اس کے کپڑے تھے الماری میں... چھڑی تھی... کچھ کاغذات تھے... عورتوں کے کپڑے تو ایک جیسے ہی ہوتے تھے اور عورتیں ہی پہچانتی ہوں گی۔“

موہن لال نے کسی سحر زدہ شخص کی اداکاری دکھائی۔ ”یہاں اس کمرے میں رہتے تھے میرے دادا جی اور میری دادی... اوما... تم نے سنا...“

اوما نے سر ہلایا۔ ”یہ سب کتنا عجیب لگ رہا ہے۔“

”میرے ابا بھی یہاں پیدا ہوئے ہوں گے... روشن لال... اسی مسہری پر...“ موہن لال نے آہستہ آہستہ بھاری بھرکم مسہری کے سرہانے پر ہاتھ پھیرا... شیشم کی لکڑی کی پالش خراب ہو کے سیاہ پڑ گئی تھی۔ سرہانے کے وسط میں نصب ایک فٹ اونچا اور چھ انچ چوڑا آئینہ دھندلا گیا تھا... اس کے قدیم بیل بوٹوں میں گرد بھر گئی تھی۔

موہن لال مسہری پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کامیاب رہی... اوما کو بھی اپنی ہنسی روک کے چہرہ اداس کرنا پڑا... اشرف علی پر اس جذباتی ڈرامے کا بہت اچھا اثر ہوا... وہ خود بھی جذباتی ہو گیا۔ کاش! اس کے اپنے پوتے بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے۔

”نانا جی! ہم دو چار دن یا جب تک یہاں ہیں... ہمیں اس کمرے میں ٹھہرنے دیا جائے۔“

اب اوما نے اس سین میں اپنے ڈائیلاگ بولے۔

”بات یہ ہے نانا جی! موہن اپنے دادا کا سب سے لاڈلا پوتا تھا... اسے وہ ہر وقت گود میں یا کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے... اس کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔ کوئی اسے غصے کی نظر سے دیکھ نہیں سکتا تھا... جب ان کا دیہانت ہوا تو یہ پاگل ہو گیا... ہر وقت روتا رہتا... ان کے کمرے سے نہیں نکلتا تھا۔“

اشرف علی کیسے ناک آؤٹ نہ ہوتا... اس نے کہا۔ ”لے، بس اتنی سی بات ہے میں یہاں... اکیلا رہتا ہوں... گھر والی کو گزرے بارہ سال ہو گئے... مجھے پتا ہے کسی کی یاد کس طرح دل کا خون کرتی ہے۔“

”نہیں نہیں... میں یہ نہیں کر سکتا... میں نے بڑی غلطی کی کہ آپ سے ایسی درخواست کر دی۔“

”او پتر... کوئی بات نہیں... میں اکیلی ذات... کہیں بھی سو جاؤں گا۔ ایک بھائی اپنی بیوی کے ساتھ تھا تو اسے یہاں ڈر لگتا تھا... کہتی تھی رات کو چمن لال کی بیوی نظر آتی ہے... اس کی روح کہتی ہے کہ میری جگہ کیوں سو رہی ہے... وہ کسی دن سوتے میں میرا گلا دبا دے گی۔“

www.pkdigest.com

"میری دادی کی روح؟"

"ہاں... کہتے ہیں... چمن لال ایک بار کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا... تیری دادی نے پکڑ لیا... اسی چارپائی پر... اس کا گلا گھونٹ دیا تھا... جھوٹ سچ کا مجھے پتا نہیں... میں ابھی تمہارا سامان یہاں رکھوا دیتا ہوں... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں... تمہارا گھر ہے... جہاں چاہو رہو۔"

موہن نے سر جھکا کے کہا۔ "آپ کا بہت بڑا دل ہے نانا جی۔"

بار بار نانا کہنا بھی اسپرین کے اشتہار کی طرح اثر کرتا تھا... سر درد کا سن سن کے سر کا درد ہو جاتا ہے۔ اچھا یا برا پروپیگنڈا آہستہ آہستہ ذہن کو متاثر کرتا رہتا ہے۔

یہ موہن لال کے لیے آئیڈیل صورت حال تھی... اس نے اپنی عمر کے دو نوجوانوں کو ساتھ لے کر رات کے وقت ایک ایڈونچر کیا۔ وہ پرانی حویلی کے باغ میں کود گئے... اندر تاریکی تھی، ویرانی اور سنسان... جہاں کبھی گھاس یا پھولوں کے تختے ہوں گے، وہاں اب جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا... درمیان کے درخت صاف کر دیے گئے تھے۔ دو چار پرانے درخت عہد رفتہ کے باغ کی یادگار رہ گئے تھے۔

ان میں سے ایک غلام علی نے شہر سے بی اے کر لیا تھا اور کئی سال سے بے روزگار پھر رہا تھا۔ ابتدا میں ہی اس نے موہن لال کو بتا دیا کہ محبت تو اسے کئی بار ہوئی جو سچی تھی لیکن بڑے اس کو زبردستی ایک کزن سے نتھی کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایسا کیا تو وہ بھاگ کے لاہور چلا جائے گا۔ وہ باڈی بلڈنگ کرتا تھا اور دو چار ڈراموں میں بھی کام کر چکا تھا... فلم انڈسٹری تباہ نہ ہوتی تو اس کے لیے بڑا چانس تھا... ٹی وی کی ایک پروڈیوسر جو عمر میں اس سے بارہ سال بڑی اور تین بار کی طلاق یافتہ تھی، اس سے شادی کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ لاہور کی کسی اچھی بزنس فیملی یا کسی اعلیٰ فوجی افسر کی بیٹی پھنس جائے تو اس کا مستقبل سنور جائے... صورت شکل یا عمر کی اسے زیادہ پروا نہیں... موٹی، کالی یہاں تک کہ تھوڑی بہت ذہنی معذور کو بھی وہ فی الحال قبول کر سکتا ہے... ایک بار اپنے قدم جم جائیں تو اسے چھوڑنا کیا مشکل ہوگا... امید ہے اس کا یہ پلان کامیاب ہوگا کیونکہ اس کی اتنی اچھی باڈی ہے اور صورت بھی بری نہیں۔

موہن لال نے اسے چن لیا۔ وہ اس کے مطلب کا آدمی تھا... دوسرا اس کا کزن عبدالرشید بالکل ہی احمق تھا۔ اس نے میٹرک میں فیل ہونے کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ عقل کے ساتھ وہ شکل کا بھی گیا گزرا تھا۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کا شوقین تھا۔ اپنے پریکٹیکل اور چالاک کزن کے مقابلے میں وہ تقدیر کی لاٹری پر انحصار کرنے کا شوقین تھا۔ کوئی ایک کروڑ والا پرائز بانڈ نکل آئے۔ کہیں کوئی پیر صاحب تھے جو چالیس دن کا عمل بتاتے تھے... عمل مشکل تھا لیکن جو کر لے، اسے خواب میں مدفون خزانے کا پتا مل جاتا تھا... ایک دوست نے بتایا تھا کہ گلگت میں سونا نکلتا ہے... وہاں حکومت کا گولڈ پروجیکٹ بھی ہے اور اس کا ڈائریکٹر کوئی محمد اعظم قریشی ہے جو باہر کا پڑھا ہوا ہے... اس کے پاس سونا بنانے کا فارمولا ہے۔

یہ شخص بھی موہن لال کے مطلب کا تھا۔ دونوں کے مزاج اور فطرت میں لالچ کا عنصر غالب تھا۔ ایک اس کے لیے غیر اخلاقی یا جرائم کی راہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ دوسرا کم ہمت تھا اور غیبی امداد پر بھروسا کرتا تھا۔ کام دونوں سے لیا جا سکتا تھا۔

اس رات وہ اپنے دادا کے کمرے میں سوئے جو حویلی کا بانی اور مالک تھا۔ دن اوما کا بھی اچھا گزرا تھا۔ اس نے سب سے رشتے قائم کر لیے تھے۔ کوئی چاچی تھی، کوئی دادی، کوئی بھابی تو کوئی باجی... وہ سب اوما سے بھارت سے زیادہ بھارتی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے بارے میں پوچھتی رہتیں... کبھی پوچھتیں کیا شاہ رخ سے ملی ہو... اوما... کبھی بہو تھی... [illegible] ...والے کی بیٹی ہے... درحقیقت وہ اوما کی فرسٹ کزن تھی... دونوں نے بچپن میں ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا... یہ خبر انتہائی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔

اوما نے سب کی تعریف کی۔ "اچھے لوگ ہیں لیکن مذہب کے معاملے میں متعصب ہیں۔"

"یہ تم نے کیسے جان لیا؟"

اوما نے کہا۔ "لو... تم نے دیکھا نہیں... ہمارے کھانے پینے کے برتن الگ ہیں... وہ ہمارے ساتھ ضرور بیٹھتے ہیں مگر ان برتنوں میں نہیں کھاتے... میرا تو خیال ہے، بعد میں وہ برتن توڑ دیں گے... پرانی بڑھیاں تو صاف کہتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانے سے منع کیا گیا ہے۔"

موہن نے کہا۔ "آج جو نوجوان میرے ساتھ تھے، انہوں نے اسی بوتل سے پانی پی لیا تھا جس سے میں نے پیا تھا... یہ تمہارا وہم ہوگا۔"

"وہم کیسا... کیا ہم کسی مسلمان کو اپنی رسوئی میں گھسنے دیں گے؟ تم تو ماس بھی کھا لیتے ہو... کیسے مزے لے لے کر

چکن تکا کھا رہے تھے... لیکن کیا تمہارے بڑے..."

"یار چھوڑو... تم بھی کس بحث میں پڑ گئیں... تم مت کھاؤ ماس۔"

"میرے لیے تو دال سبزی بن رہی ہے... چھوٹے نانا اور بڑے نانا بھی گوشت کہاں کھاتے ہیں۔"

"ان کے دانت جو نہیں ہیں... لیکن دیکھو... کتنی اپنائیت سے انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں جگہ دی... دھرم بھرشٹ ہونے کا خیال ہوتا تو یوں مہمان رکھتے... مجھے تو کوئی فرق نہیں لگا ان کے سلوک میں... اور ہو بھی تو کیا... ہم بہرحال الگ الگ مذہب کے ماننے والے ہیں۔"

"ہم تو پوجا پاٹ سے بھی گئے... ان کو دیکھو... کتنی باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں... تمہارے ساتھ رہ کے میں نے بھی سب چھوڑ دیا۔"

موہن نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "میں نے تو تمہارے لیے ساری دنیا کو چھوڑ دیا۔"

وہ مچلی۔ "چھوڑو مجھے... یہ اپنا گھر نہیں ہے۔"

"نہیں جان... یہ اپنا ہی گھر ہے... میرے دادا کے بعد میرا باپ تھا اس کمرے میں... آج میں ہوں تو کیا..."

"رات کو کسی وقت موہن نے ہلایا۔ "اوما..."

"اب کیا ہے؟" وہ نیند میں منمنائی۔

"وہ نکالو... یہی وقت ہے۔" موہن نے سرگوشی کی۔

"کل دیکھ لینا... مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"نہیں... کل کا کیا بھروسا... سوٹ کیس کی چابی دو مجھے۔"

اوما نے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی... موہن اندھیرے میں نیچے اتر کے اس دیوار تک گیا جہاں دونوں سوٹ کیس اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں ہارڈ ٹاپ تھے۔ دونوں میں نمبر والے لاک بھی تھے اور چابی والے بھی... سرخ سوٹ کیس اوما کا تھا۔ نیلا موہن کا لیکن اندھیرے میں رنگ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے... اپنا سوٹ کیس اوپر چڑھا دیا۔" اوما اندھیرے میں بیڈ پر بیٹھی موہن کی نقل و حرکت کو ایک سائے کی طرح دیکھ رہی تھی۔ "یہ میں نے نہیں رکھا تھا... تم پہلے دیکھ لیتے... اور تمہارا نیچے ہے تو میرا ہٹا دو۔"

"اچھا اچھا... کر لوں گا میں جو کرنا ہے... اتنا مت بولو۔"

اسی وقت جیسے بم کا دھماکا ہو گیا۔ موہن کے ہاتھوں پر اوما کے بالوں کا تیل لگ گیا تھا۔ اس لیے ہاتھوں سے سوٹ کیس پھسل گیا... صرف چھ انچ کی اونچائی سے گرنے پر بھی سامسونائٹ کے سوٹ کیس کی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔

"ہے بھگوان..." اوما نے گھبرا کے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "لائٹ جلاؤ..."

"کیا پاگل ہوئی ہو... میرے کپڑے..."

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو... کمبل میں گھس کے سو جاؤ... میں کہہ دوں گا کہ باتھ روم جانے کے لیے اٹھا تھا۔ سوٹ کیس سے ٹکرا گیا۔ کوئی آئے گا ضرور..." موہن نے کہا۔

اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اشرف علی باہر کھڑا تھا۔ "خیر ہے... یہ کیسی آواز تھی؟"

موہن معصوم بن گیا۔ "ہاں جی! اندھیرے میں اٹھا تھا باتھ روم جانے کے لیے... اوما نے سوٹ کیس بیچ میں رکھ دیا تھا۔ ٹھوکر لگ گئی۔" وہ برآمدے میں چل پڑا۔

واپس آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور لائٹ بجھا کے لیٹ گیا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔"

اوما نے کمبل سے سر نکالا۔ "کیا میں نے دھکا دیا تھا تمہیں؟"

"آج تم نے سر میں اتنا تیل کیوں تھوپ لیا تھا چنبیلی کا... سب میرے ہاتھوں میں لگ گیا۔"

وہ ہنسی۔ "دادی نے کہا کہ ان کا خاندانی نسخہ ہے۔ اس سے بال لمبے ہوتے ہیں... انہیں میرے بال بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔" اوما نے کہا۔

"صبح تک دیکھنا، ٹخنوں تک پہنچ چکے ہوں گے۔" وہ جل کے بولا۔ "آخر خود ان کے سر پر پودینے کی گڈی ہے۔ دادی کی چہیتی۔"

"ان کی عمر بھی تو دیکھو... اچھا، اب خون مت جلاؤ... سو جاؤ... کل دیکھ لینا مدفون خزانہ۔"

"صبح ہونے میں دیر ہے... میں کچھ دیر دیکھوں گا... ایک دن تمہارے طلسمی ہیئر آئل کی خاطر ضائع نہیں کر سکتا۔"

"وہ سب نماز کے لیے اٹھتے ہیں صبح صبح۔"

"مجھے پتا ہے... انہیں اس عمر میں نیند ہی کہاں آتی ہوگی۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ پھر اٹھا۔ قفل کھولنے کے لیے اس نے اپنے کی چین کی ننھی سی لائٹ استعمال کی جس کا دائرہ ایک انچ قطر میں نمبروں پر پڑ رہا تھا۔ کوئی آہٹ کیے بغیر اس نے ڈھکنا اٹھایا... اس کے ہاتھ تاریکی میں بھی صحیح جگہ کو ٹٹول رہے تھے... کپڑوں کی تہ کے درمیان سے اس نے دو آٹھ انچ لمبی ٹارچ جیسی چیز نکالی۔

یہ ایک خصوصی میٹل ڈیٹیکٹر اور اسکینر تھا جو موہن نے سائنسی تحقیق کے آلات امپورٹ کرنے والی ایک کمپنی سے

www.pkdigest.com

جعلی لیٹر ہیڈ پر منگوایا تھا... کمپنی نے اسے یہ آلہ جرمنی سے منگوا کے دیا تھا۔ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی اور موہن کو ڈالرز میں ادا کرنا پڑی تھی... اس کے لیے ڈالر بھی اس نے بلیک مارکیٹ سے خریدے تھے لیکن یہ چھوٹا سا آلہ بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا تھا۔

موہن نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے ہیں۔ اوما بستر پر سیدھی بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ ان کی قسمت کا فیصلہ کن لمحہ تھا... چند منٹ میں انہیں معلوم ہونے والا تھا کہ انہوں نے جو رسک لیا اور جو محنت کی، وہ بے مقصد نہیں تھی۔

یہ آلہ ماہرین ارضیات زیر زمین معدنیات کا سراغ لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ جہاز سے اور مصنوعی سیارے سے جائزہ لینے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ زمین کے نیچے کہاں لوہا ہے، کہاں سونا یا تیل... تاہم وہ انتہائی جدید آلات نہ عام دستیاب ہیں نہ کوئی خرید سکتا ہے... عام قسم کے آلات سیکیورٹی کے مقاصد میں استعمال ہو رہے ہیں اور کہیں پوشیدہ دھات کی کسی بھی چیز کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔

موہن لال نے جو خصوصی آلہ منگوایا تھا، وہ ٹھوس چیزوں اور زمین کی کچھ گہرائی تک کسی بھی قسم کی دھات کا سراغ لگانے میں معاون تھا۔ اس سے خارج ہونے والی شعاعیں روشنی نہیں کرتی تھیں، یعنی وہ نظر نہیں آتی تھیں۔ جیسے کہ ایکسرے... یا سیکیورٹی کیمروں کی انفرا ریڈ شعاعیں۔

وہ فرش پر گھٹنے کے بل جھک کر اس آلے کو آہستہ آہستہ آگے بڑھاتا گیا۔ آلے کا ٹارچ جیسا حصہ سیمنٹ کے فرش سے ایک انچ اوپر تھا۔ اس کے چپٹے حصے میں اوپر ڈیڑھ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی اسکرین تھی جس کی تصویر کو فوکس کر کے دیکھا جا سکتا تھا... چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا تھا۔

کمرے میں ایک اعصاب شکن سکوت تھا۔ وہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے سیدھے خط میں اس آلے کو فرش پر پھیرتا رہا... اگر نیچے ایک لوہے کی کیل بھی ہوتی تو آلہ بیپ دیتا... غالباً سیمنٹ کا سخت فرش اس کی شعاعوں کو پوری طرح گزرنے نہیں دے رہا تھا۔

موہن پیٹ کے بل مسہری کے نیچے گھس گیا... اور اسی وقت اچانک آلے نے ہلکی بیپ دی۔ ایک ساتھ موہن اور اوما کے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی... اوما نے اوپر سے سر جھکا کے نیچے دیکھا جہاں فرش پر اس کے شوہر کا الٹا پڑا ہوا نچلا نصف دھڑ دکھائی دے رہا تھا۔

''موہن... کچھ ہے؟'' وہ اور آگے جھک کے لٹک گئی۔

موہن نے آلے کو آگے بڑھایا۔ اس نے دوسری بیپ دی۔ پھر تیسری... یہ مسہری کے نیچے تقریباً درمیان کا حصہ تھا۔ اوما بھی فرش پر اتر آئی۔

''اوما... مبارک ہو۔'' موہن چلایا۔

''کیا؟... مجھے بھی دکھاؤ۔'' اوما نے بے چینی سے کہا اور شوہر کے ساتھ نیچے رینگ گئی۔

موہن نے عکس کو فوکس کیا۔ ''سب کچھ ہے اوما... سارا زیور ہے... اسی حالت میں...''

اوما نے اس کی طرف جھک کے دیکھا۔ مکمل اندھیرے میں ایک چھوٹی سی تصویر روشن نظر آ رہی تھی۔ ''کیا ہے... کتنا ہے؟''

موہن نے عکس اس کے سامنے کیا۔ ''یہ دیکھو... دیکھتی جاؤ۔''

سونے کے گلوبند... کڑے... پازیب... جھمکے اور بالیاں... ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اتنی صاف کہ ان کے ڈیزائن بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ خوشی سے اوما کا دل سینے میں قلابازیاں کھانے لگا۔

''ہم دولت مند ہو گئے اوما۔'' اس نے فرطِ جذبات میں اوما کو لپٹا لیا۔

اوما ہنس رہی تھی اور رو رہی تھی۔ ''یہ کتنی مالیت کا ہو گا؟''

''ہم نے حساب لگایا تھا... چوبیس قیراط کا ہوا تو سمجھو ایک کروڑ... کم سے کم بھی اسی لاکھ۔''

اوما مدفون خزانے کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ ''یہ کتنی گہرائی پر ہو گا... کیسے نکالیں گے ہم اسے؟''

''نکال لیں گے... جب یہاں تک آ گئے ہیں... تم فکر مت کرو... میرا پلان کامیاب ہو گیا ہے۔'' موہن خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

''ہم لے کر کیسے جائیں گے؟''

''سب ہو جائے گا... تم دیکھتی جاؤ۔''

صبح تک وہ ساتھ ساتھ لیٹے ایک کروڑ کے بارے میں سوچتے رہے۔ انہوں نے کئی پلان بنائے... سب قابل عمل نہیں تھے... وہ پلان بدلتے گئے... اب وقت آ گیا تھا اپنے سارے خوابوں کو تعبیر دینے کا... خیال کو حقیقت میں بدلنے کا... تدبیر سے تقدیر بنانے کا...

''تھینک یو دادا جی... یو آر گریٹ!''

☆☆☆

موہن نے غلام علی کو چھت پر پتنگ اڑاتے دیکھا... اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ماہر پتنگ باز تھا... اس کی تین تاوے کی ست رنگی پتنگ بڑی بلندی پر تھی... شام کے سورج کی دھوپ میں اس کے رنگ نکھر آئے تھے... اس کا جوڑ مخالف سمت سے اڑائی جانے والی پتنگ سے پڑ گیا تھا جس کا رنگ گہرا سرخ تھا اور جس کے کناروں پر چاندی جیسی چمکیلی جھالر تھی... یوں لگتا تھا جیسے کسی نے دلہن کے سر سے اوڑھنی لے کر ہوا میں اڑا دی ہو۔

موہن اوپر دیکھنے لگا۔ ''تم تو کمال کے گڈی باز ہو۔''

غلام علی مسکرایا۔ ''ابھی دیکھنا اس لال چڑیا کو کیسے کاٹتا ہوں۔''

موہن نے محسوس کیا کہ غلام علی کی نظر آسمان سے زمین کی طرف ایک ہی سمت میں جا کے ٹھہر رہی ہے... پتنگ بازی کے کھیل کی سنسنی خیزی آنکھوں کے میل کے بغیر مکمل نہیں ہوتی... ہر جگہ یہی ہوتا ہے... اوپر پیچ لڑتے ہیں، نیچے نظریں لڑتی ہیں... موہن نے دس کوٹھے چھوڑ کے ایک جگہ چھت پر زرد دوپٹے کو دائرے میں لہراتا دیکھا۔

''مان گئے استاد... تمہاری نظر کو...''

غلام علی چونکا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میں پتنگ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' موہن لال ہنسا۔

''بوکاٹا...'' غلام علی نے نعرہ مارا اور پھر منہ میں انگلی ڈال کے سیٹیاں بجانے لگا۔ موہن نے لال چڑیا کو ہوا میں ڈولتا دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بلندی سے گرنے لگی تھی۔ دس کوٹھے دور زرد دوپٹا ہی نہیں، وہ بھی گھوم رہی تھی جس کا دوپٹا تھا... موہن کو یاد آیا کہ چند روز میں بسنت ہو گی۔

''آپ کو بھی کچھ شوق ہے جی؟'' غلام علی چرخی پر ڈور لپیٹنے لگا۔

''کیوں یار... ہم کیا بوڑھے ہو گئے ہیں یا ہمارا دل نہیں ہے؟ گڈی اڑانے کا تو بس بہانہ ہوتا ہے... کوٹھے پر آنے اور بلانے کا۔'' وہ منڈیر پر بیٹھ گیا۔

غلام علی اس کے ساتھ پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ''شادی ایسے ہی کی تھی؟''

موہن لال نے زرد دوپٹے والی کی طرف دیکھا۔ ''چھوڑو یار! آدمی جس سے پتنگ لڑائے... آنکھیں لڑائے یا عشق لڑائے، اس سے شادی بھی کرے... میں آیا تھا تم سے کچھ اور بات کرنے۔''

''بولو جناب... ایسی کیا بات ہے؟''

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جون 2010ء ہر بک اسٹال پر موجود ہے

آبلہ پا

اس مشہور شخصیت کا احوال جس نے برطانوی حکومت کو لرزا دیا تھا۔ وہاں کی ملکہ اور حکومت اس مسلمان شخص کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنا چاہتی تھی

گمشدہ کڑی

اس کو ارض پر انسان نامی مخلوق کہاں سے آئی، سائنس اور مذہب کے انکشافات عقل دنگ رہ جائے ایک ایسا مضمون

قصہ خوانی بازار

جو صرف بازار نہیں، تاریخ کا دریچہ ہے جس سے غیور پختونوں کا ماضی جھانکتا ہے، ایک چشم کشا تحریر

سزا

ایک ایسی دلچسپ اور عبرت بھری آپ بیتی جسے پڑھ کر آپ بے چین ہو جائیں گے

اور بھی بہت کچھ

شکاریات سنسنی سرگرمی داستان، ہیپنگ کی تلاش۔ معروف گلوکار پٹھانے خان کا سوانح۔ لہو کی گردش تیز کر دینے والی ایک فرار کتھا، دلچسپ و طویل سفرنامے کی آخری کڑی، اور بھی بہت سی دلچسپ و ہوشربا دینے والی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں جن میں سبق کا پہلو ہے

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،

آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

خاص شمارہ ہر شمارہ خاص شمارہ ہر شمارہ خاص شمارہ

www.pkdigest.com

"بہت خاص بات ہے... ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی... کل سے میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک تم ہی اس قابل ہو جس پر بھروسا کیا جائے۔"

غلام علی چوکنا ہو گیا۔ "آپ کا بھروسا غلط نہیں ہوگا... انشاء اللہ۔"

موہن لال کچھ سوچتا رہا۔ یہ ظاہر کرتا رہا جیسے وہ تذبذب کا شکار ہے۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے... کل ہم ادھر کیوں گئے تھے جہاں پرانی حویلی کا باغ تھا؟"

"برا مت ماننا... مجھے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ساٹھ سال بعد ایک تمہارے دل میں پرانی حویلی کی محبت کیسے جاگ اٹھی... پہلے تو کبھی کوئی نہیں آیا... آبائی گھر... کیا کہتے ہو تم اسے؟ جنم بھومی تو یہ سب کی تھی۔"

موہن اسے دیکھتا رہا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی شک ہوتا... کیا کسی اور نے بھی یہی کہا؟"

"نہیں... نہیں، میرا دماغ خراب ہے سمجھ لو۔"

"خراب نہیں... بالکل ٹھیک ہے... میرے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اور کسی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو میری ساری محنت اکارت جائے گی... اگر تم میرا ساتھ دو... تو..."

غلام علی نے بے چینی سے پوچھا۔ "تو کیا ہوگا؟"

"تم چاہتے ہو نا کہ تمہاری تقدیر بدل جائے؟ میں بھی چاہتا ہوں... بالکل تمہاری طرح سوچتا ہوں... اور ایسا ہو سکتا ہے، اگر تم میرا ساتھ دو تو۔"

غلام علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "پہلے بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟"

"دیکھو... یہ راز فاش ہو گیا نا تو بڑی خرابی ہوگی... میرا کیا ہے... واپس چلا جاؤں گا... صبر کر لوں گا کہ جو میری تقدیر میں نہیں تھا، وہ مجھے نہیں مل سکتا تھا لیکن تم یقیناً ایک موقع گنوا دو گے۔"

"کیسا موقع؟"

"اپنی تقدیر سنوارنے کا... اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کا۔"

"دیکھو... کھل کے بات کرو۔"

موہن نے ایک گہری سانس لی۔ "او کے... فرض کرو میرے پاس کسی مدفون خزانے کا نقشہ ہے... وہ میں کھود کے نہیں نکال سکتا... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے... خزانہ نکالنے کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں بے ایمانی آجائے... تم مجھے نکال باہر کرو... یہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا... لیکن اس صورت میں جھگڑا ضرور ہوگا اور جو راز میرے تمہارے درمیان ہے... راز نہیں رہے گا... میں تو بیچ میں سے نکل جاؤں گا لیکن اور درجنوں لوگ آجائیں گے... معاملہ پھر تمہارے ہاتھ سے نکل کے تمہارے بڑوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا... جو تیرہ اور سترہ تا... ان کی اولادیں... بہوئیں... پوتے، نواسے... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پہلے وہ کیا تھے... ان چار بھائیوں نے کیسے رائے بہادر چمن لال کی حویلی پر قبضہ کیا تھا... آج وہ میرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم نے حویلی خریدی تھی... کہنے دو... مجھے کیا فرق پڑتا ہے... آج ان کے بال چٹے ہو گئے ہیں اس لیے شاید دولت سب میں انصاف اور ایمان داری سے تقسیم کر دیں... لیکن مائی ڈیئر غلام علی... اگر ایسا ہوا... تو تمہیں کیا ملے گا؟ تمہارا حصہ کیا ہو گا؟"

غلام علی اسے خاموشی سے تکتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

موہن لال نے بات آگے بڑھائی۔ "میرے ساتھ تمہارا حصہ آدھا ہوگا اور یہ آدھا میرے اندازے کے مطابق پچاس سے چالیس لاکھ کے درمیان ہوگا۔"

غلام علی کا منہ کھل گیا۔ "چالیس... لاکھ؟"

"ہاں... [illegible] لیکن یہی رقم چالیس وارثوں میں بانٹ دی جائے تو تمہیں [illegible] لاکھ... مجھے محض مایوسی اور ذلت۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا... پھر غلام علی نے کہا۔ "کیا گارنٹی ہے تمہارے پاس؟"

"گارنٹی ہے... جی... میں پاگل نہیں ہوں کہ اتنا بڑا خطرہ مول لے کر دشمن ملک میں آیا ہوں... ایسے خطرناک حالات میں... کوئی بھی مجھے شہید کر سکتا ہے۔ میں غلط کہہ گیا... شہید ہوتے ہیں مسلمان... کافر جہنم رسید ہوتے ہیں۔"

"میں تمہارا ساتھ دوں گا... نقشہ کہاں ہے؟"

"نقشہ میرے پاس محفوظ ہے... لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے ورنہ خواہ مخواہ کسی کو شک ہوگا... گھر میں ہم بات بھی نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے... ہم باہر چلتے ہیں... چار پانچ میل دور دریا ہے... وہاں تازہ مچھلی ملتی ہے... تم کھاتے ہو نا؟"

"میں سب کھاتا ہوں۔" موہن لال نے کہا۔

دریا تک وہ موٹر سائیکل پر گئے۔ وہاں ایک کچی دیواروں اور ٹین کی چھت والی دکان میں ایک بوڑھا تازہ مچھلی تل رہا تھا۔ کنارے پر پلاسٹک کی میزیں کرسیاں لگی

ہوئی تھیں۔ موہن لال نے ایک بہت پرانی کتاب سے پیلا پڑ جانے والا سادہ صفحہ پھاڑ کے لال سیاہی سے ایک نقشہ بنایا تھا... اس پر حویلی کے مہمان خانے اور باغ کی نشان دہی مخصوص تیروں اور دائروں سے کی گئی تھی... جہاں درخت تھے، وہاں تیر تھا جو سیدھا کھڑا تھا... دائروں پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے چاروں کونے واضح تھے اور ہر سمت لکھی تھی... مشرق، مغرب، شمال، جنوب... ایک جگہ بڑا سا سرخ گول دائرہ تھا... اس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "چھ فٹ گہرائی میں پکی قبر ہے... اس میں چار سو تولے یعنی پورا پانچ سیر سونا چوبیس قیراط آج چودہ جولائی 1947ء کو دفن کیا گیا... راقم چمن لال۔"

غلام علی نظر جمائے اس نقشے کو دیکھتا رہا جیسے اسے سمجھنے یا اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کر رہا ہو... حالانکہ یہ اس کی عقل کے اختیار میں نہ تھا پھر اس نے کہا۔ "تمہیں اس پر اعتبار ہے؟"

موہن لال مذاق اڑانے کے انداز میں مسکرایا۔ "یار! میں نے اپنی بیوی کے ساتھ دہلی سے یہاں تک کا سفر کیا... کسی یقین کے بغیر کیا ہوگا؟"

"یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟"

"ہاں... یہ بہت معقول سوال ہے... اس صدمے نے دادا جی کو پاگل کر دیا تھا... ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ انہیں سب اچانک چھوڑ کے بھاگنا پڑے گا... بعد میں ان کے خاندان نے بہت سختی جھیلی... سب سے پہلے ساتھ چھوڑنے والی دادی تھیں... سچ پوچھو تو اسی صدمے نے دادا کو ہوش سے بیگانہ کیا... یہ ایسا راز تھا جو ان کے علاوہ صرف دادی کو معلوم تھا... وہ سورگ سدھار گئیں اور دادا کا دماغ الٹ گیا... وہ دیوانگی کے عالم میں ہی دنیا سے گئے... سب کا خیال یہی تھا کہ سارا زیور پیچھے رہ گیا اور لٹ گیا ہوگا... ان کا کچھ ذاتی اسباب تھا جو ایک صندوق میں بند پڑا رہا... اس میں ایک گیتا تھی جس کا وہ پاٹھ کرتے تھے... یہ اسی کا صفحہ ہے... میری ماتا جی کو ہمیشہ یہ شک تھا کہ بڑے میاں نے اپنی ساری دولت کہیں گاڑ دی تھی... ان کا شک روپے پیسے پر تھا... ظاہر ہے، نوٹ ہوتے تو اب صرف کاغذ کے پرزوں سے زیادہ کچھ نہ ہوتے... ایک دن میں نے وہ پرانا بکس کھول کے دیکھا جس کو کسی نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس میں ان کا اور دادی کا شادی کا جوڑا تھا... گنگا جل کے دو ڈبے تھے... ہم جب یہاں رہتے تھے، گنگا جل اسی طرح منگوا کے رکھا جاتا تھا۔"

"جیسے ہم آپ زم زم رکھتے ہیں۔" غلام علی نے سر ہلایا۔

"کریا کرم کے وقت اُن کی ارتھی پر چھڑکے جانے کے لیے... یہ کسے معلوم تھا کہ آخری رسوم گنگا کے کنارے پر ہی ہوں گی... اشنان وہیں ہوگا اور ان کی راکھ وہیں گنگا میں بہا دی جائے گی... دادی کی رامائن تھی اور ایسی ہی کچھ چیزیں جن کا کسی کے نزدیک کوئی مصرف نہ تھا... جب میں نے یہ نقشہ دیکھا تو پھاڑ کے الگ کر لیا... پھر میں نے پتا جی سے کچھ ٹن گن لی... انہوں نے ماتا جی کے شک کو بے بنیاد نہیں کہا... یہ کہا کہ پتا جی اپنی دولت کو کہیں محفوظ تو کرنا چاہتے تھے مگر ایک دم بھاگنا پڑا... ویسے وہ بہت دور اندیش تھے اور کوئی کام ٹالتے نہیں تھے... بس اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نقشہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

وہ کچھ دیر چپ چاپ مچھلی کھاتے رہے... موہن لال اس کی صورت کے تاثرات سے سمجھ گیا کہ مچھلی جال میں پھنس چکی ہے... بالآخر غلام علی نے کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو مجھ سے... مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"اس نقشے کے مطابق زمین کھودو اور سونا نکال لو... ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے... میں نے وہ جگہ دیکھ لی ہے... اگر تم

فقیری اندازے

بعض فقیر تو اپنے "سخی" کو اپنے غلط اندازے کی وجہ سے ناراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ لبرٹی مارکیٹ میں فقیروں کی فوج کے ایک "رنگروٹ" نے کار میں بیٹھی ایک خوب صورت خاتون سے امداد کے لیے کہا تو اس مردم بیزار قسم کی خاتون نے سختی سے کہا۔ "بابا معاف کرو۔" اس پر اس نے ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھے کالے بجنگ سے شخص کو مخاطب کیا اور کہا۔ "بھاء ڈرائیور تم ہی اپنے اس غریب بھائی کی کچھ مدد کرو۔" اور بھاء ڈرائیور اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا کیونکہ وہ ڈرائیور نہیں اس حسینہ کا شوہر تھا، تب اس فقیر پہ کھلا کہ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی حسینہ اتنی مردم بیزار کیوں تھی؟

ایک اسی طرح کے نالائق فقیر کی تو پٹائی بھی ہو گئی تھی جس نے ایک بزرگ کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی کو دیکھ کر دعا دی۔ "اللہ تمہاری بیٹی کے ہاتھ پیلے کرے۔" جبکہ یہ باپ بیٹی نہیں، میاں بیوی تھے، کئی دفعہ اس طرح کے ناتجربہ کار فقیر بہن بھائی کو یہ دعا دے بیٹھتے ہیں۔ "اللہ جوڑیاں سلامت رکھے۔" اور پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں!

ولید بلال کی [illegible] کی کتاب "ہنسنا منع ہے" سے اقتباس

www.pkdigest.com

رات کے وقت کھدائی کرو تو کسی کو پتا نہیں چلے گا... وہ جگہ سنسان پڑی ہے... نہ کوئی تمہیں دیکھے گا... نہ تمہاری آواز سنے گا۔"

"ایک بات بتاؤ... تم یہ سونا واپس بھارت کیسے لے جاؤ گے؟"

"وہ میرا کام ہے... میں نے سب سوچ لیا ہے... میں نے بڑے کشٹ اٹھائے ہیں... تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا... زیادہ سے زیادہ دو راتوں کا کام ہوگا۔"

اچانک غلام علی نے ہاتھ ملایا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"تم یہ کام آج ہی کرو گے... میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا... مگر یہ مت سمجھنا کہ میرے قیام کی پوری مدت تم اس کام کو ٹال دو گے... میرا ویزا ایک مہینے کا ہے... اسے میں بڑھوا بھی سکتا ہوں... ضروری یہ بھی نہیں کہ میں یہاں رہوں... اگر مجھے شک ہوا کہ تم مجھے ٹالنا چاہتے ہو۔"

"تمہیں ٹالنے سے مجھے کیا ملے گا؟"

"پورا حصہ... لیکن ایسا نہیں ہوگا... مجھے واپس جانا پڑا تو میں یہاں کسی وکیل کے ذریعے کورٹ میں اپنا کلیم داخل کر جاؤں گا... میں جانتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا... لیکن تمہیں بھی کچھ نہیں ملے گا... سب حرام خور حکام ہضم کر جائیں گے یا سرکار کی تحویل میں چلا جائے گا۔"

"میں صرف تین دن میں مال برآمد کرلوں گا... تم کہو تو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف بھی اٹھا سکتا ہوں کہ میرے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں۔"

"حلف اٹھانے کی ضرورت نہیں... بے ایمانی کرو گے تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے۔"

موہن لال نے ایسی ہی ایک کہانی عبدالرشید کو بھی سنائی لیکن اسے ایک عمل کے چکر میں ڈال دیا جو اسے تین راتوں تک چاند نکلنے کے بعد اکیلے میں چھت پر پڑھنا تھا۔ یہ دبے ہوئے خزانے کا سراغ لگانے کا عمل تھا... جانے سے پہلے مالکوں نے کہیں دولت چھپائی ہوگی تو اسے یوں نظر آنے لگے گی جیسے کسی ڈاکٹر کو ایکسرے سے ٹی بی کی بیماری نظر آتی ہے۔

"تم سمجھتے ہو حویلی میں کہیں دولت ہوگی؟"

"ہونی تو چاہیے۔" موہن لال نے کہا۔ "جو ہندو سیٹھ یہاں سے بھاگے تھے، وہ اپنی دولت کہیں گاڑ گئے تھے کہ کبھی واپس آکے نکال لیں گے... میرے باپ دادا بھی تن کے دو کپڑوں میں گئے تھے۔"

"تم اسی کے چکر میں تو نہیں ہو؟"

موہن لال ہنسا۔ "اس کا پتا چل جائے... تب بھی وہ میرے لیے بے کار ہے... میں اسے بھارت تو نہیں لے جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے... میں آج ہی رات عمل شروع کردوں گا... ایک ہفتے بعد تو چاند کی آخری تاریخیں شروع ہو جائیں گی۔"

دراصل یہی دو نوجوان تھے جن کے کمرے آگے پیچھے تھے... ایک طرف وہ سوتے تھے... دوسری طرف چار بچے... خطرہ انہی سے تھا۔

ابھی سردیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ رات کو سب اپنے کمروں کے دروازے بند کر کے اور لحاف اوڑھ کے سوتے تھے۔ عورتوں، بچوں کی نیند سے موہن لال کو خطرہ نہیں تھا۔ معمولی شور سے ان کے جاگنے کا احتمال نہیں تھا۔ عورتیں دن بھر کے کام کاج کے بعد تھکن سے بے حال ہوتی تھیں۔ مرد بھی صبح کے گئے رات کو لوٹتے تھے۔ اصل فکرمندی زیادہ عمر کے لوگوں کی طرف سے تھی جو دن بھر کچھ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ رات بھر کروٹیں بدلتے تھے۔ اس عمر میں ان کی نیند کم ہوگئی تھی اور وہ تنہا ایک آرزو ہوگئی تھی جسے ... [illegible] ... جاتا ہے۔

موہن لال نے کچھ بزرگوں کا انتخاب کیا۔ قسمت یقیناً اس کی مدد کر رہی تھی ورنہ وہ اتنے مرحلے بھی طے نہ کر پاتا... ابھی تک اس کا پلان کامیاب جا رہا تھا۔ چوتھے دن شام کے وقت وہ صحن میں بڑے چھوٹے نانا کی بکواس بڑی سعادت مندی سے سن رہا تھا اور دونوں بوڑھے خوش تھے کیونکہ ان کی اپنی اولادیں ان سے بھاگتی تھیں... سب مصروف تھے اور ان کے پاس بیٹھنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا... وہ اس کو پرانے واقعات سنا رہے تھے... یہ سمجھتے ہوئے کہ اسے اپنے ماضی سے بڑی عقیدت ہے۔

اچانک اشرف علی نے کہا۔ "پتر موہن... ہم نے کئی بار تیرے دادا سے حویلی خریدنے کا ذکر کیا... تو نے ایک بار بھی اعتراض نہیں کیا؟"

"اعتراض کیسا نانا جی! خریدی ہوگی آپ نے۔"

"یہاں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قبضہ کیا تھا۔" اشرف علی بولا۔

"مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا۔"

"کیونکہ تو لوگوں سے نہیں ملا... اب وہ زمانہ نہیں رہا

جب ہمارا سارے علاقے پر زور چلتا تھا... ہم چار بھائی بڑے طاقتور تھے... ہمارے مقابلے پر آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی... چھوٹے موٹے جھگڑے نمٹانے کے لیے لوگ بھی آتے تھے اور خود پولیس ہم سے کہتی تھی... لین دین کے جھگڑے ہم مکا دیتے تھے۔"

بشیر علی نے وضاحت کی۔ "ایک بار مولوی صاحب روتے ہوئے آئے کہ بندہ شراب پی کے میری بیٹی سے کہتا ہے تو بھی پی... وہ نمازی پرہیزگار... اسے مارتا ہے... کئی بار گھر سے نکالا... اب طلاق کی دھمکی دے رہا ہے... اصل بات یہ تھی کہ وہ ناجائز کام پر راضی نہیں ہوتی تھی... ہم نے سب ٹھیک کر دیا۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے پتر... طاقت کا بھی ناجائز استعمال ہم نے کبھی نہیں کیا تھا... بدمعاشی کے بھی اصول ہوتے تھے پہلے... رائے بہادر چمن لال بھی ضرورت پڑنے پر ہمیں بلاتا تھا... اس کے دشمن بہت تھے... جب یہ خون خرابا شروع ہوا تو وہ بہت پریشان تھا... ہم نے بڑی تسلی دی کہ ہمارے ہوتے کس کی مجال ہے کہ حویلی میں گھسے... لیکن وہ ڈرا ہوا تھا... آخر میں اس نے کہا کہ اشرف علی... مجھے لگتا ہے کہ یہاں گزارہ نہیں ہوگا... مجھے جانا ہی پڑے گا... تم میری ... [illegible] ... کوئی نہیں ملتا تھا... سب ایسے ہی قبضے کرنے کو تیار بیٹھے تھے... پھر بھی ہم نے کوشش کی... کوڑیوں کے مول گئی زمین... بڑی اچھی نہری زمین تھی اور بہت زرخیز... دس ہزار ایکڑ کے ہزار دینے والے بھی کہتے تھے کہ چمن لال چلا گیا تو کیا ہوگا... انتقالِ اراضی کا سارا کام بند تھا... ہم نے پکی رسید لکھوا کے دی اور خود گواہ بنے... باقی پر ڈپٹی کمشنر نے بعد میں قبضہ کیا... اس سے کون قیمت مانگتا؟ لیکن چمن لال انگریز کمشنر کے پاس گیا... پھر گورنر کے پاس... اس کی رائے بہادری کی سند کام آئی اور سنا ہے گورنر نے سودا کرا دیا تھا... کتنی رقم ملی تھی... یہ مجھے نہیں معلوم۔"

بشیر علی کی بات پھر اشرف علی نے اچک لی۔ "آخر میں رہ گئی تھی حویلی... وہ ہم نے خریدی... بے شک سودا غیرقانونی تھا اور چمن لال نے مجبوری میں کیا... اسے قیمت بھی بہت کم ملی... لیکن ہماری کوشش سے اس کو جتنی رقم ملی... اس کا چمن لال نے سونا خرید لیا... ہمارے مشورے سے۔"

موہن لال کے دل نے سینے میں ایک قلابازی کھائی۔ "کیا سونا خریدا؟"

بے خبر

ایک اجاڑ اور ٹوٹی پھوٹی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک صاحب نے ایک زرد رو راہ گیر سے پوچھا۔ "سنا ہے اس کھنڈر نما عمارت میں مدتوں سے بدروحیں رہتی ہیں۔"

زرد رو شخص بے زاری سے بولا۔ "پتا نہیں، آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔ مجھے تو مرے ہوئے صرف تین سال ہوئے ہیں۔"

گواہی

"جو الفاظ مدعا علیہ نے کہے تھے، ذرا وہ تو دہراؤ!" وکیل نے گواہ سے کہا۔

"جناب! وہ الفاظ ایسے نہیں ہیں جو کسی شریف آدمی کے سامنے دہرائے جا سکیں۔" گواہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے تو پھر وہ الفاظ جج صاحب کے کان میں کہہ دو۔" وکیل نے بلاتوقف اسے ہدایت کی۔

"ہاں پتر! ہم نے کہا کہ نوٹ تو کاغذ ہوتے ہیں... کیا پتا ادھر چلیں نہ چلیں... جو ادھر سے جا رہے تھے سب سونا ہی لے جاتے تھے۔"

موہن نے پوچھا۔ "انہیں راستے میں لٹ جانے کا ڈر نہیں ہوتا تھا؟"

"سونا کیا... راستے میں جان چلی جاتی تھی... گھر کی عورتیں اٹھالی جاتی تھیں... پھر بھی لوگ گئے... سونا ملتا نہیں تھا... یا سنار مہنگا دیتے تھے... ہم نے یہ کیا کہ سونا خود خریدا... ایک تو سنار ہمیں جانتا تھا پھر ہم نے کہا کہ سونا بیٹی کی شادی کے لیے چاہیے... چمن لال کو آخر یہ سو تولے سونا زیادہ مل گیا۔"

موہن لال نے بڑا دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ "اپنے ساتھ دادا جی کتنا سونا لے گئے تھے؟"

بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف دیکھا۔ "کچھ پتا نہیں... گھر کی عورتوں کا بھی کافی زیور تھا... میرا خیال ہے سیروں سونا ہوگا۔"

موہن نے حیرت سے سن رہ جانے کی اداکاری کی۔ "سیروں؟"

"ہاں... یہ سب اس لیے بتا رہے ہیں پتر موہن لال... کہ تیرے دل میں کوئی شک نہ رہے... ہم نے واقعی یہ حویلی خریدی تھی... بے شک سستی لی لیکن مفت نہیں لی تھی... قبضہ نہیں کیا تھا اس پر حالانکہ کر سکتے تھے۔"

موہن لال بولا۔ "پھر وہ سونا کہاں گیا؟"

www.pkdigest.com

''کہاں گیا؟ چمن لال ساتھ لے گیا ہوگا... اسی لیے خریدا تھا۔''

''ان کو اچانک بھاگنا پڑا تھا؟''

''اتنا اچانک بھی نہیں... وہ دن میں چلا گیا تھا... کچھ لوگوں نے رات کو حملہ کر کے حویلی لوٹنے کی اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی... لیکن ہم نے سب کو بھگا دیا... تیرے دادا کی ایک شکاری بندوق تھی... وہ خود شکار نہیں کرتا تھا... شکار کھیلنے اس کے پاس بڑے لوگ آتے تھے... ہم نے اسی بندوق سے دو فائر کیے... وہ ڈبل بیرل بارہ بور کی ولایتی رائفل تھی... اس کی آواز کسی بم کے دھماکے جیسی ہوتی تھی... سارے حملہ آور ایسے بھاگے...''

''لیکن نانا جی! ان کے پاس کچھ نہیں تھا... جب وہ دہلی پہنچے۔''

اشرف علی نے کہا۔ ''کسی نے چھین لیا ہوگا راستے میں۔''

''ایسا ہوتا تو بتاتی جاتے... دادی نے بھی نہیں بتایا۔''

''پھر ہم کیا بتائیں پتر! اس نے بیچ دیا ہوگا وہ بھی۔''

موہن لال نے مزید بحث نہیں کی۔ یہ تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ سارا سونا کہاں محفوظ پڑا ہے۔ بس اس معاملے میں چمن لال نے اپنے محافظوں پر اعتبار کیا تھا اور نہ اپنی بیوی پر... خوابوں کے سچ ہونے پر اس کا بھی اعتبار نہ تھا... پھر وہ خواب میں ایک ایسے شخص کی بات مان کے کیوں اس موت کے سفر پر نکل کھڑا ہوا جو مرتے وقت پاگل ہو چکا تھا... کیا خود اس نے پاگل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا؟

دراصل بات صرف خواب پر یقین کرنے کی نہیں تھی... موہن لال کی دادی بھی جب مرنے کے قریب تھی تو ایک بار اس نے موہن کی ماں سے اکیلے میں کہا تھا کہ بہو! تجھے ایک راز کی بات بتا رہی ہوں... حویلی کی بنیاد میں سارا خزانہ گڑا ہوا ہے... میرے سوا یہ راز کسی کو معلوم نہیں... چند دن بعد وہ مر گئی۔ بعد میں بہو نے اس بات کا ذکر اپنے شوہر روشن لال سے کیا تو اس نے اہمیت نہیں دی۔ آخری وقت میں حواس جواب دے جاتے ہیں اور آدمی ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے... مزید یہ کہ تصدیق یا تردید صرف چمن لال کر سکتا تھا جو بالکل ہی پاگل ہو چکا تھا اور پاگل خانے میں تھا۔

ساس بہو میں بنی کبھی نہ تھی... ایک کہتی دن ہے تو دوسری رات کہتی لیکن نہ جانے کیوں موہن کی ماں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بڑھیا نے مرتے وقت ڈراما نہیں کیا تھا۔ اس نے کمرے سے سب کو نکال کے بہو کو راز کی بات بتائی تھی تو اس کے دماغ میں کچھ تھا۔ اس نے شوہر سے کہا بھی کہ آخر تمہارا باپ خالی ہاتھ کیوں آیا؟ اتنا زیور تھا تمہاری ماں کا وہ کدھر گیا... کیا پتا اس نے کہیں گاڑ دیا ہو... روشن لال نے اسے ہمیشہ جھڑک دیا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہم کس حال میں جان بچا کے نکلے تھے؟ ایک بار موہن نے ان کی باتیں سنی تھیں... اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا... ماں پتا نہیں کس کا حوالہ دے رہی تھی کہ وہ ساری دولت آنگن میں گاڑ آئے تھے... چمن لال نے بھی ایسا نہ کیا ہو؟ اس پر شوہر نے بیوی کے ایک جھانپڑ رسید کیا تھا اور کہا تھا کہ تو جانے نکال لے... میرا دماغ خراب مت کر... وہ اس وقت بھی کھاتے کھول کے بیٹھا ہوا تھا اور دکان کا حساب کر رہا تھا۔

موہن نے سب سنا تھا اور پھر باپ کے غصے کے ڈر سے رضائی میں منہ چھپا لیا تھا۔ خواب میں دادا نے گڑے ہوئے سونے کی بات کی تو اسے تمام پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ سوچتا رہا اور اس کی چھٹی حس نے کہا یا لاشعور میں دبی ہوئی خواہش نے کہ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا... یہ ہوا میں چلایا ہوا تیر تھا جو نشانے پر جا بیٹھا تھا۔

اس رات عبدالرشید نے موہن کو اکیلے میں روک لیا۔ ''بھائی جی! آپ نے سونے کے بارے میں کوئی بات کی تھی۔''

موہن لال نے سوچ کے کہا۔ ''وہ تمہارے بس کی بات نہیں۔''

''میں سب کر سکتا ہوں۔''

''کچھ چیزیں ہر جگہ نہیں ہوتیں... میں تمہیں لکھ دوں گا... کیا یہاں کوئی پرانا قبرستان ہے... کوئی سو دو سو سال پرانا؟''

موہن کو معلوم تھا کہ پرانی دھنسی ہوئی قبروں میں رات کے وقت روشنی سی نظر آتی ہے۔ یہ ہڈیوں کا فاسفورس ہوتا ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے لیکن یہ بات عبدالرشید نہیں جانتا تھا... وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''یہاں تو نہیں مگر کچھ فاصلے پر ہے۔''

''کیا تم نے کبھی کسی پرانی قبر میں جھانکا ہے... رات کے وقت؟''

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ''میں دن میں ادھر سے نہیں گزرتا۔''

''پھر تم یہ کام کیسے کرو گے... تمہیں کسی قبر کی مٹی لانی ہے جو سو سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی ہو... اگر تم اندھیری

www.pkdigest.com

رات میں دیکھو تو اس کے اندر ایک چمک دکھائی دے گی... یہ سونا ہوتا ہے۔"

"مٹی میں سونا؟" رشید دم بخود رہ گیا۔

"ہاں... یہ محاورہ ایسے ہی نہیں بنا... سو سال بعد قبر کی مٹی میں ایسے کیمیائی اجزا بننے لگتے ہیں... جن کی مدد سے سونا بنایا جا سکتا ہے... جس مٹی میں زیادہ چمک ہوگی، اس میں یہ اجزا بھی زیادہ ہوں گے اور اس سے سونا بنانے کے عمل میں کامیابی کا تناسب بڑھ جائے گا... کسی بھی دھات سے۔"

"آپ فکر مت کرو... میں مٹی لاؤں گا۔"

"کیسے لاؤ گے... تم تو ڈرتے ہو قبرستان جاتے ہوئے... حالانکہ ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

"اگر... میں اپنے ساتھ کسی کو لے جاؤں... اپنے کزن کو...؟"

"لے جاؤ... ایک چھوڑ دو کو لے جاؤ... مگر انہیں بتاؤ گے کیا؟"

"ان کو پتا ہے کہ میں سونا بنانا چاہتا ہوں... لالچ ان کو بھی ہے... اسی لیے وہ سٹہ کھیلتے ہیں مگر ہار جاتے ہیں۔"

اپنی طرف سے موہن لال ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھا رہا تھا اور پکا کام کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کو اطمینان نہیں تھا... خوف کی ایک لہر سی تھی جو اسے بے چین رکھتی تھی کہ کہیں عین وقت پر کوئی آ نہ جائے... پھر اوما نے اسے ایک ایسی خبر سنائی کہ اس نے عملاً اوما کا منہ چوم لیا... بار بار...

اس نے موہن کو مطلع کیا۔ "کل رات یہاں قوالی ہے۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ہوتی ہے... رات بھر چلتی ہے۔"

شام کو اس نے اشرف علی سے پوچھا۔ اس نے اپنے پیر صاحب کا نام لیا کہ یہ ان کا حکم تھا... قوال شہر سے آتے ہیں... ایک رات کا نذرانہ پانچ ہزار لیتے ہیں... رات کے کھانے کے بعد قوالی شروع ہوتی ہے... دس گیارہ بجے کے بعد... اور صبح فجر کی اذان پر ختم ہوتی ہے۔

"پھر تو بڑا مزہ آتا ہوگا... لوگ بھی آتے ہوں گے؟"

"ہاں... صحن بھر جاتا ہے... ایک طرف مرد بیٹھتے ہیں... دوسری طرف قنات کے پیچھے عورتیں... میٹھے چاولوں کی دیگیں بنتی ہیں۔ صبح تقسیم ہوتا ہے یہ تبرک۔"

ایک دم موہن لال کو یوں لگا جیسے اس کے سارے مسئلے جن کے لیے وہ اب تک پریشان تھا اور سو چکر چلا رہا تھا... خود بہ خود حل ہو گئے ہیں۔

قوالی کے لیے تیاریاں دوپہر کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ تخت جوڑ کے قوالوں کے لیے اسٹیج گیٹ کی سیدھ میں بنایا گیا تھا۔ اس طرح کہ سامعین سامنے رہیں... تھوڑی تھوڑی کر کے موہن اور اس کی بیوی نے بہت سی کارآمد معلومات اکٹھی کر لیں، مثلاً یہ کہ رات کو قوالوں... کچھ معزز مہمانوں اور گھر والوں کے لیے چائے کے تین دور چلتے ہیں۔ ایک قوالی شروع ہونے سے پہلے... دوسرا درمیانی وقفے میں اور تیسرا قوالی ختم ہونے کے بعد... چائے گھر میں ہی بنائی جاتی ہے۔ بہوئیں چائے تیار کرتی ہیں اور نوجوانوں کے ساتھ بچے سرو کرتے ہیں... گھر کی عورتوں کے علاوہ قوالی سننے کے لیے آنے والی خواتین بہت کم ہوتی ہیں۔

موہن لال کو علم تھا کہ قوالیوں میں کتنا شور شرابا ہوتا ہے... اس کی تو عین خواہش تھی کہ باہر قوال خواب گلا پھاڑیں... طبلے پھاڑیں اور کانوں کے پردے پھاڑیں... اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہوگی کہ گھر کے سارے چھوٹے بڑے اپنے کمروں میں نہیں ہوں گے اور وہ سب موہن لال کے کمرے سے اتنی دور ہوں گے کہ اندر وہ فرش کو ہتھوڑے سے بھی توڑے تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔

اور ایسا ہی ہوا... طے شدہ پروگرام کے مطابق موہن نے بخار اور سر درد کا بہانہ کیا... تھا پھر قوالی سننے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے سوٹ کیس میں سے چھوٹی سی مگر بہت تیز ماربل ٹائل کاٹنے والی مشین نکالی اور اسے پلگ میں لگا کے مسہری کے نیچے گھس گیا۔ اسے بالکل صحیح اندازہ تھا کہ اسے کہاں سے اور کتنی جگہ کو کاٹنا ہوگا... اس کے پاس بلا مداخلت کام کرنے کے لیے کم سے کم آدھا گھنٹا ضرور تھا... اس کے بعد اوما ہی سب سے پہلے اس کی خبر گیری کے لیے آئے گی اور واپس جا کے بیان دے گی کہ وہ گولی کھا کے سو رہے ہیں... ظاہر ہے قوالی سننے کے لیے اٹھنے پر کون مجبور کرے گا؟

موہن نے بڑے اطمینان سے فرش کو ایک لکیر لگا کے کاٹا... وہ ایک فٹ چوڑائی کے ٹائل کاٹ کے ترتیب سے رکھتا گیا۔ دو بار اس نے اسکینر سے چیک کیا... وہ بالکل صحیح جگہ پر فرش کھود رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے دروازے پر دستک سنی جس میں چوڑیوں کی جھنکار بھی شامل تھی لیکن اس نے اندر سے پوچھ کے تصدیق کی کہ وہ اوما ہی ہے۔

اوما نے اپنے پیچھے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ "سب ٹھیک ہے؟"

"اے دن... وہاں کسی نے مجھے پوچھا؟"

"پوچھا تھا... میں نے کہا کہ دیکھ کر آتی ہوں... چائے کا پہلا راؤنڈ چل رہا ہے... دوسرا شاید ایک ڈیڑھ بجے ہوگا۔"

"اپنا کام ہوشیاری سے کرنا۔"

"فکر مت کرو... میں نے چھوٹی بھابی کو ساتھ ملا لیا ہے... ہم دونوں مل کے چائے تیار کریں گے... کسی بڑھیا نے اعتراض کیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں صرف چھوٹی بھابی کا ساتھ دے رہی ہوں... برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی... چھوٹی بھابی اس ڈھکوسلے کی قائل نہیں... اچھا، اب میں جاتی ہوں۔"

موہن لال نے اوپر والا فرش کاٹنے کے بعد نیچے کے پتھر نکالنے شروع کیے... اس کے لیے ایک فٹ قطر کا گڑھا کافی تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق زیورات زیادہ گہرائی میں دفن نہیں ہو سکتے تھے... چمن لال اور اس کی بیوی ایک رات میں کتنا فرش توڑ کے کتنی کھدائی کر سکتے تھے... پھر انہیں فرش بنانا بھی تھا اور وہ کوئی پیشہ ور مزدور نہیں، خاندانی رئیس تھے۔ نہ ان کے جسم مشقت برداشت کر سکتے تھے اور نہ ہاتھ سخت کام کے عادی تھے۔

موہن کا یہ اندازہ بھی درست نکلا... زیورات کی پوٹلی صرف ایک فٹ کی گہرائی پر نمودار ہو گئی۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ موہن لال نے اسے باہر کھینچنا چاہا مگر وہ سیمنٹ میں پھنسی ہوئی تھی... اس نے ایک ایک کر کے زیورات کو باہر نکالا۔

یہ بڑا خطرناک وقت تھا۔ اس وقت کوئی آ جاتا تو ایک نظر میں موہن لال کے عزم سفر اور وطن کی محبت کی ساری اصلیت سامنے آ جاتی۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے کام روک دے لیکن باہر قوالی پورے عروج پر تھی... قوال چیخ رہے تھے... جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے... تو ہی تو... تو ہی تو... تو ہی تو... طبلے کی تھاپ، ڈھولک کی دھمک... تالیاں... سب کا ملا جلا شور موہن کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا... انٹرول ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔

تھیلی سارے زیوروں سے خالی ہو گئی تو موہن نے گڑھا دوبارہ بھرا اور ایک ایک کر کے ٹائلوں کو جمانے لگا۔ سارا کام بڑی صفائی سے ہوا تھا... جب تک کوئی مسہری کے نیچے گھس کے نہ دیکھتا، اسے کٹا ہوا فرش نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ٹائلوں کو جدا کرنے والی لکیر ایک ملی میٹر چوڑی تھی اور باہر والی لکیر بھی مسہری کے نیچے ایک فٹ اندر تھی۔

موہن نے باہر آ کے بڑی پھرتی سے کٹر مشین کو واپس

مایوسی گناہ ہے
روحانی اسکالر
پیرزادہ وسیم جعفری
کا اعلان
ہم چھین لیں گے آپ کی ہر پریشانی اللہ کے کرم سے
وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل وجادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک ونفرت کی آگ ہو، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان ہوتا ہو، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا، عزت ووقار میں کمی یا دشمن حاوی ہو بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں
پیرزادہ وسیم جعفری
گجرات پاکستان
0300-7462777
0333-8217808

اپنے سوٹ کیس میں رکھا... پھر زیورات کو اپنے سوٹ کیس میں ڈالا... اس کے لیے کپڑوں کے نیچے ڈبل باٹم تھا لیکن باہر سے اس کا کوئی اندازہ نہ ہوتا... اچانک قوالی کا شور تھم گیا۔

موہن نے اطمینان کا سانس لیا... اس کا سارا کام توقع سے کم وقت میں اور کسی مداخلت کے بغیر ختم ہو گیا تھا... اس نے جلدی سے ہاتھ پیر صاف کیے اور دروازے کی کنڈی کھول کے بیڈ پر لیٹ گیا... یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے خیر خواہوں میں سے کوئی اوما کے ساتھ آجائے... دروازہ اندر سے بند ملتا تو انہیں خواہ مخواہ شک ہوتا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اس نے اوما کی آواز سنی... یقیناً کوئی اس کے ساتھ آ گیا تھا... دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور وہ اشرف علی کے ساتھ اندر آ گئی... موہن لال نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور اٹھ بیٹھا...

"ہاں پتر موہن لال! کیسی ہے طبیعت؟" اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پھر کسی ماہر حکیم کی طرح نبض دیکھی۔

"ٹھیک ہے چھوٹے نانا جی... میں آنے ہی والا تھا... اتنا مزہ آرہا تھا قوالی میں لیکن کیا کرتا... سر کے درد نے بیٹھنے نہیں دیا۔"

"اب تو بخار بھی نہیں ہے... خیر سے... مزہ تو اب آئے گا۔"

"مزہ بہت آتا اگر کام پورا نہ ہوتا۔"... موہن لال نے سوچا... اب کیا خاک مزہ آئے گا... صبح تک بیٹھنا پڑے گا... پھر وہ گڑ کے میٹھے چاول بھی کھانے پڑیں گے... لیکن اب موہن لال کو یہ تکلیف بھی راحت محسوس ہو رہی تھی... کامیابی نے اس کے جسم میں حرارت، توانائی اور بجلی سی بھر دی تھی۔

موہن لال نے اشرف علی... کے جاتے ہی اوما کو چمٹا لیا اور چوم چوم کے بے حال کر دیا... "اوما! ہمارے خواب پورے ہو گئے... ہمیں سب مل گیا جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے... تم بلاوجہ ڈر رہی تھیں... ایک کروڑ کا سونا ساٹھ سال بعد ہمیں مل گیا اور یہاں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

اوما نے گہری گہری سانسوں میں کہا۔ "بس اب یہاں سے نکل چلو موہن۔"

"تم فکر مت کرو... کل ہم اس شان سے جائیں گے جس شان سے آئے تھے... لیکن آتے وقت ہم ککھلو تھے... اب کروڑپتی ہیں... تمہیں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں... کام ویسے ہی ہو گیا۔"

اگر کام پورا نہ ہوتا تو اوما کچھ لوگوں کو چائے میں نیند کی دوا کے قطرے ڈال کے پلا دیتی... بچے تو پہلے ہی نیند میں لڑھک رہے تھے... بڑھیاں زبردستی جاگ رہی تھیں... ایک کر کے وہ بھی نیند سے مغلوب ہو کے اٹھنے پر مجبور ہو گئیں... صرف مرد صبح تک جاگے... چائے کے آخری راؤنڈ میں ان کو بھی سلا دیا جاتا لیکن اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

صبح قوالی ختم ہونے تک موہن لال موجود رہا۔ اس نے سب کے ساتھ میٹھے چاول کھائے اور چائے پی... سورج نکلنے کے بعد قوال اپنا نذرانہ اور کچھ انعام کی رقم سمیٹ کر رخصت ہوئے تو رات بھر کے جاگے ہوئے ایسے پڑ کے سوئے کہ دوپہر تک حویلی میں سناٹا رہا... صرف موہن لال اور اس کی بیوی جاگتے رہے اور اپنے خواب شمار کرتے رہے، کمرے کی چھت ان کے لیے جیسے سنیما کی اسکرین بن گئی تھی جس پر وہ ایک کروڑ کے سونے سے خریدی جانے والی تمام خواہشات، خوشیاں اور امیدیں دیکھ رہے تھے۔

اب ان کے سامنے آخری مرحلہ واپس سرحد پار کرنے کا تھا... جب وہ آئے تھے تو خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھی... اب پانچ سیر سونے کے ساتھ دوبارہ سرحد پار کرنا آسان نہ تھا۔ دشمن ملک کے سفر میں وہ محفوظ اور کامیاب رہے تھے... لوٹ کر اپنے گھر جانے کا مرحلہ زیادہ پُرخطر ہو گیا تھا۔

لیکن موہن لال کو اس کا علم تھا... جب اس نے منصوبہ بندی کی تھی تو دونوں طرف کے سفر کی مشکلات کو سامنے رکھا تھا۔ اب تو اوما کو بھی اپنے شوہر کی ہمت، ذہانت... دور اندیشی اور منصوبہ سازی کی صلاحیت پر پورا اعتبار ہو چکا تھا... وہ جو کہتا تھا، کر دکھاتا تھا... اس کا ثبوت سب سے پہلے موہن لال نے اوما سے شادی کر کے دیا تھا۔

اگلے دن شام کے وقت موہن لال نے رونی شکل بنا کے اعلان کیا کہ انہیں واپس جانا ہے۔

"کیوں پتر! اتنی جلدی... ابھی تو ہفتہ بھی نہیں ہوا۔" اشرف علی نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بڑے نانا! ہمارا بھی کچھ دن اور ٹھہرنے کا خیال تھا مگر کیا کریں... بڑے بھیا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے... وہ آئی سی یو میں ہیں۔"

"اللہ خیر کرے۔" اشرف علی نے کہا۔ "کیا فون آیا ہے؟"

"ہاں... بھابی نے فون کیا تھا... بہت رو رہی تھیں۔" اوما نے کہا۔ "دراصل ان سے چھوٹے بھائی ملائیشیا گئے ہوئے ہیں اور وہ ابھی نہیں آسکتے... وہاں کسی نے ان کو لوٹ... جتنا روپیا پیسا تھا وہ گیا... ساتھ ہی پاسپورٹ بھی چلا گیا۔"

"اوہو..." بشیر علی نے کہا۔ "پھر تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔"

اگلے دن صبح گلباز خان اپنی ٹیکسی کے ساتھ نمودار ہوا۔ ان کا سامان جو دو سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا، چھت پر رکھا گیا۔ اشرف علی کے سارے خاندان نے ان کو تحفے تحائف اور دعائیں دیں۔ یہ بھی کہا کہ یہاں سے جو چاہے لے جاؤ... سب تمہارا ہے... موہن لال نے پیتل کی ایک گڑوی اٹھائی جو چمن لال اشنان کے لیے استعمال کرتا تھا... ٹیکسی جس راستے سے آئی تھی، اسی پر واپس چل پڑی... موڑ تک چمن لال کی حویلی نظر آتی رہی۔

☆☆☆

آج ایک سال بعد بھی موہن لال اور اس کی بیوی اوما دہلی کے اسی گھر کے ایک کمرے میں ہیں... اسی گھر سے وہ خوابوں اور امیدوں کی گٹھڑی کے ساتھ سرحد پار دشمن ملک کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اور اپنی دانست میں پوری طرح کامیاب ہوئے تھے... واپسی کے سفر کی ہر رکاوٹ کو انہوں نے ایک ہی جادو کی چھڑی گھما کے دور کیا تھا... یہ جادو سرحد کے دونوں طرف ایک جیسا اثر دکھاتا تھا... اس کا نام رشوت تھا۔

اس خزانے کی تلاش کے ایڈونچر پر ان کے تقریباً پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے جن کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اپنے یقین کے مطابق وہ ایک کروڑ کا سونا لوٹ لائے تھے... یہ ان کے آباؤ اجداد کی ملکیت تھا... وہ پکڑے جاتے تو یہ چوری کہلاتی لیکن ان کا [illegible] کسی مرحلے میں بھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوا۔

اس کے باوجود موہن لال آج دہلی میونسپلٹی کے ایک دفتر میں کلرکی کر رہا ہے... اس کی بیوی پہلے کے مقابلے میں کچھ بھدی اور موٹی ہو گئی ہے کیونکہ اس کے دو بچے ہو چکے ہیں اور وہ بیمار بھی رہتی ہے... ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی کے جھگڑے بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔

جو چار سو تولے یعنی پانچ سیر سونا وہ سیکڑوں میل دور دشمن ملک کی سرحد کے پار سے لائے تھے، اس نے موہن لال اور اس کی بیوی کی تقدیر نہیں بدلی... ہوا یوں کہ واپس پہنچنے کے بعد انہوں نے پہلے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ خوب جھوٹ بولے کہ بمبئی میں وہ کہاں گئے... کیسے شاہ رخ خان سے ملے اور کیسے امیتابھ بچن سے... ان کی خوشی دیکھ کے سب نے اعتبار بھی کیا۔

میاں بیوی کے دل میں جوش، ولولے اور امنگوں کا سائیکلون آیا ہوا تھا... دوسرے ہی دن انہوں نے بہت سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد ایک پلان بنا لیا کہ اس قارون کے خزانے کو کیسے نکالا جائے اور کیسے خرچ کیا جائے کہ کسی کو شک

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

جون 2010ء آپ بیتی نمبر کی ایک جھلک

زندگی ایک ہیرے کے مانند ہے جسے انسان خود تراش کر خوبصورت بناتا ہے **انجم انصار** کے کچھ ایسے کرداروں کی تلاش و جستجو کی کتھا

عالیہ بخاری اور **قیصرہ حیات** کے سلسلے وار ناول

رشتے ناتے کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑا نہیں جا سکتا...... گرہ ضرور لگ سکتی ہے رشتوں کی ڈور میں الجھا **یاسمین نشاط** کا ناولٹ

اظہار کے بغیر محبت کا تصور ممکن نہیں...... جب محبت کا اظہار نہ کیا جائے تو عشق میں غصے کی آمیزش بھی ہو جاتی ہے کچھ ایسی ہی آمیزش لیے **سلمیٰ یونس** کی تحریر

ماضی کی یادوں کا ایک سرمایہ **عظمیٰ گیلانی** سے باتیں **رضوانہ پرنس** کے برجستہ انداز فکر کے ہمراہ

اولاد کی تربیت میں ماں کی دلچسپی اور اس کا کردار کیا رنگ اختیار کرتا ہے **شائستہ زرین** کا دلچسپ سروے

سکینہ فرخ، نیلم احمد بشیر، بشریٰ گوندل، لبنیٰ طاہر، سیما یاسمین مجتبیٰ، سدرۃ المنتہیٰ، نگہت غفار، ریحانہ زیدی، ممتاز عمر، عطیہ ہدایت اللہ، عائشہ مصطفیٰ، ثانیہ رحمان، عائشہ خان، ہما بیگ

اور **عقیلہ حق** کی دلچسپ تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

www.pkdigest.com

بھی نہ ہو، ورنہ حسد کرنے والے تو ایک طرف... پہلے حکومت آجائے گی کہ ادھر لاؤ مالِ غنیمت... پھر ڈاکو آجائیں گے... پھر حصہ مانگنے والے دوسرے۔

موہن لال نے بڑی مشکل سے ایک صراف کا پتا چلایا جو اس کے کسی عزیز دوست کا ماموں تھا اور اس سے کہا کہ ان کا کچھ خاندانی زیور ہے... پرانے وقتوں کا سونا ہے جسے وہ اب مجبوراً بیچ رہے ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کسی کو بھی پتا چلے... اس نے تسلی دی اور انہیں گھر بلالیا۔

پہلی کھیپ کے طور پر وہ اپنی دولت کا دسواں حصہ تقریباً چالیس تولے سونے کا زیور لے گئے... صراف ماموں نے زیور دیکھا اور ایک نظر میں بتادیا کہ یہ تو سونا نہیں پیتل ہے... بس اس پر سونے کی پالش ہے... مزید تصدیق انہوں نے کسوٹی سے پرکھ کے کردی۔

میاں بیوی جب منہ لٹکائے گھر لوٹے تو انہیں ایک پارسل موصول ہوا جو کسی بین الاقوامی کوریئر کمپنی کے ذریعے پاکستان سے آیا تھا... پارسل کے اندر ایک ماتھے کا ٹیکا اور ایک خط برآمد ہوا... خط میں لکھا تھا:

"برخوردار موہن لال!

تمہارے واپس جانے کے بعد دوسرے دن ہی صفائی کے دوران ہم نے وہ جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے تم نے فرش کاٹ کے نکالا تھا اور ساری بات ہماری سمجھ میں آگئی تھی... غالباً تمہاری دادی کے ماتھے کا ٹیکا ہوگا جو تم پیچھے چھوڑ گئے تھے... یہ ہم تمہیں ارسال کر رہے ہیں۔ تمہارے آنے اور قیام کرنے کا مقصد بھی ہم پر واضح ہوگیا لیکن ہم نے برا نہیں مانا کیونکہ یہ تمہارا تھا، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنا تمہارا حق تھا۔

تمہیں صرف ایک بات بتانا مقصود تھی۔ ہمیں یہ تو علم نہیں تھا کہ تمہارے دادا اپنا زیور اسی گھر میں گاڑ گیا تھا... لیکن یہ معلوم تھا کہ جس دولت کو اس نے سونے کے ڈھیر میں تبدیل کیا تھا، وہ نقلی تھا... اس نے اپنی زمین ہماری وساطت سے بیچی تھی اور اپنی حویلی بھی ہمیں مفت نہیں دی تھی... وہ پکا بنیا تھا... اس کے باوجود کہ ہم جانتے تھے کہ اس نے یہ ساری جائیداد اور دولت کیسے حاصل کی تھی، ہم نے اس سے دغا نہیں کی۔ ہم نے اسے نقلی نوٹ نہیں دیے... اگر وہ ہم پر اعتبار کرتا تو ہم اسے اصلی سونے کے زیور بنوا کے دیتے جس کے لیے ہم نے کوشش بھی کی تھی... لیکن ہم سے بات کرکے اس نے ایک ہندو جوہری رتن ناتھ سے زیورات بنوائے جو ان کا خاندانی سنار تھا... یہ سارا نقلی سونے کا زیور اسی نے دیا تھا۔

رتن ناتھ نے اپنی ساری دولت نوٹوں کی شکل میں جمع کی تھی لیکن اسے وہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکا... حملہ آوروں نے اس کے گھر کو آگ لگادی اور عام خیال یہی تھا کہ وہ اور اس کی فیملی کے تمام افراد جل کے مرگئے... مکان پر کسی نے قبضہ کرلیا... اس کی مرمت کرائی اور رہنے لگا... چودہ سال بعد وہ جگہ کسی اور نے خریدلی... اس نے مکان گرا کے نئی تعمیر کی... جب بنیادیں کھودی جارہی تھیں تو نیچے سے لوہے کا ایک صندوق نکلا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا مگر وہ سب کاغذ کے پرزے ہوگئے تھے۔ چودہ سال میں نوٹوں کے ڈیزائن دوبار بدل چکے تھے۔

ظاہر ہے یہ سب رتن ناتھ جوہری کی جمع پونجی تھی جو وہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکا... اتفاق سے اگلے ہی سال مجھے خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی... وہاں میں نے رتن ناتھ کو فقیروں میں دیکھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی لیکن میں نے اسے پہچان لیا... جب میں نے اس سے بات کی تو وہ بہت رویا... کچھ اپنے بیوی بچوں کو یاد کرکے جو جل کے مرگئے تھے... کچھ اپنے اعمال کو یاد کرکے جو اس کے کام نہ آئے تھے... اس نے میرے سامنے علاوہ اپنے دیگر جرائم کے یہ بھی اعتراف کیا کہ اس نے رائے بہادر چمن لال کو پانچ سیر سونے کے بجائے پیتل کے زیورات بنا کے دیے تھے۔

جب تم نے مجھ سے پوچھا کہ چمن لال کا وہ سارا زیور کہاں گیا... تو بات میری سمجھ میں آگئی تھی... میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ تم اسی سونے کے چکر میں آئے ہو... تمہارا اپنے دادا کے کمرے میں سونے کا اصرار کوئی جذباتی معنی نہیں رکھتا تھا... اس کے باوجود میں نے تمہیں پورا موقع فراہم کیا کہ تم وہ خاندانی سونا نکال لو... کسی نے بھی تمہاری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

اب تمہیں اندازہ ہوجانا چاہیے کہ ہم پاکستانی کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں... لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہم بےوقوف نہیں ہوتے... خیر خواہ!

تمہارے چھوٹے بڑے (دشمن) نانا۔

بشیر علی اشرف علی بقلم خود۔

نوٹ: یہ ٹیکا جو تمہاری دادی کی نشانی ہے، اصلی سونا ہے۔ یہ اس کے سہاگ کی نشانی تھا جو ہمیں حویلی میں ملا تھا۔ ہم تمہاری بیوی اوما کے لیے بھیج رہے ہیں... تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے دشمن نانا سسروں نے اسے کچھ نہیں دیا۔ خالی ہاتھ واپس بھیج دیا۔"

www.pkdigest.com